

خواتین کے لیے صاف ستھرا تقریبی ادب

# آپنا نامہ



مورانی  
سلمیٰ کنول





### مستقل سلسلہ

286	میمونہ تاج	268	ایس صدیقی	آپ کی شخصیت
289	جویریہ طاہر	270	ہومیو پتھرا شمس	آپ کی صحت
296	شہلا عامر	275	فریدہ جمیل	کام کی باتیں
303	ہما احمد	277	عائشہ غفار	بیوٹی گائیڈ
309	شمالہ کاشف	278	طلعت آغاز	ڈش مقابلہ
314	روین احمد	281	افیش سہیل	غزل، نظم
				سورق کی شخصیت عذرا صدیق

خط و کتابت: آنچل پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200، فون 2628014 فیکس 2639577

بکے از مطبوعات نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز۔ ای میل [thair@cyber.net.pk](mailto:thair@cyber.net.pk) - [www.aanchalpk.com](http://www.aanchalpk.com)

## آنچل پبلی کیشنز

### ابتدائیہ

22	مدیرہ	سرگوشیاں
23	آزاد سن آزاد	جہ نعت
24	مدیرہ	در جواب آل

### دانش کدہ

28	حکیم محمد سعید	شرف انسانی
----	----------------	------------

### ہمارا آنچل

30	ادارہ	فوزیہ جیمہ تلااحر
----	-------	-------------------

### غزل اس نے چھری

34	فریدہ خانم	سلیم طاہر
----	------------	-----------

### جیون ساتھی

36	عالیہ را	وسیم الرحمن عظمیٰ
----	----------	-------------------

### سلسلہ وار ناول

76	اقراء صغیر احمد	تیری الفت میں ضم
130	عشنا کوثر وار	افسون جاں
212	عفت سحر پاشا	سبز تپ کی چھل مل

### مکمل ناول

38	سعدیہ مل کاشف	میرے ہاتھوں کی لکیریں
----	---------------	-----------------------

### ناولٹ

182	نازنین نازی	پریت کی ریت انوکھی ساجن
-----	-------------	-------------------------

### ناولٹ

98	شائستہ حسن	جیون کیا ہے
164	شیم شمس صدیقی	ملا بھی تو کیا ملا

### افسانے

114	عالیہ را	بس بونہی اچانک
242	عائشہ ناز علی	احساس
258	فرح عتیق	رشتہ ہمارے

پبلشر: رخسانہ بیگم، پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہلکی اسٹینڈیم کراچی مقام اشاعت 5-A-2/8 ناظم آباد کراچی دفتر کا پتا: احمد جمیل ڈاکٹر بلموریا اسٹریٹ آئی آئی چنڈریگر روڈ کراچی



## حد

کہیں نہاں تو کہیں عیاں ہے تُو  
ہر جگہ ہے مگر کہاں ہے تُو  
ڈھونڈوں تجھ کو تو ہر جگہ پاؤں  
اور اگر دیکھوں تو بے نشان ہے تُو  
بخش دیتا ہے سب خطائیں میری  
کس قدر مجھ پہ مہرباں ہے تُو  
آندھیوں میں بھی ہے ترا چہرہ  
بادلوں کے بھی درمیاں ہے تُو  
میں تو ادنیٰ غلام ہوں تیرا  
اور بڑا عالی شان ہے تُو

(آزاد حسین آزاد)

## نعت

تیری ذات ہے تو جہان ہے  
اسی بات میرا ایمان ہے  
وہ مرے نبی ﷺ کی حیات ہے  
جو کہ فلسفہ قرآن ہے  
جو ترا ذکر نہ کرے کبھی  
وہ زبان بھی کیا زبان ہے  
اشارہ ہو تو ہو چاند مگرے  
یہ میرے نبی ﷺ ہی کی شان ہے  
تیری نعت جانِ آزاد ہے  
اور جان ہے تو جہان ہے

(آزاد حسین آزاد)



## دعائیں

ڈیفرنٹ شاہینہ..... جھنگ

ڈیفرنٹ دعا۔ ”ہی ہی ہی“ کرتا ہوا خط موصول ہوا۔ دیکھ لو یہی چار مرتبہ ہے نا۔ بھائی مبارک پیار لینا۔ سند یہ چلا جائے گا۔ شعر و شاعری کے صفحات کم ہو سکتے ہیں۔ بڑھائے نہیں جاسکتے۔ پرچہ دیکھ لو گنجائش ہے؟ جو ہے وہی قائم رہے تو شکر ہے۔ سلسلوں کے ناموں میں رد و بدل سے کیا مراد ہے؟ بینکنگ ڈپلومہ مبارک ہو۔ دودو چار کے چکر میں پھنس کر آچل پڑھنا نہ چھوڑ دینا بلکہ بینک والوں کو بھی تلقین کرو کہ آچل پڑھیں۔

لالہ رخ..... لاہور

لاڈلی لالہ جیو۔ ”ہنسا“ مسکراتا ڈانٹیں کھاتا خط ملا۔ ”اف“ حالت مار پڑھ کر افسوس ہوا۔ دراصل آپ عمر کے اس حصے میں ہیں کہ نہ بچوں میں کھیل سکتی ہیں اور نہ بڑوں میں بیٹھ سکتی ہیں۔ دو چار سال گزر جانے دیجیے۔ اس پریشانی سے نجات مل جائے گی۔ بچوں کی بزرگ بن جائیں گی۔ نمبروں بننے کے لیے بڑا ہونا ضروری ہے نا۔ ایڈریس دینے کا سلسلہ بالکل بند ہو چکا ہے۔ لہذا آپ کا پتا ہمارے پاس ہی محفوظ رہے گا اور ڈاک کے انتظار میں گزرتی چلی جائے گی۔ دل برداشتہ نہ ہونا۔ ہمارے لیے مشکل ہے۔

خواجہ عرفانہ محبوب..... جتوئی

عرفانہ ڈیئر جیتی رہو۔ ناراضگی نامہ موصول ہوا۔ لگا وہ ہماری والی عرفانہ کہیں کم ہوگئی۔ خیر آپ کے 200 روپے میں 5 آچل بھیجے جاسکتے ہیں۔ بانی ڈاک خرچ میں لگ جائیں گے۔ مارچ اپریل مئی جون جولائی پھر ختم۔ کراچی کا موسم خوشگوار ہے۔ محبوب میاں عمرہ کرائے ہوں تو مبارک پہنچا دو اور وہ قلم بہت سنبھال کر رکھنا بہت خوب صورت تحفہ ہے

جس سے آپ نے ناراضگی نامہ تحریر کیا۔

نادیہ + ثوبہ بی بیار۔ دو ذیل بھانجیوں کا ٹھنڈا خط کشمیر کے فضاؤں سے ہوتا ہوا موصول ہوا۔ پہلی بار شرکت پر خوش آمدید۔ آچل فیملی میں شریک کیا۔ بجلی کا کیا پوچھتی ہو۔ ادھر بھی یہی حال ہے۔ جب چاہا چلی گئی۔ آپ کی دعاؤں کا شکریہ اللہ آپ کو اس کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ آپ اپنا تعارف جب چاہیں بھیج سکتی ہیں۔

مس زابدہ رشید علوی..... راولپنڈی

زابدہ جی دعا۔ دعاؤں بھر اخط موصول ہوا۔ اللہ آپ پر اور آپ کی فیملی پر اپنا کرم و رحم فرمائے۔ ہر پریشانی سے بچائے آمین! جیتے کی پیدائش کی مبارک بابت قبول کر دو اللہ بچے کی عمر دراز کرے۔ آمین۔ اب عید تو گزر گئی اس لیے نظم بے کار ہو گئی۔ خطوط کے تاخیر سے ملنے سے یہی ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ رہ جاتا ہے۔

شیم اختر..... فیصل پور

شیم ڈیئر دعا۔ ہم سب چیزیں ان کے شعبوں کو بھیج دیتے ہیں۔ وہاں چھائی ہوئی ہے۔ جو خطوط تاخیر سے ملتے ہیں ان کی چیزیں چھپنے سے رہ جاتی ہیں۔ کچھ چیزیں اگلے ماہ کے لیے رکھی جاتی ہیں۔ کچھ ضائع کر دی جاتی ہیں۔ آپ کی دعاؤں کا شکریہ۔

حیا غوری

حیا جیتی رہو۔ شکایت نامہ موصول ہوا۔ مارچ کا ”در جواب آں“ شکایت پر ہی مبنی ہے۔ ہر ایک کو ہم سے شکایت ہوگئی ہے۔ آپ کے لیٹر نہیں ملے۔ یہ خط بہت دنوں بعد ملا ہے جس کا ہم جواب دے رہے ہیں۔ آچل کو ”حیا“ کی

ضرورت ہے۔ یہ ضرورت کبھی ختم نہ ہوگی۔ آچل فیملی میں جو آپ کی جگہ ہے وہ رہے گی۔ مطمئن رہیں۔ شکایت دور ہوگی کہ نہیں؟

زرتاشا..... فیصل آباد

زرتاشا۔ پیار۔ پیار پیارا خط ملا۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ”ایم بی ایس“ میں آچل کو شامل کر لیا۔ اس سے بڑی کبابات ہو سکتی ہے۔ بہن سلمیٰ کنول کو آپ کی دعائیں پہنچ جائیں گی۔ ٹھیک کہتی ہو ہر کبابی نہیں نہ کہیں موجود ہوئی ہے۔ کوئی کبابی ایسی نہیں ہوتی جس کی جھلک معاشرے میں موجود نہ ہو۔

خالدہ علی..... پوران

خالدہ ڈیئر خوش رہو۔ میٹھا میٹھا خط موصول ہوا۔ چند لمحوں کو کھٹاپن دور ہو گیا۔ ہمیں خالہ کہنا بہت پسند ہے۔ اپنائیت اور محبت بھرے رشتے کا کوئی مول نہیں۔ آپ کو آج سے ایک مرلے جگہ سوپ دی گئی۔ اب اس پر محبت کا قتل قیام کرنا آپ کا کام ہے۔ اپنا تعارف بھیج دو۔ چھپ جائے گا۔

نسرین شہزادی..... ملتان شہر

شہزادی پیار۔ محبت بھر اخط ملا۔ آپ بھی ہمیں ”خالہ“ کہہ سکتی ہیں۔ خوشی ہوئی کہ آپ گھر کے کاموں سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ عورت کا اصل مقام ہی ”پچن“ ہے۔ ہزاروں پریشانیوں اور فکروں سے نجات رہتی ہے۔ آپ جب چاہیں خط لکھ سکتی ہیں۔ عشنا کو ترس دار صلیبہ افراسیاب احمد صلیبہ عفت سحر باشا صلیبہ کو آپ کی مبارک بابت پہنچ جائے گی۔ آنٹی سلمیٰ کنول کے لیے دعائے جائے۔ انشاء اللہ قبول ہوگی۔

سمیرا روشنی..... کراچی

روشنی سلامت رہو۔ آپ کا پہلا خط مل گیا۔ آچل پسند کرنے کا شکریہ۔ اپنی پڑھائی میں مصروف رہیے۔ جب مکمل ہو جائے تو باقاعدہ پڑھنا شروع کر دینا۔ آسیہ مرزا اقرام صغیر احمد اور رخ جوہری کو آپ کی مبارک بادان بطور کے ذریعے پہنچ جائے گی۔ جو چاہیں بھیج سکتی ہیں۔ تحریر معیاری ہوگی تو چھپ جائے گی ورنہ معذرت۔

اسماء افضل..... بہاولپور

اسماء جی دعا۔ اپنی والدہ کے انتقال پر تعزیت قبول کیجیے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے آمین۔ شکایتوں بھرا خط طویل تھا۔

فی الحال کبابی نہ بھیجئے۔ آچل کا سالگرہ نمبر چھپنے والا ہے۔ تیاری میں مصروف ہو جائیں گے اور آپ کی کبابی نہیں پڑھ سکیں گے۔ رکھی رہے گی اور آپ کو خواہ مخواہ انتظار کی رحمت گوارہ کرنا پڑے گی۔ ہمارے پاس رکھنے کی بجائے آپ کے پاس رہے تو زیادہ بہتر ہے۔ ضرورت ہوگی تو منگوا لیں گے۔ امید ہے آپ ماسند نہیں کریں گی۔ دل کو ٹوٹنے سے بچائے رکھیے گا۔

اقصی صابر بٹ..... اوکاڑہ ٹی

اقصی دعا۔ دعاؤں سے سجا آپ کا پہلا خط موصول ہوا۔ خوشی ہوئی۔ سمجھ گئے تھے کہ آپ شہا صابر بٹ کی بہن ہیں۔ وہ ہماری مستقل چہرہ نگار ہیں اور آچل میں شرکت سے کوتاہی نہیں برتی ہیں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔

قراۃ العین ضیا..... ملتان

عینا جیتی رہو۔ پہلا خط ملا خوشی ہوئی ہمیں ”عینا“ نام پسند آیا۔ آپ ”دوست کا پیغام آئے“ میں شرکت کر کے دوست بنا سکتی ہیں۔ البتہ ہم ایڈریس اور فون نمبر ایک دوسرے کے نہیں چھاپتے ہیں۔ آپ کی میسی مصروفیت پسند آئیں۔ اللہ آپ کو اچھے نمبروں سے پاس کرے آمین۔ آپ آچل فیملی میں شامل ہو سکتی ہیں۔ اس فیملی میں بہت محبت سے جگہ ملتی ہے۔ سب ایک دوسرے کو اپنا اپنا سمجھتے ہیں۔ اپنے دکھ اپنی خوشیاں شریک کرتے ہیں۔

فاخرہ صابری نوا..... لاہور

رنجیدہ بھانجی بہت دعائیں۔ تھوڑا سا صبر اور آچل کا سالگرہ نمبر تیار کر کے ”دردِ دلہا“ پڑھ ڈالیں گے۔ کیا کریں۔ مہینوں پڑھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ شکایتوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ ایک ہماری جان ناتوں اور اتنی شکایتیں۔ امید ہے اب شکایتیں نہیں کر دیں گی۔ مئی میں چھپنے کی خوش خبری یا کٹ بھیج کر منگوانے کا مشورہ آپ کو مل جائے گا۔

شیریں خان

شیریں جان خوش رہو۔ شکایتی خط موصول ہوا۔ ”سبز یوں سے علاج“ والا مضمون مکمل ہو جائے تو چھاپنے کا پروگرام بنائیں گے۔ آپ سبز یوں سے علاج کا باقی مضمون بھی بھیجا دیجیے بالکل ناراض نہیں۔ کیا آپ نے ہمیں ناراض کیا ہے؟ نہیں تو پھر کیوں ناراض ہوں گے۔ آئندہ اپنے شہر کا



نام لکھتا نہ بھولے گا۔

کشمالہ خان..... رشاور

کشمالہ جیتی رہو۔ زمین خط دیکھ کر آنکھوں میں رنگ بکھر گئے۔ جی ماں آپ ہمیں ”پیا“ کہہ سکتی ہیں۔ آپ اپنا تعارف بھیج سکتی ہیں۔ آپ تمام کالوں میں حصہ لے سکتی ہیں۔ آپ آج کل فیملی کی ممبر بن سکتی ہیں۔ آپ کے تمام سوالات کے جوابات حاضر ہیں۔ اب تو خوش ہو۔

ساجد عباس اعوان..... حافظ آبادی

عزیزم! دعا۔ اس ماہ کا ”در جواب آں“ شکایت ہی شکایت ہے۔ بات نظر انداز کرنے کی نہیں بلکہ مجبوری کی ہے شے والے کہتے ہیں کہ پہلے خواتین کو جگہ دی جائے گی اس کے بعد بھائیوں کا نمبر آئے گا۔ ادارتی مجبوریوں کا خیال رکھیے۔ تحریریں آپ کی سب ہی معیاری ہوتی ہیں۔ اگر ”ہم سے پوچھیے“ میں بھائی لوگوں کے سوالات خواتین کے پرچے کے لیے موزوں نہیں ہوتے تو ان کو ان کا جواب نہیں دیا جاتا۔

سباں گل..... رحیم یار خان

گل! دعا۔ پہلا پہلا محبت بھرا خط ملا۔ آج کل پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ ”آئی“ کہہ سکتی ہیں بلکہ ہم آپ کی آئی ہیں۔ ہم آپ کو اپنی صحت ایمان اور اچھے مستقبل کی دعا دیتے ہیں۔ آج سے آپ بھی آج کل فیملی میں شامل ہو چکی ہیں۔ بس شکوے نہ کیجئے گا ہماری مجبوریوں کا خیال رکھیے گا۔ ہر ماہ خط کا جواب نہ دے سکیں گے۔

منہا نزل روشی..... رحیم یار خان

منہا نزل دعا۔ اللہ آپ کی آئی کو صحت یاب کرے اللہ سے دعا ضرور قبول ہوگی۔ حوصلہ نہ ہاریے۔ انشاء اللہ آپ کی آئی ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ کے لیے بھی دعا ہے کہ اچھے پیچھے ہوں اور اچھے نمبر حاصل کریں۔ ابھی تک ہمیں آپ کا تعارف موصول نہیں ہوا۔ اگر اسی الفاظ میں تھا جس میں خط تھا تو پھر لال روشتانی سے لکھے ہوئے کی وجہ سے ایک طرف اٹھا کر رکھ دیا گیا ہوگا۔

اساء سامی..... لطیف آباد

سامی! دعا۔ جیتیا مبارک ہو۔ نام بھی پسند آیا۔ اذہان کو ہماری طرف سے پیار کر لینا۔ ہر ماہ خط نہ لکھ سکو تو کوئی حرج نہیں۔ جواب ایک ماہ چھوڑ کر دیا جاتا ہے۔ آج کل کا سالگرہ نمبر

جھینے والا ہے اپریل کا پرچہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ اگر کچھ بھیجنا چاہو تو بھیج سکتی ہو۔

شیبا عابدی..... اوکاڑہ ٹی

شیبا پیار۔ ہمارے لیے جو دعائیں نظم آپ نے تحریر کی ہیں اس کو پڑھ کر آپ کی محبت نے بہت متاثر کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ان محبت بھری دعاؤں کا بہترین اجر عطا فرمائے آمین۔

قراۃ العین..... ساکھڑ سندھ

قراۃ پیار۔ یہ پہلا خط ہے جو ہفتا مسکراتا آیا ہے۔ ورنہ شکایت شکایت۔ بارشیں ہوئیں مگر ٹوٹ کر نہ برسیں۔ کراچی بارش کے قابل نہیں۔ تعارف مع تصویر بھیج دیجیے۔ چھپ جائے گا۔ جب بھی فرصت ملا کر بے چیزیں بھیج دیا کرو۔ عید گزری بکریوں کے ساتھ گائے کو دیکھتے اور سرتاپے ہوئے۔

سعدیہ عروج عباسی..... خانپور کٹورہ

عروج پیار۔ تعارف کے لیے تصویر کی سازگی بھی بھیج دے صفحے کے اعتبار سے بنائی جائے گی۔ صاف اور واضح ہو۔ غزل کے بارے میں نہ پوچھیے تو اچھا ہوگا۔

صبا نواز بھٹی..... ساکھڑ

صبا پیار۔ محبت بھرا پیارا معصوم سا خط ملا۔ آپ اپنی خالہ جانی یعنی ہم سے ہر طرح کی بات کر سکتی ہیں۔ ہم سے آپ کو پیاری پیار ملے گا۔ اللہ آپ سب کو صحت مند رکھے آمین۔ اپنی ائی کو ہماری دعا اور سلام پہنچائیے۔ پھول بہت پسند آیا جو آپ نے ہمیں بھیجا ہے شکریہ۔

سعدیہ اہل کاشف..... ملتان

سعدیہ بی بی! سلامت رہو۔ آپ کو مبارک ہو۔ اب آپ بطور رائٹر پہچانی جانے لگی ہیں۔ ہاں یہ تو ہے کہ آج کل کے ذریعے ہی پہچان بنی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر آپ میں تحریری صلاحیت نہ ہوتی افسانوی مزاج نہ ہوتا اور قلم میں قوت اظہار نہ ہوتی تو بے جا رہ آج کل کیا کر سکتا تھا یا ہم کیا خدمت کر سکتے تھے۔ ناول لکھا۔ شاید اسی ماہ چھپ رہا ہے۔ سالگرہ نمبر کے لیے کیا کر رہی ہو؟ کاشف میاں کو دعا۔

مرفیہ صحرآصف علی..... ملتان

فصیحہ سلامت رہو۔ سالگرہ نمبر کے نامیٹل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ انکل مشتاق صاحب کو آپ کی دعا پہنچا دی جائے گی۔ آصف میاں ٹھیک ڈانٹ رہے ہیں۔ قلم کو

رنگ بھی لگ گیا ہے۔ موجودہ رجحان بھی نظر انداز کر رہی ہو۔ آج کل نئی نسل نے فلمیں دیکھ دیکھ کر اپنا ذوق خراب کر لیا ہے۔ اب انہیں ادب نہیں چاہیے۔

ریحانہ فتاب..... کراچی

ریحانہ ڈیز خوش رہو۔ تفصیلی خط پڑھا۔ ”مجھے تم اچھی لگتی ہو“۔ چھپ جائے گا۔ دیگر سوالات کا جواب یہ ہے کہ ہم صرف ”در جواب آں“ ہی میں جواب دیتے ہیں۔ ذاتی خطوط لکھنے کی فرصت کہاں۔ آپ کے خط کے اوپر دو روپے کا ٹکٹ چسپاں ہے۔ یہ کس کام آئے گا؟ اس کے علاوہ ٹکٹ موصول نہ ہو سکے۔

آزاد حسین آزاد..... پاک بکریہ

عزیز بھائی سلامت رہو۔ آپ کے عقیدت بھرے الفاظ ہمارے لیے انمول تحفہ ہیں۔ آپ نے جس طرح ہمیں دعاؤں سے نوازا ہے اس کے لیے اللہ سے بہترین اجر کی دعا کرتے ہیں۔ تجھ کو گراہونے کے باوجود بھی آپ جو بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ اس کا نفیابی سبب یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اللہ کا قرب بہت زیادہ چاہتے ہیں اور چاہنا بھی چاہیے تاکہ ”کسی کے قرب“ کی تمنا نہ رہے۔ عزیز بھائی! پورا کا پورا انسان اور اس کی زندگی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اللہ کی امانت کی حفاظت اس طرح کرنی چاہیے کہ اپنا دل اپنی تو قیں اپنے احساسات اپنی نظر اپنا فکر و عمل سب کچھ دوسروں پر قربان کرنے سے گریزاں ہونا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے بندے کے لیے کیا بہتر ہے اور کیا بہتر نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے کہ ”جب کسی کام یا کسی مقصد کے حصول میں بار بار ناکامی ہو تو سمجھ لو کہ وہ تمہارا مقدر نہیں“۔ اور آپ کو اسی حدیث پر اپنے آپ کو پختہ کرنا ہے جو آپ کے مقدر میں نہیں اس کے بہت سے بہانے پیدا ہو جائیں گے۔ آپ کی شاعری کا مجموعہ موصول ہوا۔ بہت پسند آیا۔ حمد اور نعت زیر نظر پرچے میں موجود ہیں۔ یہ ہم نے خاص طور پر شائع کی ہیں۔ تاکہ آپ آئندہ اللہ و رسول ﷺ کے ہو کر رہ جائیں۔

ام نینا وارث

نینا دعا۔ آپ کا افسانہ موصول ہوا۔ آج کل کے معیار کے مطابق ثابت نہیں ہوا۔ آپ نے مسودہ بھی غلط تیار کیا۔ ابھی

خاصی ناچنگی پائی جاتی ہے۔ اگر واپس منگوانا چاہیں تو ٹکٹ بھیج کر منگوائیجیے۔

فرحانہ ناز ملک

فرحانہ ڈیز خوش رہو۔ ”گلی رتوں کا ملال کب تک“ پڑھا۔ آج کل کے معیار کا ثابت نہ ہو سکا۔ کافی ناچنگی پائی جاتی ہے۔ کاٹ چھانٹ بھی بہت کرنا پڑے گی۔ ہم نے پہلے بھی گزارش کی تھی کہ بہت طویل نہ لکھیے مگر بہت اچھا لکھے۔ صرف مکالمات کا نام کہاں نہیں۔ ٹکٹ بھیج کر منگوائی سکتی ہیں۔

منزہ بخاری..... مظفر گڑھ

منزہ ڈیز دعا۔ ”کبھی بادل ویراں برس سائیں“ پڑھا۔ ڈھیر سا نہ لکھیے انتخاب لکھیے۔ صرف مکالمے کہاں کی معیاری نہیں بناتے کہاں بھی مضبوط ہونا چاہیے۔ کاٹ چھانٹ کے بعد قابل اشاعت ہو سکتی ہے اگر منگوانا چاہیں تو ٹکٹ بھیج کر منگوائیجیے۔ کاٹ چھانٹ اس لیے ضروری ہوتی ہے کہ تحریر معیاری بن جائے۔

ناہیدہ فاطمہ

ناہیدہ ڈیز خوش رہو۔ ”مجھے ڈھونڈ لے میرے حرم ماں“ مل گیا پڑھا۔ طوالت بہت ہے اور غیر ضروری ہے۔ کافی کاٹ چھانٹ کی ضرورت ہے۔ تب ہی قابل اشاعت ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کوشش کے بعد آپ بہتر لکھ سکتی ہیں۔ اگر کاٹ چھانٹ کے لیے راضی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ٹکٹ بھیج کر منگوائیجیے۔ آپ نے اپنا پتا بھی نہیں لکھا۔

عائشہ صدیقہ..... کراچی

عائشہ ڈیز خوش رہو۔ ”انمول چاہت ہی زندگی ہے“ مل گیا۔ آپ دوسری قسط جو آخری بھی ہوگی، بھیج دیجیے۔ جب ناول مکمل ہو جائے گا تب ہی پڑھیں گے اور آپ کو انجام سے باخبر کر دیں گے۔ آپ بے فکر رہیں جب دونوں قسطیں ہمارے ہاتھ میں آجائیں گی تو ہم پڑھیں گے۔

تاجیر سے ملنے والے خطوط۔

شمینہ شاہین ناماب، بتول حکیم خان حکیم نرس سلطانہ اعوان، فرزادہ ریش، عظمیٰ صفدر، فوزیہ سحر کائنات، سونیا سونی، راشدہ اسلم نواز، شعل فرید، صائمہ اقبال۔





# شرف انسانی

حکیم محمد سعید (شہید)

سورۃ البقرہ کی آیات کریمہ میں انسان کا مقام واضح طور پر متعین ہو جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات انسان کے لیے سراپا رحمت ہیں اور اس دین کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اندر جو بلند مقام عطا فرمایا ہے وہ اسے معلوم ہوتا کہ دنیا میں عزت و فلاح کی زندگی بسر کرے اور مرنے کے بعد ابدی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مستحق ٹھہرے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون سے کہا کہ میرا رب وہ ہے کہ جو مارتا ہے اور جلاتا ہے تو فرعون کی عقل انسانی اس حد تک خمید ہو چکی تھی کہ وہ کہنے لگا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اس پس منظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔ یہ ایک انقلابی اعلان تھا جس نے انسانوں کو پہلی بار بتایا کہ انسان ہی عزت و شرف کا مستحق ہے اور کائنات کی تمام مخلوقات اس کے تابع ہیں اس کی خدمت کے لیے ہیں اُسے فائدہ پہنچانے کے لیے ہیں اُس لیے کہ خالق کائنات اللہ جل جلالہ نے انسان کو اس کرۂ ارض پر اپنا خلیفہ اور نائب مقرر کیا ہے۔ اب دنیا میں انسان ہی کا حکم چلے گا۔ انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا اور کائنات کی تمام دوسری مخلوقات کو تصرف میں لائے گا۔

شرف انسانی کے تحمل کو عام کرنے کے لیے مزید تشریح فرمائی کہ اس شرف میں تمام انسان برابر کے حق دار ہیں۔ نسل اور رنگ اور وطن یہ سب محض پہچان اور شخص کے لیے ہیں۔ گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر یا عربی کو عربی کو عربی پر کوئی فوقیت اور کسی قسم کا امتیاز حاصل نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ دنیا کے تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں ایک خاندان کے افراد ہیں لہذا انسان اور انسان کے درمیان فرق واقعا محض جہالت و کم نظری کی پیداوار ہے۔ شرف انسانی عام ہے۔ ہاں اس میں درجہ و جہ کا فرق ہو سکتا ہے۔ مثلاً جو لوگ مفتی ہیں اللہ کے حکم کی پابندی کرتے ہیں اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اپنی ہدایت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں وہ یقینی طور پر ان بھائیوں سے زیادہ مستحق شرف ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اپنی زندگی کو عام شرف انسانی سے بڑی حد تک محروم کر رکھا ہے۔

اب یہاں ایک اور نکتے پر غور فرمائیے۔ انسان اس کرۂ ارض پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اور نائب ہے۔ یہی اس کا مقام شرف ہے۔ اس شرف کا سب سے بڑا اور سب سے اہم اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان کو اپنے فعل و عمل میں اور اپنے کردار میں اور اپنے فکر و نظر میں اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان و عمل ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ متبع اخلاق ہے انسان کو بھی صاحب اخلاق ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے انسان کو بھی انسان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہیے وغیرہ۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک سوال پر جواب عطا فرمایا کہ حیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم علم پر قرآن ہے۔ قرآن حکیم فرمان و ارشاد الہی ہے۔ سرور کائنات خرم و جودات نور مجسم ہے قرآن پر عمل کر کے زندگی کا وہ نمونہ پیش کیا کہ جو اللہ تعالیٰ جانتا تھا۔ وہ اللہ کے رسول تھے انسان تھے اور مردِ شرف انسانی پر فائز ثابت ہوا کہ اس کرۂ ارض اور اس دنیا کے ہر انسان کو وہی زندگی گزارنی چاہیے جس کا نمونہ ذاتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان سے ایسی ہی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے۔

شرف انسانی کا نظریہ سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا اور انسان کو دوسری مخلوقات کی ذہنی غلامی سے نجات دلائی اور اسے مشرف کیا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائیں کہ ہم انسانی شرف کو قائم رکھیں اور اپنی زندگیاں قرآن و سنت کے مطابق بسر کریں۔

(بشکر یہ ہمدرد محبت)



اس صفحہ ارض پر انسان اپنی حقیقت سے قطعی ناواقف تھا اور اپنے حقیقی مقام سے نا آشنا تھا۔ طلوع اسلام سے قبل اس کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے بت بناتا تھا اور ان بتوں کے آگے اپنی مرادوں کے لیے سر جھکا رہا تھا۔ وہ دین اسلام سے قبل انسان کا حال یہ تھا کہ وہ درختوں اور پاؤں سمندر میں اور چاند سورج کو اپنے سے زیادہ بڑا اور محترم سمجھتا تھا۔ اپنے سے ہر قوی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اس کا مزاج تھا اور اپنے سے توانا کے آگے جھک جانا اور اس کی پرستش کرنا اس کی عادت تھی حتیٰ کہ ایسے حالات میں ایسے انسان بھی ہوئے کہ انہوں نے اپنی معبودیت کا رنگ بچایا اور انسان نے انسان کو مجبور کیا کہ وہ اسے اپنا معبود مانے۔

یہ سارا دور انسان کی تاریکی کا دور ہے۔ یہ وہ دور اور زمانہ ہے کہ انسان کو اپنی حقیقت کا پتا نہ تھا اور اپنے مقام کا اسے احساس تھا نہ اور اک۔ وہ ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ وہ افراط پر اتر آتا تو اس نے خود کو دنیا کی سب سے بلند شے سمجھا۔ غرور و تکبر و جبر و تعظم و جور اور شر و فساد اس کا مزاج بنا۔ مگر یہی انسان جب تقریباً پر اتر آتا تو اس نے خود کو دنیا کی ذلیل ترین، سچی سمجھا اور جس شے سے اس کو فائدہ کی توقع ہوئی اور مصرت کا خوف اس نے اس کو اپنا معبود تسلیم کر لیا۔

اسلام نے ان دو انتہائی تصورات کو باطل کر کے انسان کے سامنے اس کی اصل حقیقت رکھ دی۔ ایک طرف اسلام نے انسان کے غرور و تکبر کو پاش پاش کر دیا۔ یہ بتا کر کہ وہ ایک گندے قطرہ آب سے پیدا ہوا اور مٹی اور چرموٹی کے پتھر سے کہ جو ایک حقیقی پانی ہے اس کی نسل چلائی گئی۔ اس تکبر شکنی کے بعد اسلام نوع بشر کو بتاتا ہے کہ وہ اتنا بھی ذلیل نہیں کہ جتنا وہ خود کو سمجھتا ہے۔

قرآن نے کہا: ”اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی و تری میں سواریاں دیں پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا کیا ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔“ (الاسراء: ۷۰)

انسان کی یہ دونوں حیثیتیں جب سامنے آتی ہیں تو ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس دنیا میں انسان کا صحیح مرتبہ و مقام کیا ہے؟ اس کا جواب قرآن حکیم نے یہ دیا ہے:

”اور جب کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا کہ کیا تو زمین میں اس کو نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلانے کا اور خون ریزی کرنے کا؟ حال آنکہ تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے آدم کو نام سکھا دیا۔ پھر ان فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا۔ اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ انہوں نے کہا پاک ذات ہے تیری۔ ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے۔ تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا اے آدم! ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا۔ پس جب آدم نے ان کو ان اشیاء کے نام بتائے تو خدا نے کہا کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو اس کا سب علم رکھتا ہوں۔ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو کعبہ کرو تو اس سب نے سجدہ کیا۔ یہ جزائیں اس کے کہ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا اور ہم نے آدم سے کہا کہ تُو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو مگر اس درخت کے پاس بھی نہ چلو کہ تم خالوں میں سے ہو جاؤ گے۔ مگر شیطان نے ان کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوش حالی میں تھے اس سے ان کو نکلوا دیا۔“ (البقرہ آیات ۳۰ تا ۳۶)



## نورانیہ حیرت

سو سویت آنچل فیملی اور میران کو میرا پر خلوص سا السلام علیکم! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ سب بخیر و عافیت رہیں (آمین)۔ سب سے پہلے تو اس امید سے کہ آپ مجھے ناصر برداشت کریں گے بلکہ مجبوری کے طور پر مجھے پسند بھی تھوڑا زیادہ کرنا پڑے گا۔ جی جناب ہم بھی آج بڑے اپنے بارے میں دھماکے کرنے لگے ہیں۔

جی جناب میرا نام نورانیہ ہے۔ سب پیار سے نورانیہ کہتے ہیں اور جو کوئی مجھے نورانیہ نام سے پکارے وہ تو بہت اچھے لگتے ہیں۔

میں 30 اپریل کی ایک حسین رات کو اس دنیا میں جلوہ افروز ہوئی اور مجھے اسرار سے کوئی دلچسپی نہیں جو اس کے بارے میں کچھ بتاؤں۔

میرے ماشاء اللہ 6 بہن بھائی ہیں جن میں میرا نمبر پانچواں ہے۔ سب بہت پیار کرتے ہیں ہم سب بھائی بہنوں میں پیار بھی ہے اور اکثر لڑائی بھی ہوتی ہے۔

پسندیدہ شغل میرے بے شمار مشاغل ہیں جو میرے موڈ پر منحصر ہیں۔ مثلاً اسلامی کتابیں پڑھنا اور کوئی اچھی کتاب ناول مل جائے تو انہیں پڑھنا اور آنچل اور خواتین ڈائجسٹ سب سے پہلے میں نے خواتین ڈائجسٹ میں لکھا اس کے بعد آنچل میں باقاعدگی سے لکھتی ہوں ہر ماہ۔ میوزک کی بڑی شوقین ہوں اس کے بغیر بالکل بور۔ سلائی کڑھائی کا شوق بھی ہے اور مہندی بھی جب موڈ ہو تو دوسروں کو بڑے شوق سے لگاتی ہوں اور کھانا بھی گزارے لائق بنالیتی ہوں اور جناب جی میں بی اے کی اسٹوڈنٹ

ہوں پڑھائی میں ٹھیک ہوں اگر کبھی نام ٹاپ آف دی لسٹ آیا تو پھر کھڑکی کی کد بہت اچھی ہوں۔

اور غصہ تو مجھ سے بھی زیادہ ڈھیٹ جو سب کو اتا ہے لیکن مجھے اگر کسی پر اتا ہے تو اس کا منہ دیکھ کر جھگڑا کی طرح بیٹھ جاتا ہے کہ میرے غصے سے تکلیف ہو رہی ہے۔ اور جناب مجھے دوستی کا رشتہ بہت اچھا لگتا ہے صرف مخلص دوست اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو میری مخلص دوست ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی وجہ سے چلی جاتی ہے۔ میری سب دوستیں ایک جیسی ہوتی ہیں سب سے دوستی کرتی ہوں لیکن ابھی تک صرف میری ایک دوست میرے بہت فریب ہے۔ میں اکثر اپنے دکھ گھم کی باتیں اس سے شیئر کرتی ہوں۔ لیکن میں اپنی ذاتی باتیں کسی دوست سے شیئر نہیں کرتی۔ میں اپنی ذاتی باتیں صرف ایک بہت عزیز سی جان میری زندگی کا ایک حصہ ہے صرف اس سے شیئر کرتی ہوں۔ اور جناب بچے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں ہنستے ہوئے اگر کہیں راستے میں کوئی بچہ مل جائے جو مجھے بہت اچھا لگے تو میں پیار ضرور اسے کرتی ہوں۔ اس وجہ سے بھی امی سے یا بھائی سے ڈانٹ کھائی پڑتی ہے۔

فیورٹ پرسنائی صرف اور صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

میرا قیمتی اثاثہ میرے والدین اور بہن بھائی ہیں جن سے مجھے بہت محبت ہے۔

پسندیدہ راکٹر زفر سٹائر سے باقاعدگی سے ڈائجسٹ پڑھتی آ رہی ہوں اس دوران پسندیدہ آسیہ مرزا عمیرہ احمد

رفت میران نکلتے سیماء اقرء صغیر احمد اور بہت سے ہیں جو اچھا لگتے ہیں۔

پسندیدہ شاعر: فیض، پروین شاکر، فرحت عباس شاہ نوش کیلانی اور جن کی شاعری دل کو لگے۔

پسندیدہ خوبوہ خوشبو جو میری سانسوں میں بسی ہوئی ہے۔ سن میں رچی ہوئی ہے۔

پسندیدہ پھول صرف گلاب کا۔

پسندیدہ رنگ کالا سرخ اور لائٹ کمر پسندیدہ کمر ہیں۔

پسندیدہ کھانا جو بھی مل جائے کھا لیتی ہوں اور جو پسند ہو وہ بھی سامنے آ جائے تو شور نہیں کرتی بلکہ کھانا ہی نہیں کھاتی۔

پسندیدہ موسم گریموں کا موسم مجھے بے انتہا پسند ہے خاص طور پر گرمیوں کی راتیں اور وہ بھی چاند راتیں کھلے آسمان تلے بیٹھ کر چاند تاروں کو ٹکنا اس لیے میں گرمیوں کا بڑی شدت سے انتظار کرتی ہوں۔

پسندیدہ ڈریس شلوار میض اور ساڑھی ہے۔

اور جناب وہ لوگ تو مجھے ذرا اچھے نہیں لگتے جو اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ اور ہوتے ہیں۔ مجھے سادہ زندگی پسند ہے جس میں مکمل سکون اور خوشی ہو۔ مجھے اپنی جو تعریف کرتے ہیں وہ لوگ ذرا اچھے نہیں لگتے۔ جو ایک دوسرے سے حد کرتے ہیں میں اپنے آپ کو اتنا صاف گو تو نہیں کہوں گی مگر مجھے نہ تو کسی کی برائی کرنا پسند ہے اور نہ ہی سننا۔ میرے ساتھ اگر کوئی برا بھی کرتا ہے تو میں اسے معاف کر دیتی ہوں۔ میری زندگی میں بہت دفعہ ایسا ہوا ہے جب میرے اپنوں نے ہی میرا اعتماد توڑا اور مجھے بہت گہری تکلیف دی مگر کہتے ہیں جن کے ساتھ ماں باپ کی دعائیں ہوں تو ان کا کوئی کچھ نہیں رگا رکتا اور میرے ساتھ ہر وقت میرے اپنوں کی دعائیں ہیں اور زندگی تو ہوتی ہی سے حادثوں کے لیے۔ اگر ان سے ہم گھبرا جائیں تو زندگی کیا کرے گی۔

اور جناب کچھ اپنے پیارے سے آنچل کے بارے میں۔ تو آنچل کا ہر سلسلہ ہی بہت پسند ہے اور جناب ناول تیرے ہتا میرا پسندیدہ ناول ہے۔ میری خدا سے دعا ہے کہ تیرے بنا لکھنے والی کو اللہ صحت یاب کرے۔

ارے جناب سب سے اہم چیز تو رہ گئی جس کی وجہ سے میری خواتین ڈائجسٹ میں انٹری ہوئی اور پھر جناب اس انٹری نے مجھے آنچل میں لکھنے کے لیے مجبور کیا اور جناب آج ہم حاضر ہیں۔

شاعری اچھی اور معیار بڑھنا تو میرا شوق ہے لیکن یہ نظم میں نہیں جانتی کس شاعر کی ہے لیکن مجھے بہت پسند ہے۔

یونہی ہنسی ہنسی میں ہم دلوں سے پھیل جاتے ہیں کوئی چھوٹی سی تھک بات کوئی چھوٹا سا جملہ کوئی زہرا لودھیہ کوئی بے ضرری دو معنی بات سننے والے کے دل میں کھاؤ لگا جاتی ہے پھر کھتی ہے تلافی کے مرہم لگاؤ قطرہ قطرہ خون نپٹتا رہتا ہے وہ آنسو جو آنکھ سے گرتا ہی نہیں اندر ہی اندر جم جاتا ہے برف پر گرے موم کے قطرے کی طرح اور وہ برف تو شاید وقت کی گرمی سے پھل جاتی ہے مگر وہ قطرہ جب بھی پھلنے لگتا ہے پھل جاتا ہے بڑھ جاتا ہے بس ختم نہیں ہوتا اور یونہی پلٹتی ہی میں ہم دلوں سے پھیل جاتے ہیں آخر میں آنچل کے لیے دھیر ساری دعائیں۔ اور آخر میں سب سے اتنا کہوں گی کہ ہمیشہ اپنے والدین کی عزت کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور کسی کو کوئی دکھ نہ دو۔ اگر تمہارے ساتھ کوئی برا کریں تو اسے خدا پر چھوڑ دو اور ہمیشہ پیار خلوص اعتماد اور اعتبار کا دامن ہمیشہ تھامے رکھیے گا اور جناب آپ پور تو نہیں ہوئے اگر ہوئے تو ضرور مجھے بتائیے گا اس کے ساتھ ہی اللہ حافظ۔





## ستارا سحر

ٹھک، ٹھک، ٹھک.....! ٹھک، ٹھک، ٹھک۔  
ارے کب سے ”ہمارا آنچل“ کے دروازے پر دستک دے رہی ہوں، ٹھیکس گاڈ! آپ نے دروازہ تو کھولا۔ ہم تو ناامید ہو کر واپس جانے ہی والے تھے۔ آچل فیلٹی اور آچل پڑھنے والے بہنوں، بھائیوں کو میری طرف سے محبت و خلوص کی چاشنی سے بھرا سلام قبول ہو اور نیا سال ہم سب کے لیے باعثِ رحمت ہو آمین۔ آپ سب پریشان ہو رہے ہوں گے کہ یہ کون ہے جو ہم سے باتیں ہی کیے جا رہی ہے۔ تو جناب پہلے ہم اپنا تعارف کرواتے ہیں:

ٹکلیب اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے  
ہم اُس سے بچ کر چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

مابدولت کا نام ستارا سحر، 14 اکتوبر 1986ء کو اس دنیا میں وارد ہوئے۔ ہمارا اشار LIBRA ہے۔ ہم سیکنڈ ایئر کے اسٹوڈنٹ ہیں، اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنا علیحدہ مقام بنانا ہمارا خواب ہے۔ میرے نزدیک سب سے خوب صورت

رشتہ ماں کا اور پھر دوستی کا ہے۔ ہمارا بیٹس فرینڈ ہمارا ماموں وحید ساری آئیناں اور ماموں۔ مختصر یہ ہے کہ جو میرے ساتھ فیئر ہے، وہ میرا دوست ہے مگر ایسا نہیں ہوتا کہ ہم سب کے ساتھ فیئر ہیں تو ہر کوئی ہمارے ساتھ فیئر ہوگا۔ کچھ خود غرض چہرے دوستی کی آڑ میں چھپے ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص ہوتا نہیں ہر شخص کے قابل ہر شخص کو اپنے لیے پرکھا نہیں کرتے میری عادات کیسی ہیں؟ یہ تو آپ لوگ ہی بتا سکتے ہیں، پڑھ کر۔ میں ضد نہیں کرتی، غصہ بہت کم آتا ہے مگر جب آتا ہے تو بالکل برداشت نہیں ہوتا۔ اور غصہ تب آتا ہے جب کوئی بلاوجہ اور غلط بات کرے۔ سچائی کو پسند کرتی ہوں، دوغلہ اور مبالغہ آرائی کرنے والے لوگوں سے شدید نفرت ہے۔ آپ چاہے اسے میری خوبی کہیں یا خالی کہ محبت بھی بے انتہا کرتی ہوں اور نفرت بھی بے انتہا کرتی ہوں۔ دوسروں کے ساتھ جلد فرینک نہیں ہوتی، اسی وجہ سے مغرور کہلائی جاتی ہوں۔ میں بولتی بہت کم ہوں

اور سوچتی زیادہ ہوں۔ تنہائی پسند ہوں مگر ہمارے گھر میں تنہائی بہت نایاب ہے۔ ہر وقت بلاگلا ہوتا رہتا ہے میں اللہ سے بہت ڈرتی ہوں اور عذابِ قبر سے۔ اللہ سے دعا کرتی ہوں یارب تلافی کرنا میرے گناہوں کی شاید کہ کل کی صبح میرے نصیب میں نہ ہو آئیڈل شخصیت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اگر ہم اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں تو دنیا و آخرت میں سرخرو ہو جائیں گے۔ آج کل خود غرضی کا دور ہے، ہمیں اپنی آخرت کے بارے میں بھی سوچنا چاہئے۔

کھانے میں مجھے کرلیے اور کدو پسند ہیں پھلوں میں آم، سیب اور مالٹا۔ مشروب میں چائے، خوشبو میں Havoc اور مٹی کی خوشبو۔ پھولوں میں گلاب اور نیوٹ روز۔ فیورٹ کلر بلیک۔ فارغ وقت میں آچل، کرن، شعاع، خواتین اور پاکیزہ ڈائجسٹ پڑھتی ہوں۔ میوزک سے بھی لگاؤ ہے، ابرار الحق، جگجیت سنگھ، سونو نگم، عامر سلیم اور فاخر موسٹ فیورٹ ہیں۔ اس کے علاوہ جن سونگرز کی شاعری اچھی خواہ منکر کوئی بھی ہوں، بس شاعری Serious ہو۔

فیورٹ رائیٹر اُف یہ بہت مشکل ہے کہ کسی ایک کا نام لوں کیوں کہ ہماری بہت ساری رائیٹر ہیں جو بہت اچھا لکھتی ہیں مگر عمیرہ احمد، عشنا کوثر، فرحت اشتیاق، عفت سحر پاشا میری فیورٹ رائیٹر کی فہرست میں ہیں۔ فیورٹ شاعرہ پروین شاکر، نوشی گیلانی اور شاعروں میں فرحت عباس شاہ، وحی شاہ ساگر صدیقی، نیو ایئر اور

برتھ ڈے پر دوستوں کو دس کرنا مجھے بہت اٹریکٹ کرتا ہے۔ کچن میں کام کرنا مجھے بالکل پسند نہیں مگر وہ کہتے ہیں ناں کہ مجبوری کا نام شکر ہے۔ بس مجبوری کے تحت کچھ نہ کچھ پکا لیتی ہوں۔ کھیل مجھے کرکٹ پسند ہے اور کھلاڑی یوں تو ہمارا ہر کھلاڑی اچھا ہے مگر مجھے شاہد خان آفریدی کے کھیلنے کا انداز بہت پسند ہے۔ میرا پیغام ہے کہ ہمیشہ خوش رہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھیں۔ زندگی میں مخلص لوگوں کی قدر کریں کیوں کہ آج کل کے دور میں ایسے لوگ بہت نایاب ہوتے ہیں۔ آپ سب نے مجھے بہت برداشت کیا، میرا خیال ہے کہ اب اجازت لی جائے۔ آپ سب اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجئے گا کہ ہم سے ملاقات کیسی رہی۔ اوکے، پھر ملیں گے، اگر آپ نے چاہا تو!

ہر موڈ پر ملتے ہیں ہمدرد ہزار لگتا ہے میری بستی میں اداکار بہت ہیں

لوگوں سے ایسے ملوں کہ وہ زندہ ہو جائیں اپنی ذات میں زندہ رہنا کوئی کمال نہیں





# سلیم طاہر

فرید خانم



نئی سلسل کے شعراء میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا۔ سلیم طاہر کی غزل اسے آہنگ اور احساسات میں اپنے ہمدر کی موثر ترین غزل کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

آنکھیں بھی دھڑکنوں کی زباں بولنے لگیں اور جھل ہوا وہ شخص تو کھرام مچ گیا ان کی غزل میں نظریہ حیات اور معیاروں میں جسم نظر آتے ہیں۔ اس کے لیے تو پر کئے والی آنکھ اور احساسات کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ کس طرح کی مسافت مرے نصیب میں ہے کہ جب سے باندھا ہے رنج سفر نہیں کھلتا ان کی غزل میں سچائی آہنگ اور جذبہ شہادت انداز میں شامل ہے۔ امید اور یقین پایا جاتا ہے جسے پڑھ کر آگے بڑھنے اور منزل مل جانے کا احساس ملتا ہے۔

آخر اک دن ہم بھی منزل پر پہنچ ہی جائیں گے زندگی بھر ہم کو آخر در بدر رکھے گا کون ہر دور میں شاعر نے اپنے معبود سے سوال کیا ہے کہ یہ جو آہو جھٹکتے ہیں یہ کس کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور ان کی تلاش کب ختم ہوگی؟ سلیم طاہر نے بھی یہی سوال کیا ہے

جھٹکتے آہو کو طاہر تلاش کس کی ہے گولہ پھرتا ہے کیوں در بدر نہیں کھلتا سلیم طاہر کے ہاں محبوب کا ذکر بھی بہت نزاکت اور شوق کے ساتھ آیا ہے وہ اپنے محبوب کو پھان لفظوں میں یاد کرتے ہیں کہ یاد آیا تیرا زلفوں میں چمکتا چہرہ چاند جب جمیل میں ڈوبا ہے کبھی شام کے بعد سلیم کی غزل میں یورپی شدت کا احساس بھی ہوتا ہے اور بے اختیار دل سے آہ نکل جاتی ہے جب ہم شعر پڑھتے ہیں کہ

وہ جس کا سلسلہ رگتا نہیں کہیں طاہر اک ایسے درد کا آغاز کر گیا کوئی بچپن وہ دور ہے جو کہ کسی بھی انسان کے لیے بھلا نا ممکن

بعض لوگ اس قدر خوش نصیب ہوتے ہیں کہ جب دوسرے لوگ ان سے ملتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ تعارف کے محتاج نہیں ہیں بلکہ تعارف خود ان کا محتاج ہے۔ یہ وہ بے مثال لوگ ہوتے ہیں جن کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں اور انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کیسے کرے؟ جی ہاں انہی بے مثال لوگوں میں سے ایک نام سلیم طاہر کا ہے۔ سلیم طاہر کو کون نہیں جانتا؟ کیا آپ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے؟

میں آج ان کا تعارف لے کر غزل اس نے چھیڑی میں حاضر ہوں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میری ملاقات ہمہ جہت موصوف جناب سلیم طاہر صاحب سے حلقہ ترقی و تنقید ادب پاکستان لاہور کے مشاعرے میں ہوئی۔ یہ اس ادبی تنظیم کے سرپرست اعلیٰ اور روح رواں ہیں۔ سلیم طاہر صاحب نے جس شفقت اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا میں انہیں کبھی نہیں بھول سکتی اور ان کی بہت ساری دعا میں آچل اور آچل کے قارئین کے لیے ہیں۔

سلیم طاہر کو آپ لوگ پروڈیوسر کے طور پر تو جانتے ہی ہیں ان کا بہت بڑا تعارف ہے۔ پروگرام میں اور آپ جسے بولنا آسان نہیں ان ہی کا طرہ اختیار ہے۔ انہیں PTV کے پانچوں مراکز سے کام کرنے کا اعزاز حاصل ہے لیکن میں ان کا تعارف پروڈیوسر کے طور پر ہرگز لے کر نہیں آئی بلکہ بطور شاعر آج یہ ہمارے آچل کے صفحات پر جلوہ افروز ہیں۔

سلیم طاہر کے بنیادی خاندان کا تعلق کشمیر سے ہے لیکن لاہور کے گلی کوچوں میں ان کا بچپن گزرا۔ اور بچپن کا گھر سے اٹھ کر اردو کیا۔ دوران تعلیم سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے انہی اے کے ساتھ یونیورسٹی لاہور سے ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کیا۔ ان کا گھر یلو پس منظر ادبی ہے ان کی اب تک دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی کتاب پنجابی زبان میں ننگھ تریل 1986ء میں اور دوسری کھرام 1998ء میں شائع ہوئی۔ ان کا شمار جدید ترین رجحانات کے پاکستانی غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے

ہم کتنی ترقی کر لیں کتنے ہی باشعور کیوں نہ ہو جائیں ہمارے اندر ہمارا بچپن سدا سدا سدا رہتا ہے۔ بچپن کی یادیں سدا بچپن کتنی ہیں اور سدا سرور بھی رکھتی ہیں۔ بچپن انسانی زندگی کا سب سے خوب صورت اور یادگار دور ہے۔

جائے جلتے یاد آیا ہے رستے میں بچپن بھول آیا ہوں رکھ کر بے تے میں انسانی زندگی میں وہ لحاظ بھی آتے ہیں جنہیں وہ بھلائے سے بھی نہیں بھول سکتا اور ہر اسی احساس اور اسی لمحے کی تلاش میں رہتا ہے جو دوبارہ بھی نہیں ملتا۔ سلیم طاہر بھی اسی لمحے کی تلاش میں سرگرداں ہیں

مہنگائی میں اس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں وہ لمحہ جو نہیں خرید سکتا میں سلیم کے ہاں محبوب سے ملنے کی سرخوشی اور لطافت بھی پائی جاتی ہے اپنے محبوب سے مل کر انسان کے کیا احساسات ہوتے ہیں وہ ان کے ہاں یوں بیان ہوئے ہیں

کس کے رنگ کھلے ہیں تیری آنکھوں میں کس کے ہاتھ کی خوشبو ہے گل دستانے میں سلیم ایک سادہ اور شفاف انسان ہیں ان کی شخصیت پر کوئی مہ کاری نہیں ہے۔ وہ کھلی کتاب ہیں جو چاہے انہیں پڑھ سکتا ہے اس کا دھڑکی وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں

میں ایسا شخص ہوں جو چاہے تھماک لے مجھ میں یہاں ورنہ کوئی عمر بھر نہیں کھلتا بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں کہ جب انسان بالکل بے بس ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا درد اپنا احساس دوسرے انسان تک کہے پہنچانے یا ایک بے بسی کی کیفیت ہو جاتی ہے کہ جب اپنے دل کی بات کہنے کے لیے مناسب لفظ نہیں ملے ان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ

لفظ عاجز ہیں میرا ساتھ کہاں تک دیں گے مجھ کو بھی دل کی کوئی بات بتائی آئے زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے کہ جب ہمیں کوئی ایک انسان ساری دنیا اور سارے رشتوں سے عزیز تر نظر آتا ہے۔ اس کے سامنے ہر چیز ہر شخص جیسے نظر آتا ہے اور دل پکارا اٹھتا ہے کہ چاہے زمانہ ساتھ چھوڑ دے لیکن صرف اس شخص کا ساتھ بھی نہ چھوڑے۔

اک ایک کر کے بھی رابطہ توڑ لیں مجھ سے وہ ایک شخص فقط میرا ہم نوا رہ جائے امید ہے کہ آپ سب کو یہ خود اختلاف تعارف کا طریقہ ضرور پسند آئے گا اور آخر میں ہم سب سلیم طاہر کے لیے بس یہی دعا کر سکتے ہیں کہ خدا کرے نہ دو کلمہ اور زیادہ (آمین)۔

میرے مولا نگاہ میں رکھنا

ہم کو اپنی پناہ میں رکھنا  
مگر ہی ساتھ ساتھ چلتی ہے  
تو ہمیں سیدی راہ میں رکھنا  
جھٹکتے والوں میں نام لکھ لینا  
عازلوں کی سیاہ میں رکھنا  
ہم محبت کے نام لکھ لیا ہیں  
تعلق نگاہ میں رکھنا  
تہیں شایان شاں ترے ہرگز  
ہم کو حال تباہ میں رکھنا

سروں پہ ماہ مسافت اٹھاکے چلتا ہے مسافروں کو گھروں سے ابھی نکلتا ہے وہ کاغذوں سے ابھی کشتیاں بناتی ہے تمام عمر جسے خشکیوں پر چلتا ہے یہاں معاف نہیں ہے ذرا سی لغزش پا اور اختیار میں اپنے کہاں سنبھلتا ہے ابھی سے ان میں بہت اختلاف رائے ہے وہ بچے جن کو مری صحت کے نیچے پلنا ہے ابھی تو اٹھتا ہے اٹکت آپ کی جانب ابھی تو دست خیر کو آنکھ ملتا ہے وجود شب میں اترتی ہے اعتبار کی لو سوا رہ میں مہ انکشاف چلتا ہے کبھی تو اس کے رویے کی برف پھلے گی کبھی تو میرے لیے دھوپ کو نکلتا ہے

غزل  
مرے شانوں پر سر پہلے نہیں تھا  
یہ زعم ہال کوئی پہلے نہیں تھا  
مرا اب کوئی دھبی دشمن نہیں ہے  
مگر مجھ میں یہ ذر پہلے نہیں تھا  
پڑاؤ پڑاؤ گر رہا نہیں ہوں  
مرے رستے میں گھر پہلے نہیں تھا  
خدا جانے وہ کب کا جاچکا ہے  
میں اتنا بے خبر پہلے نہیں تھا  
نکل کر آئے چہرے کہاں سے  
کہ بند آنکھوں میں در پہلے نہیں تھا  
ستم یہ ہے کہ اب فرصت نہیں ہے  
یہی رنج سفر پہلے نہیں تھا





# وسیم الرحمن ہمرائے وسیم

عالی حرا



اس سے پہلے ہم لوگ بھابھی کو رسم حنا کر کے آئے تھے۔ چونکہ بھابھی کا بہت دور گھر ہے اس لیے ہم لوگ گاتے ہوئے گئے تھے۔  
بنو تیرے ابا کی اونچی حویلی  
بنو میں ڈھونڈتا چلا آیا  
بھابھی سبز کپڑوں میں اپنی بہنوں کے سنگ  
رسم حنا کے لیے آئیں لمبا سا گھونگھٹ، دھیمی سی  
چال، شرمیلی مسکان۔

سب نے بھابھی کو پھول، گہنے، گجرے پہنائے اور مٹھائی کھلا کر رسم حنا ادا کی اور پھر ڈھولکی پر گیت گائے گئے۔  
آج میرے بھائی کی رسم مہندی ہے۔  
سفید براق کرتا شلوار، بھائیوں، گزیز اور دوستوں کے گھرے میں سرخ دوپٹے کی چھاؤں تلتے کھڑے بھائی جان کے چہرے پر روپ آیا تھا۔ مسکراہٹ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی اوپر

آج 14 اکتوبر میرے بھائی وسیم الرحمن کی رسم مہندی۔

اس شادی کی ہم لوگوں کو کتنی خوشی ہے اس کو لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے نہ بتایا جاسکتا ہے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ عظمیٰ بھابھی ہمارے برسوں کے انتظار کا صلہ.....

امی جان کی خوشی دیدنی تھی۔ اس شادی میں شرکت کے لیے لوگ دور دور سے آئے تھے۔ امی جان بہت خوش تھیں ان کے سارے بچے ان کے پاس تھے اور گارے تھے۔

آئی مہندی کی یہ رات  
لائی خوشیوں کی بارات  
سجینا رہے ساجن کے ساتھ  
رہے ہاتھوں میں یونہی ہاتھ  
گوری کرت سنگھار  
گوری کرت سنگھار

سے سب کی چھیڑ خانیاں اور ذومعنی جملے۔ ہر کسی کی خواہش تھی میں وسیم کی مدد کروں بھابھی کے گھر والے دھوم دھام سے مہندی لے کر آئے۔ انہوں نے حق مہندی ادا کیا رات گئے یہ تقریب دھوم دھام سے انتہا کو پہنچی۔  
8 اکتوبر کو شادی تھی۔ بیٹے کا گھر بیانے اور بہولانے کی خوشی جتنی امی کے چہرے پر تھی اس کا حساب ہی نہیں۔ چائنا سلک کے لائٹ گرین سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھیں۔  
بلیک سوٹ میں گلے میں موٹا سا سرخ اور سنہری گلابوں کا بارڈالے سہرا بندی کرانے کے بعد بھائی تیار تھا۔ لیکن کی خوشی چہرے سے ظاہر تھی بارات کا استقبال شان دار ہوا۔



میرون اور گولڈن احتجاج کا عربیک شرارہ ہمرنگ جیولری میک اپ ہار سنگھار کیے بھابھی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ نکاح چونکہ صبح میں ہو چکا تھا اسی لیے انہیں جلدی ہی لا کر اسٹیج پر بھائی کے سنگ بٹھا دیا گیا تھا۔ سب نے ان کا احاطہ کیا ہوا تھا، ذومعنی فقرے، شوخ نظارے اور مودی کی تیز روشنی شرارتیں اور چھیڑ خانیاں لمحہ لمحہ کیمرے کی آنکھ میں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ رات گئے رخصتی ہوئی، ہم تینوں بہنوں نے گھر لا کر کھیر چٹائی کی رسم کی اس کے بعد کمرے کا دروازہ روکا گیا، بھائی جان حیران تھے یہ کیا ہو رہا ہے۔ انہیں سمجھایا گیا تو ٹھیک ٹھاک رقم ملی۔ بھائی نے ہم تینوں بہنوں کے ساتھ انصاف کیا تھا۔

اگلے دن رسم ولیمہ تھا، عظمیٰ بھابھی رائل نیوی بلو شرارے میں جبکہ بھائی نیوی بلو سوٹ میں بہت

یوں عالی حرا کے بھائی کی تقریب سعید الحسنی گارڈن میں اختتام پذیر ہوئی، سب دعاؤں کے ساتھ رخصت ہوئے۔ خدا اس خوبصورت جوڑی کو نظر بد سے بچائے اور ان کی خوشیوں کو قائم و دائم رکھے آمین، آمین۔





# میر رہا تھوں کی لیکھیں ہر سانس کے

سعدیہ ایل کاشف

یہ ٹھیک ہے نہیں مرتا کوئی جدائی میں  
خدا کسی سے کسی کو مگر جدا نہ کرے  
اگر وفا پہ بھروسہ نہ رہے دنیا کو  
تو کوئی شخص محبت کا حوصلہ نہ کرے

”ساتھ کہ محبت دے باؤں دل کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے۔ اتنی خاموشی ہے کہ ہمیں خود اس کی آمد کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ ایسی طلسمانی چیز ہے کہ ہمیں اس کی موجودگی کا احساس تب ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے بچے مکمل طور پر گارڈ چلی ہوتی ہے۔ کیا تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ارتج۔“ شازمہ نے محبت کی طویل اور شاعرانہ وضاحت پیش کی تو ارتج مسکرائے بنانہ رہ سکی۔

”نہیں شازمہ ہماری ارتج اتنی شاعرانہ نہیں۔ یہ تو سائنٹیفک مائنڈ رکھتی ہے۔ اس کے لیے آنکھوں کا ملنا دو آنکھ کے ملنے کے برابر ہے اور محبت کا ہونا میل بننے کے۔“ کرن کے کہنے پر شازمہ ہلکھلا کر ہنس پڑی اور ارتج چو اتنی دیر سے ان کی چھیڑ چھاڑ کو برداشت کر رہی تھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جانے دو بدتمیزو تم لوگ دوست کہلانے کے لائق ہی نہیں۔ اتنی سچائی سے میں تمہیں اپنی فیلنگز

بتا رہی ہوں اور تم لوگ اس قدر نا سیریس ہو۔“ ارتج نے اپنی فائل ہینڈ بیک اور آنچل کو سمیٹا اور ہولے ہولے چلنے لگی۔ اسے روٹھتا دیکھ کر شازمہ اور کرن بھی اٹھ گئیں اور اسی کے ساتھ ہولے ہولے چلے گئیں۔

”اچھا سوری یار بتا آگے کیا ہوا۔ وہ شرمیلا بندہ کچھ بولا بھی کہ نگاہ یار کے سامنے نا میں نا میں فٹ ہو گیا؟“ شازمہ نے شرارتی آنکھوں سے دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

”بول ناں کیا ہوا پھر مرزا وصی احمد کی داستان وفا کا۔“ کرن نے لمبا سانس نام لے کر کہا۔

”مقبورہ بناس کی محبت کا۔ یار تم لوگ سیریس ہی نہیں ہوتے ہو۔ میں اس سے بدلا لینے کے چکر میں ہوں اور تم لوگ مجھے کوئی مشورہ نہیں دے رہے۔ بھول گئیں اس دن اس مرزا صاحب نے جو بدتمیزی کی تھی مجھے اپنی تذلیل کا اس سے بدلا لینا ہے۔ اس



حقى -

”کون مغرور ڈیٹر۔“ وصی احمد نے ذہن پر زور ڈالا۔

”یار اتنے بھولے مت بنو۔ میں اربع کمال کی بات کر رہا ہوں۔ جسے چار سال میں پہلی بار یاد کرنا ہوگا۔“ یار لوگوں نے تو اسے نہ صرف تقریر میں بلکہ دل سے بھی بار بار دیکھا ہے۔ ہر وقت دیدار مرزا کے لیے تڑپتی رہتی ہے۔ آج تو بڑی پریشانی سے مجھ سے دریافت کیا کہ ”وصی احمد ودن سے نظر کیوں نہیں آئے؟“ کامران نے لڑکیوں والی آواز بنا کر کہا تو وصی احمد مسکرا دیا۔

”اچھا پھر تو نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے تمہاری بیماری کے اوپر وہ مرچیں چتر کیں، وہ مرچیں چتر کیں کہ وہ قاتل نظر مقبول بن گئی۔ پریشانی کے وہ سائے لرزے اس ماہوش کے چہرے پر کہ میں آپ پریشان ہو گیا۔ پھر جب اس نے اسی پریشانی سے تمہارا فون نمبر پوچھا تو مابذولت نے خود کو سنبھالتے ہوئے اسے تمہارا ہیل فون نمبر پکڑا دیا۔“ کامران نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

”کیا؟ تو نے اسے میرا سیل فون نمبر دیا۔ عجیب  
 احق انسان ہو یا، وہ فراڈ بھی تو کر سکتی ہے۔“ وحی  
 احمد اپنی مسکراہٹ دہاتے ہوئے بولا۔

”اے نہیں یار! وہ تو تمہارے سحر میں، تمہاری  
زبردست پرستشائی کے جاو میں ایسی مبتلا ہوئی ہے  
کہ اسے دن میں بھی تارے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ  
خود اپنا آپ بھول بیٹھی ہے، پیارے دیکھنا کس طرح  
وہ اپنا اظہار محبت سیل پہ ایس ایم ایس بھیج کر کرکری  
ہے۔“ کامران مزے لے لے کر بولا۔ وحی احمد کی  
مسکراہٹ اور گہری ہونٹیں۔

”یار کامران! وہ بہت گہری لڑکی ہے۔ اور  
ویسے بھی جوڈ بیٹر ہوتے ہیں ناں ان کی دو نہیں دو سو

کے بولے ہوئے اس جملے کا حساب لینا ہے اس امیر زادے سے ابھی تو میں نے اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسانا شروع کیا ہے۔ جانتا نہیں وہ کہ اس کے مقابل بھی ارتج کمال ہے۔ ہمیشہ ہر بازی جیتنے والی۔ 'ارتج کی آواز میں بلا کا فخر تھا۔ مزاحیہ احمد کے گھنڈ کو ختم کرنا تھا۔ آخر اس نے جرم بھی تو ایسا کیا تھا۔ پہلی بار ارتج کمال کو کسی نے ڈیپٹ میں ہرایا تھا اور نہ صرف ہرایا تھا بلکہ اسے ٹرائی وصول کرنے کے بعد وہ اس کی طرف آیا اور بڑی شان سے گردن تان کر بولا۔

”ہاں تو مسرتِ کمال! جن عورتوں کے حقوق کے بارے میں آپ ڈاکس پر کھڑے ہو کر چیخ کر بولیں۔ انہی عورتوں کو ہر دایا ہم مردوں نے۔ آپ کے لیے اب اچھا بھی ہوگا کہ آپ مجھ سے شادی کر لیں اور میری جیتی ہوئی ٹرافیوں کی صفائی کیا کیجیے گا اور پھر مجھ سے اپنے حقوق مانگیے گا۔“ یہ کہہ کر وہ دوستوں کی سیٹوں اور تالیوں میں اسے دیکھتا، اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور اسی دن سے رتب کمال نے اس سے بدلا لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

بہت سوچنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک حل نکلا۔ وہ یہ کہ وہ وصی احمد کو محبت کے جال میں پھنسا کر ہی اپنی تدبیر کا بدلہ لے سکتی ہے اور پھر اس نے محبت کی ایک ننگ شروع کر دی تھی۔ بہت مہارت سے بہت صفائی سے وہ وصی احمد کا تعاقب کرتی۔ اسے کتنی دیر دیکھتی رہتی۔ اسے یہ احساس دلانے کے لیے کہ وہ اسے پسند کرتی ہے اور وصی احمد کا پورا گروپ ارتج کے اس والہانہ انداز پر دانتوں میں انگلیاں دیتا۔ پہلے تو خود وصی احمد نے اس بات کو سرسری لیا لیکن آج جب اسے یونیورسٹی گئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے سخت بخار کی وجہ سے اس نے چھٹی کی تھی۔ چھی گھر آ کر کامران نے اسے بتایا۔

”یار مرزا! وہ مغرور ڈیپٹی آج تمہارا پوچھ رہی

”ہیلو وصی احمد اسپینگ۔“

”وصی احمد طبعیت کیسی ہے؟“ بہت بیٹھا بہت مدھم بچہ تھا۔ وصی احمد کی آنکھیں کھل گئیں اور ماتوس سی آواز پر اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن انجان بنتے ہوئے بولا۔

”کون بول رہا ہے؟“

”نہیں پہچانا، حیرت ہے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ ہماری آواز لاکھوں میں شناسا ہوگی۔ آپ نے تو بہت مایوس کیا مرزا صاحب راتج کمال بات کر رہی ہوں۔“ اسی مدھرتاسے وہ بولی۔

”اوہ آپ دشمن جان کہیے کیسے یاد کیا؟“ وحی احمد نہایت رکھائی سے بولا۔

”یاد تو ان کو کیا جاتا ہے جن کو مجھ بھر کو بھول  
پائیں۔ آپ کوئی بھولنے والی چیز ہیں وصی احمد۔“ یہ  
ذو معنی لہجہ دراصل انتہائی متفرد سے بولا گیا تھا۔

”خیریت؟ آج بڑی شیرینی ٹپک رہی ہے آپ کے لہجے سے ارتعاج کمال صاحبہ آج تک تو صرف نفرت ہی اٹھی مجھ سے۔“

”وصی احمد آج تک ہم جب بھی ملے صرف لڑے جھگڑے ہیں۔ کوئی اچھی بات ہم میں نہ ہوئی۔ کوئی اچھی یاد ہم نے نہ چھوڑی لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ہمیں دوستی کر لینی چاہیے۔ دیکھیں وصی احمد نہ میرے دل میں آپ کے لیے کوئی برائی ہے اور نہ آپ کے دل میں ہوئی۔ پھر لڑنے جھگڑنے سے حاصل کیا؟ چلیں برائی باتوں کو فراموش کر کے نئے رشتے استوار کرتے ہیں۔“

”میں آپ کو سمجھ نہیں پا رہا رہی۔ سچائی تو وہی ہے  
آج تک میں نے دیکھی۔ یا یہ ہے جو آپ آج مجھے  
دکھا رہی ہیں؟“ وحی احمد کے کچے میں حیرت تھی۔  
”میں اپنے آپ کو سمجھنے کا ہی تو مومن دے رہی  
ہوں آپ کو مجھ سے ملے، دوستی کیجئے، مجھ سے بات

آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ مخالف کی کمزوری کو بہت باریکی سے نوٹ کرتے ہیں اور پھر اسی جگہ گھاؤ لگاتے ہیں۔ اس کی یہ ادائیں یہ تیور محض دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے،‘‘ وہی احمد اپنی چھٹی حس اور عقلمندانہ نظریے کے زیر اثر بولا۔

”لیکن پیارے لیکن مان اس طرح سے وہی  
لو کی ری ایکٹ کر سکتی ہے جو کہ عشق میں تن من  
تیاگ چلی ہو۔ مجھے تم سے زیادہ پتا ہے۔ پوری سترہ  
لو کیوں کو دل دے چکا ہوں میں۔“ کامران نے  
اپنے کار جھاڑے۔

”مارعورت ذات بڑی الگ چیز ہوتی ہے۔ آج تک کوئی بھی تیرے میرے جیسا مرد نہیں سمجھ پایا اس وجود زن کو۔ پچاس پچاس سال لوگ عورت کے ساتھ شوہر کی حیثیت سے گزارا لیتے ہیں۔ پھر بھی نہیں سمجھ پاتے۔ یہ ارج کمال کی شخصیت بہت اچھی ہوئی ہے۔ میری تو سمجھ سے باہر ہے۔“ وحی احمد کشن اٹھا کر سیدھا بیٹھ گیا۔

”اچھا یار تو بیٹھ کر سوچ اپنی اربح کمال کے  
ارے میں۔ میں تو چلا گھر اپنے اتنے اتنے دنوں  
بعد گھر جاتا ہوں کہ گھر والے صورت دیکھ کر کہتے ہیں  
کون ہو تم۔“ کامران یہ کہہ کر اٹھا اور اپنے مخصوص  
انداز میں دوڑتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا اور وصی  
احمد اس قاتلانہ غدوخال اور اداؤں کی مالک لڑکی کی  
سحر خیز باتوں میں کھویا رہا۔ کل تک جو آنکھیں اس  
کی طرف جان لینے کے سے انداز میں دیکھتی تھیں  
آج وہی آنکھیں جان دینے پر آئیں۔ بے یقینی  
کا دھند وصی احمد کے چاروں طرف پھیلنا تھا۔

☆☆

بخار کی دوائیوں نے کچھ زیادہ ہی سلا دیا تھا۔  
اگر سیل فون کی بیل نہ بجتی تو شاید ابھی اور سوتا رہتا۔  
اس نے بہ دقت تمام آنکھیں کھولیں اور سیل فون  
بٹن پیش کیا۔



چیت کیجئے، پھر فیصلہ کیجئے گا کہ میرا سچا روپ کون سا ہے۔ ملنا چاہیں گے مجھ سے؟“ ارتج کمال کے اس سوال پر وحی احمد ایک دم چونکا پھر سکرا کر بولا۔  
”ضرور کہاں ملیں گی؟“

”کیفے جہان کے اندر آپ کا انتظار کروں گی میں۔ کل شام چھ بجے۔ آئیں گے آپ؟“  
”ضرور آؤں گا۔“ وحی احمد نے بے ساختہ کہا۔  
ارتج کمال نے فون رکھ دیا اور شانزہ اور کرن کو وکٹری کا نشان دکھایا۔

☆☆

”یہ اتنی بن ٹھن کے کہاں جا رہی ہو اس وقت تم۔“ سلمان نے نئی سنوری ارتج کو دیکھا تو پوچھ لیا۔ سبز جار جٹ کے پرنٹ سوٹ پر بالی کولے ہلکی جیولری پہنے وہ نہایت دلنریب لگ رہی تھی۔  
”سلمان! ذرا مجھے صدر تک ڈراپ کر دو گے۔ بسوں میں چڑھ کر میں جانا نہیں چاہتی۔“ ارتج نے اپنے اکلوتے ماموں زاد بھائی کو دیکھ کر کہا۔  
”تمہیں کیا کام پڑ گیا صدر میں؟“ وہ نہایت آرام سے صوفے پر ڈھے گیا۔

”تم سیدھی طرح بتاؤ تم مجھے ڈراپ کر رہے ہو کہ نہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ جلدی جلدی سینڈل پہنتے ہوئے بولی۔

”ایسی بھی کیا جلدی ہے کسی سیمینار میں پہنچنا ہے کیا مہمان خصوصی کو۔“ سلمان نے اسے چھیڑا۔ اس نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور پینڈ بیگ اٹھا کر کمرے سے جانے لگی۔

”ماما! میں باہر جا رہی ہوں۔ ایک گھنٹہ تک آ جاؤں گی۔“ والدہ کو مطلع کرنے کے بعد وہ جلدی جلدی میٹرھیاں اترنے لگی۔ ابھی اس نے غلت میں گیٹ کر اس کیبا ہی تھا کہ سلمان اپنی بانیک اشارت کرتا ہوا اس تک آیا۔

”بیٹھ جاؤ شرافت سے۔“ وہ تھکمانہ لہجے میں

”اس وقت کیوں غرور دکھا رہے تھے۔ بد تمیز انسان۔“ ارتج بنا کی احتجاج کے بیٹھ گئی۔  
”بس ایسے ہی تمہیں چھیڑنے میں مزہ بہت آتا ہے۔ تمہارا غصیلا چہرہ بہت دلنریب لگتا ہے۔“ وہ بانیک کو ادھر سے ادھر ہلکے لہنے کے سے انداز میں لہرانے لگا۔ ”ویسے ایک بات کہوں ارتج کمال۔ اگر تم اس طرح ہر وقت غصے میں منہ نہ پھلاؤ تو تمہارا چہرہ اچھا خاصا خوب صورت ہے۔ بس ذرا ناک اونچی ہے اور میڑھی بھی۔“ سلمان نے اسے چڑانے کے لیے مزید گرہ لگائی۔

”اوشٹ اپ سلمان۔ خاموشی سے ڈرائیو کرو۔ کہیں اللہ کی پیاری نہ بنا دینا مجھے۔“ وہ اس کی چوڑی پیٹھ پر مکا رسید کرتے ہوئے بولی۔ شہر کی صاف ستھری سڑکوں سے دوڑتی دوڑتی بانیک صدر بازاری کی مصروف اور تنگ سڑکوں پر آچکی تھی۔ شام کا وقت ہونے کے باوجود بھی بازار خاصا بھرا ہوا تھا۔ ایک مارکیٹ کے سامنے ارتج نے بانیک رکوائی۔  
”یہاں لیکن یہاں تو صرف جیولری کی دکانیں ہیں ارتج۔“ سلمان نے ارد گرد کی دکانوں کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہیں اس سے کیا۔ میں چاہے جیولری کی دکانوں سے شاپنگ کروں یا برتنوں کی۔ تم سے صرف میں نے لفٹ مانگی تھی مشورہ نہیں۔“ سختی سے یہ کہتی ارتج اپنا بیگ سنبھالتی اتری اور جیولری کی جگہ گائی دکانوں کی قطاریں عبور کرنی لوگوں کی بھیڑ میں کہیں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ سلمان اسے جاتا دیکھتا رہا۔ پھر کافی دیر کے بعد اس نے اپنی بانیک اشارت کی اور واپسی کا راستہ لیا۔

وہ کافی دیر دکانوں کی قطاروں کو عبور کرتی پیدل چلتی کیفے پہنچی تھی۔ کیفے شہر کے پتوں بیچ لیکن بازار سے ہٹ کر تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو چھ بج کر دس منٹ

”جو چکے تھے۔ جلدی جلدی ٹیبل سلیکٹ کرنا چاہی تو ایک ٹیبل پر مرزا وحی احمد کے موجودگی نے اسے چونکا دیا۔ وہ خود کو سنبھالتی اور اپنے بھرپور سراپے کا جادو چگاتی اس مخصوص ٹیبل تک پہنچی۔ نظروں میں محبت کی روشنی جگمگا کر اس نے وحی احمد کو دیکھا اور بڑے معصومانہ انداز میں مسکرا دی۔ اس کی یہ ادا وحی احمد کو لرز گئی حالانکہ وہ ابھی تک شک کی کیفیت سے دوچار تھا، ارتج کمال کے اس رویے کے متعلق۔  
”وقت کے پابند ہو وحی احمد۔“ وہ مخصوص ادا سے مسکرائی۔

”میں تو سمجھا تھا کہ آپ میری منتظر ہوں گی ارتج کمال۔ لیکن شاید انتظار کرنا عورتوں کی خوبی نہیں۔“ وحی احمد نہایت کھرے انداز میں بولا۔

”خیر چھوڑیں اس بحث کو۔ یہ بتائیں اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ کافی کمزور ہو گئے ہیں دوہی دن میں۔ کسے روگ لگا بیٹھے۔“ ارتج اپنا پرس رکھ کر نہایت بے تکلفی سے بولی جیسے عرصے سے دونوں میں دوستی قائم تھی۔

”آپ کو یہ جان کر شاید دکھ ہوگا کہ میں اب کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ کر بولا۔

”مجھے آپ نے ہمیشہ غلط سمجھا ہے اور آج بھی غلط ہی سمجھ رہے ہیں مرزا صاحب میری آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ آپ ایک اچھے آدمی ہیں۔ اچھی ٹیبل سے تعلق رکھتے ہیں میرے کلاس فیلو ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔“ وہ کمال مہارت سے اسے یقین دلانے لگی۔ اس لمبی تمہید، تعریف پر وحی احمد مسکرا دیا۔ یہ مسکراہٹ بہت گہری اور مسخرانہ تھی جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ آنکھیں اور یہ نظر کرم۔

”بس بس ارتج کمال! مجھے اتنی حیرت میں مبتلا نہ کریں۔ آپ کی زبان اور میرے لیے اتنی میٹھی۔ پہلے فون پر اتنی اچھی طرح سے میری طبیعت پوچھنا۔

پھر یہاں پر بلانا اور اب اتنے اچھے الفاظ میں میری تعریف۔ پلیز ارتج کمال پلیز۔ آئی ایم اے نارل ہیومن۔ مجھے سر کے بل آسان تک نہ اٹھائیں۔“ وہ نہایت صفائی سے اسے خدشات کا اظہار کرنے لگا۔  
”یہ بتائیں آپ لیں گی کیا۔ چائے یا کافی۔“ اس نے فوراً ہی بات کا رخ بدلا۔  
”نہیں نہیں مرزا وحی احمد میں نے آپ کو مدعو کیا ہے تو آداب میزبانی بھی مجھے ہی نبھانے دیں۔ ویٹر۔“ وہ انگلی کے اشارے سے ویٹر کو بلائے لگی۔  
باوردی ویٹر ٹیبل کے قریب آیا۔ ”اب بتائیں کیا منگواؤں آپ کے لیے۔“  
”کافی۔“ وہ بے تکلفا بولا۔

”ایک کافی اور میرے لیے ایک فریش لیمن اسکوائش لائیں۔ ساتھ میں دو سینڈویچ بھی۔“ وہ مینو کارڈ سے آرڈر سلیکٹ کر کے ویٹر کو بتانے لگی اور باوردی ویٹر رو بوت کی طرح رسمی حرکات کر کے چلا گیا۔

”ہاں تو ارتج کیوں بلایا تھا آپ نے مجھے؟“ وہ باتوں باتوں میں اپنے مطلب پر آگیا۔  
”کیوں؟ کیا میں اپنے رویے کی معافی مانگنے کے لیے پرانی رنجشوں کو منانے کے لیے یا پھر نئی دوستی کا نیا تعلق استوار کرنے کے لیے آپ کو بلا نہیں سکتی۔“ اس کی آنکھوں میں دل کے نرم کونوں کی ترہائی تھی۔ کچھ ایسے جیسے کہ محبتوں کی کوپل اندر کہیں پھوٹ پڑی ہو۔

”رویے کی معافی، رنجشوں کی تلافی اور دوستی؟ ارتج کمال! میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ یہ وہ لڑکی کہہ رہی ہے جسے اپنی جیت پر غرور ہے۔ جس کی گردن رخ کا بوجھ اٹھانے کی عادی ہو چکی ہے۔“ اس منجد سے انسان پر ابھی تک بے یقینی چھائی تھی۔ ویٹر ٹرے اٹھائے ان کی ٹیبل تک آیا۔ کافی اور اسکوائش وہ ٹیبل پر سجا کے چلا گیا۔



”سچ کہوں وصی احمد تو یہ غرور اب ٹوٹ چکا ہے۔“  
 فتح کے بوجھ سے تنی گردن کو اس دن آپ کی جیت  
 نے ہرا دیا ہے۔ جھکا یا تو نہیں لیکن شکست ضرور دی  
 ہے۔ لیکن یقین مائیں یہ شکست میرے لیے کسی  
 شرمندگی اور دکھ کا باعث نہیں۔ یہ شکست میرے  
 لیے ایک ناقابل فراموش احساس لائی ہے وصی احمد  
 اگر میں اس دن باری نہیں تو شاید میں بھی اپنے دل  
 کو جتنا نہ پانی اور اگر میرا دل نہ جیتتا تو مجھ پر یہ بھی نہ  
 کھلتا کہ.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

مرزا: ”یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں جھلکے لگیں اور  
 وہ اپنا آپ سنبھالتی۔ اپنا بیک اٹھا کر کینے کی حدود  
 پھیلا تک کر دروازہ کراس کر گئی۔ وصی احمد اس کے  
 اس اجنبی رویے پر کتنی دیر حیران سا بیٹھا رہا۔

☆☆

پیار بھی عجب شے ہے  
 اضطراب میں مضطرب  
 انتشار سے خالی  
 اختیار سے باہر

”یار مرزا مان لے“ تیری صورت اس کے من  
 مندر میں سا چلی ہے اور اس کے چاروں طرف  
 تیرے ہی نام کی گھنٹیاں گھن گھن رہی ہیں۔ اب تو  
 اپنی توجہ اس پر مبذول کر دے اور اس کی مانگ میں  
 ستارے بھر دے۔“ صائم نے پہلے نظم کا بیڑ غرق کیا  
 اور پھر بڑی اداسے بولا۔

”میں تو اسے اتنے دنوں سے یہی بات سمجھانے  
 کی کوشش کر رہا ہوں مگر یہ نواب ابن نواب سمجھے تب  
 ناں۔“ کامران نے اپنے شکوؤں کا ڈبہ کھولا۔

”لیکن یار! وہ لڑکی میری سمجھ سے باہر ہے۔ اس  
 کا وہ دلربا انداز، وہ والہانہ پن، وہ مجذوبوں کی سی  
 باتیں اور پھر وہ دیوانہ وار اظہار محبت، وہ آنسو کیا وہ  
 سب جھوٹ تھے یا پھر میرا دل ہی بے یقینی کے  
 اضطراب کی وجہ سے اسے محض دھوکا سمجھ رہا ہے۔“  
 وصی احمد ہاں اور ناں کے بیچ لٹکا ہوا تھا۔

”اے تو پاگل ہے مرزا کو کوئی بھی لڑکی اور خاص  
 طور پر ارتج کمال جیسی اکھڑ اور مغرور لڑکی کسی کو اس  
 طرح بلا کر اظہار محبت اور اقرار شکست نہیں کر سکتی۔  
 تو اس کا یقین کر لے۔ وہ بے چاری ماری گئی ہے۔“

سنجیدہ سے دوست شہروز نے اسے پیار سے سمجھایا۔  
 ”میرا خیال ہے میں خود کو کچھ وقت دیتا ہوں اور  
 اسے بھی اگر تو وہ فراڈ ہوگی تو کچھ ہی دنوں بعد اس کا  
 یہ جنوں جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔“ وہ فیصلہ نہیں

کر پا رہا تھا کہ جھوٹ کیا ہے سچ کیا ہے۔  
 ادھر ارتج اپنی اہیلیوں کو اپنی زیر دست ایکٹنگ  
 اور اس کے تاثرات کے قصبے سن رہی تھی۔

”پتا ہے جیسے ہی میری آنکھوں سے آنسو جھلکے  
 اس کے ہاتھ میں کافی کا کپ ڈنگا لے گا۔ وہ تو  
 کافی پینا ہی بھول گیا تھا۔ میری باتوں نے اسے مکمل  
 طور پر بالو بنا دیا تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے زوردار قہقہہ  
 مارا۔ سہیلیاں بھی ہنس پڑیں۔

”ہاتے بے چارہ ارتج نہیں وہ میری بس نہ ہو  
 جائے۔“ کرن اپنا خدشہ ظاہر کرنے لگی۔

”پاگل! یہی تو میں چاہتی ہوں کہ وہ میری بس ہو  
 جائے۔ میری محبت میں ایسے مبتلا ہو کہ تمام کی تمام  
 کششیاں جلا دے۔ ہر طرف اسے میرا چہرہ نظر  
 آئے۔ اس کی سماعتیں میری ہی آوازیں، میری ہی  
 باتوں کی ریم جھم اس کے کانوں میں رس گھولے۔ وہ  
 میرے نام پہ سانس لے۔ وہ میری محبت میں اتنا  
 آگے جائے کہ اسے بدنامی اور بربادی کا کوئی ہوش  
 نہ ہو اور جب وہ بالکل بے بس ہو جائے تو تب میں  
 اسے اس کی اوقات یاد دلاؤں کہ وہ میرے لیے  
 صرف ایک مخالف ساتھی ہے اور مرد ہے۔ جسے میں  
 نے اپنے حسن اور دماغ کے بل بوتے پر ہرایا ہے  
 اور پھر اسے احساس دلاؤں گی کہ وہ اس قابل ہے  
 ہی نہیں کہ میں اس سے شادی کر کے اس کی جیتی  
 ہوئی ٹرافیاں صاف کروں۔“ ارتج بڑے فاتحانہ  
 انداز میں بولی۔

”اس لڑکی کے ارادے تو بڑے خطرناک لگ  
 رہے ہیں مجھے۔ خدا را اس بے گناہ پر رحم کر دو۔  
 اسے اتنا بھی مت پاگل کرنا کہ وہ مجھیں گنواںے کے تم  
 میں خودکشی کر لے۔“ شازمہ نے ایک اور پہلو  
 سامنے رکھنا ضروری سمجھا۔

”تم فکر مت کرو۔ وہ اتنا بھی بہادر نہیں۔ بس تم  
 لوگ دیکھتی جاؤ میرے ماہرانہ انداز اور اس کی

نا تجربہ کار سوچیں۔“ ارتج نے بڑے غرور سے کہا  
 اور آنے والے دنوں کی پلاننگ کرنے میں جت  
 لگئی۔

☆☆

”زندگی بھی کبھی کبھی کیسے روپ دکھاتی ہے۔  
 جس چیز کو ہم اپنی زندگی کی حقیقت سمجھ کر اسے اپنانے  
 کی تک دو دو میں دن رات ایک کر دیتے ہیں، وہی  
 حقیقت کچھ اس طرح کی ٹھوکر لگا دیتی ہے کہ ہم گنگ  
 کھڑے دیکھتے رہ جاتے ہیں اور بھی وہ چیز ہمارا  
 خواب نکلتی ہے جسے ہم نفرت کی نگاہ سے ہی  
 دیکھتے آتے ہیں۔ ہماری نظریں اتنا دھوکا کیوں  
 کھاتی ہیں وصی احمد؟“ ارتج اپنے مخصوص دھیسے لہجے  
 سے وصی احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی اور  
 وصی احمد نے بھی اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ  
 مسلسل اسی تک دو دو میں تھا کہ کہیں سے کوئی مکر کا  
 سایہ، کوئی جھوٹ کی لہر کوند کے آئے اور اس کے  
 فریب کا سارا کھیل ختم کر دے۔ لیکن اسے اتنی  
 کوشش کے بعد بھی ایسا کوئی نشان مل نہ پایا تھا۔  
 ”مجھے ایسا کیوں لگتا ہے وصی احمد کہ ہمیں میری  
 تمام کی تمام باتیں جھوٹ لگتی ہیں، تم مجھے میری باتوں  
 اور میرے پیار کو چھلاؤ سمجھتے ہو؟“ وہ اس کھوئے  
 کھوئے انداز والی آنکھوں میں نظریں گاڑے  
 بولی۔ جن آنکھوں میں اتنے دنوں کی کوشش کے  
 باوجود بھی محبت اور دیوانے پن کا کوئی عکس نظر نہ آیا  
 تھا۔

”میرے پاس تمہارے ڈھیر سارے سوالوں  
 کے جوابات نہیں ارتج۔“ وہ صاف مکر گیا۔  
 ”کیوں ڈاس یہ کھڑے ہو کر تو خوب تڑتا کے  
 جواب دیئے تھے میرے مخالف اب کیا ہو گیا؟“ وہ  
 دل ہی دل میں سوچے گئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔  
 ”محبت کے سوال کوئی اتنے پیچیدہ بھی نہیں  
 ہوتے کہ ان کے جواب ڈھونڈنے میں اتنا عرصہ

”کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے وصی احمد۔“  
 اس نے انکشاف کر دیا اور وہ کافی پینے کے لیے منہ  
 تک لایا کپ تھامے گنگ سا اسے دیکھتا رہ گیا۔  
 ارتج کے پھول سے گال ملش ہو کر سرخ پڑ گئے تھے۔  
 روشن آنکھوں کے اوپر پلکوں کی جھمی جھلر گر پڑی  
 تھی۔ یہ لمحہ اقرار کا تھا یا مکر کا۔ وصی احمد جان ہی نہ  
 پایا۔ وہ تو اس اچانک دھماکے پر حیران و پریشان  
 تھا۔  
 ”آپ..... آپ ٹھیک تو ہیں ارتج کمال؟“ وہ  
 قدرے بے یقینی سے بولا۔

”کمال ہے مرزا صاحب آپ کو یقین کیوں نہیں  
 آتا۔ اتنی دیر سے میں اپنی غلطی کا اعتراف کر کے  
 آپ کو بتا رہی ہوں کہ میں بدل چکی ہوں اور سب  
 سے بڑھ کر میں نے اظہار محبت بھی کر لیا۔ جو کہ میں  
 نے کبھی کسی کے آگے نہیں کیا۔ آپ کو ابھی تک یقین  
 نہیں آیا۔ کیا میں اپنا دل چیر کے دکھاؤں کہ مجھے  
 آپ سے محبت ہو گئی ہے۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی تھی۔  
 ”ارتج۔“ وہ حیرانی سے دیکھنے لگا۔

”ہاں وصی احمد! دو دن سے آپ کی طبیعت کی  
 خرابی کا سن کر میں کتنی بے چین رہی، اپنے پچھلے  
 رویے پر کتنا روئی میں آپ سے مجھے محبت ہو گئی  
 ہے۔ آپ میرے ارد گرد رہنے لگے ہیں وصی احمد



لگ جائے۔ محبت کوئی اتنی بھید بھری چیز نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”اپنی تعلیم پہ بھی توجہ دو یا گل لڑکی فاضل ایگزام سر پر ہیں۔ کہیں اس میں بھی میں بازی مار نہ جاؤں۔“ وہی احمد نے بھی مسکرائے کی ایکٹنگ کی۔

اس شرط پہ کھیلوں گی پیا پیار کی بازی جیتوں تو تجھے پاؤں ہاروں تو پیا تیری اس نے بڑے دیوانے پن سے یہ شعر پڑھا اور وہی احمد ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گیا۔

ارتج کے صداقت سے پر رویے سے وہی احمد کا دل موم کی طرح پگھلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے ہر زاویے سے اسے پرکھا، ہر طرح سے اسے جانچا۔ کتنے دن اس سے ملاقات ترک کی، کتنے دن اس سے سختی برتی لیکن وہ محبت کی چٹان ٹوٹنے میں نہ آئی۔ اس کے اس طرح کے جذباتوں نے وہی احمد کے دل میں بھی محبت کا ایک اشتعال سا برپا کر دیا تھا۔ وہ پہنچ چکا تھا اور پھر ارتج کا معصوم حسن، دلربا چہرہ، جادوئی آنکھیں، پتھر کو بھی موم کر سکتی تھیں۔ ایسے میں وہی احمد کے دل میں یہ خوش گمانی جنم لے چکی تھی کہ ارتج کمال جیسی پری بیکر لڑکی اس سے دیوانہ وار محبت کرتی ہے۔ ایسی محبت جو کہ اس کی کرختگی سے سوختہ جاں نہیں بن سکتی۔ ارتج کمال کی محبت نے وہی احمد کے لیے اور کوئی راستہ نہ چھوڑا تھا۔ اس نے اپنی سچائی اور بیار کا ایسا جال بچھایا کہ وہی احمد مرزا نہیں فرار باہی نہ کا۔ کہیں پوشیدہ ہو ہی نہ سکے۔ وہ نے راستے ٹھوجتی گئی اور وہی احمد ان راستوں پر چلتا گیا۔ وہ محبت کی چاندنی بکھیرتی گئی اور وہی احمد اس چاندنی میں اپنی منزل کا سرخ ڈھونڈتا گیا۔ محبت کی کوئیل دل میں پھوٹ چکی تھی۔ وفا کا پروانہ سر اٹھا چکا تھا۔ ارتج کے معصوم عشق نے سارے شک و شبہات کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ اب ارتج وہی احمد کے لیے اک چال باز کرخت لڑکی نہیں بلکہ نازک

جذبات و احساسات سے گندھی اک پیاری سی لڑکی تھی۔ وہ کتنا بے قرار تھا اس وقت کے لیے کہ جب وہ ارتج کے سامنے اپنا دل کھول کر کہے کہ بس اب اور امتحان نہیں لیا جاتا تمہاری صداقتوں کا۔ تمہارے دیوانے پن نے وہی احمد کو پگھلا دیا۔ اب اور ستایا نہیں جاتا تمہیں۔ تمہاری محبتوں نے ہر ضرور کو پاش پاش کر دیا ہے۔ تم نے اپنی محبت کا جادو کچھ اس طرح بکھیرا ہے کہ اب میری محبت تمہیں ترپتا نہیں دیکھ سکتی۔ آؤ کہ ہر رنجش بھلا کر نئی چاہتوں کے نئے راستوں پر اپنے قدم رکھیں۔ آؤ کہ خواہشوں کے چراغ جلا میں، آؤ کہ ہم ایک دوسرے کے بن جائیں۔

دونوں سے وہ کالج نہیں آئی تھی اور اس کی بے قراری زوروں پر تھی۔ نہ اس نے کوئی فون کیا، نہ کہیں بات کی، ایک خدشے نے سر اٹھایا۔ کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو گئی۔ محبت میں محبوب کی ناراضگی موت کی سی لگتی ہے۔ کہیں میں نے اسے بدول تو نہیں کر دیا اپنی طرف سے۔ کہیں میری کرختگی اور سوختہ روی نے اس کے دل کو پچھیر تو نہیں دیا؟ انہی خدشوں کا دامن تھا مے وہ ارتج کی سہیلیوں شازمہ اور کرن کی تلاش میں نکل آیا۔ کلاس کے بعد وہ دونوں میزبھیوں پر خوش گپیوں میں مصروف نظر آئیں۔ وہ جلدی سے ان کے پاس پہنچا اور سلام و جواب کے بعد مقصد کی طرف آیا۔

”ارتج! دو دن سے نظر نہیں آئی خیریت تو ہے؟“ وہ بڑے پریشان کن لہجے میں بولا۔ آنکھوں کی پریشانی نے دونوں لڑکیوں کو محفوظ کر دیا۔

”ارتج! بے چاری تو پچھلے تین دنوں سے شدید بیمار ہے۔ دو دن اسپتال میں رہی ہے۔“ کرن دکھ بھری شکل بنا کے بولی۔

”کیا ہوا ہے اسے؟“ وہی احمد چاہ کر بھی اپنی پریشانی چھپانہ پایا۔

”اسے بہت شدید ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔“ کرن نے جلدی سے کہہ دیا۔

”نہ اصل میں تین دن پہلے اسے پیٹ میں شدید درد ہو گیا تھا۔ الزام اس وقت گرانے پر پتا چلا کہ اسے اپینڈکس ہو گیا ہے۔ بہت خطرناک جو اگر پت نہ گیا تو وہ مر بھی سکتی ہے۔“ شازمہ نے اور بڑی بیماری بیٹھے بیٹھے تیار کر لی۔

”اپینڈکس؟“ وہی احمد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”فوری طور پر اس کا آپریشن کرنا پڑا۔ پرسوں رات اس کا آپریشن ہوا۔ ہم دونوں موجود تھے اسپتال میں۔ بے چاری بے ہوشی میں بھی وہی احمد وہی احمد پکارتی رہی۔“ شازمہ کی اداکاری زبردست تھی۔

”اب کیسی طبیعت ہے اس کی۔ وہ ٹھیک تو ہے ناں؟“ آخری جملے نے وہی احمد کے دل میں ارتج کمال کی محبت کی گناہ زیادہ بڑھادی تھی۔

”مت پوچھیں اس کی طبیعت گرم دوائیاں اور ڈرپ کی بوتلوں کی وجہ سے اسے ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔ اوپر سے کھانا پینا بھی بند ہے۔ صرف سوپ اور کھجور کھا سکتی ہے۔ آج اسے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا ہوگا لیکن علاج ابھی اور چلے گا۔“ کرن نے وہی احمد کے غم میں اور اضافہ کر دیا۔

”میں اس سے مل سکتا ہوں؟“ وہی احمد اضطراب زدہ چہرہ بنا کر بولا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ آج شام آپ میرے ساتھ چلیے گا۔ مل بیجے گا اس سے۔“ شازمہ نے فوراً پیشکش کر دی۔

”او کے شازمہ۔ میں آج شام تمہیں تمہارے گھر سے پک کر لوں گا اور پلیز آپ دونوں ارتج کا خیال رکھیے گا۔ میرے لیے وہ بہت قیمتی ہے۔“ دکھ بھرا لہجہ، مضطرب آنکھیں، افسردہ چہرہ۔ یہ سب

شازمہ اور کرن کو ہنسنے پر مجبور کر رہا تھا۔ شازمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ کہہ کر وہ جیسے ہی گیا اور نظروں سے اوجھل ہوا۔ شازمہ اور کرن نے زوردار قہقہہ لگا کر اتنی اچھی اداکاری پر ایک دوسرے کو داد دی۔

”کیا؟ اپینڈکس کا آپریشن یار میں نے تم لوگوں کو کوئی چھوٹی سی خطرناک بیماری کا نام لینے کو کہا تھا۔ یہ اتنی خطرناک بیماری کہاں سے پیدا کر دی تم لوگوں نے مجھ میں اور بیٹھے بٹھائے آپریشن بھی کرالیا۔“ ارتج، شازمہ اور کرن کی زبانی ساری روداد سن کر اچھل پڑی۔

”میں نے نہیں شازمہ نے یہ بیماری گھڑی تھی۔“ کرن صاف مکر گئی۔

”نہیں ارتج! کرن نے صرف ٹائیفائیڈ کہا تو میں نے سوچا یہ تو معمولی سا بخار ہوتا ہے اس لیے میں نے اپینڈکس کا کہہ دیا۔ ویسے یار جب میں نے اسے بتایا کہ تم آپریشن کے بعد بے ہوشی میں اسی کا نام پکار رہی تھیں تو بے چارہ بے قرار ہوا تھا۔ اضطراب اس کی رگ رگ میں دوڑ گیا۔“ شازمہ نے وضاحت سے بتایا تو ارتج فاتحانہ خاموشی سے مسکرا دی۔

”ہاں ارتج! اتنی پریشان سی شکل بنائی اس نے اور پوچھا۔“ میں اس سے مل سکتا ہوں۔“ کرن نے لاچار سی شکل بنا کر وہی احمد کی نقل اتاری تو ارتج اور شازمہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

”اچھا وہ تو سب ٹھیک ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ دو دن سے گھر میں پڑی پڑی برتن مانجھ رہی ہوں اور یہ اپینڈکس کے مریض کیا کرتے ہیں۔ کیسے چلتے ہیں، کیسے لگتے ہیں؟“ ارتج نے ایک ساتھ کئی سوال پوچھ لیے۔

”ارتج! مجھے زیادہ تو نہیں پتا لیکن میری کزن آمنہ کا آپریشن ہوا تھا تو وہ پیٹ کے دائیں طرف



ہاتھ رکھ کے دھیرے دھیرے چلتی تھی اور بس۔“  
کرن نے معلومات فراہم کی۔

”ارے تم اپنے اس ڈاکٹر کزن سے کیوں نہیں  
بوجھ لیتیں۔ آخر اس کی ڈاکٹری کب کام آئے گی۔  
بلکہ تم اسے ڈاکٹر بنا کر یہاں بلا بھی سکتی ہو۔“  
شازمہ نے ایک اور آئیڈیا دیا۔

”کون سلمان ارے ہاں مجھے تو اس کا خیال ہی  
نہیں آیا۔ میں ابھی اسے بلاتی ہوں۔“ اچھا آئیڈیا  
ملنے ہی اس کا چہرہ گل اٹھا۔ دوڑ کر ڈاکٹر فون  
اٹھایا اور سلمان کا سیل فون نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف سے سلمان کی آواز  
آئی۔

”سلمان! میں ارتج بول رہی ہوں۔“  
”بولیے بولے ارتج کمال صاحبہ کہیے کیسے مزاج  
ہیں؟“ سلمان نے بڑی خوش دلی سے کہا۔

”سلمان آج مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔  
پلیز آ جاؤ۔“ ارتج نے نہایت پیار سے کہا۔

”کیوں خیریت؟“ سلمان کو حیرانی ہوئی۔  
”سب بتا دوں گی۔ پہلے مجھے اپینڈکس کے

آپریشن کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرو۔  
کب ہوتا ہے، کیسے ہوتا ہے، کتنی دیر میں اس کا

آپریشن ہوتا ہے۔ مریض کی شکل کیسی ہو جاتی ہے  
کہاں درد ہوتا ہے اور کس طرح کی دوائیاں کھلائی

جانی ہیں؟“ ارتج نے ایک ہی سانس میں سوالوں کی  
بوچھاڑ کر دی۔

”اپینڈکس! اپینڈکس ایک آنت کو کہتے ہیں جو کہ  
ہر کسی کے معدے کے ساتھ ہوتا ہے کسی بھی وجہ سے

یہ پھول سکتا ہے اور فوراً اسے آپریٹ کر کے نکالنا ہوتا  
ہے۔ مائٹر آپریشن ہوتا ہے۔ آدھے ایک گھنٹے کا“

کھانا پینا بند کر دیا جاتا ہے۔ ڈریس لگتی ہیں۔  
انجیکٹ کیا جاتا ہے۔ شکل مریض کی کمزوری مر جھانی

سی ہو جاتی ہے۔ پیٹ کے نچلے حصے بائیں طرف

درد ہوتا ہے۔ دوائیاں درد کو روکنے کی اور طاقت کی  
کھلائی جاتی ہیں۔“ سلمان نے اسی رفتار سے ارتج

کے ہر سوال کا جواب دے دیا۔  
”اچھا اب ایک گھنٹے تک میرے گھر پہنچو۔

ڈریس، انجکشن، درد کی دوائیاں سوپ کے ساتھ اور  
باں اپنا وائٹ گاؤن اور اسے تھیسکوپ بھی لیتے آنا۔

آج ہی مجھے تمہاری ڈاکٹری کی ضرورت ہے۔“  
ارتج نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور شازمہ اور کرن کو

وکٹری کا وی دکھایا۔  
☆☆

وصی احمد مرزا نے چھوٹے سے نفیس گھر کے  
زینے پھلانگے، سیدھے ہاتھ پر بنے کمرے میں

داخل ہو گیا۔ سامنے بستر پر نیم دراز سر اپنے کو دیکھا۔  
کھلایا چہرہ سر جھایا سر اپا پیڑیوں میں لیے شرتی

ہونٹ آنکھوں کے گرد سیاہ ظالم حلقے، پھر لے  
بال۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑی ڈھیروں دوائیاں

سیرپ کی بوتلیں اور گولیوں کے پتے۔ دائیں خردلی  
ہاتھ میں کیوولا کی بے درد سونیاں اور ان سے جڑی

ایک شفاف ڈرپ کی بوتل۔ اس نیم تاریک کمرے  
کا ماحول کتنا مر جھایا مر جھایا سا تھا۔ کتنا بھرا بھرا سا

تھا۔ وصی احمد کمرے کی حدیں پار کرتا اس چھوٹے  
سے بیڈ کی طرف آیا۔ ساتھ ہی رکھی کرسی پر ہونے

سے بیٹھ گیا۔  
”ارتج۔“ اس نے قدرے مدہم لہجے میں اس

نام کو آواز دی۔ اس کے اس طرح پکارنے پر ارتج  
نے ہولے ہولے آنکھیں کھولیں۔ بڑی بڑی کشادہ

آنکھوں میں کتنے خواب جگمگاتے تھے۔ کتنے رنگ  
مسکراتے تھے۔ ایسے رنگ جو قسمتوں کو بھی بولنے پر

مجبور کر دیں۔ ایسے رنگ جو اداسیوں کا احاطہ کر کے  
انہیں مسکرانے پر مجبور کر دیں۔ ایسے رنگ جو وفاؤں

کو مجبور کر دیں۔ آپ کی راہوں میں مجھ جانے کو۔  
”وصی احمد! آپ آگے وصی احمد؟ میں..... میں

کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ آپ نے اتنی دیر  
کیوں لگا دی؟“ ارتج کے ہونٹ اس انداز سے بل

رہے تھے کہ گویا وہ زبردستی بولنے کی کوشش کر رہی  
ہو۔

”مجھے آج ہی پتا لگا ارتج، یقین مانو۔ آج ہی  
کرن اور شازمہ سے پوچھا تھا۔“ اب کیسی طبیعت

ہے تمہاری؟“ وصی احمد نے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر  
رکھ دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ دو ہونٹ

ہلکے ہلکے کھلنے لگے۔  
اس نے جلتی ہوئی پیشانی پر جب ہاتھ رکھا

روح تک آگئی تاثیر سچائی کی  
زندہ ہوں۔ پتا نہیں کس طرح بچ گئی۔ کوئی

ضرورت تو نہ بھی سانسوں کی۔ پتا نہیں خدا نے کیوں  
واپس لوٹا دیں۔ ان جملوں کی اداسی نے وصی احمد کو

اند رنگ لرزایا۔  
”ایسا کیوں کہتی ہو ارتج پلیز ایسا مت کہو۔ دکھ

ہوتا ہے مجھے۔“ وصی احمد نہایت پیار سے گویا ہوا۔  
”کیوں آپ کو کیوں دکھ ہوتا ہے وصی احمد آپ

کو جذبات کی قدر کرنی آتی ہے۔ آپ کو وفاؤں کا  
جواب دینا آتا ہے؟ آپ تو مندروں میں جی اس

مورنی کی طرح ہیں کہ جن کے آگے مانگنے والے  
مانگ مانگ کر چلے جاتے ہیں لیکن اس پتھر کے وجود

پر اثر نہیں ہوتا۔ جب آپ کسی کے پیار کو نہیں سمجھ  
سکتے تو کسی کے درد کو کیا خاک سمجھیں گے؟“ ارتج

نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں الفاظ ادا کیے اور جذباتی  
داؤ مارا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ارتج، ایسا کیوں سوچتی ہو  
تم۔ اگر میں تمہاری وفاؤں کو نہیں سمجھتا تو تمہاری

تکلیف پہ اتنا بے قرار بھی نہ ہوتا اگر مجھے تمہاری چاہ  
کا ادراک نہ ہوتا تو میں اس اپنے پن سے یہاں نہ

آتا۔“ وصی احمد نے صفائی پیش کی۔  
”اپنا پن وصی احمد؟ اپنا پن تو مادی چیزوں سے

ہوتا ہے۔ انسانوں سے تو اپنا پن نہیں محبت کی جاتی  
ہے۔ وہ محبت جسے محبت کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا

جاسکتا۔“ ارتج اسے سمجھاتے سمجھاتے رو پڑی اس  
کی آنکھوں سے موٹی ٹپک پڑے۔

”اتنی اداسی کی باتیں کیوں کرتی ہو پاگل، تم  
ٹھیک ہو جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم جو کوگی میں وہی

کروں گا۔ تمہاری محبت نے مجھے بالکل بدل دیا  
ہے۔ تم نے مجھ میں ایک نیا وصی احمد پیدا کیا ہے

ارتج، پردوس میں ویسا بھی نہیں کروں گا۔ تم بس  
جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔“ وصی احمد نے مسکرا کر اس

کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ بھی دروازے پر ہلکی سی  
ناک ہوئی۔ ارتج نے دھیرے سے لیں کہا تو سلمان

کرن سمیت اندر آ گیا۔ سفید طر کا گاؤن پہنے، اسے  
تھیسکوپ اٹھائے، آنکھوں پہ چشمہ لگائے بالوں کو

پاؤڈر سے سفید کیے ہوئے وہ واقعی معمر ڈاکٹر لگ رہا  
تھا۔ وہ شان سے چلتے ہوئے بیڈ کے پاس آیا۔

”یہ ڈاکٹر سلمان ہیں وصی احمد! انہوں نے ہی  
میرا آپریشن کیا تھا۔ یہ مشہور سرجن ہیں یہاں کے۔“

ارتج نے تعارف کرایا۔ سلمان نے وصی احمد سے  
ہاتھ ملایا پھر اپنی کارروائی شروع کر دی۔ انجکشن نکالا

اس میں دوائی بھری اور ارتج کے قریب لے آیا۔  
وصی احمد اس طرح بیٹھا تھا کہ اسے صرف ڈاکٹر

سلمان کی پیٹھ ہی دکھائی دے رہی تھی۔ سلمان نے  
انجکشن ارتج کو لگانے کے بجائے تکیے میں ٹھونس کر

گھسا دیا۔ ارتج نے ہلکی سی آہ کی۔ ڈاکٹر سلمان نے  
بی پی اور نمپر بیچر چیک کیا اور ارتج سے مخاطب ہوا۔

”گڈ! اب آپ کا بی پی نارمل ہے اور بخار بھی  
بہتر ہے۔“ سلمان نے کمال اداکاری سے کہا۔ ارتج

مسکرا دی۔  
”بہت بہادر بچی ہے یہ۔ اتنا سب کچھ ہونے پر

توڑ کیا بہت اپ سیٹ ہو جاتی ہیں۔“  
”آپ؟“



”وصی احمد۔“ وصی احمد نے اپنا تعارف خود کرایا۔

”اوہ تو آپ میں مسٹر وصی احمد۔ آپ ہی کا نام ارتج بے ہوشی میں بیکارتی رہی۔ لگتا ہے بہت محبت ہے ان کو آپ سے۔“ سلمان نے نہایت ذومعنی لہجے میں کہا۔ وصی احمد نے ارتج کی جانب دیکھا۔ سلمان کے جانے کے بعد وصی احمد نے بھی اجازت مانگی۔ اس کے جانے کے بعد ارتج کرن اور شازمہ زور زور سے ہنسی رہیں اور ان باتوں کو دہرا دہرا کے خوش ہوتی رہیں۔

☆☆☆

”یار وہ واقعی مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ مجھے اس کی کسی ادا، کسی انداز میں ریاکاری یا کھوٹ کا سا یہ بھی نظر نہیں آتا۔“ وصی احمد مسکرا کر بولا۔

”یہی تو میں تمہیں اتنے عرصے سے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں مرزا لیکن آپ ہی تھے کہ مانتے نہ تھے۔“ کامران نے اس کی تائید کی۔

”لیکن یار مرزا۔ یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو۔ کیا اس نے اظہار کیا اس بات کا۔“ ناصر اب بھی مطمئن نہ تھا۔

”آف کورس یار اس جیسی غیر معمولی لڑکی نے خود اعتراف کیا ہے۔ اس کی عیادت کو میں اس کے گھر بھی گیا تھا۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں بھی مجھے بیکارتی رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو رنگ اترے تھے وہ ناقابل بیان ہیں یار وہ مجھے دھوکا نہیں دے رہی۔ میرا یقین کرو۔“ وصی احمد انہیں یقین دلاتے ہوئے بولا۔

اسی یقین نے ان دونوں کے بیچ محبت کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ وصی احمد مرزا نے بھی خیال و خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ کسی لڑکی سے اس حد تک بھی محبت کر سکتا تھا۔ وہ تو اس دیوانی لڑکی کی بے پناہ چاہتوں کی بارش میں نہا چکا تھا۔ پور پور بیگیا ہوا

تھا اور ارتج نے بھی کچھ ایسی سچائیوں کے رنگ اسے دکھائے کہ وہ بے بس ہو گیا۔ ہاتھوں میں ارتج کا بیجھا ہوا خط تھا اور آنکھوں میں نئے دنوں کی ہزاروں خواہشیں تھیں۔ ایک ایک لفظ وفاؤں کی مہک پھیلاتا اسے روح تک معطر کرتا جا رہا تھا۔

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں سامنے والے کیسے چھپیں گے تجھے مجھ سے رمانے والے آج آپ کی یاد بڑی شدت سے آرہی ہے۔ ایسا آخر کیوں ہوتا ہے کہ کوئی انسان اس قدر لازم و ملزوم بن جاتا ہے کہ سانس بھی اسی کی اساس لگنے لگتی ہیں۔ محبت ایسے کیوں مجبور کر دیتی ہے کہ ہنسنا رونا، اداسی، خوشی ہر معاملہ ایک ہی انسان کی دسترس میں ہو جاتا ہے۔ آج کل میرا پڑھائی میں بالکل دھیان نہیں لگتا۔ پتا نہیں میں ان کیزام کیسے دوں گی۔ کتاب کھولوں تو ایک ہی مسکراتا ہوا چہرہ نظروں کے آگے چھایا رہتا ہے اور وہ ایسے چھبھرتا ہے کہ ایک لفظ بھی پڑھ نہیں پاتی۔ مجھے لگتا ہے آپ کا ارادہ امتحان میں بھی مجھ سے مقابلہ کر کے اول آنے کا ہے اور یہاں بھی مجھے ہرانے کا ہے۔

خط کے شروع میں جو شعر ہے وہ میں نے تخلیق کیا ہے پہلی بار زندگی میں سوچ رہی ہوں کہ یہ اسی کے نام کر دوں جس کے لیے لکھا ہے اور وہ آپ ہیں۔

آپ کی اپنی  
ارتج کمال

خط پڑھ کر کتنی دیر وصی احمد کے چہرے پر مسکراہٹ رہی اور ارتج کے محبت بھرے لہجے پہ پیار آتا رہا۔

”طوطا پھنس تو پوری طرح چکا ہے۔ بس اب پر کاٹنے باقی ہیں۔“ ارتج فون پر کرن سے باتیں کر رہی تھی اور اپنی تازہ فحش خوش ہو رہی تھی۔

”لیکن ارتج اب آگے کی کیا پلاننگ ہے یہ کرن کی بے تابی اس کے الفاظ سے ظاہر



تھی۔  
 ”بس اور ایک ہفتہ انتظار کرو۔ ٹھیک سات دن بعد اس کہانی کا کلامیکس دیکھنا۔ لیکن اسی ایک ہفتے میں وہ میرے گھر بات لانے پر بھی تیار ہو جائے گا۔“ ارتج نے نہایت شاطر لہجے میں یہ کہا اور فون بند کر دیا۔ کچھ دیر سوچا اور وحی احمد مرزا کے سیل فون کے نمبر پر پیش کیے۔ وحی احمد نے ارتج کا نمبر سیل فون کے اسکرین پر جھلکاتا ہوا دیکھا تو فوراً مین آن کر دیا۔

”ہاں ارتج بولو کیسی ہو؟“  
 ”میں آپ سے فوراً ملنا چاہتی ہوں وحی۔“  
 ارتج نے نہایت روہانسی آواز بنائی۔  
 ”لیکن..... لیکن کیا ہوا ارتج۔“ محبت سے لبریز لہجہ ارتج نے اتنی دور سے بھی محسوس کر لیا۔  
 ”میں فون پر کچھ نہیں بتا سکتی۔ آپ..... آپ آج ہی مجھ سے ملیں۔“ وہ آنسوؤں سے تر آواز بنانے کا ڈرامہ کرنے لگی۔

”ارتج دیکھو روو تو نہیں۔ اچھا ایسا کرو ٹھیک ایک گھنٹے بعد مجھ سے نیشنل پارک میں ملو اور پلیز پریشان مت ہو۔“ وحی احمد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا اور اس نے اوکے کر کے فون بند کر دیا اور اگلی ملاقات کے لیے ڈائلاگز تیار کرنے لگی۔  
 نیشنل پارک میں وہ پہنچی تو وحی احمد اس کا منتظر تھا۔ وہ نہایت پریشان کن چہرہ بنائی اس تک آئی اور بچ پر بیٹھ گئی۔  
 ”اب بتاؤ ارتج، ایسا کیا تھا جو تم مجھے فون پر نہیں بتا سکتی تھیں۔ جس نے تمہیں اس قدر پریشان کر رکھا ہے۔“ وحی احمد فوراً اپنی پوچھ بیٹھا۔  
 ”وحی! میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ پتا ہے امی نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔ میرے کزن حماد سے۔ اسی ماہ منگنی کی رسم طے پائی ہے۔“ ارتج نہایت دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ وحی احمد چونک اٹھا۔

☆☆

ہر کسی کے نقش میں چہرہ تمہارا دیکھنا  
 چونکنا کچھ دیکھ کر اور پھر دوبارہ دیکھنا  
 آسمان پر دکھ اترتے ہیں زمیں کے شام کو  
 دھوپ چہروں پر ڈھلے گی تب ستارا دیکھنا  
 تم نے تو مجھے پکا پکا شاعر بنا دیا ہے ارتج۔“ اپنی



نوٹ بک کے پچھلے کاغذ پر لکھا شعر پڑھ کر وصی احمد بولا۔

”شاعری چھوڑیں یہ بتائیں انگل آئی سے بات کی۔“ ارتج خاصی جھنجھلاہٹ سے بولی۔

”بابا سے تو نہیں میں نے مئی سے بات کی ہے۔ بڑی مشکل سے بڑی اداکاری سے انہیں راضی کر لیا ہے اب وہ پاپا کو راضی کر لیں گی۔“

”تم اسی طرح کچھوے کی چال چلتے رہنا اور حماد مجھے بیاہ کر لے جائے گا۔“ ارتج نے خفگی ظاہر کی۔

”ارے ایسی کی تیسری۔ دیکھتا ہوں کوئی کیسے لے جاتا ہے تمہیں مجھ سے جھین کر۔“ وصی احمد نے ڈائلاگ مارا۔

”تم یونہی کہتے رہنا۔ اس انوار کو وہ لوگ انگوٹھی پہنانے آرہے ہیں۔“ ارتج نے بہت تمکین صورت بنائی۔

”ارتج! کل تم انوائیٹڈ ہو۔ شام چار بجے میں تمہیں لینے آؤں گا۔ تمہارے اپنے گھر کے باہر سے۔“ وصی احمد نہایت سنجیدگی سے بولا۔

”لیکن کہاں جانے کے لیے انوائیٹڈ ہوں۔“ ارتج جھنجھلا اٹھی۔

”کل وصی احمد مرزا اور ارتج کمال کی منگنی سیر نہیں ہے۔ اگر انگوٹھی پہنانا اپنانے کی نشانی ہے تو وہ میں تمہیں کل پہنا دوں گا۔ تیار رہنا۔“ یہ کہہ کر

وصی احمد اٹھا اور میز پر ہاتھیں لگا کر تپا چلا گیا۔ ارتج حیرانی اور تقاریر بھری مسکراہٹ سے اسے دیکھتی رہی۔ بھی شازمد اس کے پاس آ بیٹھی۔

”کیا ہوا مسکرا کیوں رہی ہے۔“

”کل میں مرزا وصی احمد کی محبت اس کے منہ پر تھوکوں گی۔ کل ارتج کمال اس مغرور شخص سے جیت جائے گی۔“ ارتج نے فاتحانہ انداز میں پیش گوئی کی۔

بلک کلر کی گاڑی ساحل سمندر کے قریب ایک اکیلے کونے میں رکی تھی۔ سورج کے ڈھلنے میں ابھی وقت تھا۔ دور کہیں کہیں لوگ نظر آرہے تھے۔ لہروں کا ہلکا ہلکا شور گاڑی کے بندشیشوں کو چیر کر سنائی دے رہا تھا۔

”ارتج! آج میں اپنی اور تمہاری محبت کو ایک رشتے میں باندھنے جا رہا ہوں۔ میں نے تمہیں ہماری منگنی پہ انوائیٹ کیا تھا ناں۔“ پیار بھرے لہجے میں وصی احمد نے سرگوشی کی۔

”لیکن ہماری منگنی میں تو کوئی بھی نہیں آیا۔“ وہ بڑے ناز سے بولی۔

”آئے ہیں ناں یہ سمندر آسمان سورج یہ کانی رنگ کی شام ڈھیر سارے پرندے بے قرار موجیں نقشہ کنارہ یہ سب ہماری ہی خوشی کے ساتھ ہیں۔“ وہ بہت شاعرانہ انداز میں بولا۔

”اس رشتے میں بندھنے سے پہلے کیا میں اپنے اطمینان کے لیے آپ سے کچھ سوال پوچھ سکتی ہوں؟“ ارتج مسکرا کے بولی۔

”ہوں پوچھو۔“ وہ بھی مسکرا دیا۔

”کتنی محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے؟“ وہ سوال کر کے متوجہ ہو گئی۔

”مجھے خود نہیں معلوم لیکن بس یہ جانتا ہوں کہ میری زندگی میں بھی کوئی اس طرح میری کمک نہیں بنا۔ تم میری روح کے اندر سامنے والی پہلی چاہت ہو۔“ وہ ایک جذب کے ساتھ بولا۔

”اگر میں تم سے دور ہو گئی تو؟“ ایک اور سوال آیا۔

”زندگی بے کار ہو جائے گی۔ تم نہ ملیں تو جان دے دوں گا۔ جی نہیں پاؤں گا۔“ اس کی شفاف آنکھوں میں کتنے عکس دوڑ گئے۔

”مجھ سے جیت پاؤ گے وصی احمد؟“ لہجے میں بدلے کی بو بھی تھی۔

”دنیا بھر سے جیت سکتا ہے وصی احمد لیکن تم سے کبھی نہیں۔ میں ہار گیا ہوں تمہارے آگے۔ تم جیت گئی ہو۔“ وہ سر جھکا کے بولا۔ ”اچھا اب بہت سوال جواب کر لیں۔ لاؤ اپنی انگلی اور پہنانے دو مجھے محبت کی یہ نشانی۔ سوچنے دو مجھے اپنی چاہتیں۔ کر لینے دو مجھے ہر اقرار۔“

بزرگ کی چھوٹی سی ڈیبا میں چھوٹا سا بہرہ جھللا رہا تھا۔ وصی احمد نے ارتج کا ہاتھ تھاما اور دالہا نہا پن سے یہ شعر کہا۔

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں سامنے والے کسے جھینیں گے تجھے مجھ سے زمانہ والے ابھی انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈالنے ہی کو تھا کہ

ارتج نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”ایک منٹ وصی احمد مرزا ایک منٹ۔ سارے انکشافات تم ہی کرتے رہو گے۔ مجھے موقع نہیں دو گے۔“ وہ نہایت بدلے بدلے لہجے میں بولی۔

”آخر بار گلے ناں مجھ سے۔ اعتراف شکست کر لیا ناں۔ تسلیم کر لیا ناں کہ تم مجھ سے کبھی جیت نہیں سکتے۔ صرف ایک مہینے کے اندر اندر میں نے تمہارا

میرا پنے آگے جھکا دیا ناں وصی احمد ایک عورت سے کبھی مرد نہیں جیت سکتا۔ عورت مرد کو صرف اپنی مسکراہٹ ہی میں سالوں تک مقید کر سکتی ہے۔ میں چاہتی تو اس ڈرا سے کو اور بڑھا سکتی تھی لیکن مجھے

تمہارے اتنے ہی پاگل پن کی ضرورت تھی۔“

وصی احمد نہایت حیران آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ انگوٹھی پکڑے اس کا ہاتھ ساکت سارہ گیا تھا۔

”کون سا ڈرامہ یہ کیا مذاق ہے ارتج؟“

ارتج نے ایک لمبا سا قہقہہ مارا۔ ”مذاق یہ نہیں وصی احمد۔ مذاق تو وہ تھا جس کے ذریعے پچھلے ایک ماہ سے میں تمہیں بے وقوف بناتی تھی۔ محبت کا کھیل کھیلا اور اچھے کھلاڑی کی طرح تمہیں اس میدان سے آؤٹ کر دیا۔ تم کیا سمجھتے ہو ارتج کمال کو تم سے

محبت ہو گئی ہے۔ کتنی شان سے اس دن کہہ رہے تھے کہ تم مجھ سے شادی کر کے اپنی جیتی ہوئی ٹرائیاں صاف کرواؤ گے۔ کتنی جلدی میرے جھوٹ کے پیچھے چل دیے۔“

وصی احمد پر اس کے یہ انکشافات جان لیوا تھے۔ یعنی ارتج نے اسے دھوکا دیا، جھوٹ بولا۔ اس کی محبت اس کا اپنا پن، اس کی سچائیاں سب چھلاوا تھیں۔ آخر کیوں؟ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس

تو پن پر وصی احمد اسے پیٹر مارتا۔ لیکن یہ سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی تو ارتج کمال تھی جس نے زندگی میں پہلی بار اس کے دل میں محبت کی شمع روشن کی تھی۔ پہلی بار

اسے جاہتوں سے آشنا کروایا تھا۔ وہی دامن جاں کتنے ظالم لہجے میں اس سے گویا تھی۔

”زندگی بے کار ہو جائے گی ناں تمہاری میرے بغیر۔ جان دے دو گے ناں اپنی۔ جاؤ جا کر اسی

سمندر میں ڈوب جاؤ۔ میں تمہیں نہیں ملنے والی۔ میں آج تمہیں خود ٹھکراتی ہوں۔“ ارتج نے نہایت توہین آمیز الفاظ میں کہا۔ وصی احمد کی آنکھوں میں

شدت جذبات سے سرخی اُٹھ آئی تھی۔ اس نے گاڑی اشارت کی۔ ریورس گیر لگایا، ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھا۔ بیک کر کے سیدھا گاڑی دوڑانے لگا۔

”کہاں جا رہے ہو وصی احمد گاڑی روکو۔ جانے دو مجھے۔“ ارتج پینچنے لگی۔ لیکن وصی احمد گاڑی دوڑاتا رہا، دوڑاتا رہا۔ رات کے سائے شہر میں اتر آئے تھے۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس ہر طرف روشن تھیں۔ وہ شاہراہوں پر گاڑی تیز رفتار سے دوڑاتا رہا۔

”روکو وصی احمد اتارو مجھے۔“ ارتج چلاتی رہی۔

دیر تک انجان علاقے کی سڑکوں پر گاڑی بھاگتی رہی۔ پھر ایک انجان بنگلے کے آگے اس نے گاڑی روک دی۔ خود اترا اور دوسری طرف سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ ارتج کی کلائی پکڑی اور اسے



گھینٹا ہوا لے جانے لگا۔

”کیا کر رہے ہو صی احمد چھوڑ مجھے۔“ وہ چیختی رہی لیکن وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے اسے گھینٹا ہوا اندر لے آیا۔ یہ صی احمد کا وہ بنگلہ تھا جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ پارٹیز وغیرہ منانے آتا تھا۔ ڈیڈ نے اسے یہ اس کی ۲۳ ویں برتھ ڈے پر گفٹ کیا تھا۔ سارے گھر کے لاک کھولتا وہ اسے ایک کمرے میں لے آیا اور اسے پکڑ کر بستر پر پھینک دیا۔ نازک سا وجود جھٹکے سے گر پڑا۔

”ارتج کمال صاحب! اگر میں چاہوں تو ابھی اسی وقت تمہیں تمہارے اس جھوٹ کی سزا دے سکتا ہوں تمہیں اپنے مرد ہونے کی برتری دکھا سکتا ہوں تمہیں پامال کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا کروں گا نہیں کیونکہ میں نے تم سے سچی محبت کی ہے۔ تمہیں اپنا مانا ہے۔ تمہاری طرح ڈراما نہیں کیا۔ اداکاری نہیں کی۔ تم کیا جھٹکتی ہو میں ان لڑکوں میں سے ہوں جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہیں۔ ہر لڑکی پر جان فدا کرتے ہیں۔ جو سڑک چھاپ عاقق ہوتے ہیں۔ نہیں ارتج کمال نہیں! تم نے غلط سمجھا ہے مجھے۔ یہ جھوٹ، مکر، اداکاری، تم عورتوں کے خون میں ہوتی ہے۔ ہم مرد ایسے بد ذات نہیں ہوتے۔ میں چاہوں تو اسی وقت تمہیں تمام عمر کے لیے شکست دے سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا کروں گا نہیں۔ تم نے ایک معمولی سے تقریری مقابلے میں ہارنے کی سزا میرے جذبات سے کھیل کر دی۔ میں پوچھتا ہوں کیا حق تھا تمہیں میری محبتوں کو بیدار کرنے کا۔ مجھے اپنی چاہتوں کا یقین دلانے کا۔ مجھے اپنا بنانے کا۔“ وہ نہایت غصے میں الفاظ ادا کرنے لگا۔ ارتج کا چہرہ آنسوؤں سے ترتر ہو چکا تھا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ چلی جاؤ اور دوبارہ کبھی کسی کے جذبات کے ساتھ نہ کھیلنا۔ کسی کے ساتھ جھوٹ بول کر اس کی سچائیوں کو رسوا نہ کرنا۔“

چلی جاؤ۔“ وہ صی احمد جھٹکے جھٹکے وجود کے ساتھ صوفے پہ ڈھے گیا۔ ارتج اپنا وجود منھالتی اٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس گھر سے نکل کر سڑک پر آئی تو قدم ایک ایک من بھاری لگا۔ نہایت نے اسے گھیر لیا تھا۔ دل کے نہاں خانوں میں محبتیں سراٹھا چکی تھیں۔ اس شخص کی خاطر جس سے آن تک اس نے صرف نفرت کی تھی۔ جسے ہمیشہ ہرانا چاہا تھا۔ اس کی خاطر اس کی دفاؤں کی خاطر دل میں سچیں جل اٹھی تھیں۔

☆☆

”اچھا تو یہ بدلہ لیا تم نے مرزا صی احمد سے۔ پہلے اس کے دل میں محبت جگائی اور پھر اس کی محبت کا اس طرح مذاق اڑایا۔ ارتج! تم انتہائی خود غرض اور ظالم لڑکی ہو۔ جتنی معصوم تم چہرے سے لگتی ہو اتنی ہو نہیں۔ تمہارے اندر دل نہیں پتھر ہے پتھر۔“ سلمان ارتج کی زبانی تمام داستان سن کر اس پر پھٹ پڑا۔ ”اگر مجھے پتا ہوتا کہ تمہاری نیت کیا ہے تو اس دن میں تمہارے جھوٹ میں شامل ہوتا ہی نہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تم اس طرح مذاق ہی مذاق میں کسی کے سچے جذبات سے کھیل رہی ہو۔“ وہ انتہائی غصے میں تھا۔

”سلمان! میں تو تم سے اپنی بات شیئر کر رہی ہوں اور میں تو صی احمد سے صرف اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔“ وہ نہایت شش و پنج میں مبتلا تھی۔

”تو لے لیا ناں بدلہ اب جاؤ گردن تان گے اپنی فتح کے قصے سب کو سناؤ۔ تم تو اس سے جیت گئی ہو ناں۔ اس کی ہار کی خوشی مناؤ۔ یہ دو تین دن سے بزدلوں کی طرح کمرے میں بند کیوں ہو۔ کالج کیوں نہیں جا رہی؟“ سلمان نے اس کی کمزوری گویا پکڑ لی۔

”نہیں سلمان! میں اسے فیس نہیں کر سکتی۔“

ارتج نے سچ ہی بول دیا۔

”تمہیں پتا ہے تم اسے فیس کیوں نہیں کر سکتی ہو ارتج۔ کیونکہ تم اس سے محبت کرنے لگی ہو۔ تم نے تو اس کا دل اپنے جھوٹ سے جیتا تھا، لیکن وہ تمہارا دل اپنے سچ سے جیت چکا ہے۔ وہ چاہتا تو وہ اپنی اس توہین کا بدلہ اس دن تم سے لے سکتا تھا اور شاید کوئی اور ہوتا تو ایسا کر بھی لیتا۔ تم سے پوری عمر کے لیے جیت سکتا تھا وہ۔ لیکن اس نے اعلیٰ نظری کا ثبوت دیا۔ اس کے اس ظرف نے تمہارے مغرور دل کو اپنی ٹیٹھی میں جکڑ لیا ہے۔ ارتج کمال! سلمان لفظ بہ لفظ سچ ہی بول رہا تھا اور ارتج اس کی ہر بات سن رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب حقیقت ہے۔

”میں اس سے معافی مانگوں گی۔ منالوں کی اس کو۔“ دل میں اک اور امید نے سراٹھایا۔ بھول جاؤ ارتج کمال۔ وہ بار بار تمہارے ہاتھوں بے وقوف نہیں بنے گا۔ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ تمہاری طرح بے قدر و بے حس نہیں۔ میں نے سڑک چھاپ عاشقوں کے بارے میں سنا تو تھا لیکن آج تمہاری طرح کی فلرٹ لڑکی کو پہلی بار دیکھا ہے۔“

”بس کرو سلمان! بس کرو میں صی کو منالوں کی۔ اسے اپنی سچی محبت کا یقین دلا دوں گی۔ اسے اپنا لوں گی سلمان۔“ اب ارتج بلک بلک کر رو دی۔ سلمان کو اب اس پر کچھ رحم آنے لگ گیا تھا۔ بھی فون کی کھنٹی نے بجنا شروع کیا۔

”ہیلو۔“ سلمان نے فون اٹھالیا۔ ”میں..... میں شازمہ بات کر رہی ہوں۔ ارتج سے بات ہو سکتی ہے۔“ دوسری طرف سے شازمہ کی پریشان کن آواز آئی۔ سلمان نے ریسیور روٹی ہوئی ارتج کے سامنے کر دیا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور ریسیور تھاما۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو ارتج! کہاں ہو تم۔ اتنے دنوں سے کالج کیوں نہیں آئیں۔ شازمہ بے قرار ہو اٹھی۔

”وہ بس طبیعت کچھ بہتر نہ تھی۔“ ارتج نے مختصراً

جواب دیا۔

”تم اپنی طبیعت کا ماتم مناتی رہنا۔ پتا ہے تمہاری وجہ سے کیا ہو گیا ہے؟“ شازمہ نے اسے جھڑکا۔

”کہ..... کیا ہو گیا ہے؟“ اس کی دھڑکن تیز رفتاری سے دوڑنے لگ گئی۔

”ارتج! صی احمد نے زہر کھا کر خود کشی کر لی ہے۔“ شازمہ نے چپا چپا کر الفاظ ادا کیے۔

”کیا؟“ حیرت سے اس کی آواز خلق ہی میں پھنس گئی۔ ”ہاں تمہاری اداکاری نے تمہارے بدلہ لینے کے ارادے نے اس کی جان لے لی ہے ارتج۔ وہ مر چکا ہے۔ تم نے کسی کا اکھوتا چراغ چھین لیا ہے ارتج! تم انتہائی ظالم ہو! انتہائی ظالم۔“ شازمہ اس پر اپنا غصہ نکالے جا رہی تھی لیکن اس میں مزید کچھ بھی سننے کی سکت نہ تھی۔ اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ چکا تھا۔ آنسو آنکھوں کی دلیلیں بھلا نگ کے گرتے ہی چلے جا رہے تھے۔ وہ تیز رفتاری سے اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس کے اندر کچھ ٹوٹنے لگا۔ چھنا کے سے ہونے لگ گئے۔ دھڑ..... دھڑ..... دھڑام۔ یعنی واقعی۔ اس نے صی احمد کو مار ڈالا۔ صی احمد کی معصوم صداقت سے بھری محبت کا قتل کر ڈالا۔ اس نے ارتج کمال نے صی احمد کی جان لے لی۔ کیونکہ کس طرح وہ اتنی بے درد کیسے ہو گئی۔ وہ قاتل کیسے ٹھہر گئی۔ کیا منہ دکھائے گی وہ اپنے خدا کو جس نے محبت جیسا مقدس جذبہ بنایا۔ اس جذبے کی پناہ گاہ دلوں کو ٹھہرایا۔ اس نے اسی دل کو توڑ ڈالا۔ اسی پناہ گاہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ یعنی وہ شمع جو کہ کسی کے گھر میں نجانے کتنی منتوں مرادوں کے بعد روشن ہوئی ہوگی۔ اتنی جلدی بجھ گئی اسے تاریک کرنے



والی ارتج کمال ہے۔ اگر ایک بار صرف ایک بار وہ  
وصی احمد کے آگے اپنا قرار کرتی، وفا کا اظہار کرتی تو  
شاید۔ تو شاید وہ بیخ جاتا۔ وہ بیخ سکتا تھا لیکن وہ تو  
بدک کے ڈر کے بیٹھی رہی۔ ہمت نہ بھی سامنا کرنے  
کی لیکن کیا اس کی موت کی خبر سننے کی ہمت تھی اس  
میں۔ نہیں، نہیں، نہیں۔ وہ اپنی ہی لٹی کرنے لگ  
گئی۔

☆☆

”ارتج! دروازہ کھولو۔ پشادودن سے تم نے کچھ  
نہیں کھایا ہے۔ ضد مت کرو۔ مجھے اپنی پراہم  
بتاؤ۔“ اس کی ماما کتنی دیر سے دروازہ کھٹکھٹائے  
جاری تھیں۔ آخر کو اکٹا کر اسے دروازہ کھولنا ہی  
پڑا۔ والدہ اس کی حالت دیکھ کر چونک اٹھیں۔ روٹی  
روٹی سرخ آنکھیں، بکھرے بال، مرجھایا چہرہ وہ تو  
ارتج کمال کا سایہ لگ رہی تھی۔ اس کا ایسا کیا لٹ گیا  
تھا کہ وہ اس قدر ٹوٹ چکی تھی۔

وصی احمد کی یکطرفہ صداقت آشنا محبت نے اس  
کی رگوں کو متعین کر لیا تھا کہ اس کے جانے کے بعد وہ  
کھل کر سانس ہی نہ لے پاری تھی۔

وصی احمد کا نہ ہونا گویا چاند سورج۔ تاریک  
ہونے اور پھولوں کے بے رنگ ہونے ایسا تھا۔  
احساسات کے کتنے اژدھوں کی گرفت میں تھی وہ  
پچھتاوے اور ملال کے کتنے آکھوپس اسے جکڑے  
ہوئے تھے۔

”ارتج! بیٹا مجھے بتاؤ تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیوں تم  
نے دودن سے خود کو بند کر رکھا ہے؟ باہر کیوں نہیں  
نکلے ہو؟ اتنا کس بات پر رو رہی ہو؟“ بے قرار ماما  
اپنی اکلوتی بیٹی کی اداسی پر غمزدہ تھیں۔

”کچھ نہیں ماما، بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔“ اس  
نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا ہے طبیعت کو ارتج؟ اس طرح منتشر  
میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تمہیں تو آج تک کبھی

سردرد بھی نہیں ہوا بیٹا۔“ اب ماما کیا جانتیں اس کے  
محبت کے انتشار کو۔ اس کے اندر اٹھتے طوفان کو وہ  
کیسے بھانپتیں۔ وہ ماما کو کیسے بتاتی کہ اس کے معصوم  
دل نے کیسا پاپ کر دیا ہے۔ اس سے کیسا جرم ہرزہ  
ہو گیا ہے۔

”ہم بتاتے ہیں آنٹی۔ اس کے چہرے پر بارہ  
کیوں بچ رہے ہیں۔“ جلدی جلدی بیڑھیاں  
پھلاکتا سلمان آگیا جو کہ ماں بیٹی کی تمام باتیں سن  
رہا تھا۔

”نہیں سلمان پلیز۔“ ارتج نے باقی آنکھوں  
سے اسے دیکھا۔

”کیوں چھپاؤں میں آنٹی سے کہ تم نے ٹرم  
ٹیسٹ میں تھڑا پوزیشن لی ہے، فرسٹ نہیں۔“  
سلمان نے بہت صفائی سے جھوٹ گھڑ لیا اور ارتج  
خاموش ہو گئی۔

”تھڑا پوزیشن تو اس میں اتنی اداسی کی کیا بات  
ہے۔ فیل تو نہیں ہوئی ناں۔“ ماما نے مسکرا کر کہا۔  
پھر سلمان انہیں کچھ مزید باتوں میں الجھاتا اندر بچن  
میں لے گیا اور وہ وہیں دروازے پر چپ چاپ  
کھڑی رہی۔ اس سوچ میں کہ اس طرح کے جھوٹ  
ماما کے دل کو تو تسلی دے سکتے ہیں لیکن اس کے دل  
کے لیے کون سا بہانہ واکار گرا ثابت ہوگا۔

اب وہ کون سی دلیل دے کہ اپنے دل کو مطمئن  
کرے گی اس دل کو کہ جو وصی احمد سے بدلا لینے پر تلا  
تھا اسے شکست دینے کی آرزو رکھتا تھا لیکن وصی  
احمد نے تو مر کے اسے شکست دے دی۔ اس کے  
اندر محبت پیدا کر کے وہ خود کو امر کر گیا۔

کچھ ہی دیر میں سلمان گا جڑ کھاتا ہوا بچن سے نکلا  
اور اس کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔

”چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں کہیں جانا  
ہے۔“

”کہاں۔“ وہ افسردہ سے لہجے میں بولی۔

”کہیں باہر تمہیں اس طرح گھر پر بیٹھ کر روتے  
ہے کا شوق ہے۔ سوئے کہیں باہر بیٹھ کر بھی بہائے  
جاسکتے ہیں۔“ وہ گا جڑ چبا کر بولا۔

”ماما اجازت نہیں دیں گی۔“ وہ بہانہ گھڑ کے  
بولی۔

”میں اجازت مانگ چکا ہوں۔ اٹھو تیار ہو۔“  
وہ اسے گھینٹتا ہوا کمرے تک لے گیا اور اسے نا  
چاہتے ہوئے بھی تیار ہونا پڑا۔

سلمان بہت آہستہ سے بایک چلا رہا تھا۔ سمندر  
کی لہریں روڑے بھی نظر آرہی تھیں اور بہت رومانی  
سامنظر دکھا رہی تھیں۔ اس کے دل میں کئی طوفان  
اٹھنے لگے اس دن وصی احمد بھی تو اسے یہیں لایا تھا  
اس کی انگلی میں ایک رشتہ ڈالنے کے لیے اسے اپنا  
بنانے کے لیے۔

”کے یاد کر رہی ہو؟ وصی احمد کو؟“ سلمان نے  
طنز پر سوال کیا۔

”تمہیں اس سے کیا۔ میں کسی کو بھی یاد کروں۔  
کم از کم تمہیں نہیں کر رہی۔“ وہ ناراض ہو کر بولی۔

”ہاں مجھے بھی تم مرنے کے بعد یاد کر دو گی۔ یہ تو  
تمہاری عادت ہے ارتج کہ تم زندہ انسانوں کو رلائی  
ہو اور مرنے والوں کے لیے روٹی ہو۔“ سلمان نے  
مزید اسے تنگ کیا۔

”سلمان! تم کیوں اس طرح مجھے تنگ کر رہے  
ہو۔ تمہیں میری حالت کا اندازہ نہیں، وہ روہا سی  
ہوئے لگی۔“

”اندازہ نہ ہوتا تو تمہارا موڈ چینیج کرنے کے  
لیے تمہیں لے نہ آتا۔ میں تو تمہیں یہ سمجھانے کے  
لیے لایا تھا ارتج کہ مرنے والوں کے پیچھے مرا نہیں  
جاتا۔ جانے والے دکھ ضرور چھوڑ جاتے ہیں دلوں  
میں لیکن وہ دکھ زندگی کو روک نہیں دیتا۔ تم نے کالج  
جانا کیوں چھوڑ دیا ہے ارتج؟ تم اپنی فرینڈز سے  
کیوں نہیں ملتی ہو؟“ سمندر کے کنارے بایک

روک کے وہ اس سے مخاطب ہوا۔

”کیا تمہارے یہ دلا سے میرے دل سے یہ  
احساس ختم کر دیں گے کہ وصی احمد کی قاتل میں  
ہوں۔ اسے میری محبت نے مرنے سے مجبور کیا ہے۔“  
اس کی شفاف آنکھیں غم موتیوں سے جھنگا لگیں۔

”نہیں ارتج! زندگی اور موت کا تعین پروردگار  
نے بہت پہلے کر رکھا ہوتا ہے۔ کوئی انسان کسی کی  
زندگی یا موت کا ذمے دار نہیں ہوتا۔ پچھتاوے اور  
پشیمانی کے خیال تمہیں مار ڈالیں گے ارتج۔ پلیز ایسا  
مت سوچا کرو۔“ سلمان اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”اگر میں وصی احمد کی زندگی میں نہ آتی۔ اس کو  
محبت کی راہ پہ نہ چلائی تو کیا وہ مرتا۔ نہیں وہ تو زندگی  
کا پیا مبر تھا۔ میں نے ہی اسے موت کی آگئی دی۔  
میں ہی وجہ ہوں اس کی بے وقت جوان موت کی۔“  
وہ موتی اب اس کے گال پر پھسل آئے تھے۔

”افوہ پاگل لڑکی۔ چلو میں تمہیں آکس کریم کھلاتا  
ہوں۔ بھول جاؤ سب، کل سے کالج جانا شروع  
کردو۔ فائل پیپر قریب ہیں۔“ وہ اسے بھلاتا  
بھلاتا ساتھ لے گیا۔

اگلے دن کالج گئی تو دل کی حالت مزید بگڑ گئی۔  
پورے کالج میں ہر طرف وصی احمد ہی کا چہرہ نظر آتا  
تھا۔ ہر آنکھ اسی کی آنکھ تھی ہر ادا اس کی ادا لگتی تھی۔

ہر وہ جگہ جہاں وہ وصی احمد کے ساتھ آئی جاتی تھی  
اس جگہ پر گئے دنوں کی کتنی یادیں کھڑکیاں کھولے  
کھڑی تھیں۔

اسے سانس اندر ہی اندر کہیں گھٹتی ہوئی محسوس  
ہو رہی تھی، گلے میں جیسے کوئی گولا انک گیا ہو۔ وہ نہ تو  
کھل کے رو سکتی تھی اور نہ اپنا کرب چھپا سکتی تھی۔

کالج کا ماحول ویسا ہی تھا۔ گروپ میں جگہ جگہ  
بیٹھے لڑکے لڑکیاں، کہیں کہیں کلاسز میں پڑھاتے  
ہوئے استاد۔ کینٹین میں خوش گپیوں اور لائبریری  
میں پڑھنے میں مصروف اسٹوڈنٹس۔



اس نے ابھی اپنے ڈپارٹمنٹ کی طرف قدم اٹھائے ہی تھے کہ کیمسٹری لیب کے باہر وحی احمد کے گروپ کے لڑکے بیٹھے نظر آ گئے۔ کامران صائم شہروز اور ناصر۔ وہ ان سے آنکھیں چرا کے نکل جانا چاہتی تھی۔ آخر کیسے سامنا کر پانی وہ اس کے دوستوں کا وہ جانتی تھی کہ ان سب کو وحی احمد کی موت کا پتا ہے اور اس موت کی وجہ کا بھی۔ وہ وہاں سے تیز رفتاری سے نکل جانا چاہتی تھی کہ اچانک صائم نے اسے روکا۔

”مس ارتج ٹھہریں۔“ اس کے تیزی سے اٹھنے والے قدم صائم کی آواز پر گویا زمین میں گر گئے۔ وہ تمام لوگ اس کی طرف آ گئے۔

”ٹھہریں بھائی!“ کامران نے بھائی پر بہت زور دیا۔ وہ چونک اٹھی اس طرح کے پکارے جانے

پر۔ ”برانہ مانے گا لیکن ہم اپنے جگر کی دوست مرحوم وحی احمد مرزا کی پہلی اور آخری محبت کو بھابھی نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔“ کامران نے انتہائی غمزہ چہرہ بنا کر کہا۔ یہ جملہ ارتج کو مزید زپا گیا۔ وحی احمد جیسے انسان کے نام کے آگے مرحوم لگنا اسے کتنا برا لگتا تھا۔ ”اتنے دن ہم نے آپ کی راہ دیکھی لیکن آپ آئی ہی نہیں۔“ صائم نے بھی اپنا بیت سے کہا۔

”کیوں؟“ ارتج نے سوال کیا۔

”ایک بات تو یہ کہ وحی احمد مرزا نے ایک وصیت لکھی تھی جس میں اس نے لکھا تھا کہ یہ انگوٹھی چونکہ اس نے آپ کے لیے بنوائی تھی تو یہ آپ ہی کو ملے۔“ ناصر نے وہی ڈیوڈ نکالی جو اس دن وحی احمد لایا تھا۔ اس نے کچھ سوچا اور وہ ڈیوڈ لے لی۔ وہ وہ جانے کے لیے بڑھی تو شہروز نے اسے آواز دی۔ ”بھابھی کل ہم نے وحی کی یاد میں ایک شام رکھی ہے۔ آپ اگر آئیں گی تو ہمیں خوشی ہوگی اور وحی کی روح کو بھی قرار آ جائے گا۔“

”کہاں آنا ہے؟“ وہ آنکھیں جھکائے بولی۔ ”میں کالج کے آڈیٹوریم میں۔ کل شام چار بجے۔“ صائم نے وقت بتایا۔

”میں آؤں گی۔“ وہ مختصر اکہہ کر آگے بڑھی لیکن قدم اب اندر کلاس روم میں جانے کے بجائے باہر گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

رکشے میں بیٹھے ہی وہ ڈیوڈ کھولی تو آنکھوں کے آگے ہزاروں جگمگاتے خواب زندہ ہو پڑے اسی ہیرے کی انگوٹھی میں ہی تو وحی احمد نے اپنے سینے باندھے تھے۔ اسی انگوٹھی کو ہی تو اس نے اپنی محبتوں کا امین بنایا تھا۔ اسی کو تو محبت کا پیارا سا گفٹ بنا کر اس نے ارتج کو سونپنا چاہا تھا اسی کو تھام کے ہی تو وہ تین آمیز لہجے میں بولا تھا۔

”میرے ہاتھوں کی لکیروں میں سمانے والے۔“

اور اسی کو ٹھکرا کے تو ارتج نے اسے خواہشوں کے سلگتے جزیروں پر بھٹکنے، لوٹھرانے اور مرجانے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا۔

اس کی آنکھوں سے دو ہیرے سے اشک نکلے اور اس انگوٹھی کے ہیرے پہ جاکے ٹھہر گئے۔

☆☆

”آج کی یہ شام ہم اپنے مرحوم دوست وحی احمد مرزا کی یاد میں منا رہے ہیں۔ وحی احمد ایک بہت پیارا انسان تھا اور اس سے بھی پیارا بیٹا اور دوست تھا۔ اس کا قریبی دوست ہونے کے ناتے میں وحی احمد کے نام کے آگے مرحوم لگانا برداشت ہی نہیں کر پاتا۔ سوتا ہوں تو اس کی جگہ گاتی آنکھیں بننے لب اور منفرد انداز یاد آتے ہیں۔ جاگتا ہوں تو لگتا ہے وحی احمد پاس ہی کہیں چھپا کھڑا ہے۔ یقین مانے دوستو! وحی احمد جیسے لوگ مرتے نہیں بلکہ ہم جیسے دوستوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ مسکراتے رہتے ہیں۔“ شہروز نے اپنی تقریر ختم کی اور اسٹج سے

اتر آیا۔ فرنیٹ سیٹ پر وہ سلمان شازمداد اور کرن کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اسٹج کے عقب میں وحی احمد کی قد آدم تصویر کھڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کہ وحی احمد بذات خود تصویر کی طرح ساکت و جامد کھڑا ہو اور اسے مسکرا کے پھینچا جا رہا ہو۔ اسے یوں لگا جیسے وہ تصویر اسی کو دیکھ رہی ہو۔ اس کی تو تصویر کی آنکھوں سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ اوپر سے شہروز کے اتنے جذباتی الفاظ وہ کتنی مشکل سے آنکھوں پر بندھ باندھ بیٹھی تھی۔

شہروز کے بعد باری آئی صائم کی جو کہ ہنگامی پلکوں سے ڈاکس پر کھڑا ہوا اور نمناک الفاظ میں مانگیروں فون پر بولا۔

”یار وحی! یہ میں تجھ سے مخاطب ہوں۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے نہیں۔ یار تجھے کیوں اتنی جلدی تھی جانے کی۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا تھا۔ ابھی تو زندگی کے صرف پچیس سال دیکھے تھے تو نے۔ پچیس بہاریں یار ابھی تو تو نے سہرہ بھی نہیں باندھا تھا۔“ یہ کہہ کر صائم کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور ارتج بھی اپنی آنکھوں کو روک نہ پائی۔ سینے کے اندر وحی احمد کی محبت چلنے لگی۔ کچھ دیر ہال میں بڑا جذباتی ساما حول رہا۔ پھر صائم نے خود کو سنبھالا۔

”یار وحی! تو اپنے بار لوگوں کو دھوکا دے گیا ہے یار تو ہمیں کہتا تھا ناں مجھے شہروز کامران اور ناصر کو کہ تم لوگ میری شادی کی ارتجمنت کرنا میری بارات میں بھگتہ ڈالنا۔ یار ہم لوگ تو منتظر تھے اس دن کے لیکن تو نے تو وہ دن نہ دکھایا بلکہ اپنی موت کے دن کو لے آیا۔ یار تو بڑا بے وفا نکلا۔ یار لوگ تجھ سے بہت تھا ہیں یار۔ تو ہم لوگوں کو بہت اکیلا کر گیا۔ خدا تجھے جہاں رکھے سلامت رکھے یار!“ صائم اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا اسٹج سے اتر اس کے جذباتی الفاظ نے بھی کورلا دیا تھا۔

وحی احمد کے قریبی دوستوں کے یہ محبت بھرے

الفاظ ارتج کو مزید منتشر کر رہے تھے۔ وہ واقعی اتنا اچھا تھا، اتنا پیارا، سچے دل کا صداقت میں لپٹا انسان تھا۔ اس کے اندر کی محبت بھی لافانی تھی۔ پھر آخر اسے اتنی جلدی فنا کیسے ہو گئی۔ ایک بار صرف ایک بار وہ ارتج کو بتا تو دیتا کہ وہ کیا قدم اٹھانے جا رہا ہے۔ وہ اس کی محبتوں پر دونوں جہاں قربان کر دیتی۔ ایک بار وہ اسے بانہوں سے پکڑ کے کہتا تو سہی کہ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ پھر وہ کہاں جاسکتی تھی بھلا۔ اب ارتج کے گالوں پہ اشک روائی سے بہہ نکلے تھے۔

ارتج اب مزید خود کو سنبھال نہ پا رہی تھی۔ وہ اٹھی آنسو بہاتی، آڈیٹوریم کی تمام کرسیاں پھلاتی۔ دوڑتی بھاگتی وہاں سے باہر نکل آئی کتنی دیر تک وہ دوڑتی گئی۔ دوڑتی گئی پھر ایک کلاس روم کے اندر جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور چیخ چیخ کر بولی۔ ”آئی لو یو وحی احمد آئی لو یو۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تم جہاں کہیں بھی ہو مجھے معاف کر دو۔ واپس آ جاؤ وحی میں تمہارے بنا زندہ نہیں رہ سکتی۔“ اور کتنی دیر وہ آنسو بہاتی رہی۔ کلاس روم کی تاریک تنہائیوں میں ایک دیوانی لڑکی کی پہلی محبت تنہا سستی رہی۔ تڑپتی رہی۔ وہ آج دل کھول کے روتی تھی۔ پچھتاوے کی گرد جھل گئی تھی۔

☆☆

آج صبح سے ہی اس کا دل بہت اداس تھا اور پھر باہر موسم بھی کچھ اس کی اداسی بڑھائے جا رہا تھا۔ اندر دل میں ٹھٹھن ہی ٹھٹھن تھی۔ آسمان پہ چھائے کالے بادل اس ٹھٹھن کا ساتھ دینے جا رہے تھے۔ وہ بے اختیار ہی اٹھی جاگڑ پینے اور اپنے کمرے سے نکل گئی۔ میڑھیاں اترتے ہوئے اسے مامانے دیکھ لیا۔

”کہاں جا رہی ہو ارتج؟“

”وہ اصل میں کمرے میں بیٹھی بیٹھی بہت اداس



ہو رہی تھی۔ سوچا تھوڑا چہل قدمی کروں باہر۔ وہ خود کو فریش قیل کرانے کی کوشش کرنے لگی۔  
”اچھا بیٹا میرا ایک کام کرتی آؤ گی۔“ ماما نے ملتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔  
”کیا ماما؟“ وہ ہنچلا ہٹ سے بولی۔

”ذرا ماموں کے گھر پر اچار تو دے آنا۔ اب میں یوزھی ہو گئی ہوں بیٹا مجھ میں اتنی بہت نہیں رہی کہ میں بار بار آؤں جاؤں اور پھر فاصلہ بھی تو ہے۔“ ماما نے وجہ بتائی تو وہ انکار نہ کر پائی۔

”ویسے میرا اس طرف جانے کا موڈ تو نہ تھا لیکن آپ نے کہا ہے تو چلی جاؤں گی۔“ وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔

”ننھا ساشیٹے کا مرتبان تھا ہے وہ گھر سے نکل آئی۔ بادل آسمان پر اس طرح چھائے تھے کہ دو پہر کے ساڑھے تین بجے بھی شام کا سماں دکھا رہے تھے۔ اڑوس پڑوس کے لڑکے سڑک پر گردپوں میں کرکٹ کھیلنے میں مشغول تھے۔ کچھ لوگ شام ہونے سے پہلے ہی واک کرنے کے لیے نکل آئے تھے۔

وہ بچتی بجاتی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اپنے ماموں کے گھر کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ابھی وہ اتنی قریب نہیں آئی تھی کہ سلمان کو گھر کے گیٹ کے باہر کھڑے کسی سے بات کرتے دیکھا۔ وہ دوسرا شخص اسے ہو بہو وصی احمد جیسا لگا۔ ویسا ہی قد ویسے ہی بال ویسا ہی سراپا اس کے جسم کے اندر جیسے کچھ نہی بال ہزاروں واٹ کی بجلی نے اس کے وجود کو جگڑ لیا۔ اس کا دل لرز کے رہ گیا۔ وہ اپنی رفتار تیز کرتی این کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لیکن اچانک وہ دوسرا شخص گاڑی میں بیٹھا اور سفید رنگ کی کرو لادوڑا تاجلد ہی نکل گیا۔ وہ تیزی سے چلتی چلتی سلمان کے قریب آ

رکی۔  
”ارتج تم؟“ وہ اسے دیکھ کے حیران ہوا۔  
”سلمان! سلمان تم ابھی کس سے باتیں کر رہے

تھے میرا مطلب وہ لڑکا جو ابھی ابھی یہاں سے گیا۔ وہ کون تھا۔“ وہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔

”کون یہ جو ابھی گاڑی میں گیا؟“ سلمان نے سوال کیا تو ارتج نے گردن اثبات میں ہلائی۔

”یہ تو میرا کلاس فیلو عالم تھا۔ لیکن تم کیوں اتنی پریشان ہو؟“ سلمان اس کی بے چینی پہ حیران ہوا۔

”نہیں سلمان! یہ عالم نہیں وصی احمد تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا۔ یقین مانو یہ بالکل وصی احمد کی طرح تھا۔“ وہ جذباتی طور پر اسے یقین دلانے لگی۔

”بالکل ہو گئی ہو۔ یہ میرا دوست عالم ہے۔ وصی احمد کہاں سے آ گیا؟ اور ویسے بھی اب تو نہیں ہر جگہ وصی احمد ہی نظر آتا ہو گا۔ اپنی آنکھوں کا علاج کراؤ لڑکی۔ کسی دن مجھے نہ وصی احمد سمجھ لینا۔“

سلمان نے اسے ڈانٹا وہ کچھ خاموش ہی ہو گئی۔  
”بولیے کیسے آنا ہوا؟“ سلمان نے اس کے آنے کی وجہ پوچھی لیکن وہ نجابانے کیسی سوچوں میں ڈوب چکی تھی۔ سلمان نے اپنے ہاتھ کو آگے لہرایا۔

”کیسے آئیں ہمارے غریب خانے پر؟“ وہ چیخا تھا۔

”ہاں یہ اچار دینے آئی تھی۔ ماما نے بھیجا ہے۔“ اس نے وہ پیشے کا مرتبان اس کی جانب بڑھایا۔

”اچار آئی نے بنایا ہے ناں چلو ارتج امی سے پراٹھے ہوا کے اچار کے ساتھ کھاتے ہیں۔“ اس نے ارتج کا ہاتھ تھاما اور اندر لے جانے لگا لیکن ارتج نے ہاتھ کھینچ لیا۔

”نہیں سلمان میرا موڈ نہیں میں تو گھر سے واک کرنے نکلی تھی کہ ماما نے یہ اچار پکڑا دیا۔ میں چلتی ہوں۔“ اس نے بے دلی سے کہا۔ سلمان نے اس کی تیسری انگلی میں جگمگاتی ہیرے کی رنگ دیکھی تو مسکرا دیا۔

”ارتج کمال! تم نے واقعی وصی احمد کا نام پہن لیا ہے؟ اب اس لڑکے کا کیا ہو گا جس کی تم سدا کے

لیے جوگی۔“ اس نے ذومعنی مسکرا کے سوال کیا۔  
”سلمان! ارتج سوائے وصی کے نہ کسی کی سچی اور نہ ہوگی۔ اس طرح کی فضول بات پھر بھی نہ کرنا۔“

وہ اپنی انگوٹھی کو دوسرے ہاتھ سے تھاتی تیز رفتاری سے چلی آئی اور سلمان کتنی دیر اس دیوانی لڑکی کی محبت اور قسمت پر سوچتا رہا۔

کالج کے پیر شروع ہو چکے تھے وہ بہت حد تک مصروف ہو چکی تھی فائنل ڈگری کی ایگزام تھے تو محنت بھی زوروں پر تھی۔ ایسے میں وصی احمد کی یادیں تو نہ تھی البتہ مدھم ہو چکی تھی۔ دل میں یہ عزم پکا ہو چکا تھا کہ وہ کسی کی نہیں بنے گی تا عمر ایک لڑکے کا اپنے گناہوں کا ازالہ کر لے گی۔ پیپرز کے دنوں میں رات رات بھر جاگ کر بہت کم کھانا کھا کر اس نے خود کو بیمار کر ڈالا تھا۔ ملنے ملنے پیر کا تو اس نے ماما سے تذکرہ کیا ہی نہ تھا لیکن آخری پیر دے کر وہ جیسے ہی گھر آئی تو اسے اپنا سر بہت بھاری محسوس ہوا۔

آتے ہی بستر پر گر گئی اور جسم میں کپکپی شروع ہو گئی۔ ماما نے اسے اس طرح بستر پر گرتے دیکھا تو پریشان ہو گئیں۔ گالوں کو پیشانی کو چھوا تو وہ تپ رہے تھے۔ جسم اس کا شدت سے بخار کی زد میں تھا، والدہ نے جلدی سے سلمان کو فون کیا اور گھر بلایا۔ کچھ ہی دیر میں سلمان آیا اس نے نمبر پچر چیک کیا۔ تو پارہ بہت چڑھ چکا تھا۔ اس وقت تک وہ بے ہوش بھی ہو چکی تھی۔

”افوہ آئی! اسے تو ایک سو تین ڈگری بخار ہے۔ ابھی اسپتال لے جانا پڑے گا۔“ اور پھر سلمان نے گاڑی نکالی ارتج اور اس کی والدہ کو لیا اور اسپتال لے آیا۔ اسپتال میں کچھ ضروری دوائیوں کے دینے کے بعد اسے ہوش آیا۔ بستر پر نیم دراز بیٹھی تھی وہ بھی سلمان کمرے میں داخل ہوا۔

”کیا کہا بیٹا ڈاکٹر نے؟“ والدہ اپنی انگوٹھی بچی کے لیے پریشان تھیں۔

”آئی! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔ آرام کی کمی ہے اور غذا ابھی نہیں کھائی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ دماغ بھی ڈپریشن میں رہا ہے۔ دودن اسپتال میں رکھنا ضروری ہے۔“ سلمان نے تفصیل بتائی تو والدہ کو کچھ مزید پریشانی ہوئی۔

”لیکن کوئی ڈر نہ کرنے کی بات تو نہیں؟“

”نہیں بس ان موصوف کو سمجھا دیجیے گا کہ ابھی سے مرنے کی کوشش نہ کریں، اپنے کھانے پینے، نیند آرام اور دل دماغ کا خیال رکھیں۔ غیر مرنے چیزوں کو مٹھیوں میں قید نہیں کیا جاتا۔“ سلمان یہ ذومعنی بات کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

”ارتج! بیٹا کیوں تم اتنی لاپرواہ ہو گئی ہو اپنی صحت سے۔ تم ایسی پہلے تو بھی نہ تھیں اس طرح اداس رہنا۔ یوں چپ چاپ گم صم بیٹھے رہنا۔ رات دیر دیر تک کتابیں پڑھتے رہنا۔ دین چڑھتے ہی سو جانا۔ یہ میری ارتج کی عادتیں تو نہ تھیں بیٹا۔“ والدہ اس کے قریب آئیں اور پیار سے بولیں۔

”ایسی بات نہیں ماما۔ ایگزامز کی ٹینشن تھی اور تو کچھ نہیں۔ آپ خواہ مخواہ زیادہ سمجھ رہی ہیں اس بات کو۔“ اس نے مرجھائے ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کی۔

”جھوٹ! سب جھوٹ میں تیری ماں ہوں ارتج! تو جب کھانا مانگ بھی نہ سکتی تھی تب تیری بھوک بھانپ لیتی تھی۔ تو مجھ سے کیوں چھپاتی ہے بیٹی؟ میری جان پرسوں تو تمہارے بابا جان بھی لندن سے آرہے ہیں۔ ان کو کیا جواب دوں گی کہ میں نے ان کی انگوٹھی بچی کا یہ خیال رکھا ہے۔“ والدہ کی آنکھوں سے محبت آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلی تھی۔

”کیا ماما! بابا جان آرہے ہیں۔ پھر تو کل ہی ٹھیک ہو جاؤں گی لیکن آپ مجھ سے وعدہ کریں آپ بابا جان کو کچھ نہیں بتائیں گی۔“ ارتج نے ماں کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی تو والدہ بھی

”آئی! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔ آرام کی کمی ہے اور غذا ابھی نہیں کھائی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ دماغ بھی ڈپریشن میں رہا ہے۔ دودن اسپتال میں رکھنا ضروری ہے۔“ سلمان نے تفصیل بتائی تو والدہ کو کچھ مزید پریشانی ہوئی۔

”لیکن کوئی ڈر نہ کرنے کی بات تو نہیں؟“

”نہیں بس ان موصوف کو سمجھا دیجیے گا کہ ابھی سے مرنے کی کوشش نہ کریں، اپنے کھانے پینے، نیند آرام اور دل دماغ کا خیال رکھیں۔ غیر مرنے چیزوں کو مٹھیوں میں قید نہیں کیا جاتا۔“ سلمان یہ ذومعنی بات کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

”ارتج! بیٹا کیوں تم اتنی لاپرواہ ہو گئی ہو اپنی صحت سے۔ تم ایسی پہلے تو بھی نہ تھیں اس طرح اداس رہنا۔ یوں چپ چاپ گم صم بیٹھے رہنا۔ رات دیر دیر تک کتابیں پڑھتے رہنا۔ دین چڑھتے ہی سو جانا۔ یہ میری ارتج کی عادتیں تو نہ تھیں بیٹا۔“ والدہ اس کے قریب آئیں اور پیار سے بولیں۔

”ایسی بات نہیں ماما۔ ایگزامز کی ٹینشن تھی اور تو کچھ نہیں۔ آپ خواہ مخواہ زیادہ سمجھ رہی ہیں اس بات کو۔“ اس نے مرجھائے ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کی۔

”جھوٹ! سب جھوٹ میں تیری ماں ہوں ارتج! تو جب کھانا مانگ بھی نہ سکتی تھی تب تیری بھوک بھانپ لیتی تھی۔ تو مجھ سے کیوں چھپاتی ہے بیٹی؟ میری جان پرسوں تو تمہارے بابا جان بھی لندن سے آرہے ہیں۔ ان کو کیا جواب دوں گی کہ میں نے ان کی انگوٹھی بچی کا یہ خیال رکھا ہے۔“ والدہ کی آنکھوں سے محبت آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلی تھی۔

”کیا ماما! بابا جان آرہے ہیں۔ پھر تو کل ہی ٹھیک ہو جاؤں گی لیکن آپ مجھ سے وعدہ کریں آپ بابا جان کو کچھ نہیں بتائیں گی۔“ ارتج نے ماں کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی تو والدہ بھی

”آئی! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔ آرام کی کمی ہے اور غذا ابھی نہیں کھائی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ دماغ بھی ڈپریشن میں رہا ہے۔ دودن اسپتال میں رکھنا ضروری ہے۔“ سلمان نے تفصیل بتائی تو والدہ کو کچھ مزید پریشانی ہوئی۔

”لیکن کوئی ڈر نہ کرنے کی بات تو نہیں؟“

”نہیں بس ان موصوف کو سمجھا دیجیے گا کہ ابھی سے مرنے کی کوشش نہ کریں، اپنے کھانے پینے، نیند آرام اور دل دماغ کا خیال رکھیں۔ غیر مرنے چیزوں کو مٹھیوں میں قید نہیں کیا جاتا۔“ سلمان یہ ذومعنی بات کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

”ارتج! بیٹا کیوں تم اتنی لاپرواہ ہو گئی ہو اپنی صحت سے۔ تم ایسی پہلے تو بھی نہ تھیں اس طرح اداس رہنا۔ یوں چپ چاپ گم صم بیٹھے رہنا۔ رات دیر دیر تک کتابیں پڑھتے رہنا۔ دین چڑھتے ہی سو جانا۔ یہ میری ارتج کی عادتیں تو نہ تھیں بیٹا۔“ والدہ اس کے قریب آئیں اور پیار سے بولیں۔

”ایسی بات نہیں ماما۔ ایگزامز کی ٹینشن تھی اور تو کچھ نہیں۔ آپ خواہ مخواہ زیادہ سمجھ رہی ہیں اس بات کو۔“ اس نے مرجھائے ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کی۔

”جھوٹ! سب جھوٹ میں تیری ماں ہوں ارتج! تو جب کھانا مانگ بھی نہ سکتی تھی تب تیری بھوک بھانپ لیتی تھی۔ تو مجھ سے کیوں چھپاتی ہے بیٹی؟ میری جان پرسوں تو تمہارے بابا جان بھی لندن سے آرہے ہیں۔ ان کو کیا جواب دوں گی کہ میں نے ان کی انگوٹھی بچی کا یہ خیال رکھا ہے۔“ والدہ کی آنکھوں سے محبت آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلی تھی۔

”کیا ماما! بابا جان آرہے ہیں۔ پھر تو کل ہی ٹھیک ہو جاؤں گی لیکن آپ مجھ سے وعدہ کریں آپ بابا جان کو کچھ نہیں بتائیں گی۔“ ارتج نے ماں کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی تو والدہ بھی

”آئی! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔ آرام کی کمی ہے اور غذا ابھی نہیں کھائی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ دماغ بھی ڈپریشن میں رہا ہے۔ دودن اسپتال میں رکھنا ضروری ہے۔“ سلمان نے تفصیل بتائی تو والدہ کو کچھ مزید پریشانی ہوئی۔

”لیکن کوئی ڈر نہ کرنے کی بات تو نہیں؟“

”نہیں بس ان موصوف کو سمجھا دیجیے گا کہ ابھی سے مرنے کی کوشش نہ کریں، اپنے کھانے پینے، نیند آرام اور دل دماغ کا خیال رکھیں۔ غیر مرنے چیزوں کو مٹھیوں میں قید نہیں کیا جاتا۔“ سلمان یہ ذومعنی بات کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔



مسکرا دیں۔ وہ بستر پر بیٹھی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھی کہ سلمان کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کے اک ادھیڑ عمر ڈاکٹر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ سلمان کے ہاتھ میں سوپ کا تھرماس تھا۔

”ارتج! یہ ہمارے میڈیکل کالج کے شعبہ نفسیات کے پروفیسر پچر ڈاکٹر رمیز وقاص ہیں۔ یہ نہ صرف میرے فیورٹ پچر ہیں بلکہ ایک بہت اچھے سائیکائرسٹ ہیں۔ تم ان سے محل کے اپنی ہر پر اہم ڈسکس کر سکتی ہو۔“ سلمان نے وضاحت سے ڈاکٹر رمیز کا تعارف کروایا۔ ارتج نے سلام کرنے کے بعد سرسری نظر ڈاکٹر پر ڈالی۔ لمبا قد، سفید بال، سفید داڑھی مونچھ، آنکھوں پر مونے فریم والا چشمہ لگائے ہوئے۔

”ڈاکٹر رمیز! یہ ہے میری کزن ارتج۔ پچھلے چند مہینوں سے بہت ادا اس ہے۔ اپنے ایک بہت قیمتی دوست کو کھودیا ہے۔ اس کے بعد خود بالکل بکھر گئی ہے۔“ سلمان نے صاف گوئی سے ساری بات ڈاکٹر رمیز کو بتائی۔

ڈاکٹر رمیز اس کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور پاٹ دار آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔

”ہوں چہرے سے اور آنکھوں سے تو خاصی براحت گری نظر آتی ہیں۔ لگتا ہے مقابلے بھی ون کرتی آتی ہیں۔“

”بالکل ٹھیک ڈاکٹر۔ ارتج ہر مقابلہ جیتی تھی۔“ سلمان نہایت روانی سے بولا۔ ارتج حسب سابق خاموش رہی۔ صرف ڈاکٹر کے چہرے کو دیکھ جا رہی تھی۔

”لیکن دل کا مقابلہ تو ہار گئی ناں۔ اس طرح کے لوگ بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ اکثر دل کی باتیں بتا نہیں پاتے اور چھپانے کی وجہ سے وہی باتیں ان کے دل کی پھانس بن جاتی ہیں۔ ان کو چاہیے کہ وہ

باتیں یہ کسی سے شہر کر لیا کریں۔“ ڈاکٹر نے بہت سچ سچ نتیجہ نکالا تھا۔ ارتج کو حیرت ہوئی اس انکشاف پر۔ کچھ وقف کے بعد ڈاکٹر رمیز بھر گیا ہوئے۔

”ہاں رہتی بات اہم دوست کو کھودینے کی تو سلمان! ہم اکثر اپنے حلیے والوں کو بھول نہیں پاتے ہیں۔ ہاں اگر اس شخص یا دوست کا کوئی تم البدل ہماری زندگی میں آجائے تو پھر ہم پہلے والے شخص کو فراموش ضرور کر لیتے ہیں۔“ ڈاکٹر رمیز نے نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

”معاف کیجیے گا ڈاکٹر رمیز! دل کے فریم سے بار بار تصویر پیچ پیچ نہیں کی جاتی۔ آپ اپنا یہ فلسفہ اپنے اسٹوڈنٹس کے ہی دماغ میں گھسائیے۔ محبت، محبت ہوتی ہے کوئی بس یا ٹرین نہیں کہ ایک چھوٹ گئی تو دوسری پکڑ لی۔“ ارتج کو ڈاکٹر کی بات پر غصہ آ گیا تھا اس لیے وہ بھڑک اٹھی تھی۔

”لیکن ارتج! ڈاکٹر رمیز کی یہ بات غلط بھی نہیں۔“ سلمان نے ڈاکٹر کی تائید کی۔

”شٹ اپ سلمان! محبت صرف ایک بار دلوں میں بہتی ہے۔ وفا کے راستے تبدیل نہیں ہوتے۔ دکھاتی ہے۔ بار بار یہ راستے تبدیل نہیں ہوتے۔ میں نے وحی احمد سے محبت کی ہے کوئی کاروبار نہیں کہ اگر وہ مر گیا تو میں ساسھی بدل دوں۔“ ارتج کی ستارہ آنکھیں شفاف پانیوں سے جھگکا اٹھیں۔ بھی ڈاکٹر رمیز اٹھ کھڑا ہوا۔

”لگتا ہے بے بی برامان گئی ہیں سلمان! انہیں تم کسی دن میرے کلینک میں لے آنا۔ ان کا نفسی چیک اپ کرنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر رمیز کمرے سے چلا گیا اور سلمان اسی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”پاگل لڑکی! تمہیں کیا ضرورت ہے چرکی سے اچھنے کی۔“ ڈاکٹر نے تو بس جنرل سی بات کی تھی۔ اس کا اور کوئی مطلب نہ تھا۔ چلو میں تمہیں سوپ پلاتا ہوں۔“ سلمان نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے

نہایت نرمی سے کہا۔ وہ قدرے کول ڈاؤن ہو چکی تھی۔ سلمان نے بڑے سے باؤل میں سوپ ڈالا اور اس تک لے آیا۔ وہ پیچھے سے گرم گرم سوپ پینے لگی۔ سوپ پیتے پیتے اچانک اسے خیال آیا۔

”ایک بات ہوں سلمان! میرا یقین کرو؟“

سلمان نے سر کو مسکرا کر اثبات میں جھنسن دی۔

”یہ ڈاکٹر رمیز پتا نہیں کیوں مجھے وحی احمد سے مشابہ لگا۔ اس کا لب بلانے کا انداز، آنکھوں کی پتلیوں کا رنگ، لہجہ، وحی احمد جیسا تھا۔“ وہ نہایت گہری سوچ میں ڈوب کر بولی۔ اس پر سلمان نے زوردار قہقہہ مارا۔ اس کا یہ قہقہہ اسپتال کے چھوٹے سے کمرے میں گونجنا رہ گیا اور ارتج کو اپنی ہی کبھی بات پر شرمندگی محسوس ہوئی۔

اس کے والد کمال عثمانی لندن سے واپس آئے تو ایئر پورٹ پر اپنی اکلوتی بیٹی ارتج کو نہ پا کر حیران ہوئے۔ ایئر پورٹ سے گھر آتے ہوئے ان کی ٹیکم آصفہ نے انہیں ارتج کے بخار کے بارے میں بتایا تو وہ اور پریشان ہوئے۔

گھر پہنچے تو ارتج، سلمان، سلمان کی والدہ، والد اور بہن عائشہ نے استقبال کیا۔ گھر پر رونق آ چکی تھی۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ ارتج بھی سالوں بعد اپنے بابا بیا جان سے ملی تھی، سو وہ بھی عرصہ بعد محل کے سکرانی تھی۔ ڈرنر ٹیبل پر سارے بیٹھے تھے کہ سلمان نے ارتج کے کان میں سرگوشی کی۔

”ارتج! اب یہ مت کہنا کہ انکل کا چہرہ بھی تمہیں وحی احمد جیسا لگ رہا ہے۔“ ارتج نے یہ سنا تو زور سے پیچ اس کے ہاتھ پر دے مارا۔

”آصفہ! ہم تو جانتے تھے کہ ہماری ارتج اب بڑی ہو گئی ہوگی لیکن وہ تو ابھی تک سلمان سے ویسے ہی لڑتی ہے۔“ کمال عثمانی نے دونوں کو لڑتے دیکھ لیا تھا۔

”انکل! آپ کی یہ لاڈلی کبھی بڑی نہیں ہوں

گی۔ دادی بھی نہیں گی تو پوتوں کے ساتھ کچے کھیلے گی یا پھر پٹنگ اڑائیں گی۔“ سلمان ہاتھوں سے پٹنگ اڑانے لگا تو ارتج نے ایک چپٹ اس کے کندھے پر دے ماری۔ کمال عثمانی مسکرا دیے۔

”جاؤ جاؤ۔ ہماری بھانجی اب ماشاء اللہ سے تعلیم پوری کر چکی ہے۔ آپ تو ابھی تک پورے ڈاکٹر بھی نہیں بنے۔“ سلمان کے والد عفان علی نے ارتج کی سائیڈ لی۔

”ہاں ارتج! کیسے پیپرز ہوئے تمہارے۔“ کھانے میں چھری کا نئے کا استعمال کرتے ہوئے کمال عثمانی مخاطب ہوئے۔

”بہت اچھے بابا جان! بس اب زلزل کا انتظار ہے۔ اس کے بعد کوئی جاب وغیرہ۔“ وہ والد کو اپنے ارادے بتانے لگی۔

”اتنے اچھے امتحان دیئے انکل کہ آخری پیپر والے دن بے ہوش ہو گئیں اور مجھے ان کا سٹرک کو گرام کا وزن اٹھا کے اسپتال لے جانا پڑا۔“ سلمان نے اسے چھیڑا تو اسے غصہ آ گیا۔

”چپ ہو جاؤ احمق۔“ وہ بے اختیار بول بڑی۔

”کیا کہا۔ میں تم سے بڑا ہوں۔ معافی مانگو۔“ سلمان نے کھانا چھوڑا اور اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”کیوں معافی مانگوں میں۔“ اس نے بھی ضد کی۔ سلمان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور مروڑنے لگا۔

”بولو آئی ایم سوری۔“

”بول دو ارتج بیٹا۔ اس طرح بڑے بھائیوں کو نہیں بولتے ہیں۔“ آصفہ بیگم نے صلح کروانی چاہی اور اسے مجبوراً سوری کرنا پڑا لیکن سوری کرنے کے بعد وہ بیٹھی نہیں بلکہ دوڑ کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔

”آصفہ بیگم! آپ نے تو بیٹی کی شادی کرنے کا بھی سوچ لیا ہے لیکن ارتج کی عادتیں تو اب بھی بچپن سے لبریز ہیں۔“ کھانے سے فارغ ہو کر کمال عثمانی لان میں چہل قدمی کرنے آصفہ بیگم کے ساتھ آ گئے



کو منانے کی پوری ذمہ داری لے رکھی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں ارتج اس کے علاوہ اور کسی سے اتنی گور نہیں۔ بچپن سے اپنی پراہیز اسی سے شیر کرنی آئی ہے اور ویسے بھی سلمان کہہ رہا تھا اس نے بات کی ہے۔ ارتج نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہا کہ مجھے اپنے ماما اور بابا جان کا فیصلہ منظور ہوگا۔“ آصف بیگم نے شوہر کو اطمینان دلایا۔

”یہ کیریڈ تو پھر آپ کی پرورش کو جائے گا آصف، اتنے سال اس طرح اکیلے لگتے اچھے طریقے سے میری بیٹی کی تربیت کی ہے آپ نے۔“ شوہر کی آنکھوں میں اپنے لیے عزت دیکھ کر آصف بیگم کی روح تنک سرشار ہو گئی۔

”چھ سال کی تھی ارتج جب میں ماں اور باپ دونوں بن گئی تھی آپ کا لندن جانا برس شروع کرنا اس گڑیا کو پالتے پالتے نجانے کب بوڑھی ہو گئی میں۔ ساری زندگی تو آپ سے دور گزری ہے میری۔“

”فکرت کرو آصف! بیٹی کو اچھا گھر دے کر۔ مطمئن ہو کر ہم پہلے حج پہ چلیں گے اور پھر لندن میں ہی سیٹل ہو جائیں گے۔“ کمال عثمانی اور آصف کمال آنے والے دنوں کی پلاننگ کرنے لگے۔

☆☆

صبح سے ہی گھر میں شرم کو آنے والے مہمانوں کی آمد کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ماما نے پورے گھر کے کمرے اور پردے تبدیل کروائے تازہ پھولوں کو خوب صورتی سے واز میں سجاکے کونے میں رکھ دیا۔ کارپٹ کو اچھی طرح سے دیکھ کر دیا اور اب وہ کچن میں تھیں۔ ارتج ہر چیز سے بے خبر تھی اور پھر اس طرح کی دعوتیں بابا جان کے آنے کے بعد روز ہی ہوا کرتی تھیں اس لیے ارتج نے کسی بھی خاص تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ وہ نارمل ہی رہی بلکہ اب وہ کمرے سے اٹھ کر کچن میں آگئی تھی۔

”کمال! آپ کو نہیں علم لیکن میں نے ارتج کی تنہائی دیکھی ہے اگر اس کا کوئی بھائی یا بہن ہوتی تو شاید ایسا نہ ہوتا لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ کالج سے فراغت کے بعد وہ بالکل اکیلی پڑ جاتی ہے۔ اس طرف دھیان میرا بھی نہ جاتا۔ اگر سلمان مجھے نہ دکھاتا یہ۔“ آصف بیگم نہایت راز داری سے شوہر کو ارتج کی حالت سے آگاہ کرنے لگیں۔

”اچھا آپ نے چھان بین کی وہ لوگ کیسے ہیں؟“ کمال عثمانی نے پوچھا۔

”آپ کے بغیر ہر کام کرنا سیکھ لیا ہے میں نے۔“ آصف بیگم نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔

”یہ تو سراسر شکایت ہوئی ناں۔“ کمال عثمانی مسکرا دیے۔

”وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ اونچا خاندان ہے حیثیت میں ہم سے بہت اونچے ہیں۔ سلمان کا دوست ہے لڑکا۔ میں نے لڑکا بھی دیکھا ہے۔ ان کے گھر لے گیا تھا سلمان مجھے تو اس کے والد والدہ اور خود لڑکا پسند آیا۔ کل آکر وہ ارتج کو دیکھ لیں گے۔ لڑکا تو کہتا ہے کہ ارتج اسے بنا دیکھے ہی منظور ہے لیکن لڑکے کی ماں ارتج کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ آپ لڑکے کے والد سے اور لڑکے سے مل بیٹھ جائے۔ مجھے تو کوئی اعتراض والی بات نظر نہیں آتی۔ باقی آپ اطمینان کر لیں۔“ آصف بیگم نے تمام معلومات شوہر کو سنادیں اس پر کمال عثمانی مسکرا دیئے۔

”بیگم! آپ نے تو پوری شادی طے کر کے ہمیں مدعو کیا ہے۔ باقی سب کچھ ٹھیک ہے آپ مطمئن ہیں تو ہمیں پورا اعتماد ہے آپ کے اطمینان پر لیکن کیا ارتج راضی ہے۔ دیکھیں بیگم ہم اپنی انگوٹھی بیٹی پر کبھی بھی طرح کا دباؤ نہیں ڈالنا چاہتے۔“ کمال عثمانی نے بیٹی کی رضامندی پر فکر ظاہر کی۔

”آپ اس کی فکر نہ کریں کمال! سلمان نے ارتج



”اما! میں کوئی سیلپ کرا دوں۔“ وہ مختلف پتیلیوں کے دھکن اتار کے دیکھنے لگی۔

”نہیں بیٹا، تقریباً سارا کام ہو گیا ہے۔ بریانی“ تورمہ بن گیا ہے۔ سوئیٹ ڈش تو پہلے ہی تیار کر کے فریج میں رکھ دی ہے۔ اب اچار گوشت بنارہی ہوں۔ باقی رہ گیا سلا تو وہ یہ صائفہ بنا لے گی۔“ آصف بیگم نے تمام مینوک تفصیل اس کے گوش گزار کر دی۔

”لیکن ماما کوئی چائیز ڈش بھی بنائیں ناں۔ یہ بریانی تو رے والی دھوتیں اب پرانی ہو گئی ہیں۔“ ارتج نے تورمہ کا ذائقہ چچ کے ذریعے چکھتے ہوئے کہا۔

”سوچ رہی تھی کوئی چکن کی چائیز ڈش بھی بنا لوں۔“ آصف بیگم کچھ سوچ کے بولیں۔

”آپ چھوڑیں ماما! میں ایسے زبردست شاشک دھڑا کر رہی ہوں اور پڑا ہواؤں گی کہ مہمان آپ کے تورمہ بریانی کو بھول جائیں گے۔“ ارتج نے مسکرا کے کہا اور اپن باندھ لیا۔ چکن کے کینٹ کھول کر مطلوبہ اشیاء تلاش کرنے لگی۔

”اچھا تمہاری مرضی۔ ویسے میں نے سنا ہے دل تک پہنچنے کا راستہ پیٹ میں سے ہو کر گزرتا ہے۔“ آصف بیگم ذومعنی مسکرا دیں۔ پھر وہ چکن سے جانے کے لیے پھیلیں۔

”اور ہاں ارتج۔“ ماما کو پھر کوئی بات یاد آگئی۔ ”میں کوئی اچھا سا سوٹ پہننا۔ مہمانوں سے تمہیں بھی ملنا ہے۔ بہت خاص مہمان ہیں یہ۔“ آصف بیگم نے مسکرائے کہا تو ارتج کو حیرانی ہوئی۔

”لیکن کون ہیں کیا میں جانتی ہوں؟“ ”تفصیل تو تم سلمان سے پوچھ لو۔ رہی بات جاننے کی تو جلدی جان جاؤ گی۔“ آصف بیگم یہ گول مول سی بات کہہ کے چکن سے باہر چلی گئیں لیکن ارتج کو سوچ میں ڈال گئیں۔ لیکن ارتج نے اس

بات کو نارمل ہی لیا اور پڑا ہواؤں اور شاشک کے لیے چکن کو میرینٹ کرنے میں مشغول رہی۔

ککٹ سے فارغ ہوئی تو شام ہو چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آئی اور ماما کے کپڑے کے مطابق کوئی اچھا سا سوٹ سلیکٹ کرنے لگی۔ اسے سفید جارجٹ کا سوٹ مناسب لگا۔ وہ نکال کے اس پر استری پھیری اور کچھ دیر کے لیے بستر پر آکر لیٹ گئی۔

تھکاوٹ کے سبب اس پر گہری نیند چھا چکی تھی اسے احساس ہی نہ ہوا کہ کب شام کے سات بجے اور مہمان آ گئے۔ وہ ابھی دروازے کی اوٹ سے جھانکا تو ایک باوقار شخصیت کی مالک خاتون اور اچھی قد و قامت والے مرد کو دیکھا۔ ساتھ میں سلمان ان کا تعارف کمال عثمانی سے کروا رہا تھا۔ وہ ابھی سوٹ اٹھا کے جلدی جلدی ہاتھ روم میں جانے ہی لگی تھی کہ سلمان آ گیا۔

”یہ کیا تم ابھی تک تیار نہیں ہوئی ہو؟“ ”بس ابھی ہونے ہی لگی تھی۔“ وہ کچھ کچھ شرمندہ بھی ہوئی تھی اتنی دیر تک سوئے پڑے رہنے کی وجہ سے۔

”اور یہ کیا یہ سفید سوٹ کس لیے نکالا ہے۔ کسی میلاد میں جاری ہو گیا؟“ سلمان نے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سوٹ دیکھا تو اسے ٹوک دیا۔ اس کی الماری تک آیا ڈھیر سارے سوٹ نکال کے دیکھنے لگا۔ پھر ایک رائٹ بلیو کلر کا سوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

”یہ لو یہ پہن لو۔“ ”لیکن سلمان یہ تو اتنا ہیوی کام والا ہے۔ ماما نے پچھلی عید پر بنوا کے دیا تھا۔“ ارتج نے پریشانی سے کہا۔

”تو کیا ہوا۔ یہ بہت ہی خاص مہمان ہیں ارتج۔ چلو یہ پہن آؤ۔“ سلمان نے سختی سے کہا تو اسے مجبوراً

وہ سوٹ لینا پڑا۔ سوٹ چینج کر کے وہ ہاتھ روم سے نکلی تو سلمان کو ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھے جیولری سلیکٹ کرتے پایا۔ وہ سفید پرل والا سیٹ تھا سے اس کی جامع متوجہ ہوا۔

”سوارتج! تم اپنے بال کھول کے اوپر سے پن لگا دو اور یہ پرل کا سیٹ بھی پہن لو۔ کسی اچھے سے لپ کھر والی لپ اسٹک لگانا۔“ سلمان نے تحمانہ انداز میں کہا تو وہ جھلا اٹھی۔

”تم مجھے کسی کی شادی پہ لے جا رہے ہو یا میری اپنی شادی کر رہے ہو۔ نہیں پتا ہے سلمان کہ مجھے یہ سب پسند نہیں۔“

”تم چاہتی ہو کہ تمہاری ماما اور بابا تم سے ناراض ہو جائیں؟“ سلمان کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور وہ بے دلی سے ہی لیکن تمام کام کرنی رہی۔ تیار کر کے اسے فاسٹل کے طور پر پرفیوم لگایا اور باہر لے آیا۔

”سنو بہت اچھی لگ رہی ہو۔ بس ذرا چہرے پر مسکراہٹ کی کمی ہے۔“ سلمان کے کہنے پر ارتج مسکرا دی۔ وہ دونوں ساتھ ہی ڈرائنگ روم کی طرف آئے جہاں پہ دونوں فیمیلز بات چیت میں مصروف تھیں۔

”یہ ہیں ہماری بیٹی ارتج۔ اسی سال ایم بی اے کیا ہے۔“ کمال عثمانی نے ارتج کا تعارف کروایا۔ ارتج نے دونوں کو سلام کیا۔

”ارتج یہ ہیں مسٹر اینڈ مسز شبیر۔ انکل کے فرینڈ۔“ سلمان نے ارتج سے ان کا تعارف کرایا۔ مسز شبیر ارتج کو بہت غور سے پارہری آنکھوں سے دیکھے جارہی تھیں اور ارتج بھی مسکرا کے بھرپور خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ چند ایک باتیں کرنے کے بعد ارتج وہاں سے چلی آئی جب کہ باقی لوگ ڈنر کرنے لگے۔ ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر وہ لوگ چلے گئے اور سلمان ارتج کے کمرے میں آ گیا۔

”ارتج! چلو ہم آؤں کریم کھا کے آتے ہیں۔“ سلمان کی پیشکش کو اس نے بنا کسی سوال جواب کے قبول کر لیا اور دونوں چہل قدمی کرتے ہوئے گھر کے قریبی آؤں کریم بارلر آ گئے۔

”میں اندر نہیں بیٹھوں گی سلمان! مجھے آؤں کریم بیٹیں لا دو۔“ وہ بارلر کے باہر بنی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ سلمان بھی بنا کسی تردید کے گیا اور اندر سے دو آؤں کریم کپ لے آیا۔

”یہ تو تمہاری ٹوٹی فروٹی۔“ سلمان نے اس کا کپ آؤں کریم بڑھایا۔ ”تمہیں کیسے پتا مجھے ٹوٹی فروٹی کھانے کا دل ہو رہا ہے۔“ ارتج حیرانی سے مسکرا دی۔

”بچپن سے ہم اکٹھے ہی آؤں کریم کھاتے آئے ہیں۔ مجھے پتا ہے تم اداسی میں ونیلا اور نارمل موڈ میں ٹوٹی فروٹی کھاتی ہو۔“ سلمان نے یہ کہا تو ارتج نے زور سے مسکرا دیا۔

”اور مجھے بھی یہ پتا ہے کہ تم چاہے اداس ہو یا خوش تم پتا فلیور ہی کھاتے ہو۔“ ارتج کی مسکراہٹ اب تھپتھپ میں بدل گئی اور سلمان دیر تک اسے اسی طرح دیکھتا رہا۔

”ارتج! بہت عرصے بعد مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں پرانی والی ارتج کمال کے ساتھ ہوں ٹوٹی جھگڑنی، ہستی کھلکھلائی۔ میں تو سمجھا تھا کہ وصی احمد نے مجھ سے میری گڑبادی دوست چھین لی ہے۔“ سلمان کی اس بات پر ارتج کا قبضہ اور مسکراہٹ دونوں غائب ہو گئے۔ شاید وصی احمد کا ذکر اب صرف اداس آنکھوں اور اشکوں کا ترجمان بن چکا تھا۔

شاید وصی احمد کی یاد کانٹوں سی چھین لیے آتی تھی شاید وصی احمد اس کی مسکراہٹوں پر حاوی ہو گیا تھا ”میں تمہیں بہت ضروری بات کرنے کے لیے یہاں لایا ہوں۔ ایک ایسی بات جو تمہیں بتانے کے



لیے انکل آئی نے مجھ پر بھر دیا۔“ سلمان آکس کریم کھاتے کھاتے بولا۔ ارتج خاموشی سے اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”ارتج! تم انکل آئی سے کتنا پیار کرتی ہو؟“ سلمان نے سوال کیا۔

”ہر کسی سے زیادہ وہ میرے والدین ہیں! ان کے علاوہ میرا اور میرے علاوہ ان کا دنیا میں کوئی نہیں لیکن تم ایسا کیوں پوچھ رہے ہو؟“ ارتج کو اس بات پر حیرانی ہوئی۔

”کیونکہ ان دونوں نے مل کر تمہارے لیے ایک فیصلہ کیا ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ تم ان کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ گی۔ انہوں نے اپنی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے تم پر اعتماد کیا ہے۔“ سلمان نے نہایت صفائی سے بات شروع کی۔

”کیسا فیصلہ! کیا اعتماد؟“ ارتج کو پریشانی ہوئی۔

”ارتج! انکل اور آئی نے مل کر تمہاری شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور آج تم جن مہمانوں سے ملیں وہ تمہارے سرانی عزیز تھے۔ لڑکے کا نام احمد ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں اور انکل آئی دونوں راضی ہیں۔“ سلمان کے اس انکشاف پر ارتج کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ حیرت کی انتہا ہی ان آنکھوں میں۔ خوابوں کی بھری کرچیاں تھیں ان نظروں میں۔

”سلمان! تم نے تم نے سب کچھ جاننے ہوئے بھی ہر بات مجھ سے چھپائی۔ تم نہیں جانتے کہ میں وحی احمد سے..... نہیں سلمان..... میں کس طرح سے شادی کروں گی۔ تم..... تم منع کیوں نہیں کرتے ہو بابا جان اور ماما کو۔ تم انہیں بتا کیوں نہیں دیتے ہو۔“ ارتج متوحش نظروں سے منتشر الفاظ سے سلمان سے مخاطب ہوئی۔

”کیا بتاؤں انہیں کہ تم نے وحی احمد نام کے شخص سے محبت کی تھی اور وہ محبت تمہیں اس شخص کے مرنے

کے بعد محسوس ہوئی۔ اس کی موت کی ذمہ داری تم ہو اور اس کے بعد تم نے عمر بھر خود کو تنہا اذیتوں کے صحرا میں جھلنے کی سزا دی ہے۔ جو کہ پچھلے سات ماہ سے تم بھگت بھی رہی ہو۔“ سلمان کی آواز اونچی ہو گئی۔ ”کیا وہ ماں باپ برداشت کر پائیں گے اپنی اکلوتی بیٹی کا صدمہ۔ وہ ماں کہ جس نے انیس سال اپنے خاوند سے دور گزارے صرف اپنی بیٹی کی وجہ سے۔ وہ باپ کہ جو اتنے سال ترستار با بیٹی کے چہرے کو دیکھنے کے لیے۔ ان دونوں کو میں یہ بتا دوں کہ تم نے کیا کیا ہے۔ ارتج وہ دونوں بکھر جائیں گے۔“ سلمان کا لہجہ ثورے مدھم ہو گیا تھا۔

”لیکن سلمان! یہ بے وفائی ہوگی وحی احمد کے ساتھ۔“ اس کی آنکھوں میں اشک تھے۔ وفا کی داستان دہراتے ہوئے صداقت کے لیے سائے دکھاتے ہوئے۔

”ارتج! وحی احمد تمہارا گزرا ہوا کل ہے اور ماضی کے پیچھے اپنا حال اور مستقبل تیاگ کے بھاگا نہیں جاتا۔“ سلمان اسے سمجھانے لگا۔

”لیکن سلمان ایسے مستقبل کا کیا کروں جس کی جڑیں ماضی نے پھین لی ہوں۔ میں نہیں کر پاؤں گی یہ سب۔ یہ بہت مشکل ہوگا میرے لیے۔“ نرم سے آنسو گال پر آ کے ٹھہر جاتے تھے۔

”ٹھیک ہے ارتج میں کہہ دیتا ہوں انکل آئی کو کہ آپ کی بیٹی کو آپ کی نہیں ایک سائے کی خوشی عزیز ہے وہ سب یہ جو وحی احمد کا ہے۔ آپ کی بیٹی کو آپ کے خوابوں کی کوئی پرواہ نہیں۔“ سلمان نے آکس کریم کا کپ رکھا اور جانے کے لیے اٹھا۔ ابھی دو قدم ہی چلا تھا کہ ارتج نے اسے پکارا۔

”ٹھہر و سلمان! اگر بات میرے بابا اور ماما کی خوشی کی ہے تو میں راضی ہوں ان کی ہر بات ماننے کے لیے۔ وحی احمد کو تو میں زندگی میں کوئی خوشی نہ دے پائی، کم از کم اپنے والدین کو تو تکلیف نہ دوں

اور دیے بھی میرے خواب تو تاجر بھٹکتے ہی رہیں گے۔ چاہے میری شادی ہو یا نہ ہو۔ تم ماما باپ کو کہہ دینا کہ میں شادی کے لیے تیار ہوں۔“ ارتج نے رصاصہ بندی ظاہر کر کے اپنے والدین کے فیصلے کو مانتے ہوئے اور سلمان نے مسکرا کے اس کا ہاتھ تھاما اور دونوں ساتھ ساتھ گھر آنے لگے۔

وہ آنکھیں موند سے بھی ایک اداس سی غزل سن رہی تھی کہ ماما نے آکر ٹیپ آف کر دیا۔

”یہ کیا تم آج کے دن غزل سن رہی ہو اتنی اداس بیٹی۔ آج تمہیں ہم مایوں بٹھا میں گے۔ آج تو خوشی کے گانے لگاؤ۔“ ماما کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ انہوں نے غزلوں کی کیسٹ نکالی اور دوسری ڈال دی۔ پورے ماحول پر تیز موسیقی چھا گئی۔

گوری کرت سنگھار۔ گوری کرت سنگھار  
بال بال موتی چمکائے۔ روم روم مہکار  
ماگ سنگھار کی سندر تارے۔ جھکے چندن وار  
”ماما! اس نے شکایت آمیز آنکھوں سے والدہ کو دیکھا جو کہ خوشی سے جھومے جا رہی تھیں۔ اس طرح کے سائے والدہ کے چہرے پر دیکھ کے اسے اپنے فیصلے پر ناز ہوا تھا۔

”کیوں بھی! ایسے کیا گھور کے دیکھ رہی ہو۔ ہماری اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کی شادی ہے جسے ہم نے بیٹوں کی طرح پالا ہے۔ اس دن کی تیاری تو بیٹیوں کے پیدا ہوتے ہی ماں باپ شروع کر دیتے ہیں۔ میں تو دل کھول کے خوشی مناؤں گی۔ جھوموں گی ناچوں گی، کھلکھلاؤں گی۔“ آصفہ بیگم نے خوشی سے کہا۔

”لیکن ماما! میں آپ سے دور بھی تو چلی جاؤں گی ناں۔ ایک انجان دنیا میں انجان لوگوں کے بیچ۔“ میں کیسی طرح رہ پاؤں گی آپ کے بغیر ماما۔“ ارتج نے غم آنکھوں سے ماں کی گردن میں

بازو ڈال دیئے۔

”یہ تو ہمارا رواج ہے میری بیٹی! میں بھی کہیں سے آئی تھی تیرے بابا کے گھر اور انہیں اپنا بنا لیا۔ میری ماں بھی کہیں سے آئی تھی اور اس کی ماں بھی۔ ہر عورت کی ماں نے یہ سفر طے کیا ہے اور نجانے کب تک کرنا ہے۔“ آصفہ بیگم اس کی بھری لٹوں کو کان کے پیچھے اڑاتے ہوئے بولیں۔

”کیا یہ نسل در نسل چلنے والی سزا۔ یہ کتنی مرحلہ ختم نہیں ہو سکتا۔ کیا بیٹی تا قیامت اپنے والدین کے گھر نہیں رہ سکتی۔ کیا ہمیشہ تک وہ گڑبازوں سے نہیں کھیل سکتی۔“

ارتج کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں والدہ کو اس کی معصوم فرمائش پہ پیار آ گیا اور اس کے دہلے سے وجود کو گلے سے لگالیا۔

پیلے رنگ کی سادہ ساڑی کے اوپر پیلا کرن والا دوپٹہ اوڑھے گلے کان اور بازوؤں میں سفید موٹیے کی خوشبو دار کلیاں پہنے معصوم سادہ سے روپ کی بجلی گرائے وہ لانی میں سکھوں کے ساتھ مایوں کی رسم کے لیے آچکی تھی۔ ماما نے اپنے اچھے ذوق اور ٹیسٹ کا ثبوت دیتے ہوئے پورے لان کو فریش فلاورز سے سجایا تھا۔ زمین پر پیلے رنگ کی چاندنی اور سبز رنگ کے گاؤں تیکے رکھے گئے تھے۔ دو لمبے والوں کے لیے کھانے کا الگ ارتج منت تھا۔ وہیں والوں کی طرف سے گنتی کے چند لوگ تھے۔ سلمان کی بیٹی اور شازمہ کرن اور چند ایک اور سہیلیاں۔ پاپا ماما کی طرف سے اور تو کوئی رشتہ دار نہ تھا۔

دو لمبے والے باری باری رسم مایوں کے لیے آرہے تھے۔ اس کی شفاف پیشانی پر سات سہاگنیں صندل کی تحریر لکھنے آئیں۔ اس کی لمبی سیاہ چوٹی کو تیل لگایا گیا۔ پتیلی پہ بندھی باری باری رکھی گئی۔ گنتی خوب صورت رسمیں تھیں لیکن پتا نہیں کیوں دل پہ



اداسی کے ڈیرے تھے۔ ایک تو ماما، پاپا سے بچھڑنے کا تم اور پاپا سے وہی احمد کا وجود جو اس کے دل کے اندر ہی اندر اپنی محبت کی شمعیں جلائے جا رہا تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ ان شمعوں کی روشنی مزید روشن ہو رہی تھی۔

رسموں کے بعد شازمہ کرن اور دوسری لڑکیاں ڈھولکی کی تھاپ پر سہرے گانے لگیں۔ ابھی اچانک ڈھیر سارے لڑکوں کے گرد پوں میں سے سلمان کے ساتھ صائم کا حیران، شہروز اور ناصر پہلے رنگ کی چیزیاں پہنے نکلے۔ پہلے وہ ارتج کے پاس آئے۔

”تم جتنی بھی ناں ارتج تمہارا کوئی بھائی نہیں۔ دیکھو آج ہم پانچ بھائی ہیں تمہارے۔“ سلمان نے کہا تو ارتج کا دل اندر تک سرشار ہو گیا۔

پھر ان ساروں نے مل کر گروپ ڈانس کا وہ مظاہرہ کیا کہ سب حیران رہ گئے۔ رات دیر تک ان کا فٹنشن جاری رہا۔ فٹنشن ختم ہونے کے بعد سلمان اوپر اس کے کمرے میں آیا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ارتج! تمہارے دو پہرے نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہیں اس کی تصویر دکھاؤں۔ ورنہ کل اچانک پہلی بار اسے دیکھ کر تم بے ہوش نہ ہو جاؤ۔ یہ دیکھو یہ ہیں تمہارے مجازی خدائے“ سلمان نے ایک فوٹو گراف اس کی طرف بڑھائی لیکن اس نے منہ پھیر لیا۔

”مجھے کوئی ضرورت نہیں یہ دیکھنے کی۔ جب وصی احمد نہیں تو پھر چاہے کوئی بھی ہو۔ میں نے بھی آئیڈیل بنایا ہی نہیں اس لیے میں اس میں کسی کو نہیں ڈھونڈوں گی۔“

”وصی احمد کو بھی نہیں۔“ سلمان نے اس کی آنکھوں میں چھانکا۔

”نہیں۔“ اس نے انکار کر دیا۔  
”دیکھ لو۔ ہو سکتا ہے بے چارہ تمہیں پسند آجائے۔“ سلمان نے مزید اصرار کیا۔

”میں نے کہا ناں نہیں تم کیوں خواہو اور وقت ضائع کر رہے ہو۔“ وہ جھٹلائی۔

”اچھا ٹھیک ہے اس کے ضد و خال بتا دیتا ہوں۔ باقی سب ٹھیک ہے۔ صرف ایک آنکھ کافی ہے دانستہ کچھ بچپن میں ٹوٹے تھے کچھ جوانی میں سر کے بال اڑے ہوئے ہیں ناک بس سوچنے کے لیے کافی ہے۔ دیکھنے میں نہیں آتی اور.....“ سلمان تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

”سلمان۔“ وہ غصے میں چیختی تھی۔ کشن اٹھایا اور اسے دے مارا۔ وہ جانے کے لیے دوڑا اور مڑ کے بولا۔

”ہاں لیکن تم سے اچھا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کیا اور کشن دروازے کو جاکے لگا۔

آخر وہ دن آگیا تھا کہ جب اس کا نانا کشی انجان بندے سے جڑنے والا تھا اور وصی احمد کی یادوں اور خوابوں سے ہمیشہ کے لیے ٹوٹنے والا تھا۔ یہ دن ہر لڑکی کے لیے کتنا قیمتی ہوتا ہے کہ جب وہ ماں باپ کی دلہن پھلانگ کر اپنے نئے ساتھی کے دروازے تک آتی ہے، مٹی میں ہزاروں خوابوں کی ڈور تھامے آنکھوں میں نئی حسرتیں جگمگائے لیکن آج تو ارتج کا دل پھنسا جا رہا تھا۔ آنسو تھے کہ ختم نہ رہے تھے۔ غم کے رنگ رک رہا تھا۔

اس کے ہاتھوں کی مہندی کیا خوب کھلی تھی۔ خوب صورت سے سرخ پھول ہاتھوں پر بھللا رہے تھے۔ جب بیونیش نے اپنی مہارت اس کے نازک سے روپ بردھائی تو وہ اپراؤں کی شہزادی لگ رہی تھی چاند نگر سے اتاری ہوئی چاندنی کا پرتو محسوس ہو رہی تھی۔ سرخ زرتار لینگے کے اوپر زار جستان کی چوٹی دھانی سا اچھل مہندی اور تازہ پھولوں کی مہک نے اس کا انگ انگ معطر کر دیا تھا۔ چہرے کی اداسی معصوم حسن پہ اور بھی بھلی بھلی لگ رہی تھی۔ ٹیکے اور جھومر نے پیشانی پہ پھول لگا دیئے تھے۔ ماما

اسے ایک نظر دیکھ کے پھر دیکھنے کی ہمت ہی نہ کر سکتا تھا کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ آنکھوں میں موتی ٹھہر گئے تھے۔ آصف بیگم نے بیٹی کا ماتھا جو مادرِ پیار سے گواہ ہو گئیں۔

”ایک وہ دن تھا کہ جب میری آنکھوں نے تیرا منہ سہا و وجود اپنی بانہوں میں پہلی بار دیکھا تھا۔ آج کا دن ہے کہ جب میں تمہیں دلہن بنے دیکھ رہی ہوں۔ یقین کرو ارتج آج بھی تم مجھے اتنی ہی پیاری لگ رہی ہو جتنی پہلے دن لگی تھیں۔“ ماں اور بیٹی دونوں گلے لگ گئیں۔ چپ چاپ اپنے درو کو چھپائے بیٹھی ماما کی آنکھیں چمک پڑیں۔

”اے لڑکی! رو نا نہیں۔ ابھی ہمیں سیدھا میرج ہال جانا ہے۔“ ماما نے پیار سے کہا تو وہ چپ ہو گئی۔ ماما اسے ساتھ لیے اس کے عروسی لینگے کو پکڑنے اسے اس میں لپٹنے سے بچاتی ہوئی میرج ہال میں لاری تھیں۔ اب ہال میں بیٹھے تمام کے تمام لوگ اپنے سب کام چھوڑ کر اس شام کی سب سے ضروری ہستی یعنی دلہن کو دیکھنے لگے تھے۔ دولہا کو پہلے ہی اتر پر بٹھایا جا چکا تھا۔ سفید شیر وانی سوٹ اور سرخ پنکا باندھے وہ بھی وجاہت و خوب صورتی میں کمال لگ رہا تھا۔

ارتج کو اس انجان بندے کے پہلو میں بٹھا دیا گیا۔ بیٹھے ہی ایک خوشگوار مانوس سی مہک نے ارتج کے اس کم کر دیئے۔

”یہ خوشبو تو وصی احمد کے ملبوس سے پھونٹی تھی۔“ پہلے قدم پر ہی وصی احمد کی یاد اس کے دماغ پر چھا گئی۔ اف وصی! تم نے کس طرح اس کے وجود کو اس سے چھینا تھا۔ اس نے بمشکل خود پر قابو رکھا اور دو پہر کی طرف نظر نہیں اٹھائی۔ فوٹو سیشن اور مووی اپنے عروج پر تھی، کیمرا فلیش اور مووی کی روشنیاں آج کے شہزادہ شہزادی کو گھیرے ہوئے تھے۔ نکاح

کسی کے نام

تم نے کہا تھا کہ دوستی اور دوست ایک ایسا واحد رشتہ ہے کہ جس کی تم کو چاہ کر تے ہو۔ تمہاری دوستی اور دوست ہونے پر مجھے فخر ہے۔ مگر ایک بات ہم دونوں کے درمیان مذہب، خاندان کی تفریق ہے مگر دوستی مشترک ہے۔ اس لیے چاہتی ہوں کہ تم اب سہرا جاؤ اپنا مستقبل محفوظ کر لو۔ تمہارے لگے ہوئے گانے سن کر تم کو یاد کرتی ہوں خاص کر وہ گانا ”جو میری روح کو چین دے فرار دے“ تمہارا دیا ہوا گلاب اگرچہ مر چکا ہے مگر خوشبو ابھی تک ہے۔ اپنا خیال رکھو کر دہر کسی سے پنکامت لیا کرو اپنی تم کو پیار دے رہی ہیں۔ (رونی کیلانی..... جرنوالہ)

سے مل آئینہ دکھانے کی رسم ہوئی تھی۔

خوب صورت مغلی فریم سے آراستہ آئینہ شازمہ اور کرن ان دونوں کے سامنے لے آئیں۔ سلمان ارتج کے سائیڈ پر رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ دو پہر نے اپنی عروسہ کی شبیہ شیشے میں دیکھی تو حسن و معصومیت کا امتزاج دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

”نہیں بھی! یہ تو سراسر چیٹنگ ہوئی۔ ہم نے تو اپنی دلہن دیکھی۔ ہماری دلہن نے تو ایک آنکھ اٹھا کر بھی ہمیں نہیں دیکھا۔ کیا ہم اتنے بے ہیں۔“ اک مانوس سی آواز پر ارتج نے بے اختیار شیشے پر نظر ڈالی اور جیسے آنکھ وہیں پر ٹھہر گئی۔ یہ تو وصی احمد تھا۔ وصی احمد مرزا! ارتج کا وصی۔ وہی تو چہرہ تھا۔ وہی تو مسکراہٹ تھی۔ وہی تو سہرا تھا۔ اس نے آئینے پر بھی یقین نہ کیا۔ ساتھ بیٹھے شخص کے چہرے کو نزدیک سے دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ کہیں اسے پہلے کی طرح دھوکا تو نہ ہوا تھا۔ کہیں پھر خیل تو وصی کا چہرہ نہ دکھارہا تھا لیکن یہ خیل نہ تھا۔ یہ تو اس کی محبت کی تکمیل تھی وفاؤں کی معراج تھی۔ وہ جتنی بھی آنکھوں سے اس کے چہرے کی سمت دیکھے جارہی تھی، کچھ یقین کرنے کی تک و دو میں تھی۔ کسی ثبوت کی تلاش میں تھی اور وصی احمد اس کے ان تاثرات سے محفوظ ہو رہا تھا۔



”ارتج! کہیں یہ بھی تمہیں وحی احمد جیسا تو نہیں لگ رہا۔ اگر لگ رہا ہے تو پریشان مت ہو یہ۔۔۔۔۔ یہ وحی احمد ہی ہے۔ تمہارا جہون سا بھی۔ تمہارا مجازی خدا۔ کل اگر تصویر دیکھ لیتیں تو اتنی حیرانی نہ ہوتی۔“ سلمان نے سرگوشی سے کہا۔ ارتج نے کچھ کہنا چاہا لیکن لب پہ بار بار کے فقرہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہ پاری تھی۔

”مجھے مرزا وحی احمد کہتے ہیں۔ کیا ہم پہلے بھی کہیں ملے ہیں۔“ وحی احمد نے قدرے قریب ہو کر اس سے کہا۔ دوا لہز اشک اس کی شربی آنکھوں سے ٹوٹے اور تھکے تارے کے ساتھ ایک گئے۔ کیا وہ عالم خواب میں تھی یا خوابوں نے حقیقتوں کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ کیا زندگی خوب صورت ہو گئی تھی یا وہ پھر سراب میں بھٹک رہی تھی۔ یہ کیا تھا جو اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد نکاح کے لیے قاضی آج تک آیا۔

”ارتج کمال بنت کمال عثمانی! کیا آپ نے وحی احمد مرزا ولد شبیر احمد مرزا کو شوہر کی حیثیت سے قبول کیا؟“

”کیا آپ نے وحی احمد مرزا کو بحیثیت شریک حیات منظور کیا؟“ قاضی کا یہ فقرہ اسے عالم حقیقت میں ہونے کا یقین دلا گیا اور صرف ایک ہاں کے بعد وہ وحی احمد کی ہو گئی۔ اس طرح اچانک اس طرح بے خبری میں کس طرح کیسے؟

ہزاروں سوال اس کے دل میں امنڈنے لگے اور جواب پانا ممکن نہ تھا۔ شازمہ! کرن! صائم! کامران! شہروز! ناصر اور سلمان گیتوں اور خوشیوں میں مصروف تھے۔ رسمیں ہوئیں، رخصتی ہو گئی۔ اسے وحی احمد مرزا کے گھر لایا گیا۔ محلہ عروہی میں بٹھایا گیا لیکن وہ حیرت کی بھول بھلیوں میں کھوئی تھی۔

محلہ عروہی کی مہکتی بچ پر وہ بستر کے عین درمیان بٹھائی گئی تھی۔ ہر طرف تازہ پھولوں کی خوشبو پھیلی

تھی۔ خوب صورت مہم روشنی نے پورے ماحول پر ڈیرہ بجا رکھا تھا۔ سچی وحی احمد مرزا کمرے کا دروازہ پار کرتا۔ ہو لے ہو لے قدم بڑھاتا اس تک آیا۔ ”ہم نے تو سوچا تھا کہ ہماری دہن ہمیں مسکراتی ملے گی لیکن آپ تو اتنی حیرت سے دیکھ رہی ہیں جیسے ہم مرتع سے آئے ہوں۔“ وحی احمد نے نہایت پیار سے کہا۔

”یہ سب کیا ہے؟ وہ کیا تھا جو پہلے ہوا اور یہ کیا ہے جواب ہو رہا ہے؟ پلیز بتائیں مجھے۔“ اتنی دیر سے سوچوں کی بھول بھلیوں میں بھٹنے والی آنکھیں اب پھلک پڑی تھیں۔ اس کے پھول سے رخسار شفاف بوندوں سے سج گئے تھے۔

”ارتج! رو! نہیں میں سب بتاتا ہوں۔ یہ لو پانی پی لو۔“ وحی احمد نے پانی کا گلاس اسے دیا اور اس نے بنا سوچے لے لیا۔

”اب اطمینان سے میری بات سنو۔ میں کوئی وحی احمد کی روح! آسیب وغیرہ نہیں ہوں زندہ و سالم وحی احمد مرزا ہوں۔ بات شروع ہوتی ہے اس دن سمندر کے کنارے سے جب میں تمہیں یہ انگوشی پہنانے لایا تھا۔“ وحی احمد نے اس کا خرطہ ہاتھ تھاما اور تیسری انگلی میں روز اول کی طرح جگمگاتی انگوشی کی جانب اشارہ کیا۔

”تم نے سچائی بتائی تو اسی دن تمہیں پانے کی چاہ دل میں جاگی اور اسی دن میں نے یہ پلاننگ کی اور اس پلاننگ میں سب سے پہلے شامل کیا اپنے گروپ کو صائم، شہروز، کامران اور ناصر کو۔ ان کی مدد سے میں پہنچا تمہاری سہیلیوں کرن اور شازمہ تک۔ تمہیں یاد ہو گا شازمہ نے ہی تمہیں میری موت کی خبر سنائی تھی۔“ وحی احمد کی اس بات پر ارتج کو شازمہ کی وہ فون کال یاد آ گئی۔

”اور پھر اس کے بعد میں نے تمہارے کزن سلمان کو اپنے اعتماد میں لیا اور وہ بچا رہ میری جچی

محبت کا پہلے سے ہی قائل ہو چکا تھا۔ اس نے ہر طرح سے میری مدد کی۔ اس دن جب میرے گروپ کے دوستوں نے میرے نام کی شام منائی۔ تو ارتج پر لگی اپنی ہی قدم آدم تصویر کے پیچھے ہی میں کھڑا تھا اور تمہاری محبت جو کہ میرے لیے بھی کو تمہاری آنکھوں سے چمکتا تھا دیکھ رہا تھا اور کلاس روم میں چیخ چیخ کر آئی لو یو وحی احمد کہنا میں نے کلاس کے دروازے کے باہر سے ہی لیا تھا۔ اپنے دوستوں کے ذریعے میں نے وہ انگوشی بھی تمہاری انگلیوں تک پہنچادی۔ اس دن جب تم سلمان کے گھر آئیں چہل قدمی کرتے ہوئے تو اس کے ساتھ میں ہی باتوں میں مصروف تھا، ہم اپنے اگلے اسٹیپ کی پلاننگ کر رہے تھے۔ تم نے مجھے دیکھا لیکن سلمان نے مجھے عام بنا کے تمہارا مذاق اڑایا۔ کالج کے تمام پیپرز میں نے تم سے چھپ کر دیئے۔ لیکن تمہارے ساتھ ہی دیئے اور کلیئر کیے اور جب تم بیمار پڑیں۔ تو تمہاری محبت نے دل میں بہت شور و غل مچایا۔ تو میں ڈاکٹر ریمز بن کر وائٹھی مونچھ لگا کے تمہیں دیکھنے آیا۔ یاد ہے کس طرح غصہ ہوئی تھی مجھ پر۔“ وحی احمد کی اس بات پر ارتج حیرانی سے ہی لیکن مسکرا دی۔

اس دوران سلمان نے میرے رشتے کی بات آنٹی کے دل میں ڈال دی اور تمہارا حال دکھا کر انہیں قائل بھی کر دیا۔ چوری سے انہیں ہمارے گھر لے آیا ماما پاپا سے ملاقات کروائی مجھے ملوایا۔ آنٹی نے گرین جینز دکھایا تو پھر تمہارے بابا کو بلایا گیا۔ سلمان نے مجھے اپنا دوست ظاہر کیا تھا۔ انکل مجھ سے اور ڈیڈ سے ملے تو انہیں بھی ہم پسند آ گئے اور پھر اس دن ماما نے تمہیں دیکھا تو جلدی سے تمہیں اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کیا۔ تم انہیں اتنی پسند آئیں کہ ایک ہی ماہ کے اندر اندر تمہیں اپنی بہو بنا کے لے آئیں۔“

یہ سارے انکشافات ارتج کے لیے عجیب تھے کہ پچھلے سات ماہ سے اسے اس طرح سب نے دھوکے میں رکھا اس کے ساتھ یہ سب ہوتا رہا لیکن وہ جان ہی نہ پائی۔

”میں نے کل اپنی تصویر بھیجی تھی سلمان کے ہاتھ لیکن تمہیں ہی شوق نہ تھا دیکھنے کا۔“ وحی احمد نے اسے چھیڑا تو اس نے ایک مکاس کی چھانی پر لگایا۔

”آپ نے بہت تنگ کیا مجھے وحی! بہت ترپایا مجھے۔ جانتے ہیں کتنا منتشر ہوئی آپ کی ارتج ان سات ماہ میں۔ پچھتاوے کے کتنے اژدھے مجھے ڈستے رہے۔“ وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ آنسوؤں کی لڑیاں رواں ہو چکی تھیں۔

”اب لگ گیا پتا کہ اداکاری کرنا صرف تمہیں ہی نہیں آتی۔ تم سے جیتنے والے بھی ہیں کوئی۔“ وہ کالر جھاڑنے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔

”ہاں وحی میں ہار گئی اور آپ جیت گئے۔“ اس نے اقرار شکست کر لیا اس کی چوڑی چھاتی میں خود کو سمو کے۔

”نہیں محبت جیت گئی وفائیں منزل پا گئیں۔ تمہیں میں اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں لے آیا۔ میرے ہاتھوں کی لکیروں میں سامنے والے کیسے چھینیں گے تجھے مجھ سے زمانے والے

”پھر چھین پائے زمانے والے؟“ وحی نے والہانہ آنکھوں سے اسے دیکھا اور اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ابھی تو کتنی باتیں کرنی تھیں۔ وفا کے کتنے اقرار کرنے تھے۔ ہجرت کے کتنے قصے سنانے تھے۔ اسی پیار بھرے موسم کا پورا چاند چڑھا اور رات کی شمع قطرہ قطرہ پکھلے گی۔





# تیری آفت میں

قسط نمبر 12 اقراء خیر احمد

خدا کی اتنی بڑی کائنات میں میں نے  
بس ایک شخص کو مانگا مجھے وہی نہ ملا  
بہت عجیب ہے یہ قربتوں کی دوری بھی  
وہ ساتھ رہا اور مجھے کبھی نہ ملا

”میں چائے نہیں پیوں گی۔“ چائے کے معمولی برتن چائے لانے والے بچوں کا حلیہ اس کی نفاست پسندی و نازک مزاجی بھی ہضم نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے قطعی انکار کر دیا تھا اور شاہ ویز نے بھی اصرار کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہیں قریب بڑی ٹوٹی پھوٹی کرسی میز پر بیٹھا اطمینان سے چائے کے ساتھ کیک پیس کھا رہا تھا۔ قریب ہی وہ دونوں بچے کچھ شرماکر مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ یقیناً ان سے وہ انٹرویو لے رہا تھا اور اس سے اس کی مسکراہٹ ہونٹوں پر گویا چپک کر رہ گئی تھی اور چہرے پر بھی بڑی نرم و روشن مسکراہٹ تھی۔ بہت دوستانہ تھا اس کا انداز مشعل کار کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی دیکھتے ہوئے سوچ کر ہی تھی۔ ”کتنی سوٹ کرتی ہے اس پر یہ نرم مزاجی و خوش دلی کیسا روشن روشن ہو جاتا ہے سراپا کوئی اس شخص کا وہ روپ دیکھتے تو یقین نہ کرے کہ اتنا مہذب و خوش مزاج شخص اس قدر بددماغ، منہ زور اور ہاتھ پھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی سانسے وہ اس کی سوچوں سے بے خبر ملن بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا اسے اندر بیٹھے انتظار کرتے ہوئے جبکہ شاہ ویز بہت بے فکری سے اندر ہوٹل میں چلا گیا تھا اور وہاں لوگوں سے باتیں کرتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آدھا گھنٹہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ نہ آیا تو اس کا صبر جواب دے گیا اور اس نے دو مرتبہ بارن بجانے کے بعد تیسری مرتبہ ہاتھ نہ ہٹایا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے کیا تمہارا ہاتھ بٹاؤ۔“ وہ آتے ہی غرایا تھا۔  
”مجھے یہاں بٹھا کر وہاں آرام سے بیٹھے باتیں بنارہے ہو ابھی نہ معلوم کتنا سفر باقی ہے اور تمہیں کوئی فکری نہیں ہے۔ ہر جگہ تمہیں اپنی کیٹلری کے لوگ مل جاتے ہیں۔“ کار کے ساتھ ساتھ اس کی بڑبڑاہٹ



بھی شروع ہو گئی تھی۔

”انسان ہوں انسانوں سے ہی روابط بڑھانے میں سکون محسوس کرتا ہوں“ کینگری کی کبھی میرا کپکپکاتے نہیں رہی۔ جو چاہتوں کے اسیر ہوتے ہیں وہ مادیت پسند نہیں ہوتے۔ کیا ملتا ہے انسان کو زر زینت جانیدار حاصل کر کے۔ سب یہیں رہ جاتا ہے۔ کچھ بھی تو ساتھ نہیں جاتا، پھر کیوں یہ کینگریاں بنائی جاتی ہیں، میری سمجھ نہیں آتا۔“

”اس شخص سے کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ فوراً تقریر شروع کر دیتا ہے۔“ اس نے جل کر سوچا تھا اور خاموشی میں ہی عافیت جانی تھی۔

○○○○

خرم کا بیٹا عرفان آج کل آیا ہوا تھا۔ اُس دن خرم گھر میں تھے وہ سارے دن بیٹے کا انتظار کرتے رہے کہ وہ اُن سے ملنے آئے گا اُن کی شادی کو چھ ماہ ہو چکے تھے اور وہ اس سے بھی کئی ماہ قبل ملے تھے اور اُن کی شادی کے بعد تو انہوں نے احتجاجاً اس سے فون پر بات کرنی بھی چھوڑ دی تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُن کے باپ نے دوسری شادی کر کے نہ صرف اُن کی معاشرے میں بے عزتی کی ہے بلکہ اُن کی مری ہوئی ماں سے بھی بے وفائی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ تیسری اور اہم بات جو انہیں مستحیل کر گئی تھی وہ یہ تھی کہ اُن بہن اور بھائی کی جائیداد میں تیسری ہستی شامل ہو گئی تھی جو زیادہ گراں ثابت ہوئی تھی۔

ابھی بھی اُن کی یہی شرط تھی کہ وہ حرا کو طلاق دے دیں تو وہ اپنی ناراضگی بھلا کر اُن سے ملنے لگیں گے ورنہ وہ ان سے نہیں ملیں گے۔ خرم صاحب کو پہلے ہی بچوں کی خود غرضی و بے حسی سے شکایت تھی اور اب تو وہ ان کا بدلہ لانا دیکھ کر دل میں خوب اچھی طرح دیکھ چکے تھے لہذا انہوں نے بھی اُن کی فکر کرنا چھوڑ دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عرفان کی آمد کی خبر سن کر دل میں باپ ہونے کے ناتے ایک موہوم سی امید کی کرن جا گئی تھی کہ شاید اتنے عرصے کی جدائی اُن کی اندر کوئی محبت کی تڑپ جگا دے مگر سارا دن اپنے کمرے میں انتظار کرنے کے بعد انہوں نے بھی کوشش نہ کی باہر نکل کر اس سے ملنے کی۔

وہ از حد خود دار ضدی و باوقار اور با اصول انسان تھے۔ بے تحاشہ دولت نے انہیں لاپرواہ اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والا بنا ڈالا تھا۔

بزئس کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے انہیں نیپال جانا تھا اور جانے سے قبل انہوں نے بہت چاہا کہ وہ بھی ساتھ چلی جائیں مگر وہ امی حضور کو چھوڑ کر جانے کے لیے راضی نہ تھیں۔ سو وہ بے دلی سے انہیں یہیں چھوڑ گئے تھے اور جاتے جاتے سمجھا گئے تھے کہ وہ عرفان سے بالکل گفتگو نہ کریں جب اسے توفیق نہ ہوئی کہ سوئٹلی ہی سہی ماں سمجھ کر سلام کرنے آ جاتا حالانکہ اسی گھر میں رہ رہا تھا۔ امی حضور کی بیماری کے دنوں میں اُن کی تیمارداری کرنے سے وہ اور اس کی بیوی صاف انکار کر چکے تھے۔ اب امی حضور سے خوب خاطریں کروا رہا تھا۔

وہ جواب میں خاموش رہی تھی۔ خرم چلے گئے وہ تنہا ہو گئی اور موقع دیکھ کر امی حضور کے کمرے میں آ گئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ شکایتی لہجے میں گویا ہوئیں۔

”خوب رہی بہو یہ بھی کوئی مہمان بن کر تمہارے گھر آئے اور تم ایسی مصروف کہ مہمان داری تو ایک طرف رواداری نہ جانتا بھی گوارا نہ کرو۔“

”مجھے احساس ہے امی حضور! لیکن خرم کی اجازت نہیں ہے۔ وہ بہت فحاشیاں عرفان سے کہاتے عرصے بعد آنے کے باوجود کبھی وہ اُن سے ملنے نہیں آئے۔ کتنا انتظار کیا تھا۔“ اُن کے قریب بیٹھے ہوئے وہ بجاوت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”کوئی انہونی بات تو نہیں ہوئی۔ اگر عرفان ملنے نہیں گیا تھا تو خرم خود آ جاتے بیٹے سے ملنے۔ آخر بیٹا دوسرے شہر سے طویل عرصے بعد آیا ہے۔“

”امی حضور! یہی بات آپ عرفان کو سمجھا تیں تو زیادہ مناسب ہوتا۔“

”آخر آگئی نہ وہی سوئٹلی اور سگے والی بات، سوئٹلی ماں ہونا، کس طرح سوئٹلی بیٹے کی طرف داری کر سکتی ہو۔ خاندان کو سمجھایا نہ گیا کہ ذرا ناک چینی کر کے بیٹے کو منائے، کیا باپ آ کر بیٹے کا ہاتھ پکڑتا تو بیٹا باپ سے ملتا نہیں؟ وہی بات ہوئی کہ باپ کو پروا کہاں ہے انہیں بیوی مل گئی اب کسی اور کی انہیں کیا ضرورت ہے۔“ آج تو ان کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے جن لبوں سے پھول جھڑا کرتے تھے اُن سے انکارے نکل رہے تھے۔ وہ دم بخود سی بیٹھی تھی۔

”اگر تم چاہیں تو وہ عرفان سے مل سکتا تھا، مرد تو ایسے ہی لاپرواہ بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہ عورت کا کام ہوتا ہے کہ اپنے مرد کو رشتوں کی سمجھ بوجھ دے، مرد عورت سے رشتوں، مانوں کے بارے میں جانتا ہے۔“

آج تو ان کی جون ہی بدلی ہوئی تھی۔

وہ ہونفوں کی طرح امی کی شکل دیکھ رہی تھی انسان تو وقت سے بھی زیادہ تیزی سے بدلتا ہے۔ ان کی منطق لڑائی و فلسفہ بعید از عقل تھا۔

عورت ہو یا مرد اس کی جیسا درس گاہ ماں کی آغوش ہوتی ہے وہیں سے وہ اچھے برے کی تمیز، اخلاق و آداب کو سمجھتا ہے۔ اپنے برائے کا فرق جانتا ہے، دور اور قریب کے رشتوں سے واقفیت و انسیت حاصل کرتا ہے۔ اُس کی شخصیت کی بنیاد ماں کی پرورش رکھتی ہے۔ وہاں سے ہی ماں کے، ایک عورت کے، ایک مستقبل کے مثبت و منفی رویوں کا آغاز ہوتا ہے جو آگے چل کر اُس کی شناخت بنتا ہے۔

عورت کا کام مرد کو رشتوں سے باور کرانا نہیں ہوتا بلکہ ہر ماں کی یہ ذمہ داری ہے اُسے ہی ایک نسل کو پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ وہ جس نیچر کی ہوگی، وہی تربیت بچوں کو دے گی، پھر وہ جس کو خرم کی زندگی میں داخل ہوئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا، ابھی وہ اُن کی مزاج کی باریکیوں سے ناواقف تھی۔ صرف ان کی ماننے کی مجاز تھی، کس طرح اُن کی ذہنی رو بدل سکتی تھی۔ وہ کسی کو خاطر میں لانے والے بھی نہ تھے اور اُس سے زیادہ باپ و اولاد کا رشتہ سمجھنے والے تھے۔ از حد کافر و بدبہ تھا اُن کی شخصیت میں۔ وہ خود بہت سنبھل کر گفتگو کرتی تھی، مبادا اُن کا موڈ خراب نہ ہو جائے۔ اُن کو سمجھانے یا بتانے کی پوزیشن میں ابھی کیا، کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ امی حضور کے تلخ رویے سے خائف ہو گئی تھی اُن کی ہر بات و بے جا اعتراض کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت رکھتی تھی مگر اُن کی عزت دل سے کرتی تھی اسی لیے خاموش بیٹھی تھی۔

”آپ بلول نہ ہوں امی حضور! کوتاہی ہو گئی مجھ سے، معاف کر دیجئے۔“ اس نے انہیں راضی کرنے کے لیے سچ بچا ہاتھ جوڑ دیئے تو ان کا موڈ بہتر ہوا۔

”میں نے جو کچھ کہا تمہیں بُرا ضرور لگا ہوگا۔“

”نہیں نہیں امی حضور! آپ میری بڑی ہیں، میری بزرگ ہیں، بھلا میں آپ کی بات کا بُرا کیسے مانوں



گی۔ اس کے شفاف لہجے میں سچ چمک رہا تھا۔

”میں تمہارا نہیں چاہتی اور چاہتی ہوں کہ اس گھر میں اچھی طرح اپنے قدم جماؤ تو بہتر ہے کیوں کہ تمہاری حیثیت سوتیلی ماں ہونے کی وجہ سے بڑی نازک ہے۔ اگر تم خرم کی پہلی بیوی بن کر آئیں تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ تمہارا ہم عمر ہوتا اور بچے بھی سکے ہوتے تو تمہیں اس گھر سے کوئی بیدخل کرنے کی جرات نہ کرتا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ خرم نے اس عمر میں شادی کی ہے۔ کب اس کا مزاج بدل جائے بھروسہ نہیں ہے پھر اولاد کا دباؤ اس پر مسلسل ہے کہ وہ تمہیں طلاق دے گا تو وہ باپ سے ملیں گے ورنہ نہیں۔ اب وہ تمہارے اور اولاد کے درمیان میں رسہ کشی کا شکار ہو گیا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس عمر میں وہ تمہاری خاطر اولاد کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ طلاق کا نام حرا کے ہوش و حواس درہم برہم کر گیا۔

”جو سچ ہے۔ تم نے دیکھا نہیں ایک گھر میں رہتے ہوئے خرم نے عرفان سے ملنے آیا اور نہ ہی عرفان باپ کے پاس گیا۔ کچھ تو چل رہا ہے نا ان کے درمیان۔ ابھی خرم تم کو اہمیت دے رہا ہے مگر اس عمر کی محبت ڈھلتی دھوپ کی مانند ہوتی ہے، کل اس کے کہ سب کچھ ختم ہو جائے تمہیں سمجھ داری ہے کام لینا ہوگا۔“ وہ گائیکوں سے ٹیک لگائے دھیمے دھیمے لہجے میں اُسے سمجھا رہی تھیں۔ حرا نے ایسی دل دہلانے والی باتیں سن کر رونا شروع کر دیا تھا۔

”ان بچوں سے راہ و رسم بڑھاؤ انہیں اپنا سمجھو ایسی آؤ بھگت کرو کہ وہ تمہارے عادی ہو جائیں۔ ایک طریقہ تھے تحائف کے ذریعے محبت پیدا کرنا ہے دوسرا خدمت، منساری، خیال رکھنا آگے بڑھ کر ملنا سب کو ہی گرویدہ بنا ڈالتا ہے۔ تم بھی یہی کر اپنالو۔ ایک دفعہ بچوں کے دل میں جگہ بن گئی تو پھر کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔“

”خرم ناراض ہوں گے۔“ وہ خود کو بھنور میں پھنسا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ امی حضور کی باتیں غلط نہیں تھیں۔ خرم اور عرفان کی اجنبیت و بیگانگی نے اسے بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اُن دونوں کے درمیان کوئی دیوار ہے اور اب معلوم ہوا وہ دیوار خود اس کی ذات ہے۔ اسے اپنا وجود اس طرح لگنے لگا جیسے منوٹ جگہ کا پارک کر دی جائے۔ نو انٹری میں انٹری دے دی جائے یا جیسے کسی فٹ پاتھ پر نا جائز جگہ تعمیر کر دی گئی ہو اور اب جس کے گرائے جانے کا خطرہ ہر دم بڑھتا جا رہا ہو۔

وہ سمجھ نہیں رہی تھی خرم کی بات کا احترام کرے جو عرفان سے ملنے سے منع کر گئے تھے یا امی حضور کی ہدایتوں پر عمل پیرا ہو جن کی باتیں بھی غلط ہرگز نہ تھیں۔

”خرم کی ناراضگی کا خیال کر دیا اپنے گھر کا فیصلہ نہیں ہی کرنا ہے۔“ وہ کہہ کر اطمینان سے لیٹ گئیں۔ حرا نے پریشان نظروں سے اُن کی طرف دیکھا تھا۔

○○○○

”خالہ جان! السلام علیکم۔ اتنے عرصے بعد آئی ہیں۔“ راضیہ بے جی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر خوشی سے دوڑ کر اُن سے لپٹ کر گویا ہوئی۔

”کھینچوں نے ہی کچھ اس طریقے سے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ وقت ہی نہیں ملتا۔ ایک دوسرے کے پیچھے دن گزرتے چلے جاتے ہیں اور میں یہی سوچتی ہوں کہ کل چلی جاؤں گی لیکن آج تو میں

نے بکا ارادہ کر لیا کہ ہر حال میں یہاں آؤں گی اور دیکھ لو تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ دراصل ہم سوچتے ہیں وقت ہمارے اختیار میں نہیں رہا اور یہ صرف غلط فہمی ہے۔ ارادے کی مضبوطی فیصلے کی طاقت ہم کو بھی بھی بھگت سے دو چار نہیں کر سکتی۔“ وہ اس کے ساتھ ہی پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

”ارے یہ سورج آج کسی سمت سے نکل آیا؟ ہم پر مہربانی کا خیال کیونکر ہوا؟ ہم غریب تمہیں کس طرح یاد آگئے تم تو ایسی بدل گئیں آ یا کہ ہم تو تمہیں یاد ہی نہیں گویا ہمیں صبر کر کے بیٹھ گئی ہو۔“ زینہ باہر روم سے عکس سے فارغ ہو کر نکلی تھیں اور بہن سے شکوے شروع کر دیئے تھے۔

”اللہ کی پناہ زینہ! تمہاری زبان کی رفتار نے تو درزی کی کپڑی کو بھی مات کر دیا ہے۔ بلا سوچے سمجھے جو منہ میں آتا ہے کہی چلی جاتی ہو۔ سوچتی سمجھتی کچھ نہیں ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں درازی عمر دے ایمان کے ساتھ۔“ بے جی نے غلطی سے انہیں ڈانٹا تھا۔

”آپا! جب دل جلتا ہے تو سمجھو عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے اور خیال اپنوں کا ہی آتا ہے۔ شکوہ غیروں سے نہیں کیا جاتا، سگوں سے ہی شکایت کی جاتی ہے۔“ تو لکے سے بال خشک کرتی ہوئی وہ ناراض لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”شکوہ شکایت کرو، بُرا بھلا کہو مجھے اعتراض نہیں ہے مگر اپنے لیے تو ایسے الفاظ استعمال نہ کرو جو مجھے تکلیف پہنچائیں۔“

”ارے آپا! تمہیں کون بد بخت بُرا بھلا کہہ سکتا ہے بلکہ بُرا کہے بھی تو تم بہت ہی زیادہ باہمت اور صبر والی ہو نہ معلوم اللہ نے مجھے تمہاری جیسی کیوں نہیں بنایا۔ تم بے اولاد تھیں سب سے زیادہ دکھ مجھے ہی تھا کہ میری بہن کی گود سونی ہے اس کی کوئی اولاد نہیں، کوئی ماں کہنے والا نہیں، تم صابر تھیں، کبھی کوئی شکوہ تمہارے لبوں پر نہیں آیا اور دیکھو اللہ نے تمہارے بند لیوں کی کیسی سنی جیتا جا گتا ہونہار، فرمانبردار بیٹا تمہاری جھولی میں ڈال دیا۔ بے شک تم نے اسے اپنی کوکھ سے جنم نہیں دیا لیکن تمہارا اور شاہ ویز کا رشتہ کس قدر مضبوط ہے۔ کتنا احترام کرتا ہے تمہارا، کس قدر محبت کرتا ہے، کتنا خیال رکھتا ہے اور ایک ماں کو ایسی محبتوں کے علاوہ کیا چاہئے، ایسے جاں نثار رویوں کی توقعات تو ہوتی ہیں۔ اب میں اتنی ہی خوش ہوں تمہارے بے اولاد ہونے پر دوسروں کا خون تمہیں اپنے بچے سے بڑھ کر محبت دے رہا ہے بہت خوشی کی بات ہے ورنہ اولاد والی آج کل کے دور میں اولاد کی بے اعتنائی و بے رخی کی دردناک مار سمبہ رہی ہیں۔ مجھے ہی دیکھ لو بیٹیاں ہیں اُن کی طرف سے بھی کوئی نہ کوئی فکر پریشانی گھیرے رکھتی ہے۔ کبھی بڑی کے ساتھ کوئی مسئلہ چھوٹی کے ساتھ کوئی اُجھڑ، مچھلی کے لیے کوئی تردّد اُن جھیلوں سے فارغ بھی نہیں ہوتی ہوں کہ اکلوتے بیٹے کی طرف سے جلن لگی رہتی ہے۔ وہ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی نہ رہنے کے برابر ہے۔“

وہ بال سلجھا کر چوٹی باندھ کر اُن کے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں جبکہ راضیہ باورچی خانے میں چلی گئی تھی دو پہر کے کھانے کا انتظام کرنے۔

”تم دل چھوٹا نہیں کیا کرو زینہ! سب صحیح ہو جائے گا۔“

”میرا تو بہت ہی دل دکھی ہے آپا! بہو کی حرکتوں کی تمہیں سب خبر ہے اور اصغر کے کروت بھی میں نے تم سے چھپا کر نہیں رکھے کہ کس طرح بیوی اور سسرال والوں کو ماں کے مقابلے میں اہمیت دیتا ہے انہیں اُلٹے سیدھے چکروں میں پڑ کر بیٹا کھو دیا ہے۔ عقل ابھی بھی نہیں آئی، اللہ لاٹھی لے کر تھوڑی مارتا ہے اس



کی مارتو ایسی ہی ہوتی ہے۔ انہوں نے میرا دل دکھایا، اللہ نے میرا بدلہ لیا مگر ابھی اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہیں۔ اصغر چپکے چپکے راضیہ سے کہتا ہے اماں کو راضی کرو کہ وہ جا کر فرح کو لے کر آئیں۔ وہ ضد باندھے بیٹھی ہے کہ جب تک اماں مجھے لینے نہیں آئیں گی میں نہیں جاؤں گی، میں بھی چپکے چپکے رتی رتی یہ سمجھتے ہیں میں انجان ہوں۔ راضیہ تو بے ہی بدھ فوراً اس کی باتوں میں آ کر میرے پیچھے لگی رہتی ہے کہ اماں بھابھی کو لے آؤ، بھائی پریشان ہیں۔ گھر ایسا لگ رہا ہے گھر ویسا لگ رہا ہے اس کی جگہ کوئی تیز و طرار لڑکی ہوتی تو فوراً ہی بھائی کا گریبان پکڑ کر پوچھتی کہ بھابھی کیا اماں کی اجازت سے گئی ہیں یا اماں نے اس کو گھر سے نکالا ہے جو اماں کے ساتھ واپس آئیں گی۔

”.....خوب! اب تم نہیں سے بھائی کا گریبان پکڑو گی؟ کچھ عقل کو ہاتھ لگاؤ۔“ بے جی نے سخت لہجے میں سرزنش کی۔

”آئے آبا! زبان ہے پھسل جاتی ہے۔“ انہیں خود اپنے جملے کا احساس ہوا تو جھجھک گئیں۔ ”میرا منصوبہ ہے کہ اگر وہ مجھے کئے کہ اماں چلو فرح کو لے کر آئیں تو میں کیا اسے انکار کر دوں گی؟ کیا مجھے احساس نہیں ہے بیٹے کی زندگی کی بے رونق کیا؟“

”تم ماں ہو جتنا اچھا و بہتر تم اپنے بچوں کے لیے سوچ سکتی ہو ایسا کوئی بھی نہیں سوچ سکتا۔ ماں کے قدموں تلے جنت ایسے ہی تو نہیں رکھی گئی۔ بات ساری ہمارے گھر یلو بنائے گئے ماحول کی ہوتی ہے ذہنی قربت اور اعتماد کی ہوتی ہے۔ بچوں سے ہمیں دوستی بھی رکھنی چاہئے، انہیں کہنے اور سننے کا موقع بھی دینا چاہئے تاکہ وہ اپنی چھوٹی بڑی ہر بات بلا جھجک ماں باپ سے کر سکیں اپنی خوشی اور پریشانی بتا سکیں۔ ماں صرف ماں نہیں ہوتی، بہت سارے رشتے اس کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ وقت پڑنے پر اسے یہ سارے رشتے نبھانے پڑتے ہیں اور ہر سکون زندگی کا راز یہی ہے۔ اور تم نے اصغر کو بہت محبت دی ہے حد خیال رکھا لیکن ایک سخت مزاج ماں کی طرح۔ اگر تم کچھ دوستی کا رنگ بھی بھرتیں تو اسے تم سے چھپ کر تمہارے ہی لیے راضیہ سے سفارش نہیں کرنی پڑتی اور نہ ہی فرح کی ہمت ہوتی، اس کے کان بھرنے کی۔ فی الحال جو کچھ ہوا اس سے سبق حاصل کرؤ اپنے اندر تبدیلی لاؤ، عاجزی و انکساری اچھے لہجے کی مٹھاس اور زبان کی شیرینی دشمنوں کو بھی دوست بنا ڈالتی ہے پھر یہ تو تمہاری اولاد ہے ان کا سلوک و رویہ بہت جلد بدلے گا۔“

”سوچو گی ابھی میں تم تو آبا ایسی ہی باتیں کرتی ہو ہمیشہ سے۔“

”بس اٹھ جاؤ، اب سوچنے کا وقت گزر گیا، عمل پیرا ہونے کا وقت ہے اور نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ چلو ہم بڑے ہیں اور بزرگی کا تقاضا یہ ہے کہ چھوٹوں کی غلطیوں کو معاف کر کے اپنے بڑے پن کا ثبوت دیا جائے۔ فرح کو لینے چلو میرے ساتھ۔“

انہوں نے گویا دھکا کر کیا تھا، زرینہ اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔

”میں اور اُس ٹھوہری کو لینے جاؤں! کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

”ہاں..... اور میں اب کوئی بکواس نہیں سنوں گی تمہاری۔ نہ معلوم کیسا دماغ لے کر آئی ہو، کتنا سمجھاؤ مگر سمجھ میں نہیں آتا تمہارے۔ بد عقل لوگوں کی طرح اپنی ضد پر اڑی رہتی ہو۔ ایسے لوگوں کو دشمن بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ خود اپنے دشمن ہوتے ہیں۔“ بے جی کبھی کبھار ہی غصہ ہوتی تھیں اور ایسے میں کسی کی

چھ آت نہیں ہوتی کہ ان کی بات سے روگردانی کی جائے، اس وقت بھی زرینہ جو بہت کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھیں خاموش ہو گئیں۔

”خال جان! بالکل صحیح کہہ رہی ہیں آپ، بھائی اور بھابھی کے بغیر اماں کوئی خوش رہتی ہیں، اکثر کسی نہ کسی بات میں اماں بھابھی کا ذکر ضرور کرتی ہیں بھائی سے خواہ زیادہ بات نہیں کرتیں مگر ان کی ہر ضرورت کا کھانے میں ان کی پسند کا اُن کے آرام کا خیال انہیں رہتا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہوا کہ یہ انہیں بہت چاہتی ہیں، بظاہر ناراضگی کی خشکی ہے مگر دل میں محبت کے چشمے اُبل رہے ہیں۔“ راضیہ نے روٹی پکاتے پکاتے بچن کی کھڑکی سے جھانک کر ہنستے ہوئے کہا تو بے جی مسکرا کر بولیں۔

”میں جانتی ہوں یہ دل کی بہت نرم اور اچھی ہے، بس تھوڑا زبان پر اختیار نہیں ہے ورنہ لاکھوں میں ایک ہے میری بہن۔“

”آبا! اب مجھے کھن مت لگاؤ ڈاکٹر نے چکنی چیزوں سے منع کیا ہے بلڈ پریشر کی وجہ سے، چل رہی ہوں فرح کو لینے آپ کے ساتھ۔“ وہ روٹھی روٹھی مسکرائیں۔

”تم نہیں سدھنا زارینہ۔“ بے جی نے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔

”اب آخری وقت میں سدھ کر کروں گی بھی کیا، چل اور راضیہ جلدی سے میرا کوئی ڈھنگ کا سوٹ نکال کر استری کر دے۔ ہم کھانا کھاتے ہی نکلیں گے۔“

”اماں! میری نظروں میں تمہارا کوئی ڈھنگ کا سوٹ نہیں ہے، ایسا کرو بھابھی کے ویسے کا شرارہ سوٹ یا شادی والے دن کا غراہ سوٹ پہن جاؤ۔“ ماں کو اپنی ضد توڑتے دیکھ کر راضیہ خوش ہو گئی تھی، سو شرارت سے گویا ہوئی۔

”مت ماری گئی ہے کیا تیری، تیری بھابھی کو لینے جارہی ہوں۔ کوئی تیرے لیے نیا باپ لانے نہیں جا رہی جو ایسی جج دیج کر جاؤں گی۔ سفید چکن کا سوٹ نکال دے۔“ انہوں نے تپ کر جواب دیا تھا اور راضیہ قہقہے لگنے لگی تھی۔

”زرینہ! انہیں بھی سوچ سمجھ کر بولنا نہیں آئے گا۔“ بے جی نے سر پکڑ کر کہا۔

○○○○

سفر طویل ترین ثابت ہوا تھا اور جب رات کے ڈیڑھ بجے وہ مطلوبہ جگہ پر پہنچے تو ملازم ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کی کار دیکھتے ہی لوہے کا براگیٹ کھولا گیا تھا اور کئی ملازم اور ملازما میں ان کے سواگت کو آگے بڑھی تھیں۔

مشعل کا طویل سفر کی تھکان سے برا حال تھا۔ نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ ایسے میں وہ جبراً بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی، ایسے میں اس کی پہلی اور آخری خواہش نرم گرم بستر کی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اتنا طویل سفر بذریعہ کار کیا تھا اور اس کے بدن کا جوڑ جوڑ شدید تکلیف کا شکار تھا، ایسے میں اس کا موڈ بہتر ہونے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ شاہ ویز بہت اخلاق سے اُن سے مل رہا تھا، وہ منہ بنائے کھڑی تھی۔

”اُن سے بیڈروم معلوم کرو مجھے شدید نیند آرہی ہے۔ کھڑا نہیں ہوا جا رہا مجھ سے۔“

اسے حسب عادت باتوں میں مگن دیکھ کر مشعل کو کہنا پڑا تھا۔



”پہلے آپ کھانا کھالیں، آپ کا بیڈروم میں نے صاف کر دیا ہے۔“ ان میں سے ایک عورت نہایت ادب سے گویا ہوئی تھی۔

اگر اس وقت اس کے ہمراہ شاہ ویز نہ ہوتا تو وہ اس کو خود سے براہ راست مخاطب ہونے پر مزہ چکھادیتی۔ وہ ملازموں کو مزہ لگانے کے قابل ہی نہ سمجھتی تھی اس وقت وہ کسی بد مزگی کے خیال سے برداشت کر گئی اور ملازمہ کو انگور کر کے شاہ ویز سے بولی۔

”میں کھانا نہیں کھاؤں گی، سینڈویچ جو راستے میں کھائے تو وہ ابھی تک ہضم نہیں ہوئے مجھے صرف سونا چاہتی ہوں۔“

”اوکے، ایز یوش“ میں تو ابھی نہاؤں گا، کھانا کھاؤں گا پھر سوؤں گا۔“ اس نے اطمینان سے کہا اور ملازمہ سے کہا کہ وہ اسے بیڈروم میں لے جائے۔

وہ اس بری طرح تھکی ہوئی تھی کہ اس نے کمرے کا جائزہ لینا بھی گوارا نہ کیا۔ کمرے کے وسط میں ڈبل بیڈ پر پنک کمر بے شکن چادر چھٹی تھی اور دونوں سائیڈ ٹیبلز برتر و تازہ گلاب کے پھول کرشل کے چمکتے گلدانوں میں مہک رہے تھے جس سے کمرے میں مسکور کن، بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے ایک جھٹکے سے سینڈل سے پاؤں آزاد کئے تھے پرس بیڈ پر اچھلا تھا اور ایک انگڑائی لے کر بیڈ پر لیٹی تھی اور سر سے منہ تک رضائی اوڑھنے کے بعد چند لمحوں میں ہی دنیا و مافیہا سے غافل ہو گئی تھی۔

ملازمہ اس کے کمرے میں ان کا سامان لے کر آئی تو وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے بغیر کوئی آواز نکالے سامان رکھا تھا، دائیں بائیں پرے سینڈل اٹھا کر بند کے نیچے رکھے اور باہر نکل گئی۔

خوب فیہ بھرنے کے بعد اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی تھی۔ کسی خیال کے تحت اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر شاہ ویز بے خبر سو رہا تھا، وہ فوراً اٹھ گئی اور بیڈ سے نیچے اتر گئی۔

باتھ روم میں اس کے سوٹ کے ساتھ ہر شے ٹھکانے پر موجود تھی۔ ناشتے کی ٹیبل پر اس کی پسند کی تمام اشیاء تھیں جسے دیکھ کر اسے حیرت آمیز مسرت ہوئی تھی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا میری پسندیدہ ڈشز کا؟“ ڈونگے میں سے دلیہ پیالے میں نکالتی ہوئی وہ قریب کھڑی ملازمہ سے مخاطب ہوئی تھی۔

”بیگم صاحب جی، ہمیں صاحب نے سب سمجھا دیا ہے کہ آپ کی پسند اور ناپسند کے بارے میں۔ رات میں آپ نے کچھ کھانا نہیں تھا اس لیے میں نے دوسری چیزوں کے ساتھ دلیہ بھی بنالیا تھا اور انڈے بھی دو تین طرح بنا لیے تھے کہ جو آپ کو پسند آئے وہ کھالیں۔“ وہ نوعمر لڑکی خاصی پُر اعتماد تھی مگر اس سے باتیں کرتے وقت اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور انداز بھی خاصا مودب تھا۔

مشعل کو کم کرتے والے لوگوں کی ایسی ہی تابعداری و فرمانبرداری بھاتی تھی جو اس کے مغرور ذہن کو تقویت پہنچاتی تھی کہ وہ ان سے اعلیٰ و ارفع ہستی ہے۔

”شاہ ویز نے ناشتہ کر لیا ہے؟“ دلیہ میں دودھ شامل کرتے کھاتے ہوئے گویا ہوئی۔

”جی..... وہ تو خاصی صبح بیدار ہو گئے تھے، بابا کے ساتھ چہل قدمی کو بھی گئے تھے وہاں سے آ کر انہوں نے ورزش کرنے کے بعد ناشتہ کیا تھا اور آپ کے ناشتے کا حکم دے کر سونے چلے گئے تھے۔“



”اچھا تم جاؤ مجھے ضرورت پڑے گی تو پکار لوں گی۔ نام کیا ہے تمہارا؟“  
 ”جی فریدہ نام ہے میرا میں کمرے کے باہر کھڑی ہوں۔“ وہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی وہ ناشتہ کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”شاہ وزیر کو اس کا اتنا خیال کس طرح آ گیا کہ اس نے ملازماؤں کو اس کے بارے میں اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے کی ہدایت دی ہے۔ آخر اس کے پیچھے اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ یہ کون سی نئی سازش ہے اس کی؟“ وہ سوچ رہی تھی اور بے حد سوچنے کے باوجود بھی جب وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تو شانے جھٹک کر پوری توجہ ناشتے کی طرف لگا دی۔

وہ جن مہر بانیوں کو شاہ وزیر کی کرم نوازی سمجھ رہی تھی درحقیقت یہ تمام احکامات شاہ وزیر نے نہیں بلکہ حسن بیگ صاحب کے تھے جنہوں نے چونکہ راجہ نواز اور اس کی بیوی بتول کو دیئے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی حسن بیگ کے پرانے نمک خوار تھے پہلے شہر کی کوٹھی میں کام کرتے تھے مگر جب حسن بیگ صاحب نے یہاں زمین خریدی تو انہیں یہاں بھیج دیا تھا۔ وہ پچھلے تیس سال سے یہیں مقیم تھے شادی کے کچھ دنوں بعد وہ دونوں میاں بیوی یہاں آ گئے تھے اور اب ان کے بچے بھی جوان ہو گئے تھے اور ان کی وفاداریاں بھی مضبوط و قابل بھروسہ تھیں۔

ان میاں بیوی کو صورت حال معلوم تھی ماسوائے ان کی تینوں بیٹیوں کے جو ماں باپ کے صاحب کہنے پر شاہ وزیر کو بھی بڑے صاحب سمجھتی تھیں۔  
 وہ ناشتہ کر کے کھڑی ہوئی تھی کہ فریدہ کسی جن کی طرح حاضر ہوئی تھی۔

”بیگم صاحب! دوپہر کو آپ کھانے میں کیا کھائیں گی؟“  
 ”جودل چاہے بنالینا، تم نے ناشتہ اتنا اچھا بنایا ہے تو یقیناً کھانا بھی مزیدار بناؤ گی۔ بہت دنوں بعد مجھے ناشتہ کرنے میں مزہ آیا ہے۔ مرچیں کم ڈالنا۔“ وہ جس طرح کسی کی بے عزتی کرنے میں کوئی تامل نہ کرتی تھی اسی طرح جو عمل قابل تعریف ہوتا اس کی تعریف کرنے میں قطعی کنجوسی نہ کرتی تھی۔  
 فریدہ اپنی مغرور و بد مزاج نظر آنے والی نئی مالکن کے منہ سے اپنی تعریف سن کر مسرت سے جھوم اٹھی تھی۔

وہ بھرپور نیند لے کر اٹھی تھی اس لیے طبیعت بھی بہت تروتازہ تھی یا پھر کئی ہفتے قید جیسی زندگی گزارنے کے بعد یہ آزادی کھلی فضا اور کسی قسم کے بلا روک ٹوک کے لحوں میں اسے بہت اطمینان و سکون محسوس کر رہی تھی۔

وہ کسی آزاد پنچھی کی طرح پورا بنگلہ دیکھتی پھر رہی تھی۔ کشادہ کمروں، کھلے دالانوں، وسیع برآمدوں، سرخ اینٹوں والا بنگلہ سبزے میں گھرا بہت خوب صورت تھا۔

وہ لان میں چلی آئی جہاں گہری سبز گھاس پر بے شمار پھل دار درخت پھلوں سے لدے کھڑے تھے پھولوں کے پودوں کی بہتات بھی چاروں سمت بہار دکھا رہی تھی۔ طویل و عریض لان کے مشرقی حصے میں مصنوعی آبشار بنا ہوا تھا جس کا پانی جھاگ اڑاتا ہوا پتھروں سے نیچے گرا رہا تھا اور یہ منظر اس قدر خوب صورت تھا کہ وہ کئی لمحے مبہوت نگاہوں سے اس منظر کو دیکھتی رہی تھی۔

”واج مین! اس آبشار کے لیے واٹر پلانٹ کی آرینجمنٹ کرنی پڑی ہوگی۔“ قریب سے گزرتے



چوکیدار سے وہ مخاطب ہوئی تو وہ رک کر مودب لہجے میں بتانے لگا۔

”نہیں بی بی جی! باہر پیچھے ہی جھیل بہہ رہی ہے وہاں سے کچھ انجینئروں نے کام کر کے جھیل کے پانی کو اس طرح ایک جھے سے کاٹا کہ وہاں سے پانی کٹاؤ کی صورت میں اس آبشار میں داخل ہو کر راستے سے نکل کر واپس جھیل میں گرتا ہے۔“

”اوہ! کتنا سہل اور زبردست آئیڈیا ہے، جھیل کہاں ہے میں دیکھوں گی۔“

”جھیل بنگلے کے پیچھے ہے میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔“

”نہیں۔ میں چلی جاؤں گی، تم اپنا کام کرو۔“ وہ قطعی انداز میں بولی۔

”بی بی جی! آپ کا وہاں تنہا جانا مناسب نہیں ہوگا اور موسم بھی ٹھیک نہیں لگ رہا۔“ چوکیدار ڈرتا ڈرتا گویا ہوا تھا، وہ غصے سے گویا ہوئی۔

”آئندہ مجھے ایڈوائز کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ بہت برا حشر کروں گی، سمجھے۔“ وہ غصے سے بولتی ہوئی آگے بڑھ گئی، چوکیدار ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

موسم ابراؤ لود تھا، فضا میں خوشگوار کھنکھیلی ہوئی تھی۔ وہ گیٹ سے باہر نکل آئی تھی ایک پراسرار خاموشی و سکوت پرست پھیلا ہوا تھا۔ ادھر ادھر گاؤں دلکش سینری کی طرح پھیلا ہوا تھا۔

اسے بھی ایسے نظاروں سے دلچسپی نہیں رہی تھی وہ تو روشنیوں ہنگاموں پارٹیز کی دلدادہ رہی تھی۔ اپنے حسن کا اسے اتنا زعم تھا کہ بھی اس نے فطرت کے روپ قدرت کے حسن کی پروا ہی نہ کی تھی۔

اور آج جبکہ وہ اس ماحول کا حصہ نہ رہی تھی، اسے حسن کی خوشحالیوں سے لاپرواہ ہوئی تو قلات کے حسن سے متعارف ہوئی اور اسے بے اختیار دنیا کے رنگ دلکش حسین لگنے لگے۔

وہ بنگلے کے دوسری طرف آگئی جہاں جھیل کا پانی ایک چھوٹی ندی کی صورت میں دور تک بہتا ہوا جا رہا تھا۔ ہر سو پھیلے ہوئے جنگلی پیڑ پودوں نے ایک گھنے جنگل کی صورت اختیار کر لی تھی۔ فضا پرندوں کی چہکاریوں سے گونج رہی تھی وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے رنگ برنگے پھولوں کو توڑ کر مستی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

معاً خاموش فضا فار کی زوردار آواز سے لرز اٹھی۔ وہ ٹھٹھک کر اپنی جگہ رک گئی۔

”آج تو بہت ہی بڈلک ہے یار! صبح سے دوپہر ہونے کو آئی ہے مگر تیر تو ایک طرف ہم کو ایک چیز یا تک شکار کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے پرندوں سے ہماری خبری کر دی ہے اور وہ ہماری آمد سے قبل ہی چھپ کر بیٹھ گئے ہیں۔“ ایک دوسرے سے بولا تو دوسرے نے بھی گردن ہلا کر تائید کی۔ وہ دونوں جن کے ہاتھ میں لمبی شکاری ہندوئیں تھیں لباس بہت چست تھے، سر پر ہیٹ جمائے ایک پتھر پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی اٹھی ہوئی گردنیں درختوں میں چھپے پرندوں کو ڈھونڈ رہی تھیں، جن کی آوازیں تو مسلسل آرہی تھیں مگر وہ نظروں سے اوجھل تھے۔

”کیا کھائیں گے یار اب جو کچھ راستے سے خریدا تھا وہ وقفے وقفے سے حٹ کر چکے ہیں۔ اب کھانے کے لیے گھاس اور پتے ہیں اور پینے کے لیے جھیل کا پانی۔“ پہلے والے نے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر پانی اس کی طرف اچھا لود دوسرا بھنا کر بولا۔

”مذاق نہیں کرو جو کچھ کھایا ہے تم نے تنہا ہی ہڑپ کیا ہے اب تو مجھے بہت ہی بھوک لگی ہے۔ تیز اور

مرغابی کا دوست کھانے کے خیال سے میں نے ناشتہ بھی پیٹ کر نہیں کیا تھا اور یہاں روست تو کیا ہوتا پرندے دیکھنے کو بھی نہ ملے۔“ دوسرا کپڑے جھاڑتا ہوا بڑبڑا رہا تھا، پہلا ہنستا ہوا اسے دیکھ رہا تھا کہ ان کی نگاہ سامنے سے آتی مشعل پر پڑی تھی وہ چونک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بڑے غور سے اس سمت دیکھ رہے تھے۔

”یار! بڈلک نہیں گڈلک، ہم شکار کے لیے مارے مارے گھوم رہے ہیں شکار خود ہمارے پاس چل کر آ رہا ہے۔“ دوسرا مشعل کو اپنی جانب آتے دیکھ کر پُر جوش لہجے میں گویا ہوا۔

مشعل ان کے قریب پہنچ گئی، وہ چونکا ہیں اٹھائے اسے گھور رہے تھے فوراً ہی مودب سے بن گئے۔

”مس! آپ یہاں تنہا کیا راستہ بھٹک گئی ہیں؟“

”نہیں۔“ فائر تم نے کیا تھا ابھی؟“ ان کے ہاتھوں میں پکڑی رائفلز دیکھتی ہوئی پر اشتیاق لہجے میں مخاطب ہوئی تھی۔

”ہاں..... ہم یہاں شکار کرنے آئے ہیں۔“ وہ گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

”کسا شکار کیا ہے مجھے دکھاؤ۔“ اس کی دوستی بچپن سے لڑکوں سے رہی تھی عام لڑکیوں کی طرح لڑکوں کی موجودگی ایسے کسی قسم کی گھبراہٹ و شرم سے دوچار نہ کرتی تھی۔ وہ لڑکوں سے اسی طرح سکون و اطمینان سے بات کرتی تھی جس طرح لڑکیاں لڑکیوں سے کرتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ بہت آرام سے دو اجنبی لڑکوں سے اس ویرانے میں کھڑی گفتگو کر رہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو کب کی اجنبیوں کو دیکھ کر بھاگ چلی ہوتی لیکن وہ بے فکری سے کھڑی تھی۔

وہ دونوں لڑکی بھی برگزینی کے بگڑے ہوئے ادباش نوجوان تھے، مشعل کو تنہا دیکھ کر پہلے ہی ان کی نیت خراب ہو چکی تھی۔ اس پر اس کی بے تکلفی سے گفتگو وہ اپنے مطلب کی لڑکی لگی تھی۔ ان کے لبوں پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”میں اپنے پاپا کے ساتھ بہت دفعہ شکار پر گئی ہوں، مجھے رائفل چلانا آتی ہے۔ ایک گولی سے میں کئی پرندوں کا شکار کر سکتی ہوں۔“

”تمہیں گولی مارنے کی کیا ضرورت ہے ڈیڑ! صرف آنکھ مار دیا کرو دیکھنا جنگل کے سارے چرند پرند نازن سمیت تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو جائیں گے۔“ پہلے نے خاصے بے ہنگم انداز میں کہتے ہوئے قہقہہ لگایا تو دوسرے نے بھی ساتھ دیا تھا۔

”وہاٹ یو مین مسٹر؟“ وہ جھٹکا کھا کر دور ہو کر پھنکاری تھی۔

”ارے اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو؟ تم ہم سے کپنی لینے آئی تھیں، ہم دینے کو تیار ہیں۔ خوب بنے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے تین۔“

”شٹ اپ! مجھے کیا سمجھ رہے ہو تم؟ ذرا آگے بڑھ کر بات کیا کر لی تم اپنی اوقات دکھانے لگے۔ ٹھو میرے راستے سے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ ان کے بدلتے تیور اسے احساس دلانے لگے کہ وہ غلط لوگوں کی طرف بڑھ آئی اور ان سے جلد دور ہونا ہی بہتر ہے۔

”سنو میڈم! ناز خیرے ہم دیکھنے کے عادی نہیں ہیں۔“

”بکو اس مت کرو۔“ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ ان دونوں کو آگے بڑھتے دیکھ کر وہ چیٹی تھی۔



”میرا نام میر ہے ہاتھ لگا مال کبھی جانے نہیں دیتا۔“  
 ”اور میرا نام امین ہے مگر یار لوگ پیار سے کہیں کہتے ہیں۔ میں ہاتھ آئی دولت چھوڑ سکتا ہوں مگر لڑکی نہیں اور لڑکی بھی تم جیسی جو کسی پکے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں خود ہی آن گری ہو۔“ انسان پر جب شیطان سوار ہو جائے تو وہ مکمل ایسے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ وہ دونوں بھی اس وقت..... شیطان بن گئے تھے۔ وہ جو خود کو ناقابلِ تسخیر سمجھتی تھی۔  
 اسے خود پر زعم تھا کہ کوئی مرد اسے اس کی مرضی کے بچا چھو بھی نہیں سکتا، سب خیال ریت کے گھروندے ثابت ہوئے تھے۔

وہ کافی دیر تک ان کی گرفت سے بچنے کے لیے پارے کی طرح ادھر ادھر دوڑتی رہی تھی لیکن وہ دونوں بھی گھاگ شکاری تھے جان بوجھ کر اسے اتادوڑا رہے تھے کہ وہ تھک کر خوان کے قابو میں آئے گی اور وہی بات ہوئی۔ بھاگ بھاگ کر اس کی سانس لکھڑی لگیں دل بند ہونے لگا تو وہ گر پڑی۔  
 ”خبردار آگے ایک قدم بھی نہ بڑھانا۔“ شاہ ویز نے قریبی قدار جھاڑیوں سے نکلتے ہوئے ان دونوں کو لاکار تو وہ تھک کر رہ گئے جبکہ مشعل کی جان میں جان آئی تھی وہ ہانپتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔  
 ”کون ہوتا ہے تو ہمیں روکنے والا۔“ میرنا می لڑکا سینہ تان کر گویا ہوا۔

شاہ ویز نے گویا اس کی بات سنی ہی نہ تھی اس کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر مشعل کی ابتر حالت پر ڈالی تھی اور قہر بن کر ان پر پلٹا تھا۔ وہ دونوں صحت میں اس سے کافی تندرست و توانا تھے مگر غصہ جنون اور زخموں میں مارے غیرت کے لاوے کی طرح کھولتا، خون نے اسے فولاد بنا ڈالا تھا۔ وہ ان دونوں سے بری طرح متحکم گھٹتا تھا۔  
 مشعل کھڑی ہو چکی تھی خوف و دہشت سے وہ کانپنے لگی تھی۔

مردوں سے تعلقات پہلے بھی تھے لیکن کسی نے ایک نگاہ غلط نہ ڈالی تھی۔ ان کے درمیان گہری فریوند شپ تھی وہ ساتھ بیٹھے تھے رہتے تھے ڈانس کرتے تھے، مستی مذاق، چھیڑ چھاڑ، سب کچھ ہوتا تھا مگر اس طرح کسی نے وحشی پن کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ سب سے بڑھ کر شاہ ویز جسے تمام حقوق حاصل تھے اس نے بھی اپنے حق کا معمولی سا بھی اظہار نہ کیا تھا۔

کئی پردے تھے جو ایک کے ایک اس کی نگاہوں سے اٹھ رہے تھے۔

آگنی کا احساس

شعور کی دستک

فہم و ادراک کی آمد

ذہن کے مقفل در پہ کھل رہے تھے

وہ لڑ رہا تھا اس کی خاطر اس کا جنون اس کی وحشت اس کی دیوانگی سب اس کے لیے تھی۔ جس نے کبھی اسے درخور اعتنا نہ جانا تھا۔

جو ہمیشہ اس کی تذلیل و توہین کا شکار رہا تھا جس نے کسی لمحے اسے اپنائیت کا احساس نہ بخشا تھا وہ اس کی خاطر لڑ رہا تھا۔

ان دونوں میں سے ایک تو بڑی طرح گھائل ہو گیا اس کے سر اور ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ شاہ ویز



کے مکوں اور لکڑوں نے اس کے اوسان خطا کر ڈالے تھے۔ دوسرے کا حال بھی ایسا ہی تھا، شاہ ویز کے تاہر توڑ حملوں نے اس کی قوت مدافعت و مزاحمت توڑ کر رکھ دی تھی۔ جبکہ زخمی وہ بھی ہوا تھا مگر اس کی وحشت ہر جذبے پر حاوی تھی۔ نیکی و بدی کی جنگ میں ہمیشہ جیت نیکی کی ہوتی ہے وہ بھی جیت گیا تھا۔ وہ دونوں گرتے پڑتے وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ شاہ ویز نے اُن کے پیچھے جانا چاہا تو مشعل نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔

”تم زخمی ہو بھاگنے دو انہیں اتنی مار لگائی ہے اُن کی کہ کبھی اس علاقے میں ہی قدم رکھنے کی کوشش نہ کریں گے۔“ اس نے شاہ ویز کا بازو مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

”اس احقانہ حرکت کی کیا ضرورت تھی؟ جب تمہیں چوکیدار نے تنہا باہر نکلنے سے منع کیا تھا تو کیوں ادھر آئی تھیں؟ یہ علاقہ شکاریوں کا پسندیدہ علاقہ ہے اور وہ پرندوں کے علاوہ تم جیسی بے وقوف لڑکیوں کا بھی شکار کر لیتے ہیں۔ اگر چوکیدار مجھے اسی وقت آ کر اطلاع نہ دیتا اس طرح تمہارے یہاں تنہا آنے کی تو سوچ کیا ہوتا؟ میں آرام سے سکون کی نیند سو رہا ہوتا اور تمہاری ہتھی کا یہاں نام و نشان مٹ چکا ہوتا۔“ وہ بگڑے تیوروں سے اسے ڈانٹ رہا تھا۔

مشعل خود اس صورت حال سے بُری طرح سہم چکی تھی، اس وقت شاہ ویز کی ڈانٹ میں اپنائیت و اضطراب محسوس کر کے وہ خود پر قابو نہ پاسکی تھی اور اس کے شانے پر سر رکھ کر رو پڑی تھی اور خاصی دیر تک روتی رہی تھی۔

شاہ ویز نے اسے رونے دیا، وہ اس کی اندرونی کیفیت سمجھ رہا تھا کہ وہ اس وقت کس خلفشار میں مبتلا ہے۔ ایسے میں اس کے دل کا غبار نکلتا بہتر تھا۔

”انم سوری“ میں نہیں سمجھی تھی کہ وہ لوگ حیوان صفت ہوں گے۔“ وہ ہتھیلیوں سے آنسو صاف کرتی ہوئی ندامت سے گویا ہوئی۔

”تمہاری نگاہ میں سب اچھے ہوتے ہیں سوائے میرے۔ خیر آج ایسی بے وقوفی کر چکی ہو مگر آئندہ خیال رکھنا، قسمت بار بار ساتھ نہیں دیتی۔“ اس کے چہرے پر وہی سکون و اطمینان چھا گیا جو اس کی ذات کی پہچان تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اس شخص کے چہرے سے شعلے نکلتے دکھائی دے رہے تھے جو جنون و وحشت کی مجسم تصویر دکھائی دے رہا تھا۔

”اب کس کی آمد کا انتظار ہے جو آگے نہیں بڑھ رہی ہو؟“ اسے اسی جگہ براہمان دیکھ کر وہ غصے سے مخاطب ہوا تو وہ ہٹا کر اس کے ساتھ چلنے لگی۔

”نامعلوم تم کس مٹی کی بنی ہو جو ذرا بھی عقل و شعور نہیں رکھتیں، اُن اُلو کے پتھوں سے زیادہ مجھے تمہاری بے وقوفی پر غصہ آ رہا ہے، بھلا کس نے کہا تھا کہ.....“

”پلیز میں نے کہا تو جو ہوا برا ہوا اور بری باتوں کو دہرانے سے دکھ بھی ملتے ہیں۔ میں آئندہ کبھی اس طرح نہیں نکلوں گی، بعض لوگ دنیا میں دوسرے کو گرتے دیکھ کر سنہیل جاتے ہیں مگر مجھے جیسے لوگ ٹھوکر کھا کر ہی مصیبتیں ہیں۔“

شاہ ویز سخت حیرانی کی لپیٹ میں تھا۔ مشعل کی طرز گفتگو سوچنے کا انداز، پشیمانیوں و ندامتوں میں ڈوبا لہجہ حیران کن بات تھی۔ وہ لڑکی جس

### ماہِ محرم میں عبادات

سورہ کا ناسح علی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماہِ محرم بہت ہی بابرکت مہینہ ہے۔ شبِ عاشورہ اور یومِ عاشورہ کی عبادت کے لیے فضائل ہیں۔ آپ نے فرمایا محرم کا چاند دیکھ کر چار مرتبہ سورہ اخلاص پڑھ کر اپنے اوپر دم کرنا بہت ہی افضل ہے اول شبِ یومِ نمازِ عشاء آٹھ رکعت نماز چار سلام سے پڑھے اور ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد گیارہ دفعہ سورہ اخلاص پڑھنی چاہئے۔ اس نماز کے پڑھنے والے اور اس کے گھر والوں کی روزِ محشر شفاعت فرماتا اللہ کے ذمے ہے اس کے بعد یہ دعا گیارہ مرتبہ پڑھے۔

سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ  
محرم کی پہلی شب سے شبِ عاشورہ تک روزانہ بعد نمازِ عشاء ایک سو مرتبہ پکڑ کر پڑھنا بخششِ گناہ کے لیے افضل ہے۔  
پہلی شب سے شبِ عاشورہ تک یہ دعا پڑھنی بھی افضل ہے ایک سو مرتبہ پڑھے۔  
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطٰی لِمَا مَنَعْتَ وَلَا رَادٍّ لِمَا قَضَيْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَالِجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ

یومِ عاشورہ کے دن بعد نماز فجر طلوع آفتاب کے بعد دو رکعت نماز ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد جو بھی سورہ یاد ہو پڑھ لے سلام پھیرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اس دعا کو پڑھ لے۔  
یومِ عاشورہ کی وقت بھی با وضو ستر مرتبہ پڑھی۔

حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ  
(مومن تاناہی)

نہ جھکنا اور کسی سے مرعوب ہونا سیکھا ہی نہ تھا۔

ان لحوں میں کتنی کم زور بے بس و بے اختیار لگ رہی تھی۔

پہلی شوگر ہی اُس کے لیے آخری ثابت ہوئی ہے؟

لگتا تو نہیں کہ وہ سنہیل گئی ہوگئی۔ اس نے سوچا۔

راستہ خوب صورت تھا۔

ماحول پر سکون۔

ہوائیں خوشبوئیں لٹاتی ہوئی لگ رہی تھیں۔

موسم خوش گوار تھا، صبح سے ابر نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔

اب ابر چھٹ گیا تھا۔ نیلے و سفید شفاف بادلوں سے آسمان دلکش لگ رہا تھا۔

سورج کی چمکتی روشنی ہر سو پہیلی ہوئی تھی اور جھیل کے بہتے ہوئے پانی میں جب سورج کی کرنیں چمکتیں تو

نگاہوں کو ان کا حسن خیرہ کرنے لگتا تھا۔

وہ ساتھ ساتھ جارہے تھے مگر سوچیں الگ الگ تھیں۔

مشعل پر اس حادثے نے گہرا اثر ڈالا تھا، جہاں وہ اپنی عزت بچ جانے پر شکر ادا کرتی وہیں شاہ ویز کے سامنے خود کو نگاہ اٹھانے کے قابل نہ پاتی تھی۔ وہ اس کے سامنے کس قدر اکڑتی تھی، بہادری و خود دہری کے مظاہرے کرتی مگر وہ درحقیقت کیا تھی؟

معمولی و کم زور لڑکی۔

جو وقت پڑنے پر اپنا دفاع بھی نہ کر سکتی تھی۔

وہ کتنا عظیم تھا۔



بلند حوصلہ، جرأت مند، بہادر ہونے کے ساتھ غیر لک مند بھی بلا کا تھا۔

ایسا مرد ہر لڑکی کی چواکس و آنکھیں میں ہوتا ہے۔

دھیرے دھیرے اُس کے دل کی دنیا میں پھیل پھیل پیدا ہو رہی تھی۔ دل کی دنیا میں حشر برپا تھا اور کانوں میں کوئی سرگوشیاں کر رہا تھا۔

خوشبو کی پوشاک پہن کر کون گلی میں آیا ہے

کیا یہ پیغام رساں ہے

کیا کیا خبریں لایا ہے

کھڑکی کھول کر باہر دیکھو

موسم میرے دل کی باتیں تم سے کہنے آیا ہے

○○○○

فرح کے گھر میں زرینہ اور بے جی کا استقبال از حد سرد مہری و بے گانگی سے کیا گیا تھا۔ فرح اُن کے سامنے نہیں آئی تھی۔ اس کی ماں اور بہنیں کمرے میں موجود رہی تھیں، فرح کی والدہ بے جی کی عمر کی تھیں مگر بالکل جوانوں کی طرح فیشن اسٹیل تھیں۔ بے جی نے سلام کیا تو منہ میڑھا کر کے انہوں نے جواب دیا تھا۔ خود بیٹھی تھیں مگر اخلاقاً بھی انہیں بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔

دونوں اُن کی بیٹیاں بھی اسی بے جی سے بیٹھی رہی تھیں۔

”تمیز طریقہ تو تمہارا پہلے ہی نیست و نابود ہو گیا تھا۔ اب کیا میزبانی بھی بھول گئیں؟ گھر میں آنے والے غیروں کو بھی بیٹھنے کو کہا جاتا ہے پھر ہم تو تمہارے جان بچان والے ہیں۔ ایسی بھی کیا بے مروتی کہ بیٹھنے کو بھی نہ بول رہی ہو۔“

زرینہ کو اُن کی بے التفاتی ذرا نہ بھائی وہ دمک کر بولیں۔

”آئے بیٹھ جاؤ، اب بیٹھنے کے لیے بھی تمہیں کیا دعویٰ کارڈ دینا ہوگا۔“ فرح کی ماں تیوریاں جڑھا کر بولیں اور قبل اس کے کہ زرینہ بھی بڑھ کر جوابی حملہ کر تیں، بے جی نے اُن کا ہاتھ پکڑا اور صوفے پر بیٹھنے ہوئے کہنے لگیں۔

”نہیں! کارڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا اپنا گھر ہے، خود ہی بیٹھ جائیں گے۔“ بے جی اور زرینہ کو بیٹھنے کا کافی دیر گزر گئی مگر ان کے درمیان بالکل خاموشی تھی۔ پہل کر کے کوہ تیار نظر نہ آ رہی تھیں تو زرینہ بھی خاموش تھیں۔

اس الجھن زدہ صورت حال سے بے جی کو بے چینی ہونے لگی تھی۔ وہ یہاں کام سنوارنے آئی تھیں وہ زرینہ کی نگاہوں کو نظر انداز کر کے فرح کی ماں سے استفسار کرنے لگیں۔

”زرینہ! فرح کو بلاؤ، ہم اسے لینے آئے ہیں۔“

”اب کیسے یاد آگئی فرح کی؟ میری بیٹی موت کے منہ سے واپس آئی ہے۔ میں اسے نہیں بھیجوں گی! تکلیف کی حالت میں کسی نے آکر جھانکا تک نہیں۔ اب وہ تندرست ہوئی ہے تو خدمت کروانے کے لیے لینے چلی آئیں۔“ زرینہ بھری بیٹھی تھیں ذرا سی بات سے ہی وہ پھٹ پڑی تھیں۔

”موت کے منہ میں بھی تو تم ہی لے کر گئی تھیں اسے۔ ماں اور ساس دونوں خود ہی بن بیٹھی تھیں مجھے تو

اپنے دور کیا تھا جیسے دودھ میں گری مکھی کو نکال کر پھینکتے ہیں۔ اور خدمت کی بھی تم نے خوب کئی بی بی! کئی خوش گمانی میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے بیٹی کی تربیت خدمت کرنے کی نہیں لینے کی ہے۔ وہ کیا خدمت کرے گی خدمت کروانے والی ہے۔“ زرینہ غصہ سے بلند لہجے میں بولیں۔

”مگر ہماری آپی خدمت کروانے والی ہوتی تو ان کا ایسا حال نہ ہوتا، جو تکلیف انہوں نے اٹھائی ہے ہم جانتے ہیں۔ وہ تو اپنے بچے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔“ فرح کی چھوٹی بہن منہ بنا کر کہنے لگی۔

”اے بی بی! تمہیں غصے نے یہ نہیں بتایا کہ جب بڑے بات کر رہے ہوں تو چھوٹوں کو نہیں بولنا چاہئے۔ تم ابھی کنواری ہو ایسی باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔“

”..... گئے وہ وقت جب بچیاں منہ میں کھٹکھٹیاں ڈالے بیٹھی رہتی تھیں لیکن اب وہ وقت نہیں رہا، بچیاں جو دیکھیں گی وہ کہیں گی۔“

”جب ہی تو ان کی صورتوں پر پھٹکار بھی برس رہی ہے، کنواری ہیں مگر ایسا لگتا ہے کئی کئی بچوں کی مائیں لگ رہی ہیں۔“ زرینہ نے اس انداز میں کہا کہ ان ماں بیٹیوں کے پتنگے لگ گئے اور وہ تینوں تیز تیز بولنے لگیں۔

زرینہ بھی شروع ہو گئیں اور لڑائی کا ماحول بن گیا۔ وہ تینوں ماں بیٹیاں شروع تھیں، غصہ کے طعنے تشبیہ کی طرح ایک دوسرے پر داغے جارہے تھے۔

زبانی گولہ باری کرنے میں زرینہ کا بھی کوئی ثانی نہ تھا۔

خوب ایک دوسرے پر زبانی حملے بڑھ بڑھ کر کیے جارہے تھے۔ بے جی نے پہلے تو انہیں منع کرنے روکنے کی بہت کوشش کی مگر دونوں طرف سے ہی کوئی ماننے کو آمادہ نہ ہوا تو وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گئیں کہ اچھا ہے دونوں کے دلوں میں گھری غلط فہمیاں رُخ ہو جائیں تو ٹھیک بات ہوگی۔

بالآخر ایک دوسرے کو خوب کہنے سننے کے بعد دل کی بھڑاس نکل گئی تو وہ خاموش ہو گئیں۔ زرینہ ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

”آپا! کیسے اطمینان سے بیٹھی ہو اتنی بے عزتی ہونے کے باوجود۔ چلو۔“

”بیٹھ جاؤ، کوئی بے عزتی نہیں ہوئی۔ تم نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔“

”آپا! یہ تم کہہ رہی ہو، اسے تم میری بہن ہو یا ان کی؟“

”تمہاری بہن ہوں تو غیر زبیدہ کے لیے بھی نہیں ہوں، سگی خالہ کی بیٹی ہے اور اصرار کا رشتہ بھی اسی وجہ سے کیا تھا کہ مضبوط ہوگا رشتہ مزید، لیکن لگتا ہے تم دونوں عقل فروخت کر کے بیٹھی ہو۔ ابھی جو تمہارے درمیان باتیں ہوئی ہیں بالکل بے بنیاد اور فضول ہیں۔ نہ زرینہ تمہاری بیٹی کی دشمن ہے اور نہ زبیدہ۔ تم اصرار کو سکھا پڑھا کر زرینہ کے خلاف کر رہی ہو۔“

”بہن! میں بھی یہی کہتی ہوں، مگر نہ جانے کیوں زرینہ کو سمجھ نہیں آتی، نہ معلوم کیوں یہ ایسی باتیں کرتی ہے۔ کون سکھاتا ہے اس کو میرے خلاف۔“ زبیدہ کے دل کی بھڑاس نکل چکی تھی، پھر بے جی کے بات کرنے کا انداز، لہجہ کی شیرینی اور سچے خلوص کے مظاہرے کچھ ایسے ہی ہوتے تھے کہ برے سے برے عزائم والوں کے دل بدل جایا کرتے تھے۔ پھر یہ تو رشتہ ایسا تھا وہ موم بن گئی تھیں۔

”لو یہ بھی خوب کہی، مجھے کون سکھائے گا، میں نا سمجھ ہوں کیا؟“



”ہاں“ مجھے معلوم ہے تم بہت سمجھ دار ہو لیکن اب خاموش بیٹھی رہو میں فرح کو لینے آئی ہوں۔ تم کیا کہتی ہو زبیدہ! اگر ابھی بھی کوئی گلہ شکوہ باقی رہ گیا ہو تو کر لو مگر فرح کو میں ہر حال میں لے کر جاؤں گی۔“ زبیدہ کو ڈپٹ کر وہ زبیدہ سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”اے بہن! بیٹی کو کون اپنی چھاتی پر بٹھانا پسند کرتا ہے۔ اگر مجھے اپنے گھر ہی بٹھانا ہوتا تو شادی ہی کیوں کرتی؟ اگر زبیدہ پہلے آ جاتی تو میں ہیج دیتی۔“

”آج سے سارے گلے شکوے ختم ہو گئے ہیں۔ آئندہ چھوٹی چھوٹی باتیں ایک دوسرے سے کہہ کر غلط فہمی دور کر لیا کرنا۔ بات کچھ نہیں ہوتی اور جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

بے جی نے اٹھ کر انہیں ایک دوسرے سے گلے ملوایا تھا۔

○○○○

مشعل نے مردکی ہوس ناک نظریں پہلی مرتبہ دیکھی تھیں اور اس کی دنیا پدل گئی تھی۔ وہ جوشاہ ویز کی پر چھائیں سے بھی دور رہنا چاہتی تھی۔ اب ہمہ وقت اس کا سایہ بنی رہنا چاہتی تھی۔

بے پناہ خوف و وہم اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔

”کہاں جا رہے ہیں؟“ اسے تیار ہوتے دیکھ کر وہ بولی تھی۔

”کیوں؟ اب تمہیں بتا کر جانا ہوگا؟“ اس نے بال بٹاتے ہوئے ڈرینگ ٹیبل کے مرمر میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی ساتھ چلوں گی۔“

”ہمارے درمیان معاہدہ نہیں ہوا تھا۔“

”کیسا؟“

”کہ تم ہر جگہ میرے ساتھ جاؤ گی۔“ وہ ہمیشہ برش رکھ کر اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

”معاہدے کی بات نہیں میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گی۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ عجیب بے نام سے گھبراہٹ و پچھل سی محفل لگی تھی۔

وہ جو بے خوفی سے اس کا مقابلہ کرتی تھی اب نگاہ ملا کر بات کرنا تو درکنار اس کے قریب بھی کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔

”میرے ساتھ؟ یہ میرا ساتھ تمہیں کب سے بھانے لگا؟ میں تو وہی بے مایہ لیسرا شخص ہوں جو تمہارے پاپا کی دولت پر قبضہ کر کے پیچھا گیا ہوں۔“

اُس کا رویہ خواہ مخواہ ہی رخ ہوا جا رہا تھا۔

”ضروری نہیں پرانی باتیں دہرائی جاتی رہیں۔“

”ہاں ضروری نہیں ہے مگر میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر نہیں جاسکتا۔“

”لیکن کیوں؟ کیا میں تمہارے ساتھ چلنے کے قابل نہیں؟ بد صورت ہوں؟ اچانچ ہوں؟ آخر کیا برائی ہے مجھ میں؟“ وہ اُس کی مسلسل انکار کی تکرار سے زچ آ کر بولی۔

”بد صورت؟ تمہیں ابھی تک اپنے حسن پر ناز ہے؟“ وہ اس کے دلکش چہرے کو بغور دیکھتا ہوا استہزاء سے لہجے میں گویا ہوا۔

وہ ہونٹ بھیج کر خاموش ہی رہی کہ کیا کہتی اس کو دودو جواب دینے کا مطلب تھا اپنے پیروں پر خود ہی کھڑی مارنا جو وہ چاہتی نہ تھی۔

”حالانکہ ہمارے ہاں خوب صورت اسی کو کہتے ہیں جو پیا من بھا جائے۔“ اس کی زبان رواں ہو گئی تھی۔

اسی دم رشیدہ صفائی کے لیے کمرے میں آئی تو وہ اس سے مخاطب ہوا۔

”رشیدہ! تمہاری مالکن بہت خوب صورت ہے؟“

”ہاں صاحب جی! بہت خوب صورت ہیں بالکل پری کی طرح۔“ وہ مشعل کو دیکھ کر شائستہ لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

”پری کی طرح! تم نے کبھی پری دیکھی ہے؟“ وہ استہزاء سے انداز میں ہنس کر بولا تو مشعل ملازمہ کے ساتھ خود کو ڈسلس کرنا متنازعہ مسئلہ آڑا نا وہ بل کھا کر رہ گئی تھی مگر خاموش رہی۔

”دیکھا تو نہیں ہے مگر بے بے بتائی ہے پری بہت خوب صورت ہوتی ہے تو بیگم صاحبہ بھی اتنی ہی خوب صورت ہیں تو پری کی طرح ہی ہوں۔“ رشیدہ نے پوری طرح وضاحت کر دی تھی۔

”اگر پری کو معلوم ہو گیا تو وہ برا مان جائے گی اپنی اسلٹ پر۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا اور رشیدہ سمجھ نہ سکی۔

”صفائی تھوڑی دیر میں کرنا۔“ مشعل گویا ہوئی۔

”نہیں ابھی ہی کرنے دو تم تو میرے ساتھ چل رہی ہونا۔“

”کہاں؟“

”فش پونڈز میں یہاں پر وہیں چلنا ہے۔“

”مگر مجھے پھلیوں کی بو سے پڑ ہے۔“

”لیکن میری مرغوب غذا پھلیاں ہی ہیں اور میں نے آج ڈش بھی فش فرائی بنوائی ہے۔“ اس نے معلومات فراہم کی تھی۔

”میں کچھ اور کھا لوں گی۔“

”ہر چیز بندے کو کھانے کی عادت ہونی چاہئے سب اللہ کی بنائی ہوئی ہیں۔“

”میں نے اعتراض تو نہیں کیا صرف اپنی پسند بتائی ہے۔“

”اوکے! چلو دیاں میں تمہیں خالص گاؤں کی ڈش ملے گی روٹی اور سرسوں کا ساگ کھلاتا ہوں بڑے مزے دار ڈش ہوتی ہے۔“ اس کا موڈ بھی بہتر ہو گیا تھا۔

مشعل نے ٹیٹ کا ٹیٹ سوٹ پہنا تھا۔

وہ تیار ہو کر باہر آئی تو کار کے پاس اس کے انتظار میں کھڑا شاہ ویز اسے دیکھتا رہ گیا۔

(باقی آئندہ)





# جیون کیلئے

شائستہ حسن

کہاں سے چلا تھا جدائی کا سایہ نہیں دیکھ پایا  
کہ رستوں میں تھی آنسوؤں کی روانی ذرا پھر سے کہنا

ابھی ارضی عباس کا فون آیا تھا وہ کہہ رہا تھا۔ ”میرا کوئی مصروفیت ہوتی“ میں کہیں انوائٹ ہوتی  
”میں امی اور آپا کو بھیجنا چاہتا ہوں تمہارے بابا کے پاس۔“  
میں خوف زدہ ہو گئی۔ بابا کے غصے کا تصور کر کے  
کانپ گئی۔  
”نہیں عباس..... ابھی کچھ روز اور ٹھہر جاؤ۔“ مجھے  
کوئی بہانہ بھی نہ سوچ رہا تھا۔  
”کیوں؟“ اس کے لہجے میں کچھ حیرت کچھ  
ناخوشگوار بھی تھی۔  
”بابا کا موڈ آج کل کچھ ٹھیک نہیں۔“ میں نے  
دھیرے سے کہا۔ وہ ہنس دیا۔  
”تمہارے بابا کا موڈ ابھی ٹھیک ہوتا بھی ہے؟ اور  
تم اتنی خوف زدہ کیوں ہو؟ میں نے کہا تو تھا کہ میں  
انہیں منا لوں گا وہ مجھے انکار نہ کر سکیں گے۔“ اس کے  
لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا مگر میں مسکرا بھی نہ سکی جانے  
کیوں میرے تصور میرے خیالوں میں بار بار وہ بگنی  
آ جاتی ہے اور میں لرز جاتی ہوں۔ کاش پچھلے اتوار

میری کوئی مصروفیت ہوتی“ میں کہیں انوائٹ ہوتی  
میری ریکارڈنگ ہوتی یا میں بیمار ہی ہوتی، کوئی بھی  
سبب بن جاتا اور میں پینک پر نہ جا پانی مگر کچھ بھی نہ  
ہوا اور میں چلی گئی۔ بس بیٹھے بٹھائے اچانک ہی ایسا  
آپی نے دریا پر جانے کا پروگرام بنالیا، موسم کچھ اس  
طرح کا دلکش ہو رہا تھا کہ امی، جیلہ، آپا اور جمشید بھی  
مان گئے۔ میں نے پہلے تو سر اٹھا کر نیلے آسمان سے  
بے تکلفی سے پتی ہوئی سرمئی اودی گھٹاؤں کو دیکھا  
اونچے اونچے ساکت کھڑے درختوں کی شاخوں سے  
سرگوشیاں کرتی پروا کو محسوس کیا اور جانے کی ہانی  
بھری۔ راستے میں ہوٹل سے بیچ باکس پیک کرائے  
فروٹ اور سوٹ جوس لیے اور دریا کا رخ کیا۔ وہاں  
جا کر مزہ بھی آیا، دریا پوری طغیانیوں پر تھا۔ لہریں چل  
چل کر ہمیں اپنی گرفت میں لینا چاہتیں اور ناکام ہو کر  
سر پٹیں۔ ہم نے بونٹ کی گھوٹے پھرے کارڈز  
کھیلے، جمشید نے بے ایمانی کی تو میری اس سے لڑائی  
بھی ہوئی۔ واپسی سے کچھ دیر قبل میں نے بیگ سے



اپنی نوٹ بک نکالی اور سین کے ڈائلاگ یاد کرنے لگی۔ اگلی صبح میری آؤٹ ڈور شوٹنگ تھی۔ ”گلاب رستے“ اپنی طرز کا نوکھا گلش ڈرامہ تھا۔ ارتضیٰ عباس کو اس سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں اور مجھے یقین تھا ہمیشہ کی طرح، میرا یہ ڈرامہ بھی بہت مقبول ہوگا۔ سین یاد کرتے کرتے میری نظریں کچھ دور درخت سے ٹیک لگائے کھڑی اینٹلا آپی پر ٹیک لگیں۔ وہ کھوئی کھوئی سی دریا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سرکش لٹیں ماتھے پر اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں اور سوٹ کا ہم رنگ فیروزہ دوپٹہ کچھ ڈھلک کر لہرا رہا تھا۔ اُس سے مجھے اپنی نازک سی بہن کوئی ماورائی ہستی لگی۔ میرا دل چاہنے لگا کیرے کی آنکھ سے اس منظر کو ہمیشہ کے لیے قید کر لوں۔ میں کیرہ اٹھا کر ان کی طرف لپکی، کبھی کسی نے پیچھے سے میرا کندھا تھام کر کہا۔ ”سنو“ میں چونک کر پچلی اور دہشت زدہ رہ گئی۔ وہ کوئی لپکی تھی اچھے بکھرے بال، دہشت زدہ چہرہ اور دکھوں سے لہبا لہبا آنکھیں۔ اس نے کہا۔

”سنو..... میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے۔“ اس کی آواز کے درد نے مجھ پر کچپی طاری کر دی۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھامنا چاہا، میں جھرجھری لے کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”دیکھو..... خدا کے لیے میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے۔“ اب میں باقاعدہ کانپ رہی تھی۔

”جی مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے جشید نے ہنس کر کہا۔

”دلاری! تم ہمیشہ ایک ہی فقرہ کہتی ہو میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے حالانکہ میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ پورا شعر ہے۔

اس کی ہنسی میں بہت روز رہا میرا وجود میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے اور تم ہمیشہ دوسرا مصرع کہتی رہتی ہو..... کیا پہلا مصرع تمہیں پسند نہیں؟“ اور وہ لپکی جشید کے مذاق سے بے خبر وہ نیازاب رما سے کہہ رہی تھی۔

”میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے۔“ کہو کی نا..... اور جشید اُس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”دلاری پہلا مصرع بھی کہو نا..... ہمیشہ دوسرا ہی کہتی ہو۔“

”جشید“ میں نے آواز دی۔ ”کیوں مزار اُڑاتے ہو اس کا؟“ میری آواز بھرا گئی۔ ”مت تنگ کرو اسے۔“ میری آنکھیں بے اختیار پھلک پڑیں۔ جانے کیسے حالات تھے جنہوں نے اسے بے حواس کر دیا تھا۔ جشید میرے آنسو دیکھ کر پلٹ آیا۔

”تم کیوں اپنا دل خراب کرتی ہو ماہا؟ یہ بے چاری کئی سالوں سے ایسی ہے۔ سردی گرمی، صوبہ بارش میں ایک ایک سے کہتی ہے میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے۔“

”تم جانتے ہو اسے؟ میں نے کچھ دور ایک مسافر کو مخاطب کرتی لپکی کو دیکھا۔

”ہاں ہمارے کالج کے مالی بابا نے اس کی کہانی سنائی تھی۔ یہ بنگلہ دیش کی ہے ایک اچھے گھرانے سے تعلق تھا، دسویں میں پڑھتی تھی جب ایک فریبی شخص نے محبت کا جھانسہ دے کر اس کو گھر سے بھگا دیا اور پاکستان لے آیا مگر وہ بہت ظالم اور سفاک نکلا۔ روزانہ بات بے بات مارتا پٹیتا، بے تحاشا کام کرتا اور کھانے کو پورا نہ دیتا۔ بے تحاشا کام بھوکہ اور مارا دے جسمانی اور روحانی طور پر تھکتی چلی گئی۔ جب رو رو کر آزاد کرنے کو کہتی تو کہتا دس سال میرے پاس پورے کرو میں وعدہ کرتا ہوں دس سالوں بعد تمہیں آزاد کر دوں گا۔ پھر تم بنگلہ دیش چلی جاؤ تمہارے گھر کا پتہ میرے پاس لکھا ہوا ہے۔ تمہاری ماں تمہاری جدائی میں رو رو کر اندھی ہو چکی ہے اور تمہارا باپ فوج کا مریض ہو گیا ہے، تمہاری بہن اور بھائی اب بھی تمہارے منتظر ہیں۔ جب تم انہیں خط لکھ کر اپنی واپسی کی نوید سنائو گی تو وہ خوشی سے پاگل

ہو جائیں گے۔ وہ تمہاری لیے واپسی کا کرنا بھیج دیں گے اور تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنوں میں چلی جاؤ گی“

بیس تیس سال میرے پاس رہا اور بلا مواضع کام کرو میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ اور دلاری آزادی کی اُمید لیے دن رات اس کی لائڈری کے کپڑے دھوئی اور آنکھوں پر ایک ایک دن گنتی اور ظلم سہتی رہی..... جب دس سال پورے ہوئے اور اس نے بے پناہ خوشی سے کھلکھلاتے ہوئے اسے اپنا وعدہ پورا کرنے کو کہا تو وہ جس سفاکی سے ہنسا اور بولا۔ میں نے اپنی لائڈری اور تمہیں اپنے دوست ظہیر کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اب یہ التجائیں تم اسی سے کیا کرنا دے گی اب بنگلہ دیش جا کر کیا کرو گی؟ پچھلی گرمیوں کی شدید بارشوں میں تمہارا گھر گر گیا تھا، تمہاری اندھی ماں فوج زدہ باب اور تمہارا اکلوتا بھائی اور بہن سبھی بلے کے نیچے دب کر ختم ہو گئے۔ اب وہاں تمہارا کیا رکھا ہے جو جاؤ گی؟“ بس ظہیر کے پاس رہا اور لائڈری چلاؤ۔ اور دلاری یہ سن کر ہوش و خرد سے بے گانہ ہوئی اور آج تک پاگل ہے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر کہتی ہے میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے۔“

میں یہ کہانی سن کر پھوٹ پھوٹ کر روئی، اس ظالم سختی القلب شخص پر مجھے بے تحاشا غصہ آیا۔ وہ میرے نزدیک ہوتا تو میں اس کا منہ نوچ لیتی، اسے شوٹ کر دیتی مگر اب سوائے رونے اور کڑھنے کے کیا کر سکتی تھی۔ امی نے میری اداسی کو محسوس کر کے واپسی کا اعلان کر دیا اور میں کئی دن تک اس لپکی کو اس کی دکھوں سے لہبا لہبا ہنسی آنکھوں کو اس کے کرب ناک ٹوٹے لہجے کو یاد کرنے کی روتی رہی۔ میرا دل ایسا ہی نازک ہے، کوئی بھی ممکن بات سن کر میرے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ البتہ افسانہ پڑھ کر گھٹنوں روتی ہوں، فی وی کے ٹریجڈی سین کے لیے مجھے بھی ٹیکسین کی ضرورت نہ پڑی اور ارتضیٰ عباس کہتا ”ماہم بہت عظیم

فکارہ ہو..... ڈوب کر اداکاری کرتی ہو سین کو خود پر طاری کر لیتی ہو۔“ اور میں دل ہی دل میں ہنستی۔ ”تمہیں کیا پتہ ارتضیٰ عباس کہ نا تو میں سین خود پر طاری کرتی ہوں اور نہ ہی عظیم اداکارہ ہوں بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ دردناک اسٹوری اور ٹریجڈی سین کے ممکن الفاظ ہی مجھ بے حد حساس لڑکی کے آنسو پلکوں پر اکٹھا کرنے کو کافی ہیں اور اب تمہارے بے حد اصرار کے باوجود میں راضی نہیں ہوئی۔ مجھے بابا کے انکار سے ڈر لگتا ہے اگر بابا نہ مانے تو میں تمہیں کھوکھو کیسے زندہ رہ پاؤں گی؟“ وہ لپکی میرے تصور میں آ جالی ہے اور میرا دماغ ماؤف ہونے لگتا ہے میں گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھ لیتی ہوں۔ کاش ارتضیٰ عباس میں تم سے نہ ملتی ہوتی، میں نے تمہیں اس قدر نہ چاہا ہوتا، تم میری رگ جال میں نہ اترے ہوتے تو آنے والے لمحات سے میں یوں خوف زدہ نہ رہتی۔ یہ ذہنی آسیب کی طرح میری جان سے نہ چٹا ہوتا۔ مجھے تو آج بھی چار برس کی لکھی وہ پتی دو پہر یاد ہے جب تم سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی اور میرے نوخیز دل نے دھڑکنے لگا تھا ان دنوں میں فرسٹ ایئر میں تھی جب ہمارے گھر کے پاس ایک بڑے سے پلاٹ پر کام شروع ہوا اور چھ ہی مہینوں میں ایک خوب صورت بنگلہ تیار تھا۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات پر تھی کہ گیٹ کے پاس جو بڑا سارا جامن کا پیر تھا وہ جوں کا توں رہا۔ بنگلہ مالکان نے اسے نہ گرایا۔ ہر سال منوں کے حساب سے اُس پر جامن آتے تھے جسے صرف میں ہی جھولیاں بھر بھر کے کھایا کرتی، پھر بنگلے کے ملین بھی آگئے مگر خاموشی ہی طاری رہی جبکہ ہماری کونجی میں ہنگامہ بنا رہتا۔ جیلہ آئی، اینٹلا آئی، سہیل جشید اور رما۔ چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک، شور شرابا، قہقہے، امی اور بابا مطمئن تھے بقول ان کے ”اُن کا گلشن ہرا بھرا تھا۔“ ساتھ والے بنگلے میں تو بس صبح ہی صبح ایک بی وی وگن آ کر ایک اسمارٹ سے بندے کو



لے جاتی اور پتا نہیں کب چھوڑ جاتی۔ شاید وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔

پھر ایک دن چلچلاتی گرم دوپہر میں جب سب گھر والے سو رہے تھے میرا دل جامن کھانے کو لچلایا اور جیلہ آئی انیلا آپی کی نظر بچا کر میں آہستگی سے بیڈ سے اتر کر اور دھیرے سے دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ ہمارے اور ساتھ والے بنگلے کی دیوار بالکل ساتھ ساتھ تھی۔ میں اُچک کر اپنے گھر کی باؤنڈری وال پر چڑھی اور جامن کی شاخوں کا سہارا لیتی ہوئی ساتھ والوں کی بڑی دیوار پر چڑھ گئی اور وہیں دیوار پر کھڑی ہو کر اچھے اچھے جامن دوٹے میں ڈالنے لگی۔ میں اپنے کام میں اتنی منہمک تھی کہ گیٹ کھول کر اندر آنے والا شخص بھی مجھے نظر نہ آسکا میں تو اس وقت چوکی جب کسی نے کھنکھار کر کہا۔ ”محترمہ ذرا نیچے اتریں۔“ میں چونک پڑی پھر جھینپ کر جامنیں دوٹے میں باندھ کر دیوار سے نیچے چھلانگ لگادی۔ وہ دنگ رہ گیا، دیوار واقعی اونچی تھی مگر میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میرا تو سارا بچپن ہی درختوں اور دیواروں سے کودتے پھاندتے گزرا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ میں بڑی بے نیازی سے کھڑی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”آپ جامن چوری کیوں کرتی ہیں؟“ وہ اپنا تھیر چھا کر بولا۔

”چوری؟“ میں حیران رہ گئی۔ ”میں تو بہت برسوں سے یہ جامنیں توڑ رہی ہوں..... جب یہ کھر نہیں بنا تھا اور ادھر سارا میدان ہوتا تھا۔“ میں نے معصومیت سے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا۔

”اچھا..... اچھا..... مگر اب تو یہ درخت ہماری حدود میں ہے آپ اجازت لے لیا کیجئے۔“

”واہ کیوں لوں اجازت؟“ مجھے غصہ آنے لگا۔ ”اور اتنی ساری جامنیں جو روزانہ نیچے گرتی اور خراب ہوتی رہتی ہیں تو کوئی بات نہیں اور اگر میں نے تھوڑی

سی توڑ لیں تو گناہ کر لیا۔ اور آپ تو صبح کے گئے شام آتے ہیں اور کوئی گھر میں ہے ہی نہیں اجازت کر سے لیں؟“ میری اتنی لمبی چوڑی تقریر پر وہ حیرت سے مجھے دیکھتا ہنس پڑا۔

”اچھا محترمہ آپ جیتیں میں بارہا۔ آئندہ جو وقت دل چاہے جامن توڑ لیا کیجئے کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔“ وہ مسکراتا ہوا اندر جانے لگا پھر پلٹ کر ”ویسے آپ کا نام کیا ہے؟“

”ماہا نمیر۔“ میں نے بے ساختہ بتایا پھر دیوار دیکھنے لگی جس پر چڑھ کر اپنے گھر کو دنا تھا۔ وہ سمجھ گیا۔

”آپ گیٹ سے چلی جائیں۔“

”مگر ہمارا گیٹ اندر سے بند ہوگا۔“ میں نے پریشانی سے کہا۔

”پھر؟“ وہ بھی میرے ساتھ پریشان ہونے لگا۔ ”آپ کوئی میز لے آئیں اس پر چڑھ کر میں دیوار پر چلی جاؤں گی۔ آپ نے کیوں مجھے نیچے آنے کو کہا تھا کوئی آسمان پر تو نہیں تھی کہ آپ آواز مجھ تک نہ پہنچ سکتی۔“ میں نے غصے سے اسے گھورا وہ سر کھاتے ہوئے اپنی مسکراہٹ چھپانے لگا۔ مجھے اور غصہ آ گیا۔

”اگر..... جیلہ آپی بابا کی جاگ ہوگی تو.....؟“ بابا کے غصے کا تصور کر کے میرے رونکنے کھڑے ہونے لگے۔ اتنے میں وہ اندر سے چیخ اٹھا کر آ گیا۔ چیخ دیوار کے ساتھ لکھ کر میں ان کی دیوار پر چڑھی اور پھر اس کو منہ چڑا کر اپنی دیوار پر کودی۔ جامن اس افرا تفری میں گر گئے تھے مگر میرے دوپے پر یادگار چھوڑ گئے تھے۔ مگر جانے کیا بات تھی دل میں کسی قسم کا ملال نہ تھا۔ اپنی دیوار سے کود کر ہاتھ اور کپڑے جھٹکتی برآمدے میں آئی آہستگی سے دروازہ کھول کر جھانکا۔ انیلا آپی اور رما ویسے ہی بے سہارے

سورہی تھیں خدا کا شکر ادا کر کے اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ ”بہت اچھا انسان ہے۔“ میں نے اس کے خوب

صورت دجود گھنے بالوں والے سر اور شوخ مسکراتی آنکھوں کو دائرہ تصور میں لاکر سوچا۔ ”ہائے کیسے حیران ہو رہا تھا مجھے دھپ سے کودتے دیکھ کر۔“ مجھے بہت دیر بعد شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔ اور ارتضیٰ عباس بھی میری تم سے پہلی ملاقات۔

”شام تمہارا ٹوک ٹوکرا ابھر کر جامنوں کا دے گیا۔“ ”ارے اتنے سارے کون کھائے گا؟“ امی نے کہا۔

”میں کھاؤں گی اور کون کھائے گا؟“ مجھے بے تحاشا خوشی ہو رہی تھی۔ یہ بندہ واقعی اچھا ہے اتنی ساری جامنیں بھیج دیں۔

پھر ایک دن امی نے نیاز دلوانی تھی اور ڈش بھر کر پلاؤ کی مجھے دیتے ہوئے کہا۔

”ماہا! جمید کو کبوتر ساتھ والے بنگلے میں دے آئے۔“

میں لان میں آئی جمید نہیں تھا۔ میں خود ہی اٹھا کر چل پڑی ہمارے گیٹ کے ساتھ ہی تمہارا گیٹ تھا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ برآمدے میں آ کر میں نے نیل دی، تم خود ہی باہر نکلے۔ مجھے دیکھ کر بچپان کی چمک تمہاری آنکھوں میں لہرائی۔

”ماہا آپ؟“ میرا نام تم کو یاد رہا تھا۔ مجھے خوشی سی ہوئی۔ ”امی نے نیاز دلوانی تھی یہ چاول لے لیں۔“ تم نے ڈش تمام لیں اور اندر چلے گئے۔ واپس آ کر خالی ڈش تم نے مجھے بکرائی۔

”گھر میں اور کوئی نہیں؟“ میں نے لمبی سی گیلری سے اندر جھانکا۔

”امی اور بہنیں ہوتیں تو آپ کو اندر نہ بلاتا۔“ تم مسکرا کر بولے۔ میں واپس پلٹنے لگی تھی، ابھی تم نے آواز دی۔

”ماہا! کیا سب کو ٹیویوں میں آپ ہی؟“ ”نہیں۔“ تمہاری بات سمجھ کر میں نے سر ہلایا۔

”وہ تو رما اور جمید جا نہیں گئے۔“ ”پھر ادھر وہ کیوں نہیں آئے؟“ تمہاری آنکھیں گہری ہو گئیں۔

”اس دن آپ نے بہت ساری جامنیں بھیج دی تھیں تا ان کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔“ میں نے اپنے آنے کا سبب بتایا۔

”اوہ۔ میں تو بالکل ہی بھول گیا، میری مصروفیات ہی کچھ ایسی ہیں۔ آج یاد کر کے جامن بھیجوں گا۔“

میں نے سر اٹھا کر جامن سے لدے درخت کو دیکھا اور اس دن کی بات یاد کر کے مسکرا دی۔ تم ہنس دیے۔

”بہت پسند ہیں؟“ لہجے میں اپنائیت تھی میں نے سر ہلادیا۔

”آج فخر کی ڈیوٹی لگا دوں گا وہ خود ہی ہر دوسرے دن تو ذکر دے جایا کرے گا ورنہ تو میں اپنی مصروفیت میں بھول جاتا ہوں۔“

”آپ کیا کرتے ہیں؟“ ”دی وی پر پروڈیوسر ہوں۔“

”آپ کا نام؟“ میں نے جھک کر پوچھا۔

”گیٹ پر لکھا ہوا ہے۔“ تم نے سر ذرا سا جھکا کر

شوخی سے کہا۔ میں جھینپ کر پلٹ آئی۔ گیٹ سے نکلتے ہوئے میں نے سیاہ ٹیم پلیٹ پر ابھرے سہارے حروف کو پڑھا۔ ”سید ارتضیٰ عباس رضوی“ خوب صورت نام ہے تمہاری اپنی طرح۔“ میں بڑبڑائی۔

\*\*\*

وہ چاند رات تھی جب ہم ہمیشہ مہندی لگوانے اور چوڑیاں پہننے بازار گئی تھیں۔ واپسی پر گجروں کی دوکان دیکھ کر جیلہ آپی نے جمید کو کاررو کرنے کو کہا پھر مجھ سے بولیں۔ ”ماہا! سحرے لے آؤ۔“ میں اتر کر دوکان میں داخل ہوئی۔ دوکان میں پشت کیے کوئی بالکل تمہارے جیسا لگا جب میں بولی اور اس نے چونک کر دیکھا تو واقعی وہ تم تھے۔ تم نے دھیرے سے سرمہ کر کے سلام



کیا۔ میں نے سبز بوائے کو چار گجروں کا آرڈر دیا تھا جبکہ تم نے پھولوں کا پورا زور پیک کرایا۔ پتا نہیں کس کے لیے مگر جب میں بے منت کر کے آنے لگی تو وہ پیکٹ تم سے میرے ہاتھ میں تھا دیا۔

”ماہا! زور عید پر پہن کر کسی کو یاد کر لیجے گا۔“  
”مگر ارضی.....“ میرے لبوں سے اتنا ہی نکل سکا۔ تبھی باہر جیلڈ نے ہارن دیا۔

”پلیز ماہا۔“ تمہاری آنکھوں میں بے تحاشا التجائیں تھیں جنہیں میں باوجود کوشش کے ٹھکرا نہ پائی اور گجروں کے ساتھ وہ پیکٹ لے کر خاموشی سے پلٹ آئی۔

”یہ کیا ہے ماہا؟“  
”میں نے اپنے لیے پھولوں کا زور لیا ہے آپ۔“  
میں نے جیلڈ آپ کی نوٹس نہ کیا۔

دوسرے دن عید تھی میں نے وائٹ نیٹ کا وائٹ ہی نفیس ایئر ایڈری اور گلوں والا سوٹ پہنا۔ میچنگ شوز کے ساتھ تمہارا دیا ہوا پھولوں کا زور پہن کر ہلکا سا میک اپ کر کے باہر نکلی تو جیلڈ آپ کی اور انیلا آپ کی واقعی ششدر رہ گئیں۔

”ویسے ایک بات ہے ماہا ہم سب بہنوں سے نمبر لے گئی ہے۔“ انیلا آپ نے فراخ دلی سے کہا۔ میں نے شرارتاں چھک کر آداب کہا تو جیلڈ آپ کی جو رشک سے دیکھ رہی تھیں ہنس دیں۔

امی سے اجازت لے کر میں اور ماہا اپنی اپنی دوستوں سے ملنے چل دیں۔ جیلڈ آپ کی اور انیلا آپ کی تو شام کو ہی فارغ ہوئی تھیں پھر وہ اگلے دن دوستوں سے عید ملنے جاتی تھیں۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے میں اور ماہا فائدے میں رہے۔ صوبیدار شا کر علی کے گھر لان میں ہی باہر نکلے ہوئے تم مل گئے اور میرا دل جو صبح سے چل رہا تھا کہ کاش اپنے دے پھولوں کے زور میں تم مجھے دیکھ سکتے شانت ہو گیا۔ تم نے ایک لکھنے کو گردن موڑ کر مجھے دیکھا چہرہ تو سنجیدہ سنجیدہ سارہا

مگر بھوری آنکھوں سے ہویدا روشنیاں بہت کچھ کہیں۔ راتوے خیالی میں تیز تیز چلتی اندر چلی گئی تم رک گئے تھے میں نے رفتار دھجی کر دی۔ تم نے پر گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور دلفریب مسکراہٹ سے سچے ہنسون کو بڑے دلنشین انداز میں سکڑ کر کہا ”زندگی! عید مبارک۔“ اور پھر تیزی سے باہر نکلے چلے گئے۔ ڈھیر ساری شفق میرے رخساروں پر سمٹ آئی اور وہ سارا دن میرے کانوں میں بجی مدھر جملہ گونجتا رہا۔ ”زندگی! عید مبارک۔“ آف! ارضی عباس۔ کوئی اتنی جلدی بھی کسی کے قریب آتا ہے۔ دو ہی ملاقاتوں میں۔ مگر میں چاہنے کے باوجود تمہاری برق رفتار چاہت کو ٹھکرا نہ پائی۔

پھر بہت دن بعد تم نے فون کیا۔ اتفاق سے میں ہی اس وقت فون کے قریب تھی۔

”ماہا! میں ارضی عباس بول رہا ہوں۔“ تمہارے بھاری لہجے میں جانے کون سا سحر ہوتا تھا کہ تمہارا مدھر لہجہ میرے کانوں میں اترتے ہی تمہاری آنکھیں مجھے اپنے حصار میں لے کر میرے دل کی دھڑکنوں کو منتشر کر دیا کرتیں۔

”جی، کس سے بات کرنی ہے؟“ میں نے سانسوں کو نارمل رکھنے کی ناکام کوشش کی۔  
”بات تو سہمی سے کرنی ہے زندگی۔ میں آج کل جو ڈرامہ بنا رہا ہوں اس کی ہیروئن کے لیے تم بالکل مناسب ہو۔ یعنی ہمیں جس قسم کی لڑکی چاہئے خوب صورت، معصوم اور چٹیل یہ ساری خصوصیات تم میں موجود ہیں۔ کیا ہمیں اداکاری کا شوق ہے؟“

میرے دل میں تو دور دور تک ایسا خیال نہ تھا۔ تم نے شوق دلایا تو دل بھی چاہنے لگا۔ اسکرین بیوٹی تو ویسے ہی میری بہت تھی عام گھر بیویاں میں بغیر منہ ہاتھ دھوئے بھی میری تصویریں اس قدر پیاری آتیں کہ میری اپنی بہنیں جل جل جایا کرتیں۔ مونی مونی براؤن آنکھوں کی وجہ سے خاندان بھر میں غزالی

آنکھوں والی لڑکی کے نام سے مشہور تھی۔  
”بولونا زندگی خاموش کیوں ہو گئیں؟ دلکش سرگوشی ابھری اور میرا دل پھر دھڑک اٹھا۔

”بابائیں مائیں گے۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔  
”میں نے سنا ہے ہمارے سینئر پروڈیوسر قمر اجلال تمہارے بابا کے گہرے دوست ہیں ان سے کہلوادوں گا۔“

”کیا نہیں گے آپ ان سے؟“  
”کچھ بھی کہہ دوں گا مگر تم خود کو تیار رکھنا۔ اجازت لینا میرا ذمہ ہے۔“

پھر بابا نے کچھ ہچکچاہٹ سے اجازت دی۔ میری بہنیں اب مجھ سے باقاعدہ حد کرنے لگی تھیں۔ امی البتہ ناراض تھیں مگر امی کے ناں کہنے کی وجہ سے ہی تو ابانے ہاں کی تھی۔ وہ امی کوستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے البتہ ہم بچوں پر جان چڑھتے۔ چپ چپ سی افسردہ سی امی پر مجھے بہت ترس آیا اگر یہ صرف میرا شوق ہوتا تو میں امی کی وجہ سے انکار کر دیتی مگر ارضی عباس میں تمہیں ناراض نہ کر سکتی تھی۔ تم دونوں میں میرا سب کچھ بن چکے تھے۔

پہلے پہل تو میں بہت گھبرائی، سب کچھ انوکھا اور انجانا تھا تا میرے لیے۔ میک اپ، کیمیرے، لائٹس، سیٹ ڈائلاگز، ساتھی اداکار مگر تمہاری حوصلہ افزائی مشوروں اور محبتوں نے مجھے پُر اعتماد بنادیا۔ دو چار ہی دن ٹیکس ہوئیں پھر میری خود اعتمادی لوٹ آئی۔ میری ڈائلاگ ڈیلوری کو تم نے بھی سراہا۔ بڑا اچھا دوستانہ ماحول تھا، دوہی دنوں میں میں سب سے بے تکلف ہوئی۔ بڑا زبردست ٹیم ورک ہوتا تھا۔ میک اپ مین، کیمیرہ مین، لائٹ مین سب ہی بہت محنتی تھے۔ ہماری محنت رنگ لائی۔ چند ماہ بعد جب میرا پہلا ڈرامہ ٹیلی کاسٹ ہوا تو واقعی دھوم مچ گئی۔ اسکرین بھی پاور فل تھا اور گلس بندی بھی بڑی مہارت سے کی گئی تھی۔ میں

تو حیران تھی کہ کس قدر حسین لگ رہی تھی میں۔ میرے ڈریسز بے حد پسند کیے گئے اور پرنسز بوتیک کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ ڈرامہ ”مٹلاشی آنکھیں“ اور اداکارہ ماہا ملک تہلکہ مچا گئے۔ ارضی عباس کی محبت اب دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگی تھی۔ میری شہرت خاندان میں کہیں پسند کی گئی تو کہیں ناپسند۔ البتہ میں اور میری فیملی دونوں ہی مشہور ہو گئے۔

اور پھر ایک اور ڈرامہ ”کاغذ کی ناؤ“ میں بھی میں ہیروئن لی گئی۔ یہ ڈرامہ انکل قمر اجلال پروڈیوس کر رہے تھے۔ اس وقت تک میں اداکاری کے اسرار و رموز سیکھ چکی تھی۔ ”کاغذ کی ناؤ“ کافی مشکل ڈرامہ تھا مگر میں نے بہت اچھی طرح پرفارم کیا اور آن ایئر جانے کے بعد خاصا مقبول ہوا۔ پھر جنید مظفر صاحب نے اپنے ڈرامے ”چشم حیراں“ میں پاور فل رول دیا جو بے تحاشا پسند کیا گیا اور مجھے اس پر ایوارڈ بھی ملا مگر ان خوشیوں سے زیادہ اہم یہ خوشی اور احساس تھا کہ تم یعنی سید ارضی عباس رضوی ایک اونچا پورا شہزادہ پورے کا پورا ماہ ملک کے دل میں سما گیا۔ تمہارا خلوص سے سمجھانا، نہ سمجھنے پر ڈانٹنا، کسی اور اداکار سے ہنستے بولتے یا کر روٹھ جانا، گھنٹوں کھوئے کھوئے رہنا، مجھے بہت انوکھا، بہت دلکش لگا۔ اور میں سورج کھسی کے پھول کی طرح اپنے سورج کی طرف جھکتی چلی گئی۔

”زندگی۔“ تم جھک کر میری آنکھوں میں اپنی تصویر کھوجتے۔ ”جب تم کسی اور سے ہنس نہ سکتی رہا تم میری ہو میرے لیے بنی ہو۔ میرے لیے۔ تمہاری ان بادام جیسی حسین آنکھوں میں میری ہی تصویر ہے۔ تمہارے معاملے میں بہت حاسد بن گیا ہوں۔ ماہا تمہیں ہوا بھی چھو کر گزرے گی تو میں بدگمان ہو جاؤں گا۔ دیکھو میری شدید ترین چاہت خود مجھے دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔ میں راتوں کو بھی تمہارے تصور کو لیے گھنٹوں جاگتا ہوں۔ تمہاری تصویر سے باتیں کرتا



ہوں اور تمہیں پتا ہے بابا، میں سوچتا تھا محبت و محبت بس ایسے ہی احساسات ہیں۔ کوئی کسی کے لیے پاگل نہیں ہوتا، کوئی کسی کے لیے نہیں مرے گا وہ شہداء کے انتہائی احمق تھے جنہوں نے محبتوں میں تخت و تاج ٹھکرا دیئے لیکن مجھوں کسی بیوی شہر میں فرما دیا یہ سب مصنوعی سے قصے لگتے تھے۔ اب خود پر گزری ہے تو یقین آیا ہے کہ عشق ایک آفاقی جذبہ ہے۔ یہ عیروں پر محیط ہے لوگ غلط کہتے ہیں کہ محبت ذاتی پھرتی چھاؤں ہے۔ یہ تو اتنا طاقت ور جذبہ ہے کہ اس کی خاطر تو جان بھی دی جا سکتی ہے۔ تخت و تاج تو کچھ بھی نہیں۔“

اور میں حیرت زدہ تمہاری باتیں سن کر بیٹھی محورو بے خود کرنے والی باتیں مجھے یقین ہی نہ آتا، کوئی مجھے یوں بھی چاہ سکتا ہے۔ میں سرشار سرشاری رہتی مگر ایک پھانس اندر ہی اندر اٹکتی رہتی۔ بابا سیدوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ جیلہ آبی نے میرے اصرار پر بتایا تھا کہ بابا کو بونی ورٹی لائف میں اپنی کسی کلاس فیلو سے محبت ہو گئی تھی اور وہ لڑکی سید ملی سے تھی اس کے خاندان والوں نے بابا کو قبول نہ کیا۔ بقول ان لوگوں کے سیدوں کا ملکوں سے رشتہ ناک کہنے کے مترادف تھا اور بابا کے پروپوزل کو حقارت سے ٹھکرا کر اس لڑکی کی شادی اس کے تایا کے میٹرک فیل آوارہ لڑکے سے کر دی گئی۔ بابا چلا تے رہ گئے۔ یہ کس قانون میں ہے کون کہتا ہے؟ اسلام تو ایک نو مسلم کو بھی پورے حقوق اور پروٹوکول دیتا ہے جبکہ میں تو بہت پختوں سے مسلمان ہوں۔ اسلام میں تو عربی کو بھی پر بھی فوقیت نہیں اور اللہ کے نزدیک بھی صرف مفتی کا درجہ ہے مگر کسی نے ناما اور بابا کے دل میں سیدوں کے خلاف نفرت ہی نفرت بھری۔ وہ کہتے اسلام تو بھائی چارے اور مساوات کا حکم دیتا ہے۔ اسلام میں تو کوئی چھوٹا بڑا نہیں، پھر لوگ اسلام کو بھی پسندنا پسند کے مطابق کیوں ڈھال دیتے ہیں؟ یہ کہاں کے مسلمان ہیں جو اسلام کی روح سے ہی واقف نہیں۔ یہ اپنی جھوٹی انا اور

چاہتے ہو۔ بابا کو میں ہی جانتی ہوں۔ ان کی ہر بات بھر پر گہر ہوئی ہے اور مجھے تو یہ ڈر بھی تھا کہ تمہارے پروپوزل پر بھر کر مجھے ہمیشہ کے لیے بی وی اسٹیشن جانے سے نہ روک دیں یا آنا فانا میرا رشتہ خاندان میں طے کر دیں تو میں کیا کر سکیں گی؟ میں نے بشکل چند دنوں کے وعدے پر نہیں ملا۔ تم میرے بغیر نہیں رہ سکتے تو میں کون سا رہ سکتی تھی۔ جدائیاں میرے لیے بھی جان لیوا تھیں میری بے بسی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ میں کیا کروں؟ کیسے بابا کو منوان؟ کون سا ایسا طریقہ اختیار کروں کہ وہ میرا ہاتھ نہیں ایک سید زادے کو سونپ دیں۔ تم نے کہا تھا کہ ایک ہفتے کے بعد تم کوئی جیلہ کوئی بہانہ کوئی عذر نہیں سونگے اور میرے ذہن میں کوئی ایسا لائحہ عمل نہیں تھا جو اس مشکل سے مجھے نکال سکے۔

سوچیں مجھے پاگل کر رہی تھیں۔ میں اندھیروں میں ٹانگ ٹوئیاں مار رہی تھی کیا کروں! راضی عباس مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا؟ کس طرح فاصلوں کی طنائیں تھیں؟ دوں کہ تم میرے قریب آ جاؤ۔ کوئی شارٹ کٹ نہیں مل رہا جو تم تک پہنچنے میں مدد دے سکے حالانکہ سوچا جائے تو تم میرے کس قدر قریب ہو کر جاں میں قطرہ خون کی طرح اور دیکھا جائے تو تم کس قدر دور ہو کہ فاصلے سمیٹتے سمیٹتے میں بے حال ہونے لگی ہوں۔



آج صبح دس بجے تمہارا فون آیا تھا اور اب سہ پہر ڈھلنے لگی ہے۔ لمبے لمبے سائے دیوار و در کو ڈھانپ رہے ہیں مگر میں اسی طرح دل گرفتہ بیٹھی تمہیں سوچ رہی تھی۔ تم اتنے ڈسٹرب کیوں تھے؟ حالانکہ آج تم نے پورے دس دنوں بعد فون کیا تھا اور میں تمہاری آواز سن کر نام ہو گئی تھی کیوں کہ باوجود کوشش کے میں بابا سے بات نہ کر پائی تھی۔

مجھے یقین تھا تم اب ڈانٹو گے۔ بے وقوف بزدل! حافظ۔“

کم ہمت اور جانے کیا کیا کہو گے کیوں کہ تمہارے ڈرائے آنکھ کے درتے میں اور انکل حنیف مظفر کے ڈرائے سراسر منزل کے لیے میں نے اسی لیے ہی معذرت کر لی تھی کہ گھر رہ کر اپنا مسئلہ سلجھانا چاہتی تھی۔ بات کرنے کے لیے کوئی سراسر تلاش کر رہی تھی مگر ڈانٹ کی بجائے ریسور سے بھاری بوجھ سی آواز سن کر میرا دل دکھ گیا۔ شاید تم تمہارے رہتے بہت تھک گئے تھے۔

”راضی! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ میں نے بے تابانی سے پوچھا۔

”ہاں بابا، میں اچھا ہوں۔“ ریسور سے تمہاری آہ نگرانی اور میں بے قرار ہو گئی۔

”راضی! پلیز کوئی بات ہے مجھے بتائیں۔“

”ارے نہیں میری زندگی! تمہارا وہم ہے۔“ تم

ہنس دینے مگر تمہاری بوجھ سی ہنسی سن کر میں بے اختیار

رودی۔

”بتائیں نا کیا ہے؟“

”بس کچھ طبیعت خراب ہے زندگی۔ مگر تم پریشان

مات ہو۔“

تم جانتے تھے کہ میں کس قدر حساس ہوں میں تو

کسی راہ گیر کو بھی پریشان نہ دیکھ سکتی تھی اور تم تو میرا اپنا

آپ تھے۔

”راضی میں ابھی آپ کے پاس آ رہی ہوں۔

کوئی بات ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔“

”تم سے کیا چھپاؤں گا زندگی..... امی نے بلوایا

ہے ابھی گاؤں جا رہا ہوں۔“

”کیوں؟“

”وہ بیمار ہیں شاید۔“

”کب تک واپس آئیں گے؟“ میں نے افسردگی

سے پوچھا۔

”دس بارہ دنوں تک آنے کی کوشش کروں گا۔ خدا



تم فون بند کر گئے اور میں ریسور تھا ہے کھڑی رہ گئی۔ اس طرح تو تم بھی نہ کرتے تھے، کھنٹوں بات کر کر کے بھی تمہارا دل نہ بھرتا۔ میں ہی آخر کار کبھی امی کے بلانے کا بہانہ کر کے کبھی بابا کے آجانے کا ڈراوہ دے کر فون بند کر دیتی۔ تم چل چل کر قسمیں دے کر خدا حافظ کہنے سے روکتے اور اب..... خدا حافظ کہتے ہوئے تمہاری آواز کیسے جھرجھرا رہی تھی۔ میرا دل بند ہونے لگا۔ میں نے دوبارہ تمہارا نمبر ڈائل کیا مگر نیل بجتی رہی۔ کسی نے نہ اٹھایا، تم واٹھی چلے گئے تھے۔ تم دس دن تک آنے کا کہہ گئے تھے۔ میں دن گن گن کر کاٹنے لگی لیکن ابھی ایک ہفتہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ایک صبح ایک دل خراش خبر پڑھنے کوئی۔ میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ الفاظ گڈمڈ ہو کر دائرے سے بننے لگے دل بیٹھے لگا۔

”نہیں..... نہیں یہ غلط ہے جی“ میں چیخی اور چیختی چلی گئی۔ پھر نہ جانے کہاں سے ڈھیر ساری تاریکیاں منہ کھول کر میری طرف پھیلیں اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ جیلہ آئی انیلا آئی امی بابا بے حواس ہو کر آئے مگر میں اس وقت تک قائلین پر گر چکی تھی۔ معلوم نہیں کب تک میں اندھیروں کے حصار میں رہی ہوش آیا تو ہمیشہ کے لیے اندھیرے میرا مقدر بن چکے تھے۔ اخبار میں وہ چھوٹی خبر میرے دل کی دنیا برباد کر گئی تھی۔ میری طرف آنے والی خوشیوں کے تمام راستے بند کر دی گئی۔ میرے سنے پنے پرے خوابوں میں آگ لگا گئی تھی وہ المناک خبر کہ ”دی وی پروڈیوسر سید ارتضیٰ عباس رضوی روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے۔“ لعش ان کے آبائی قبرستان میں دفنادی گئی۔“ کیا ایسے بھی ہوتا ہے؟ عزیز از جان لوگ یوں چپکے سے چلے جاتے ہیں اپنے اپنے چاہنے والوں کی تڑپ سے بے نیاز ہو کر مجھے اس دن زندگی کی بے ثباتی کا ادراک ہوا موت کیا ہوتی ہے، صدمہ کیسا ہوتا ہے؟ مجھے پتا ہی نہ تھا ابھی خبریں تو بہت پڑھنے اور سننے کو ملتی

ہیں، کیا وہ یونہی کسی کے شہر دل ہوتے ہوں گے۔ کسی کی آنکھوں کے خواب اور زندہ رہنے کا جواز ہوتے ہوں گے۔ کیوں ہوتا ہے ایسا..... منزلیں سامنے آ کر کم کیوں ہو جاتی ہیں؟ جوں جوں وقت گزرتا گیا اُس کی جدائی کا احساس دوچند ہوتا گیا۔ مجھے یقین ہی نہ آتا ارتضیٰ عباس وہ اونچا پورا شہزادہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ کوئی اس طرح بھی مرتا ہے؟ یوں اچانک آنا فنا؟ پھر میں سوچتی لوگ صدمے کیسے برداشت کرتے ہیں؟ اپنے پیاروں کو کیوں بھلا جاتے ہیں۔ میں تو اُس کو بھلانے کا تصور بھی نہ کر سکی۔ پچھڑے والے اپنے پیچھے والوں کو زندہ درگور کر جاتے ہیں اور ارتضیٰ عباس بھی مجھے زندہ درگور کر گیا۔

میں پھر بھی ٹی وی انٹیشن نہ گئی۔ انکل تمرا جلال اور جنید مظفر صاحب نے ایک دو ڈراموں کے لیے اصرار کیا مگر میں نہ جاسکی۔ کیونکہ جانی ٹی وی انٹیشن کے تو چپے میں اس کی یادیں بھری پڑی تھیں۔ ایک ایک گام پر اُس کی باتیں ابھولانے چلی آتی تھیں۔ اس کا ہونٹ دبا کر مسکرانا، سر ذرا سا اٹھا کر تہقہ لگانا، آنکھیں بند کر کے سوچنا، منہ پھلا کر روٹھنا، چہرے پر بچوں کی طرح سوز طاری کرنا ہاتھ جوڑ کر منانا، کیا کیا بھلائے کی کوشش کرتی؟ وہ زہل لہجے میں باتیں کرنے والا شخص جانے کہاں چلا گیا؟ میں کس کے لیے زندگی کی طرف آتی؟ کیونکہ جینے کی خواہش کرتی، میری تمام سرگرمیاں، مشغلے ختم ہو گئے۔ بس چپ چاپ پڑی اُن لمحوں کو سوچتی رہتی جب تم میرے ساتھ ہوتے تھے۔ جب زندگی ایک رو پہلا حسین خواب لگا کرتی تھی۔ جب دل شادو آ بار بار بگرتا تھا۔ تمہارے بعد تو میں بے قراری بولا بولا اُن ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرا کرتی، جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہوں، جیسے کچھ گھو گیا ہو مگر یہ کچھ ہی نہیں بلکہ میرا سب کچھ تھا جو گھو گیا تھا مگر میں کیسے تلاشتی؟ اُفق پار جانے والوں کو کوئی کیسے

پاسکا ہے۔ ارتضیٰ عباس تم جو جان تمنا تھے تمنائے لا حاصل بن کر رہ گئے۔ تمہاری روشن جگہ گاتی آنکھیں بار بار میرے تصور میں آتیں اور میں ریت کی طرح بکھر نے لگتی۔ وہ باتیں جو میں نے تم سے کی تھیں وہ جملے جو تم نے مجھ سے بولے تھے تمہانیوں میں بار بار اُن کو سوچتی دھبی ہوئی اور روتی رہتی۔ وہ اچھا وقت کتنی جلدی بیت گیا؟ کیا خوشیوں کی عمر اتنی تھوڑی ہوتی ہے وقت برق رفتار خاتم وقت، اسے ہم سے کیا عداوت؟ یہ اتنی جلدی کیوں بیت گیا؟

انیلا آئی جیلہ آئی کی شادیاں ہو گئیں اور وہ کینیڈا چلی گئیں۔ رما میڈیکل کے آخری سال میں تھی اور میں کئی ٹینک بن گئی تھی۔ بے مقصد ناکام زندگی میرا مقدر تھی، کبھی کبھی میں سوچتی کیا تصور تھا میرا؟ مجھے کس جرم کی مرامی؟ کیوں ریک زاروں کا سفر میرا مقدر ٹھہرا؟ تب خیال آتا تو صورتو ارتضیٰ عباس کا بھی نہ تھا جس نے چپ چاپ مٹی اوڑھ لی۔ کیسے کیسے خوب صورت خواب اس نے اپنی آنکھوں میں بسا رکھے تھے جن کی تعبیریں لیے بغیر وہ چلا گیا۔ یہ جیون کیا ہے؟ یہاں کرٹیل گھبرو جوان آنا فنا مر جاتے ہیں اور بیمار لاچار بوڑھے موت کی آرزو لیے جیے چلے جاتے ہیں کیوں ہوتا ہے ایسا؟



بابا کے گلشن میں خزاؤں کا ہیرا تھا۔ سنبیل ٹو کیو کی کسی فرم میں مکینیکل انجینئر تھا۔ جشیڈا کسفرڈ میں بڑھ رہا تھا اور رما کی شادی پشاور ڈاکٹر حماد قریشی سے ہوئی تھی۔ دونوں اپنا برائیوٹ ہسپتال چلاتے تھے۔ خوب صورت شوخ رنگوں کی تلتیاں اُڑ گئی تھیں۔ بابا کا وہی سخت سارو یہ امی کے ساتھ تھا۔ امی بے چاری بالکل تنہا ہو گئی تھیں۔ بابا نے ہمیشہ انہیں اپنی محبتوں سے محروم رکھا تھا، کبھی انہیں جاننے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ وہ جی رہی تھیں کہ انہیں جینا تھا۔ میں نے محسوس کیا وہ میری لمپنی چاہتی تھیں ان کا دکھ سکھ بانٹنے

والی بیٹیاں تو پیادیں سدھار گئی تھیں اور انہیں بالکل تنہا کر گئی تھیں اور میں اپنے غموں میں الجھی ہوئی تھی۔ ارتضیٰ عباس کو بھول جانا میرے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ مجھے یاد آتا، تمہارے اولین پھول کو دیکھ کر ساون کی کالی گھٹاؤں میں گولے اُڑانی تیز ہواؤں میں۔ سرما کی سرد ملی راتوں میں گرمی کی چاندنی میں، کوئل کی کوک میں رات کی رانی کی خوشبو میں اور میں سوچتی ارتضیٰ عباس ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہماری چائیں اتنی کم زور کیوں ہوتی ہیں؟ عزیز لوگ کچھڑ کیوں جاتے ہیں؟ اور اگر کچھڑنا ہی لوح مقدس پر دم تھا تو عزیز کیوں بنتے ہیں؟ ہم اتنے بے بس کیوں ہیں؟ کچھ بھی ہمارے اختیار میں نہیں۔

سارا دن یونہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہتی۔ سوچیں میرا حصار بن گئی تھیں جو دن رات دھند کی طرح میرے ارد گرد بھیلی رہتیں۔ میری ذہنی حالت کے پیش نظر ڈاکٹروں نے امی بابا کو سخت تاکید کی تھی کہ میرا بہت خیال رکھا جائے، کسی قسم کی روک ٹوک نہ کی جائے ورنہ زوریں بریک ڈاؤن کا خدشہ تھا۔ کبھی سائیں سائیں کرتے سنانے امی کو ڈسنے کو آتے تو وہ گھبرا کر میرے کمرے میں چلی آتیں۔ میں آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت لیٹی المیہ گیت سنتی رہتی۔ وہ خاموش بیٹھی رہتیں، اگر کچھ بولتیں بھی تو ہوں ہاں سے زیادہ جواب نہ ملتا۔ میں اتنی خود غرض اور بے نیاز ہو گئی تھی کہ دو جملوں کی جھجکا بھی ان کی تنہائی کے خالی کشکول میں نا ڈال سکی اور وہ جو کچھ سننے، کچھ کہنے کی آرزو لے کر آتیں مایوس ہو کر اٹھ جاتیں۔ میں تو اپنا غم ان کے دکھوں سے زیادہ جان لیوا اور بھاری سمجھتی تھی ان کا دکھ کیا بیٹائی؟ اور پھر ایک رات وہ سوئیں تو ابھی ہی نہیں، شاید وہ بہت تھک گئی تھیں۔ شاید وہ جان گئی تھیں کہ یہاں ان کا دکھ بانٹنے والا کوئی نہیں اور بابا تھے تو ان کی زبان ہر روز نیا ہی زخم لگاتی تھی مگر ان کے بعد بابا کو بھی محسوس ہوا کہ وہ گھر کا کتنا اہم فرد تھیں۔ وہ



خاموش بھی رہتی تھیں تو ان کے ہونے کا احساس تو رہتا تھا۔ کتنے ہی کام تھے جو خود بخود ہو جاتے تھے۔ میں نے خاموشی سے ان کے کئی کام سنبھال لیے مگر خاموش ویران درود یار بھائیں بھائیں کرتے کرتے کاٹنے کو آتے۔ اسی کے زمانے میں ایک دور شتے آئے تھے جو میں نے ٹھکرا دیے۔ پھر نہ کوئی آیا اور نہ میں نے اُمید رکھی۔ میں نے ارضی عباس کی یادوں کو اپنا اوڑھنا چھوٹا بنالیا تھا۔

رازیہ اور مارتھا میری بہت گہری دوست تھیں۔ وہ کبھی کبھار اپنی مصروفیات اور اکجھنوں سے دامن چھڑا کر آ جاتیں تو ان کی ساتھ بھی میں ارضی کی باتیں کرتی رہتی۔ انہوں نے کتنے جتن کئے کیا کیا کوششیں نہ کیں کہ کسی طرح میں اُسے بھول جاؤں زندگی کی طرف لوٹ آؤں خوش رہنے کی کوشش کروں لیکن جب میں خوش نہ تھی تو خوش رہنے کی کوشش کیوں کرتی؟ اور زندہ ہونی تو زندگی کی طرف لوٹ کر آتی۔ ارضی عباس کو موت نے مارا تھا اور مجھے زندگی نے مار دیا۔ اور زندگی کہنے والے نے میری زندگی کو غم کے گہرے اندھیرے میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔

پھر چند سالوں بعد بابا بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ بائیں طرف کا فالج ہوا تھا بائیں پاگل جانے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔ اُس دن میں اپنے گھر کی چیل پہل اور دفنوں کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ تمہاری تصویر کو آنسوؤں سے بھگو دیا۔ ارضی عباس تمہارا بظلمت کسی اور کی ملکیت ہے۔ پتا نہیں کون لوگ ہیں؟ کبھی کبھی اونچی آواز میں ڈیک پر گیت لگا ہوتا ہے اور میں اپنے کمرے کو بند کر کے چٹخیں مار مار کر روتی ہوں تڑپ تڑپ کر تمہیں بلاتی ہوں مگر ملنا ہمارے نصیب میں ہوتا تو کچھڑتے ہی کیوں؟ یہ بات کبھی میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ میں تو آنکھیں بند کر کے تمہارے نقش قدم پر چلتی آ رہی تھی اور آنکھیں بند کر کے چلنے والوں کو راستہ کہاں یاد رہتا ہے۔ میں نے تو واپسی کا راستہ

رکھا ہی نہ تھا۔ بس تاریک راستوں کی مسافت میرا مقدر تھی اور مقدر سے بھلا کون لڑ سکتا ہے؟ پہلے بھی اندھیرا کچھ گھٹنوں کرے میں بند رہتی تھی تو امی آ کر لائٹ جلا دیتیں۔ دودھ کا گلاس ٹیبل پر رکھ جاتیں مگر اب کون تھا؟ کسے میری پروا کرنی تھی؟ کبھی اپنے اکاؤنٹ سے پیسے نکال کر ساتھ والوں کے نوکر سے کھانے پینے کی چیزیں منگوا لیتی مگر ساری چیزیں فرج میں پڑی سڑتی رہیں اور میں بھوک سے نڈھال کم زور پڑی تمہیں سوچتی رہتی کبھی مارتھا آ کر ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیتی۔

”ماہا! اپنے آپ سے تم کس قسم کا انتقام لے رہی ہو؟ بھول جاؤ اسے بھول کیوں نہیں جانی ہو وہ تمہارا نصیب نہیں تھا۔ وہ تمہارا نہیں بن سکتا تھا۔ اب نہ بعد میں اس کی اتنی ہی زندگی تھی۔ وہ اتنی ہی سانسیں نکھو کر آ رہا تھا۔ خدا کے لیے سنجیدگی سے اپنے متعلق سوچو پڑھا میں کے پیچھے بھاگنا دہائی ہے۔ اب بھی وقت ہے لوٹ آؤ ہماری طرف زندگی کی طرف۔“

مگر میں تو گردن تک تمہاری چاہت میں غرق تھی کیسے نکلتی؟ بھی سوچتی میری چاہت کی عمر کتنی ہے؟ ڈرینگ ٹیبل کے آئینے سے جھانکتے میرے سفید بال کہتے۔ ”اٹھارہ سال۔“ ہاں ارضی عباس تمہاری طویل ابدی جدائیوں نے مجھے قلیل از وقت بوڑھا کر دیا۔ میرے چہرے کی شادابی محل لیکروں میں بدل گئی۔ گھیرے چمکتے بال چاندی کے تار بن گئے صرف پینتیس سال میں ہی بوڑھی ہو گئی۔ مگر سر خرد تھی اپنی وفا میں محبت کو ایمان بنا کر چاہت میں خود کو مٹا کر روزِ حشر میں تم سے ملنا چاہتی تھی فخر و غرور کے ساتھ اور اپنی تمام ریاضتوں اور کٹھنائیوں کے صلے میں اپنے رب سے ملنا چاہتی تھی تمہیں ایک طویل اور سیاہ تنہیری رات کے بعد تو میرا حق بنا تھا ناروٹن اور چمکیلی سحر پر جس کے انتظار میں میں زندگی کی قید

بے معیاد کاٹ رہی تھی۔

”ماں ایسے ہی کہوں گی بہت برباد کر لی اس نے اپنی زندگی۔ بہت روگ لگا لیا اپنے آپ کو وہ شخص اپنی خوشیوں میں مست اور مگن ہے اور یہ قطرہ قطرہ ہر پتی رہی ہے۔“

”کیسی عجیب بات کی ہے ابھی رازیہ نے اُن ہوئی، ناممکن کتنی ہے ارضی عباس زندہ ہے۔ اس کے بچے کالجوں میں پڑھتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے خود اس کی موت کی خبر اخبار میں پڑھی تھی مرنے ہوئے بھی کبھی زندہ ہوئے ہیں؟ میں نے بہت کہا ہے رازیہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ کوئی اور ارضی عباس ہوگا۔ مگر وہ کہتی ہے نہیں ماہا وہ وہی ہے تمہارے والا۔“

”میرے والا؟“ میں زیر لب بڑبڑائی۔ دور کہیں سے آواز آئی۔ ”کچھ طبیعت خراب ہے زندگی میرا انتظار کرنا“ ہنسنے تک لوٹ آؤں گا۔

”نہیں رازیہ نہیں وہ کوئی اور ہوگا۔“ میں نے بڑے تین سے کہا۔

”تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا؟ میں ابھی آرہی ہوں تمہیں اس کی کوئی پرلے چلتی ہوں گرین ٹاؤن میں اس کی عالی شان کوئی ہے جہاں وہ بڑے ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ اسے تو یاد بھی نہیں کہ اس نے کسی کو خواب دکھائے تھے کچھ تعبیریں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ کسی کی خوشیاں اس پر قرض ہیں ایک تم ہو کہ اس کی خاطر اپنی سنہری جوانی کو دھول کی طرح اڑا دیا۔“ رازیہ نے غصے میں فون بند کر دیا اور میں سائیڈ ٹیبل پر پڑی ارضی عباس کی بڑی سی مسکراتی تصویر کو دیکھ کر سوچ رہی ہوں یقیناً رازیہ کو دھوکا ہوا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں اس کی گہری آنکھوں میں تو سچائیاں اور وفا میں جگمگاتی تھیں اور چرچ بولنے والی آنکھیں با وفا ہوتی ہیں اور با وفا لوگ راستے نہیں بدلا کرتے۔

”ماہا! ماہا! رازیہ دور سے پکارتی آرہی ہے۔ میں ویسے ہی چل پڑی تھی خود کو سنوارنا تو میں نے برسوں بیٹے چھوڑ دیا تھا۔ رازیہ ڈرائیو کر رہی ہے اور میں خالی خالی نظروں سے سڑک کو دیکھ رہی ہوں آج تو میرے ارد گرد سوچوں کا حصار بھی نہیں۔ میں اپنے



آپ کو تنہا تنہا محسوس کر رہی ہوں سوچنے کو کچھ بھی نہیں بچا۔ کیوں سوچوں؟ راز یہ نے بات ہی ایسی ناقابل فہم کی ہے۔ بھلا ایسے ہو سکتا ہے کہ وہ زندہ ہوتا اور ملنے نہ آتا؟ میرے بنا تو وہ ایک دن نہ رہ سکتا تھا کجا انہیں برس! چانک کا رایتک جھٹکے سے رکی۔

”اترو ماہا۔“ راز یہ نے چونکا دیا۔ میں حیران حیران اتری بہت خوب صورت لان اور بیلوں اور پھولوں سے سجی ہوئی کٹھی ہے۔ پیشانی پر بڑا بڑا ’العباس‘ لکھا ہوا ہے۔ راز یہ نے خود ہی بیل کی اور میں مجھے تو کچھ ہور ہا تھا۔ سیاہ تختی پر سہرے ابھرے حروف میں لکھا ہے۔ ”سید ارتضیٰ عباس رضوی۔“ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انہیں برس پہلے والی نیم پلٹ پیہاں کیسے آگئی؟ ایک نو جوان لڑکی نے ڈور کھولا راز یہ نے پوچھا۔

”ارتضیٰ عباس ہیں؟“

”نہیں وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔“

”کب آئیں گے؟“

”بس آنے ہی والے ہیں..... اگر آپ کو انتظار کرنا ہو تو ڈرائنگ روم کھول دوں؟“

”آپ اُن کی کون ہیں؟“ میری آواز خود مجھے اجنبی لگی۔

”میں اُن کی بیٹی ہوں، روینہ ارتضیٰ۔“

میں نے راز یہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”چلو راز یہ گھر چلو۔“

”ارتضیٰ سے نہیں ملو گی؟“

”نہیں۔“ میں تیز چلتی گیٹ کی طرف آنے لگی میرے اندر جیسے ہر شے تہ دبلا ہو رہی ہے سانسیں اٹک رہی ہیں میں کئی برسوں سے کمرے کی مٹن کی عادی ہو گئی ہوں نا باہر کی ہوائیں رنگ و خوشبو میرے لیے اجنبی ہو گئے ہیں۔ میں جلد از جلد اپنے تاریک بیڈروم میں پناہ لینا چاہتی ہوں اندھیروں میں اپنا وجود کم کر دینا چاہتی ہوں۔ روشنیاں مجھے راس نہیں

آتیں نا آشنا ہوائیں مجھے بے قرار کرتی ہیں۔ میں گیٹ تک پہنچی ہوں کہ ایک کار دھیرے سے اندر داخل ہوتی ہے۔ آف ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص کون ہے؟ ایسا لگا جیسے قیامت آگئی ہو صور پھونک دیا گیا ہو ہر شے ریزہ ریزہ ہو کر ٹکڑی ہو رہی ہو۔ اس نے بھی چونک کر راز یہ کو دیکھا، پھر پہچان کر کار روک کر اترا۔ اس نے مجھے نہیں پہچانا میں بہت بدل چکی تھی نا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گزریے ماہ و سال نے اسے گر لیس فل اور سو پر بنا دیا تھا۔ وہ اپنے پورے قد کے ساتھ میرے سامنے کھڑا اب میری طرف دیکھ رہا تھا بے پناہ حیرت لیے۔ اب اس نے مجھے پہچان لیا تھا میری روح میں سیکڑوں نیزوں کی انہاں بیک وقت پیوست ہو گئی ہیں۔ جسم و جاں جیسے دہکتی آگ کی لپیٹ میں ہیں۔ دماغ میں جھجک سے چلنے لگے ہیں کانوں میں بے پناہ شور قیامت خیز آوازیں گونجنے لگی ہیں۔

”زندگی عید مبارک۔“

”ماہا سوچا ہے متعلق سنجیدگی سے زندگی کی طرف لوٹ آؤ۔“

”ماہا تم میرے لیے بنی ہو آسمانوں سے میرے لیے اتاری گئی ہو۔“

”ماہا پھر چھائیں کے پیچھے بھاگنا دلو انگی ہے۔“

”زندگی تم نہیں تو سانسوں کو بھی ٹھکرا دوں گا۔“

”ماہا تم اسے بھول کیوں نہیں جانتی ہو؟“

کتنی آوازیں باز گشت بن بن کر مجھ پر جھپٹ رہی ہیں۔ میں بمشکل ہوش مجتمع کرتے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر گزریے وقت نے کوئی اثر نہیں ڈالا وہ وہاں ہی ہے پُرسکون آسودہ تروتازہ اس کی آنکھوں میں اب بھی روشنیاں جگمگاتی ہیں۔ پچھڑی محبتوں اور بیتے دنوں کی کوئی کسک اُس کے چہرے پر نہیں۔ میرا ذہن چیخ رہا تھا کیوں ہوتا ہے ایسا.....؟ یہ کیوں کیا ہے؟ یہ سب اندھیرے میرا ہی

نصیب کیوں بنے؟ قدرت کی طرف سے سزاوار نصیب میں ہی کیوں ٹھہری؟ میری غلطی تو صرف اتنی تھی کہ اس کی لغائی کو حرف آخر مجھے بھی اُسے روک جان بھالیا مگر میں تو کم تھی نادان تھی مجھے اس نے خواہ کیوں دکھائے اعتبار کیوں دلایا وعدے کیوں کیے؟ اور اب ٹھک ٹھاک میرے سامنے کھڑا تھا مگر وہ شوخ و چٹیل اتنی ٹھکھلائی ماہا کہاں تھی؟ کہاں کھو گئی؟ کس دوراے پر جدا ہو گئی وہ ماہا ملک جس کو ایک نظر اسکرین پر دیکھنے کے لیے لوگ منتظر رہتے تھے کہاں ہے؟ اور ارتضیٰ عباس نے ماہا کی جدائی کو کوئی اہمیت نہیں دی کوئی روگ نہیں لگایا کوئی جوگ نہیں لیا بلکہ اس کے چہرے کی آسودگیاں بتاتی ہیں کہ اس نے زندگی کے لمحے لمحے سے انجوائے کیا ہے قطرہ قطرہ خوشیاں کشید کی ہیں بہاریں لوٹی ہیں۔

”بابا بابا بابا بابا۔“ میرے چاروں طرف سے قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے چونک کر دیکھا دیواریں مجھ پر ٹپس رہی ہیں پھول بھی پتے بھی فضا کی بھی ہوائیں بھی ایک ایک چیز مجھ پر خندہ زن ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ میری ہسی اڑا رہا ہے۔ مجھے پاگل دیوانی بے وقوف کہہ رہا ہے۔

”نہیں نہیں۔“ میں چیخ اٹھی تھی۔ ”دیواروں مجھ پر مت ہنسو میرے سچے جذبول کا مذاق مت اڑاؤ۔“ پھولوں سنو خاموش ہو جاؤ خدا کے لیے راز یہ ان کو خاموش کراؤ۔ دیکھو خدا کے لیے مجھ پر مت ہنسو میں نے دھوکہ کھایا ہے۔ میں پتھر کو ہیرا سمجھ کر پوجتی رہی ہوں میرا کوئی دوش نہیں۔ میں خدا کی بے نیازیوں کا رونا روٹی رہی ہوں۔ مجھے کہاں معلوم تھا کہ وفا میں روندنے کے لیے اور جذبے مٹانے کے لیے ہوتے ہیں۔ میں بے وقوف بنتی رہی ہوں مجھے دھوکہ دیا گیا ہے۔“

میں سسک رہی تھی۔

میرا ہنستا ہنستا گھر میری جوانی میرے سہرے

لحات اور میری ماں میری دھکی ماں وہ مجھے اپنے دکھ سنانا چاہتی تھیں اپنے غموں میں شریک کرنا چاہتی تھیں۔ میں سنوں گی بابا کے تغافل بابا کی بے مہرباں ماں کی تنہائیاں۔ میں اس کے دکھ بانٹوں گی۔ لاؤ وہ تمام سال جو میں نے تڑپ کر رو کر سسک کر گزار دیے۔

میں دونوں ہاتھ پھیلائے چیخ رہی تھی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ میری ہسی اڑا رہا تھا۔ زمین و آسمان ہوائیں قہقہہ لگا رہی تھیں۔

میں تڑپ کر گیٹ سے باہر بھاگتی ہوئی نکل گئی۔ سڑک پر ایک مسافر جا رہا ہے میں بھاگ کر اس کا کندھا تھام لیتی ہوں۔ میرے بال بکھر کر اڑ رہے ہیں میرا چہرہ وحشت زدہ ہے۔ میری آنکھیں دکھوں سے لہلہاں بھری ہیں اور میں کہہ رہی ہوں ”خدا کے لیے میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے۔“ وہ پیچھے ہٹ گیا ہے اس نے مجھے پاگل سمجھا ہے۔

”نہیں“ میں پاگل نہیں ہوں میں دیوانی نہیں ہوں۔“ میں چلا رہی ہوں۔ ”میں نے دھوکہ کھایا ہے مجھے فریب دیا گیا ہے میرا پورا جیون لوٹ لیا گیا ہے۔“

میری آواز درد و کرب سے پھٹنے لگی ہے۔ اب میں چیختی ہوئی..... سڑک پر دوڑ رہی ہوں۔ میرا دوش اڑ گیا ہے جوتی پاؤں سے نکل گئی ہے اور میں ایک ایک راہ گیر سے کہہ رہی ہوں۔ ”دیکھو میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے۔“

اب مجھے آزاد کرے۔ میرے ساحر سے کہو.....

میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے۔“





# بس نہی اچانک

عالیہ چرا

سننا تھا وہ بھی سب سے پُرانی کہانیاں  
شاید رفاقتوں کی ضرورت اُسے بھی تھی

امی نے جونہی بچن میں جھانکا، ان کا خون کھول اٹھا۔ بچن کا وٹسر پڑے میں چائے کے کپ رکھے تھے، جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ قریب ہی سموے اور چپس کی پلٹیں تھیں اور خود غبرین تیزی سے چائے کی کٹیل چکا رہی تھی۔

”پہلے یہ چائے اندر پہنچا دے تا مراد پھر پتیلی کو غسل دیتی رہنا۔“

”بس امی! دو منٹ! ہاتھ کے ہاتھ کام نہ لانا چاہئے۔ شاز بہ چوہدری کی ہیروئن بھی تو.....“

”آگ لگے تیرے افسانوں کو اور ان کی ہیروئنوں کو کم بخت! یہ تو دیکھ اندر آئے مہمانوں کو کتنی دیر ہو گئی ہے بیٹھے ہوئے۔ پہلے موٹی نے دیر کر دی، سوئے یہ سہاگہ تو نے کر دیا۔ چل جائے لے کر۔“ انہوں نے اس کی ساری خوشی پر پانی پھیر دیا۔

”امی! آپ بھی بس نا۔“ شاکی نظروں سے دیکھا۔ جواباً امی نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور وہ ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی، جہاں امی کی سبیلی مع اپنے تین بچوں کے آئی ہوئی تھیں۔

آج کل اس پر گھر داری کا بھوت سوار تھا۔ چند دن پہلے ہی بی بی اے کے پیپر زدے کر فارغ ہوئی تھی۔ رسالے پڑھ پڑھ کر اسے بھی شوق ہوا افسانوی ہیروئن بننا جائے۔ سنا، پڑھا تھا کہ سکھ سلیقہ مند، صوم و صلوة کی حامل لڑکیوں کو سب پسند کرتے ہیں۔ ان کے رشتہ بھی جلدی طے ہو جاتے ہیں، ایسی لڑکیاں آئیڈیل ہوتی ہیں اور دور پار کے رشتہ دار جب ان کے ہاں آکر قیام فرماتے ہیں تو انہیں ایسی لڑکیوں سے محبت ہو جاتی ہے۔

وہ سوچتی اور اندر ہی اندر شرماتی کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ بس ابھی آیا ہی جا رہا ہے۔



وہ گھریلو امور میں فوراً ہی طاق، مشاق ہونا چاہتی تھی اور اسی تیزی کے چکر میں سب کچھ غلط سلط ہو جاتا۔ اس سے بڑی آپا تھیں جن کی پچھلے سال شادی ہوئی تھی۔ اس سے چھوٹی فریج تھی، پھر دو چھوٹے بھائی تھے دو بڑے۔ بڑے بھائی جاوید کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنی بیگم کے ساتھ الگ رہتے تھے۔ اس چھوٹے سے چار کمروں ایک ڈرائنگ روم اور چھوٹے سے صحن والے گھر میں جیلہ بھائی کا دل ہی نہیں لگا، لہذا اپنے ابا کے ایک خالی فلیٹ کو لے کر اس میں رہائش اختیار کر گئی اور اب کبھی بھی ملنے آتے تھے۔

چھوٹے بھائی تو شادی کے نام سے ہی بدک جاتے تھے۔ ابو بینک میں جاب کرتے تھے۔ دو چھوٹے بھائی بڑھ رہے تھے فریج انٹر میں تھی۔ آپا موجود تھیں ان کی موجودگی میں کبھی بچپن میں کچھ پکانے کی خواہش ہوتی نہ شوق تھا۔ امی اور وہ ہی مصروف بچن رہتیں اور طرح طرح کے کھانے پکاتی تھیں۔ اکثر فریج ان کے ساتھ مل جاتی، اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاں صفائی ضرور کر لیتی تھی یا کبھی کبھی واشتیک مشین لگائی۔ فارغ وقت میں رسالے پڑھا کرتی تھی۔ آپا کی منگنی دو سال پہلے تایا کے گھر ہوئی تھی۔ اور اب اس نے بی اے بھی کر لیا تھا، اس کا کہیں رشتہ ہی طے نہیں ہوا تھا۔ اسے خیر اس بات کی پروا نہیں تھی۔

آج کل وہ اور اس کی دوست سارہ خود کو گھریلو امور میں ماہر کر رہی تھیں۔ منگنی اس کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں فریج کے لیے خالہ نے بہت پہلے رجحان کے لیے ہاں کر رکھی تھی۔

□□□□

”کتنی بار کہا ہے تجھ سے اتنے کام ایک ساتھ مت کیا کر۔ ایک لمحہ کام مکمل نہیں ہوتا۔ ایک

اچھی تھی، رنگت بھی کھلتی ہوئی تھی۔ قد بھی خوب صورت ہوتا سا، گنے سیاہ بال تھے۔ پھر؟ وہ خواہ تو وہ ہی اداس ہونے لگیں۔ آج کل تو خاور کے لیے لڑکیاں دیکھنا شروع ہوئی تھیں، خاور اور عزیز کی شادی ایک ساتھ ہی کر دیتی ہوں۔ خاندان میں کسی کو خیال نہیں، پھر دو بیٹیاں تو خاندان میں ہی گئی ہیں۔ صفورا اور فریج، عنبر کے لیے باہر ہی سہی۔ خود سے باتیں کرتی جارہی تھیں اور تسلی دیتی جارہی تھیں۔

”ارے سنتے ہیں آپ، کیا ہوا آپ کے کمال صاحب کا؟ کسی رشتہ کے بارے میں بتا رہے تھے۔“ انہوں نے صحن میں لگے پودوں کی کاٹ چھانٹ کرتے اپنے صاحب کو دیکھا۔

”ہوں۔“  
”انہوں نے دوبارہ بات کی؟“  
”ابو!.....“ ان کے منہ میں پان تھا۔  
”تو پھر آپ نے انہیں گھر کیوں نہیں بلایا؟“  
”ہوں.....!“

”آپ انہیں آج کل میں بلا لیں۔ یونہی بات سے بات گفتی ہے، عنبر کے لیے ڈھونڈنا ہے، کہتی ہوں اسے ملنے جلنے والوں سے۔“

آج کل یہ ان کا من پسند موضوع تھا۔ بے ٹکان بول سکتی تھیں اور یہ دیکھے بغیر کہ مخاطب کا رد عمل کیا ہے یا وہ کس جانب رجحان رکھتا ہے۔  
”ہوں!“ وہ کھربنی ایک جانب رکھ کر کھڑے ہوئے۔ ”کیا کہہ رہی تھیں؟“

”کیا؟“ انہوں نے صاحب کی جانب دیکھا، بشکل اپنے غصہ پر قابو پایا۔ وہ ہاتھ دھونے تلکے کی جانب چلے گئے۔

”عنبر چائے تو بناؤ بیٹا۔“  
”جی ابو۔“ اندر سے آواز آئی۔  
وہ آکر دوبارہ ان کے پاس تخت پر بیٹھ گئے۔

بیٹھے کیا نیم دراز ہو کر انہوں نے اخبار اٹھالیا۔

”کیا کہہ رہی تھیں آپ؟“  
”میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ آج اخبار پورا پڑھ کر ہی ادھر سے اٹھیں گے۔ اگر ایک صفحہ بھی چھوڑا نا تو.....“

”تو؟“ انہوں نے اخبار ہٹا کر اپنی صاحبہ کو دیکھا۔ اور پھر بے اختیار ہنس دیئے۔ یہ اس بات کا سگنل تھا کہ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں اور موضوع سخن پر توجہ نہ دینے پر ناراض ہو گئیں۔

”ظاہر ہے کہ میں خود سے تو اس سے کوئی بات نہیں کر سکتا نا۔ اس نے ایک خیال ظاہر کیا تھا، دوبارہ اس نے بات ہی نہیں کی۔“  
”تو آپ خود سے بات کر لیتے۔ آخر ضرورت تو ہماری ہی ہے نا۔“

”پھر تم کیوں فکر مند ہو رہی ہو؟ جب ہونا ہوگا ہو جائے گا۔ کون سی خاور کی عمر لگی جارہی ہے۔“  
”خاور کی نہیں، عنبر کے بارے میں بھی تو سوچنا ہے۔ اکیسویں سال میں لگ گئی ہے خاندان میں سے تو.....“ وہ چپ ہو گئیں۔

”ابو چائے۔“ عنبر ٹرے میں تین کپ لیے آ گئی۔ ”الاجکی والی خوشبودار چائے..... پیجئے اور بتائیے، کیسی ہے؟“

”یہ تیسرا کپ کس کا ہے؟“  
”ایک ابوکا فرمائی کپ، دوسرا آپ کے میٹ کے لیے، تیسرا امیرا۔“ اس نے اپنا کپ اٹھالیا۔  
”کتنی بار کہا ہے..... دو وقت چائے پیا کر خون جلتا ہے۔“

”اوہ امی، مجھے بھی تو معلوم ہو کہ عنبر یا میں نے کتنی اچھی چائے بنائی ہے۔“ خالد نے بڑی معصومیت سے کہا کہ امی ابودونوں ہی ہنس دیئے۔  
”یہ تم مجھ سے پوچھ لیا کرو مجھ سے۔“ خالد نے



ہر کام میں صفر ہوتی جا رہی ہوں۔ کیا میں پھو ہڑ اور بدسلقہ بھی رہوں گی۔ اللہ نہ کرے..... وہل کر سوچا اور کھڑی ہوئی۔

سیکھ ہی جاؤں گی آہستہ آہستہ۔

□□□□

”ہائے عزیز۔“ سارہ نے اس کے ساتھ چھت پر واک کرتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔ عزیز کی افسوس ناک آہ اس کے ساتھ شامل تھی۔

”اب تو کالج کا راستہ بھی بند ہو گیا۔ اب ہمیں کہاں سے افسانوی شہزادہ ملے گا اب کہاں کا کیو پڈ کا تیرہت۔“

”اور کیا لگتا ہے خاندان والوں کو بھی میں نظر نہیں آتی۔“ مگر اس نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔

”کوئی مجھ سے بڑا ہے بھی تو نہیں۔ سب برابر کے ہم عمر ہم عصر ہم کلاس۔ امی کہتی ہیں کہ عزیز کو غیروں میں بیانا ہے۔ اور غیر تو لگتا ہے جیسے ہمیں نگاہ اٹھا کر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔“ سارہ بھی ہم خیال ہوئی۔

”اور کہانیوں کی ہیروئنوں کو جانے کس طرح ہر لمحہ محبت ملتی ہے۔ کیا ہم لوگ خوب صورت نہیں۔“

”چہ..... چہ..... چہ۔“ دونوں نے خود پر افسوس کیا ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیں۔

”ہم تو خوب صورت ہیں مگر دیکھنے والی آنکھ خوب صورت نہیں۔“

چنب سے امی نے تھپا جاوید بھائی کے گھر بیٹھی ہوئی تھی جب سے بے قرار تھیں۔

”مجھے جاوید کی طرف لے چلو میں پوتی تو دیکھ لوں۔“

یامین صاحب نے اخبار پڑھتے ہوئے انہیں

آ کر کپ لے لیا۔  
”سچ اتنی اچھی جائے بناتی ہو کہ خوشبو کھینچ لاتی ہے مجھے۔“ ایک سب لیا۔

”واہ سچ مزا آ گیا۔ اتنی اچھی چائے چھت سے آیا ہوں۔“

”خالد! خالدا کے بچے۔“  
خالدا نے چوتھے گھونٹ میں کپ خالی کر کے اسے تھما دیا تھا۔

”چہ..... چہ۔“ ابو نے اسے افسوس سے دیکھا اور ہنس دیئے۔

”آئندہ اتنی اچھی چائے مت بنانا۔“ دوبارہ چھت کی چائے رخ کیا اور عزیز نے اسے جاتے دیکھے جا رہی تھی۔

□□□□

امی..... وہ..... وہ۔“ گھبرا کر وہ اندر آئی۔  
”ہاں کیا وہ..... وہ.....“ لگ گیا نہ سالن۔ کتنی بار کہا ہے کہ ایک طرف دھیان رکھا کر یہاں تک بدبو آ رہی ہے۔ کہاں تھی تو؟“

”وہ..... امی۔“ سر جھکا لیا۔ انہیں کیا بتاتی کہ سالن چڑھا کر اس نے آٹا گوندھا پھر چائے بنا کر قادر بھائی کو دی اپنے کمرے میں جا کر الماری کھولی کسی کام سے تو فریج کا کبڈ خراب ہو رہا تھا۔ یہ لڑکی تو افسانوی محبت..... دو ہاتھ مار کر ٹھیک کر دیتی ہوں۔ ان دو ہاتھوں کے چکر میں سالن جل گیا۔ اور..... اور اب امی کے دو ہاتھ اسے پڑ رہے تھے جو انہوں نے جاتے جاتے اسے جڑ دیئے۔

”اف اللہ۔“ دھم سے صوفے پر گر گئی اور سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ سلیقہ شعار بننے کے چکر میں میں کہیں پھو ہڑ تو نہیں ہوتی جا رہی۔ ہر کام غلط ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں ان رائٹرز کی ہیروئنیں کس طرح برقی رفتاری سے کام نمٹا لیتی ہیں۔ اور میں؟



”نہیں بہن! ابھی دیکھ رہے ہیں۔ دو چار رشتے

دیکھا۔

”خالد کے ساتھ چلی جاؤ۔“

”ہوں!“ وہ کچھ سوچ کر غبر کو دیکھ کر رہ گئیں۔

پھر تمام وقت ان کی نظریں غبر پر ہی رکھی رہیں۔ اور انہیں ایک بے چینی نے اپنے حصار میں لے لیا۔

□□□□

”آؤ غبر! ابٹن لگائیں۔ میں نے بڑی محنت سے کیوں کے چھکوں کو پیس کر بنایا ہے..... اور مختلف چیزیں ملائی ہیں۔“

”جی!“ غبر چھلانگ مار کر سیڑھیاں اتری اور ادھر ہی صحن کے کنارے امرود کے درخت کے نیچے بیٹھ کر دونوں ابٹن سے طعج آزمائی کرنے لگیں۔

”سارہ! اس رشتے کا کیا ہوا جو تمہارے لیے یہ جھوٹا سا قافلہ نئے مہمان سے ملنے پہنچا۔“

جیلہ بھابھی گھر آ چکی تھیں۔ ان کی امی، بہنیں اور کرنل وغیرہ آئی تھیں۔ ان کی پونی بہت خوب صورت تھی۔ بسم اللہ کہہ کر گود میں بھر لیا۔ سدرن کو دیکھ کر جیلہ بھابھی کی امی کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

پچھلے غبر اور فریحہ کھڑی تھیں۔

غبر کو دیکھ کر ایک دم دماغ نے کلک کیا ورنہ تو بھری بیٹھی تھیں (آجائے ذرا جاوید کی ماں اچھی طرح سے سیدھا کروں گی یہ دیا ہے بیٹے کی محبت کا صلہ دو دن بعد ادھر جھانکا ہے) مگر مطلبی سی مسکان ہونٹوں پر سجا کر زہر کا ٹھونٹ بھرا۔

ان کے بھائی کے لیے غبر بہت مناسب تھی۔

خوشدلی سے ملیں۔

فریحہ نے گڑیاسی بیٹی کو گود میں بھر لیا۔

”اتنی کیوٹ! اتنی پیاری۔“ غبر بھی اس پر جھک گئی تھی۔

تھوری دیر بعد وہ ملنے ملانے کی رسموں کے بعد کچھ دیر بعد مطلب پر آ گئیں۔

”غبر! کہیں رشتہ وغیرہ طے کیا؟“

”جی!“ غبر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔



ہو جاتا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ ہماری چاہت اور محبت کے رشتے میں دراڑ پڑے۔“  
”تم اس سے بات کر کے دیکھو۔“  
”سارہ۔“ تعجب آمیز حیرت سے اسے دیکھا۔  
”فریجہ سے کیا بات کروں میں؟“  
”یہ ہی کہ.....“ سارہ سے بھی جواب نہ بن پڑا۔

”ایوب کے اور میرے درمیان سوائے کزن کے اور کوئی جذبہ نہیں ہے اس کے لیے ہو تو اور بات ہے مگر میں کزن کے بعد اسے صرف فریجہ کا منگیتر سمجھتی ہوں اور بہنوئی کا درجہ دیتی ہوں فریجہ بھی میرے بارے میں بدگمان ہوگی۔ میں اس کی بدگمانی تو دور کر سکتی ہوں مگر بدگمانی پر یقین کی مہر نہیں لگا سکتی۔“ اس کا انداز سختی اور لہجہ یقینی تھا۔  
”اور مجھے ایسی خوش قسمتی نہیں چاہئے جو جدائی کا راستہ دکھا دے۔“

”ہوں!“ سارہ نے کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھا جو اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں مگن تھی۔  
”آپنی! ایک بات کہوں؟“ رات بڑے دن بعد فریجہ اس کی قریب بیڈ پر آکر بیٹھی۔  
”ہوں کہو۔“ آج کل چونکہ اس کا شوق مطالعہ تھا کتاب کو بند کر کے اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

”آپ نے امی کو انکار کیوں کیا؟“  
”فریجہ!“ بحر استعجاب سے اسے دیکھا۔  
”انکار کیوں کیا؟“  
”کیا تم میری جگہ ہو تیں تو اقرار کر لیتیں اس شخص کا گھر بسائیں جس کے نام کے خواب تمہاری بہن کی آنکھوں میں روشن ہوں۔“  
اس کے بھٹکے ہوئے سر کو دیکھے گی۔  
”تم اگر ہاں کر بھی لیتیں مگر میں اتنی خود غرض نہیں ہوں۔ اپنی بہن کے خوابوں پر اپنا گھر تعمیر

کر کے تمام عمر احساس گناہ میں مبتلا رہوں۔ تمہارا سامنا کرتے ہوئے شرمندہ رہوں اور نہ ہی میری ذات اتنی ارزاں ہے کہ تو نہ ہی اور سبھی کا صدمہ سہوں میری اپنی شخصیت اپنا انداز ہے۔ اور ایک ایسا شخص میری تمنا نہیں ہو سکتا جو ظرف کا اتنا چھوٹا اور نظر کا اتنا کم زور ہو اور جس کی ثروت فیصلہ اتنی کم زور ہو جو آج میرے لیے تمہیں چھوڑ سکتا ہے وہ کل کسی اور کے لیے مجھے بھی تو چھوڑ سکتا ہے۔ تم افسردہ مت ہو۔“ دھیرے سے اس کا رخسار تھپتھپایا۔ فریجہ کے آنسو رخساروں پر بہہ نکلے۔ اس کی بہن کتنی عظیم تھی اور وہ کیا سمجھتی رہی دھیرے سے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

امی نے اس کا انکار تائی کو بھجوا دیا۔  
اگلے دن فون پر ایوب اس سے انکار کی وجہ پوچھ رہا تھا۔  
”ہمارے درمیان جو رشتہ ہے ایوب بھائی اسے ہی سلامت رہنے دیں کسی اور حوالے سے مجھے کوئی اور رشتہ قبول نہیں اور میں کسی ایسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی جو ایسی صفت کا مالک ہو جو دوسروں کو ہرٹ کرے کل کسی اور کے لیے مجھے بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔“  
”غیر!“

”ایوب بھائی اس سلسلہ کو ادھر ہی ختم کر دیں تو بہتر ہوگا۔ میری بہن میں کوئی خامی نہیں۔“  
”آپنی! میرا مقدمہ کسی کی عدالت میں لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ فریجہ اس کے سامنے آکر چیخی۔  
”میں مرنے نہیں جاؤں گی یہ بڑوں کا ہی فیصلہ تھا۔“ اس کا لہجہ بھرا رہا تھا رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ غبر نے چونک کر اسے دیکھا تھا جو پلٹ کر واپس جا رہی تھی۔

”یہ فریجہ تھی؟“ ایوب پوچھ رہا تھا۔  
”ہاں۔ ایک بات پوچھوں ایوب بھائی؟“

”ہوں۔“  
”فریجہ کے لیے انکار کیوں۔ وہ مجھ سے زیادہ پیاری، کھڑا اور خوش مزاج ہے۔“  
”انکار!“ دھیرے سے آواز ابھری اور پھر فون بند ہو گیا۔ اس نے بھی دھیرے سے ریسیور رکھ دیا۔

امی کو اس کے انکار کا افسوس تھا ایک نہ سہی دوسری سہی اس سے ناراض تھیں۔ غیر معمولی خاموشی نے گھر کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ سارہ بھی آج کل کم آ رہی تھی اس کے کزن کی شادی تھی اور ٹھنڈی آہیں بھر کر وہ اس شادی میں شریک ہوئی تھی۔  
سارے کزن کی ہو گئی شادی۔  
میں رہ گئی..... پچھل.....

اور غبر نے اسے تسلی دی تھی۔ ہمت نسواں مدد خدا..... اور مدد خدا نے ان کا گھر دیکھ لیا تھا۔ جاوید بھائی نے ادھر آنا بالکل بند کر دیا تھا۔ ان کے آئے ہوئے دونوں رشتوں کے لیے انکار جو ہوا تھا۔ امی ابو نے بھی مطلق پروا نہیں کی تھی۔ ان کے بچے ان پر بھاری نہیں تھے اب وہ خوب دیکھ بھال کر بھولانے والی تھیں۔ اب تو فریجہ کا بھی رشتہ ڈھونڈنا تھا۔

لیکن ایک معجزہ سا ہوا۔ اس روز تائی امی اور تائی ابو بڑی بہو اور بیٹے کے ساتھ آ گئے۔ ساتھ میں مٹھائی کے دو ٹوکے تھے آتے ہی انہوں نے رقیہ خاتون کو سینے سے لگالیا اور ابوتایا ابو کے گلے لگ گئے۔  
”ہوتا وہی ہے جو قسمت میں رقم ہوتا ہے مگر بچوں کو شرمندہ ضرور کروانا ہوتا ہے۔“  
”سب ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔“  
”ہم لوگ رشتہ ٹوٹنے سے پہلے ہی جوڑنے آ گئے ہیں۔“

اس خوشی نے سب پر شادی مرگ طاری کر دیا۔ تائی امی نے اٹھ کر سب کا منہ میٹھا کر دیا اور سب کو یقین آ گیا۔  
”ہم شادی کی تاریخ لینے آئے ہیں۔ ایوب جانے سے پہلے شادی کرنا چاہتا ہے تاکہ دیزے وغیرہ کا انتظام ہو سکے۔“  
غبر نے چپکے سے جا کر فریجہ کو گلے لگالیا۔  
”مبارک ہو۔“  
فریجہ نے ہنسیکے ہوئے مڑگان سے اسے دیکھا۔  
”جی محبت رایگاں نہیں جاتی۔“  
گھر کا وہی سماں ہو گیا تھا سب کے چہروں کی رونق لوٹ آئی تھی۔ تین ماہ بعد فریجہ کی شادی طے ہوئی تھی۔  
امی کو بڑا قلق تھا کہ غبر خالی ہاتھ بیٹھی تھی۔ تاہم بالا بالا وہ رشتے دیکھ رہی تھیں۔ کہیں تو بات بن جائے۔  
بھی ایک اور معجزہ ہو گیا۔  
شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں کافی سالوں بعد یہ شادی ہو رہی تھی۔ جینیز کے ساتھ ساتھ اپنے کپڑوں کی خریداری بھی جاری تھی فریجہ بھی خوش تھی۔  
اس پر بہت روپ آیا تھا۔  
ولیمہ والے دن غبر سارہ نے ایک جیسے کپڑے بنائے تھے بس رنگ کا فرق تھا۔ غبر کا رائل بلوکلر تھا اور سارہ کا پنک چوڑی دار پانچامہ اور فنگنگ والی قمیض کے ساتھ ساڑے تین گز کا چننا ہوا دوپٹہ۔  
دونوں ہی بے حد رنگ جیولری اور لائٹ میک اپ کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھیں۔  
اسٹج پر دہن بنی فریجہ اور ایوب بھائی کے ساتھ مووی بنوا رہی تھیں۔ ایوب بھائی اور فریجہ دونوں کے چہرے پر بے مثال مسکراہٹ تھی۔  
رضیہ خاتون اور سارہ کی امی نگہت ساتھ ساتھ



پیشی تھیں۔ ایک عورت نے ذومعنی سے انداز میں  
عبر کے متعلق پوچھا، وہ شاید دلہا والوں کی طرف  
سے تھیں۔

اس وقت جنید خاوری اور نگین آنٹی سب کی  
نظریں اس سچ پر تھیں اور سب کے دل ایک خیال پر  
رقصاں تھے۔

”معلوم نہیں کون ہے؟“ گھٹ آنٹی نے  
صفائی سے منع کر دیا۔

”گھٹ“ رضیہ خاتون نے حیرانی سے  
دیکھا۔

”تم سے ایک بات کہنی تھی۔“ ذومعنی سرگوشی  
کی۔

”کیا؟“  
”تم اپنی عہد کو مجھے دے دو۔ جنید کے لیے۔“

”کیا؟“ وہ حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ اتنی  
اچانک من چاہی بات سنی تو دم بخود رہ گئیں۔

”جنید تمہارا دیکھا بھالا ہے خاور سے دوستی  
ہے۔ اچھی نوکری کرتا ہے، لکھا ہوا سمجھ دار لڑکا ہے،

پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو سالوں سے جانتے  
ہیں گھر جیسی بات ہو گئی ہے۔“

رضیہ خاتون کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔  
”بیٹیوں کے رشتے ایسے مانگے جاتے ہیں۔“

”تم اقرار کرو شادیانے بچہ دوں گی۔“ ان  
کی خوشی دیدنی تھی۔

”مگر ایک شرط پر۔“ انہوں نے شرارت سے  
دیکھا۔

”میرا بیٹا گھر داماد نہیں بنے گا۔“ گھٹ آنٹی  
نے برجستہ کہا۔

”نا..... نا..... نا۔“ انہوں نے بولکھاکر سر  
بلایا۔

اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔  
”ہاں بولو کیا؟“ گھٹ آنٹی نے رومال سے

آنکھوں کے گوشوں کو صاف کیا۔

”اپنی سارہ میرے خاور کے لیے دے دو۔“  
انہوں نے دھیرے سے گھٹ کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ

چونک کر انہیں دیکھنے لگیں۔  
”یہ میری پسند ہے، بس میں عبر کا رشتہ ہونے کا

انتظار کر رہی تھی۔ پھر میری دیکھی بھائی ہے میں  
نہیں چاہتی کہ کوئی دوسری جیل جیسی آئے اور میرا

گھر ویران ہو جائے۔“ ان کا لہجہ آبدیدہ ہونے  
لگا۔

”اللہ نہ کرے۔“ دھیرے سے ان کا ہاتھ تھام  
لیا۔

”تم نے جنید سے پوچھ لیا تھا؟“  
”اور تم نے خاور سے؟“ اور پھر دونوں ایک

ساتھ مسکرا دیں۔  
”سارہ ادھر آؤ۔“ گھٹ نے اس سچ سے عبر کا

ہاتھ تھام کر اتنی سارہ کو ادھر بلایا۔ دونوں کی  
بات پر بے ساختہ ہنس رہی تھیں، دونوں ہی ادھر

آ گئیں۔  
”جی امی۔“ مڑ کر عبر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”عبر کیسی ہے؟“ اسے میں نے جنید کے لیے  
مانگ لیا ہے۔“

”جی.....“ دونوں حیران رہ گئیں۔  
”بڑی ہے کیا؟“

”نہیں بڑی کیسے میری دوست ہے۔ مگر.....“  
”مگر کیا؟“

”مگر مبارک ہو امی۔“ بے ساختہ ان کے گلے  
لگ گئی۔ عبر ایک دم سے گھبرا اور شرما گئی۔

”اے! سنو میرے گھر کا میری امی کا میرے  
بھائیوں کا بہت خیال رکھنا۔“ کان میں سرگوشی کی۔

”جیل بھابھی پر مت جانا۔“  
”بدتمیز!“ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

”ایک خبر اور بھی تو سنو۔“ رضیہ خاتون مسکرا کر

عبر کو دیکھنے لگیں۔ خدا نے اچانک کتنا کرم کیا تھا

حالانکہ وہ کنشی پریشان تھیں دونوں بچوں کے رشتے  
کے لیے ہوا تو اچانک ہو گیا۔ اپنے رب کا جتنا بھی

شکر کرتیں کم تھا۔  
”صغور ابھی ادھر آ گئی۔“

”صغور! سارہ کو میں نے خاور کے لیے مانگ  
لیا ہے۔“

”جی۔“ صغور کے ساتھ ساتھ سارہ بھی چونک  
گئی۔ ابھی کلک کی آواز آئی اور خاور نے ان کا

گروپ فوٹو کھینچ لیا۔  
”اب آیا ہے اونٹ پہاڑ کے نیچے۔“ عبر نے

سارہ کے کان میں سرگوشی کی۔  
”کون سے پہاڑ کے نیچے؟“ خاور کے لہجے

میں شرارت تھی۔ وہ تمام ارادوں سے بے خبر تھا۔  
”میری تمام کڑیوں کا خیال رکھنا، تمام کھلونوں

کا۔ میری کریموں کا اور ان تمام لوشنز کا جو میں نے  
بڑی بچت سے خریدا ہے ہیں۔“

ان کا چھوٹا سا گروپ زعفران زار بن گیا۔  
سب مڑ مڑ کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ سرخوشی ان کے

چہروں پر رقصاں تھی۔  
”سب کو یہ فیصلہ پسند آیا تھا۔ ایک دوسرے کو بھی

مبارک باد دے رہے تھے۔  
”میں فریج کو بتا کر آتی ہوں۔“ عبر ایک دم

سے پلٹی۔  
”کیا بتاؤ گی؟ اپنے بارے میں یا میرے

بارے میں۔“  
”تم تو ادھر آؤ۔“ سارہ کو ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

اور ساتھ ہی وارننگ دی۔  
”اے! خبردار اگر نندتی تو۔“

”اور تم؟“ عبر نے رک کر اسے دیکھا۔  
اس نے شانہ انداز میں کالر جھاڑے۔

”میں تو ہوں ہی نند سارے کھڑاپے دیکھوں

گی۔“  
”کیا..... کیا!“ اسے مکا دکھایا، دونوں

کھلکھلا کر ہنس دیں۔ بے ساختہ خوشی سب کے  
چہروں سے عیاں تھی۔ کچھ فیصلے شاید یوں ہی

اچانک ہو جایا کرتے ہیں۔  
”فریج بھی یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔“

اس سچ سے اترتے ہوئے سارہ اسے بائیں  
جانب اچانک ہی لے آئی۔

”ایک شخص کو یہ خوش خبری سنا دوں جو کب سے  
تمہارا منتظر ہے بہت چاہتا ہے تمہیں اور اس خوشی

سے بے خبر۔“  
”ک..... کون؟“

”یہ!“ اس نے جنید کے سامنے کھڑا کر دیا۔  
وہ ایک دم سے ہلش آن ہو گئی۔

”یہ ہماری برسوں کی خواہش تھی جو اس لمحہ کی  
منتظر تھی۔“ دھیرے سے ہاتھ دبایا۔ اس نے سر

جھکا لیا۔  
”بھائی! مبارک ہو ہم نے اسے اپنے گھر کی

بہو بٹالیا ہے۔“ سارہ جنید کو بتا رہی تھی۔  
”اچھا!“ سینے پر ہاتھ باندھ کر دلچسپی سے

دیکھا۔ ”کب۔“ کیسے؟“ چہرے پر شرارت  
رخساروں پر چمک اور پیغام دیتی جگنوؤں کی

آنکھوں کو دیکھا اور پلکیں جھکا لیں۔  
تاب دید نہ تھی بے ساختہ پلٹی۔

”کدھر؟“ سارہ نے ہاتھ تھام لیا۔  
”تمہارے جرم کی سزا سنانے۔“

”مبارک ہو۔“ جنید کی سرگوشی ابھری۔ پلٹ  
کر اسے دیکھا، روشن قد ملیں اس پر عیاں تھیں۔

”خیر مبارک!“ جواب دیتی وہ سارہ کے  
ساتھ پلٹ گئی۔

✽



آتا ہے خیالوں میں مرے ایک ہی چہرہ  
بس اس کے سوا کچھ بھی مجھے یاد نہیں ہے  
دل جس کی جدائی میں دھڑکتا ہے سرشام  
وہ عام سا چہرہ ہے پری زاد نہیں ہے

ماحول میں اک سکوت سا در آیا تھا اور یقیناً سکوت کسی طوفان کا پیش خیمہ ہی تھا۔ فارحہ نے نظروں ہی نظروں میں بیٹے کو تنبیہ کی تھی۔ درخواست کی تھی مگر آج اس نے ہر درخواست رد کر دی تھی۔  
”جو کچھ بھی ہو چکا ہے وہ ایک الگ بات ہے۔ مگر جو کچھ بھی ہونا ہے وہ ہمارے اختیار میں ہے۔ خرد مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ان مذاکرات کو یہیں اسی موڑ پر اختتام پذیر کر دیں۔ آئندہ پھر بھی نہ ڈسکس کرنے کے لیے کیونکہ ماہا ایسا نہیں چاہتی تھی۔ شاید آپ لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہے۔ جو نا انصافی ہوئی اس کا ادراک ہے مگر ماہا اس غلطی کو دوبارہ دہرانا نہیں چاہتی۔ آپ کو شاید افسوس ہو مگر آپ کو یہ نشست یہیں برخواست کرنا ہوگی۔“

”فارحہ ششدری بیٹے کی سمت تکی چلی جا رہی تھی۔ سید سعید حسن شاہ بخاری کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات بے حد واضح تھے۔ نگاہوں میں حد درجہ غصے کی کیفیت تھی مگر اذہان حسن بخاری کو جیسے اس لمحے کی بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اسی قدر مضبوطی سے اپنے قدموں پر جما کھڑا تھا۔ آنکھوں میں عزم اسی طور پر قرار تھا۔ چہرے پر وہی پرسکون کیفیت تھی۔ وہی سمندر سا ٹھہراؤ تھا۔

”ہمیں آپ کے جذبے کی قدر ہے۔ آپ کا اقدام یقیناً قابل تحسین ہے مگر مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ آپ لوگ تشریف لے جاسکتے ہیں۔“ بے حد مضبوط انداز میں کہتے ہوئے اس نے ایک نظر فارحہ کی طرف دیکھا تھا۔ ان پر سکوت نظروں میں اس لمحے کوئی کیفیت نہ تھی۔ وہ بس پر خیر انداز سے اس کی



سمت نکلتی جا رہی تھیں۔ سید اذبان حسن بخاری کی نظروں میں کسی طرح کا کوئی احساس جرم نہ تھا۔ جیسے وہ اس گھڑی حق پر تھا۔ جیسے کسی اقدام کے لیے غلط اقدام سرزد نہ ہوا تھا۔ جیسے وہ کسی بات کے لیے ذمے دار نہ تھا۔

فارحہ خالی خالی نظروں سے بیٹے کی سمت نکلتی چلی گئی تھی۔

سید اذبان حسن بخاری پلٹا تھا اور پھر باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ سعد حسن بخاری نے سر دونوں ہاتھوں سے تمام لیا تھا۔ کہنے سننے کو جیسے اب کچھ باقی نہ رہا تھا۔

نشت برخواست ہو گئی تھی۔ مہمان اٹھ کر رخصت ہو گئے تھے۔ اس لمحے کمرے میں فقط دونوں تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے نظریں کھڑائے بیٹھے تھے۔ کمرے کا ماحول ساکت و جامد تھا۔ ارد گرد بے حد خاموشی تھی۔ بالکل ویسا سکوت جو کسی طوفان کے آنے سے قبل ہوتا ہے۔

پھر جانے کے بعد!

ایک انہونی تو ہو چکی تھی۔ ایک واقعہ رونما ہو چکا تھا۔

تو کیا کوئی اور طوفان بھی ابھی آنا باقی تھا؟

کتنی سرد مہری تھی اس گھڑی رویوں میں

کتنی برف جمی تھی

اور برف جب پگھلتی تھی تو کتنے بندھ ٹوٹ جانے کا احتمال تھا۔

فارحہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

سید سعد حسن بخاری بنا کچھ کہنے بنا اس کی جانب دیکھے بنا کوئی الزام دینے کوئی فیصلہ سنائے بغیر ہو لے اٹھے تھے نگاہ فارحہ سے یکسر انہنی تھی۔ جیسے وہ اس کے لیے یکسر کوئی اجنبی ہو۔ غیر ہو۔ جیسے کوئی سلسلہ بھی رہا ہی نہ ہو۔

فارحہ دم سادھے اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ سید سعد حسن بخاری نے بہت آہستگی سے قدم اٹھائے تھے اور وقت اس لمحے میں فاصلوں کی کہانی رقم کرتا چلا گیا تھا۔ خاموشی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اک سکوت نے ماحول کو چاروں سمت سے لپیٹ کر اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

کچھ کہا نہیں گیا تھا۔

کچھ سنا نہیں گیا تھا۔

کہیں کوئی فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا۔

بس اک خاموشی تھی۔ طویل خاموشی۔

اور اس چپ کے کتنے اسرار تھے۔

سید سعد حسن بخاری بہت خاموشی سے رخ موڑے کمرے سے نکلتے چلے گئے تھے۔ فارحہ کی آنکھوں میں یکدم ہی نمی گھر کرنے لگی تھی۔

☆☆

رات بہت سرد تھی۔ بخ پستہ ہوائیں رگوں میں خون منجمد کیے دے رہی تھیں مگر وہ کسی طرح کے احساس سے ماورا اس گھڑی میسر پر تھی۔ شانوں پر شال نہ تھی۔ نہ یہ خدشہ تھا کہ کوئی آنے گا اور بہت ہو لے سے

ٹالے پر اپنا ہمدرد ہاتھ دھردے گا اور ان ہاتھوں کی پیش کش سمیٹ لے گی سب کچھ۔ سارے خدشے سارے

دھڑکے سارے خوف چن لے گا سارے غمی احساس ساری کلفتیں بانٹ لے گا۔ وہ بڑی ساکت سی گھڑی تاروں سے بھرے آسمان کو یک یک دیکھے جا رہی تھی۔ آف وہائٹ شیشون آئینے کے تزیینات ساہو اسنگ لہرا رہا تھا۔ خود میں اس قدر گرم تھی کہ نہ کان کوئی آہٹ سن سکے نہ کسی چپ کو محسوس کر سکے یا پھر آنے والا ہی بہت دیر سے قدموں آیا تھا۔

سردار سنگین حیدر لغاری نے اس قطعے پر تاثر نظر آنے والی کو بہت سرسری انداز میں دیکھا تھا۔ نگاہ بڑی بے تاثر تھی۔ پھر بہت آہستگی سے قدم اس کی جانب بڑھا دیے تھے۔ دو مضبوط بھاری قدموں کی آہٹ اس کی سمت تھی۔ مگر وہ اسی قدر غافل تھی۔ سردار سنگین حیدر لغاری لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے مقابل آن رہا تھا۔ میرب سیال اس لمحے بھی نہیں چوکی تھی۔ فاصلہ بہت زیادہ بھی نہیں تھا۔ فقط چند قدم کی بات تھی۔

سردار سنگین حیدر لغاری نے بخ پستہ ہواؤں کے رخ پر گھڑی اس یکسر غافل لڑکی کو دیکھا تھا۔ جو خود سے ہی نہیں اپنے ماحول سے بھی اجنبی تھی۔

شاید آنے والے کو پہچان کے حوالے از بر نہ تھے۔ آ تو گیا تھا مگر مخاطب کیا ہونا چاہیے تھا؟ یہ معلوم نہ تھا۔ شاید اسی لیے ان لبوں پر جامد چپ تھی۔ رویوں میں کسی درجہ سرد مہری سہمی مگر کچھ تاثر ان قربتوں میں درج تھا کہ میرب سیال یکدم ہی چوکی تھی۔ نگاہ اس سامنے کھڑے شخص پر اٹھی تھی، انداز کسی قدر چونکنے والا تھا، کچھ حیرت بھی شامل تھی ان آنکھوں میں مگر سامنے کھڑے شخص کی نگاہ ہی نہیں چہرہ بھی بہت حد تک بے تاثر تھا۔ میرب سیال کے متوجہ ہونے پر وہ لمحہ بھر کو اپنی نگاہ اس پر سے ہٹا گیا تھا۔ پھر اسی سرد مہر انداز میں اس کے لب ملے تھے۔

”میں کل نیویارک جا رہا ہوں۔“ اطلاع دی گئی تھی۔ ”تو پھر؟“ لبوں سے کچھ نہ کہا تھا مگر نگاہوں نے اس شخص کی سمت تکتے ہوئے استفسار ضرور کیا تھا۔ سردار سنگین حیدر لغاری نے چند لمحوں اسی طرح خاموشی کے ساتھ ان بخ پستہ ہواؤں کو محسوس کیا تھا۔ میرب سیال اسی قدر خاموشی سے کسی نئی اطلاع کے لیے منتظر تھی۔ بھی وہ کو یا ہوا تھا۔ ”مائی اماں کا حکم تھا آپ کو بھی اپنے ہمراہ لے لوں۔ ضروری تیاری کر لیجیے آپ ہم کل نیویارک جا رہے ہیں۔“

”کیا؟“ وہ بے طرح چوکی تھی مگر وہ بنا اس کی سمت دیکھے اس استفسار کی کوئی تاویل دیے چل دیا تھا۔ میرب سیال حیران سی اس شخص کی چوڑی پشت کو تک رہی تھی۔ جو اس گھڑی لمبے لمبے ڈگ بھرتا بہت خاموشی سے اس کے اور اپنے مابین فاصلوں کی کہانی رقم کر رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ اس ایک حکم پر خوش ہو۔ اطمینان ظاہر کرے اسے اپنا دوست اپنا ہمدرد اپنا ہم نفس جانے اس کے اس اقدام پر اسے سراسر بے باک اقدام بگاڑی کو جانچے۔ فوری طور پر وہ کوئی تاثر ظاہر کیے بغیر اسی طرح گھڑی رہی تھی جو بھی تھا کسی کو اس کا خیال تھا یا نہیں تھا یہ بات تسلی بخش تھی کہ وہ پاپا کو دیکھ سکے گی۔ ان لمحوں میں ان کے قریب ہوگی۔ جب انہیں اس کی ضرورت ہے۔ شاید اسی لیے دل نے کوئی تعرض نہیں برتا تھا۔ بلکہ کسی قدر اطمینان نے دل میں ڈیرا ڈال دیا تھا۔ وہ بہت آہستگی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی تھی۔ جانے سے قبل سینی سے بھی توملنا تھا۔ اس سے بھی تو بات کرنی



تھی۔ اسے مطلع بھی تو کرنا تھا۔

”مہی مون پر جارہی ہو؟“ اس نے نیند سے بیدار ہوتے ہی حیرت کا زبردست اظہار کیا تھا۔ میرب سیال کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹے چھوٹے بچا تھا۔

”شٹ اپ سیفی ڈونٹ بی اسٹوپڈ۔“ پر سخت انداز میں اسے ڈپٹا تھا مگر دوسری طرف سیفی مسکرا دیا تھا۔

”معاملہ کیا ہے؟“

”تم پہلے اچھی طرح بیدار ہو جاؤ۔“ میرب نے ایک بار پھر ڈپٹا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

”وہ تو میں ہو جاؤں گا۔ مگر تم کس خوشی میں جاگ رہی ہو اب تک۔ آخر شکاری کرنے کا قصد کر لیا ہے کیا؟ یا پھر شب بے داری کا ارادہ ہے؟“ وہ قطعاً طور پر غیر سنجیدہ تھا اور میرب سیال کا دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہتا تھا۔

”سیفی! میں نیویارک پاپا سے ملنے جا رہی ہوں۔“

”اور محترم سردار صاحب؟“ سیفی کی شوخی بدستور قائم تھی۔

”وہ میرے ساتھ جا رہے ہیں۔“

”تم ان کے ساتھ جاؤ یا وہ تمہارے ساتھ جائیں؟ بات تو ایک ہی ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جا رہے ہو۔“

”سیف الرحمن اب جاگ جاؤ۔“

”خوشی ہو رہی ہے؟“ سیفی بدستور مسکرا رہا تھا۔

”کس بات کی خوشی ہوگی؟ پانچلے ہو گئے ہو تم۔ سیفی جانتے ہو کس قدر تنہا ہوں میں اور تمہیں ہری ہری سوچ رہی ہے۔“ میرب سیال نے جی سے کہا مگر وہ نہیں دیا تھا۔

”میرب سیال! جو بھی کہو سردار صاحب ہیں واقعی کمال شخص تمہیں یاد ہے بے جی ہمیں ایک کہانی سنانا کرتی تھیں۔ سردار بنگلیکن نامی ایک بادشاہ کی، جنہیں ہرن کے شکار سے خاصا شغف تھا جو روز و شب صورت ہرنیوں کا شکار کیا کرتے تھے اور ایک دن جب.....“

”شٹ اپ سیف الرحمن۔“ میرب سیال کے صبر کا پیمانہ یکدم لبریز ہوا تھا۔

”سنو تو۔“ سیف الرحمن نے اصرار کیا۔

چند ثانیوں تک خاموش رہا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پر خیال انداز میں گویا ہوا تھا۔

”تمہیں تمہارے سردار صاحب بھی تو ایسی کسی بابی کے شائق نہیں؟“

”سیف الرحمن۔“ میرب سیال نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا مگر دوسری جانب سیف الرحمن کی بولی خاص فکر نہ تھی۔

”جو بھی کہو بی ایم ڈ بلیو اور لیووزن میں گھومنے والا شخص اتنا ہی باور شریف ہو نہیں سکتا۔“

”کیوں۔“ تمہیں سب کچھ اتنا مشکوک کیوں لگ رہا ہے؟ ہوش کے ناخن لو سیف الرحمن بے جی میں تمہاری عقل ٹٹوں میں ہے۔

”دراز تو سردار صاحب بھی ٹھیک ٹھاک ہیں ان کے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟“ وہ مسلسل چھیڑتا تھا۔

میرب سیال خاموشی سا دھنگی تھی۔ کبھی دوسری طرف سے گویا ہوا تھا۔

”واپس کب لوٹو گی؟“

”کچھ ہی دنوں میں سیف تم دعا کرنا۔“

”لو یہ بھی کوئی کہنے والی بات ہے میں تو ہمیشہ ہی تمہارے لیے دعا گو رہتا ہوں۔ خدا تمہاری جوڑی سلامت رکھے۔“ دودھوں نہاؤ پوتو پچلو۔“ وہ ایک بار پھر پیڑی سے اتر چکا تھا۔ میرب سیال کچھ نہیں بولی تھی مگر دوسری جانب اس کی ہنسنے کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔

”میرب سیال! اتنی دور جا رہی ہوں تمہارا موڈ اچھا کرنا چاہ رہا تھا انشاء اللہ سب اچھا ہوگا تم اپنا خیال رکھنا۔“

”بے جی کیسی ہیں؟“ میرب سیال نے نانی کے متعلق دریافت کیا تھا۔

”ٹھیک ہیں۔ تمہیں یاد کر رہی ہیں۔ دراصل مظہر انکل کے رویے نے انہیں کچھ زیادہ خوش نہیں کیا۔ عائشہ پھوپھو کے بعد انہوں نے فاصلوں کی بہت وسیع خلیج رشتوں کے درمیان استوار کر دی ہے۔ یقیناً یہ اچھا نہیں ہے۔ ہم انہیں بلیم نہیں کر سکتے۔ مگر بے جی اس معاملے کو لے کر خاصی افسردہ رہتی ہیں۔ خصوصاً اب جب کہ میرب تمہارے ہوتے ہوئے اس وقت نہیں اور قیام پذیر ہو۔ بے شک وہ اب تمہاری سرسرا ہے۔ مگر بے جی کو یہ چیز بہت پریشان کر رہی ہے۔ مظہر انکل نے ایسا کر کے یقیناً ہماری اور ہمارے خاندان کی ٹٹی کی ہے۔ جو تعلق تم میں اور ہم میں موجود ہے اسے قطعاً جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ مگر مظہر انکل اس معاملے میں ہمیں خاصا اجنبی تصور کرتے ہیں۔ ہم تو پھر بھی اس صورت حال کو فیس کر لیتے ہیں مگر بے جی خاصی حساس ہیں اس معاملے میں کیوں نہ ہوں ان کی نواسی ہوتی ہے وہ بھی اکلوتی ہو سکے تو تم بھی آکر ان سے مل جاؤ۔“ سیف الرحمن جس قدر سنجیدگی سے اس لمحے بات کر رہا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی سیف الرحمن ہے جو کچھ لمحے قبل اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ میرب سیال نے ہونٹ ہنچ کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”ہوں میں آؤں گی تم میری طرف سے بے جی کو پوچھ لینا۔“ دوسری طرف سیف الرحمن خاموش رہا تھا۔ وہ بھی چند ثانیوں تک چپ رہی تھی پھر بہت آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔

”دراصل میں بھی کبھی اس بے وجہ بے مہری کی وسیع ترین خلیج کو سمجھ نہیں سکی۔ ماما کی موت ایک ایجنڈا تھا اور اس کے لیے ماموں پاپا کو بلیم کرتے تھے اور پاپا ماموں کو پاپا ماما کو لے کر اپنی جگہ پوز سیتے تھے اور ماموں اپنی جگہ تصور ماموں کا جی نہیں تھا غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے بہر حال ماموں تھا اس معاملے میں تصور وار نہیں ہیں۔ رشتوں میں دراز تو پہلے ہی موجود تھی ماما کی موت نے تو اس دراز کو مزید وسعت دی ہے ممکن ہے شاید ایک دن سب بہت اچھا ہو جائے مجھے یہ وقت یہ زندگی کبھی سمجھ میں نہیں آتی تھی شاید کبھی میں تمام معاملات اس وقت کے حوالے کر دیتی ہوں۔ ایک دن سب کچھ بہت اچھا ہو جائے۔ فی الحال میں پاپا کے لیے بہت پریشان ہوں۔ سیفی تم بے جی سے کہنا ان کے لیے دعا کریں، بعض اوقات غلطیاں معاف کر دینے سے کسی کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ پاپا کو اس وقت دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔“ اس کا لہجہ بہت دھیما تھا۔

”میرب! پریشان نہ ہو مظہر انکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ میرب نے فون دھردیا تھا مگر دل پر جانے کیوں اک انجانا سا بوجھ دو کر آیا تھا۔





بات ساری یہ تھی کہ دل بہت مشکل میں تھا۔ جان پر جی ہوئی تھی۔ راہ کوئی نہ تھی، بھائی کچھ نہ دے رہا تھا۔ ایسے میں جو بھی ہوتا وہ ایک ضروری اقدام ہوتا اس ایک لمحے سے بچ نکلنے کا جان کنی کی کیفیت میں کوئی کیا کرتا ہے کیا کر سکتا ہے؟  
فی الفور اس نے بھی یہی کیا تھا۔

اس کے گھر کی ڈور تیل پر ہاتھ دھرتے ہوئے اسے علم نہ تھا کہ اس سے اگلا لمحہ کیا ہوگا۔ کیسا ہوگا۔ مگر یہ ایک لمحہ جو اس کے ہاتھ آیا تھا وہ اسے ہارنا نہیں چاہتا تھا۔  
”ایک دو تین۔ چندانے ہی گزرے تھے شاید گیٹ کھلا تھا اور دوسرے ہی لمحے کوئی اس کے مقابل تھا۔ عضنان علی خان مسکرا دیا تھا۔  
”السلام علیکم، مس انابیہ شاہ ہیں؟“

سامنے کھڑے بریگیڈیئر اعظم رحمان شاہ نے اسے سرتاپا بغور دیکھا تھا۔ کسی کے گھر میں پہلی بار آنے کا اتفاق شاید اسی قدر کیفیوڑ کرتا ہے۔ عضنان علی خان جیسا شخص اس لمحے خود کو خاصا چغد محسوس کر رہا تھا۔  
”آپ؟“ اس نے سامنے کھڑے سوئڈ بوئڈ شخص کو بریگیڈیئر صاحب نے بغور دیکھا تھا۔ وہ لب بھینچ کر جیسے اس لمحے زبردستی مسکرایا تھا پھر محض راہ و رسم کو۔  
”جی میں..... میں عضنان علی خان ہوں۔“

”تو اس میں اتنا کیفیوڑ ہونے کی کیا بات ہے۔“ بریگیڈیئر صاحب دھیمے سے مسکرائے تھے۔ عضنان علی خان حیران ہو کر تکتے لگا تھا۔ بھی وہ مسکرا دیے تھے۔  
”اندر آ جاؤ، بر خوردار تم صحیح مقام پر پہنچے ہو۔ میں انابیہ کا دادا ہوں۔“

عضنان علی خان نے سکون کا گہرا سانس لیا اور ساتھ ہی ان کے ساتھ قدم اندر بڑھا دیے تھے۔  
”ساتھ پڑھتے ہو؟“ سرخ بجری کی روش پر چلتے ہوئے اور داخلی دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بریگیڈیئر صاحب نے دریافت کیا تھا۔ عضنان علی خان چونکا تھا۔ پھر مسکراتے ہوئے سرٹھی میں بلا دیا تھا۔  
”نہیں پڑھ چکا ہوں۔ آج کل پرنس کر رہا ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں پڑھنے والی لائف جتنی ایزی اور کمزور فل ہوتی ہے۔ اتنی ہی ٹھ اور ہارڈ بھی ہوتی ہے۔ موٹی موٹی خشک کتابوں سے سرکھپا یقیناً آسان نہیں۔ لیکن اس کے باوجود سب کچھ بہت انٹریٹنگ ہے۔“ مسکراتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔  
بریگیڈیئر صاحب اسے دلچسپی سے سنتے ہوئے مسکرا دیے تھے۔  
”انابیہ سے کب ملے تم؟“

”مگنی پر۔“ بہت بے ارادہ منہ سے پھسلا تھا۔

”مگنی پر؟“ بریگیڈیئر صاحب چونکے تھے۔ عضنان علی خان کو اپنی بدحواسی کا یکدم ادراک ہوا تھا۔  
تبھی لب بھینچ کر بڑی رسائیت سے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ ساتھ ہی بہت ہولے سے گویا ہوا تھا۔  
”آئی مین ایک تقریب میں۔ انابیہ گھر پر ہیں نا؟“ ان کی طرف تکتے ہوئے دریافت کیا تھا بریگیڈیئر صاحب مسکرا دیے تھے۔  
”یقیناً۔“ گلاس ڈور کھولتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئے تھے۔ اسے ایک وسیع و عریض ویل ڈیکورٹڈ



ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا۔ پھر نوکر کو آواز دے کر انابیہ کو بلانے کا حکم دیا تھا اور خود اس کے مقابل آن بیٹھے تھے۔

”برخوردار خاصے اچھے وقت پر آئے ہو تم“ آج ہمارا برتھ ڈے ہے اور انابیہ کو بت سننے پر براؤز دینے کی عادت ہے۔ یہ جو تم گھر میں کچھ بھاؤ دیکھ رہے ہو اسی کے باعث ہے۔ کیک بھی بس کتنے ہی دنوں کے لیے ہے۔ تقریباً ہر سال اسی سادگی سے انجام پاتی ہے۔ اس 65 برس کی عمر میں بھی انابیہ نے مجھے بچہ بنا کر رکھا ہوا ہے اور میں اس کی خوشی میں خوش ہوں۔“ بریگیڈیئر صاحب مسکرا رہے تھے۔ عصفان علی خان اس مسکرا دیا تھا۔ ساتھ ہی کچھ براہمن انداز میں ہونٹ پیچ کر شانے بھی اچکائے تھے۔

”لیکن میں تو آپ کے لیے کوئی گفٹ نہیں لایا۔“

”کوئی بات نہیں لیکن یہ تمہارے ہاتھ میں پیکٹ تو ہے نا۔“ بدستور اس کے ہاتھ میں تھے ہونے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ چونکا تھا۔ پھر مسکرا دیا تھا۔ اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔ بھی وہ پیکٹ ٹیبل پر دھرا دیا تھا۔

”ہاں انابیہ کے لیے ہے۔“ دھیمے سے مسکراتے ہوئے مطلع کیا تھا۔

”لیکن انابیہ کی تو آج برتھ ڈے نہیں ہے۔“ محترم بریگیڈیئر صاحب برجستہ بولے تھے۔ عصفان علی خان نے چونک کر ان کی سمت دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں اس لمحے ایک نرم سا احساس تھا اور لبوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔ یقیناً یہ ایک دوستانہ اقدام تھا۔ وہ یقیناً دوستانہ مزاج رکھتے تھے اور اسے انابیہ کا دوست جانتے ہوئے خصوصی رعایت دے رہے تھے۔ عصفان علی خان مسکرا رہا تھا۔ پھر دھیمے سے گویا ہوا تھا۔

”جانتا ہوں یہ ان کی کتابوں کا کوئی اسٹف ہے جو میری گاڑی میں رہ گیا تھا۔ وہ بھول گئی تھیں۔“ مطلع کرنے سے یکدم اس کی نظر سامنے کی طرف اٹھی تھی جہاں وہ تھی۔ یقیناً اپنے گھر میں اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ کسی قدر حیران ضرور ہوئی تھی۔ نظروں میں کسی قدر حیرت کا احساس بھی چھلکا تھا۔ بریگیڈیئر صاحب نے پلٹ کر اس کی طرف نگاہ کی تھی۔

”آؤ آؤ تمہارا کوئی مہمان آیا ہے۔“ انابیہ جو صوفے کی پشت پر تھی اس کی سمت تکتے ہوئے دھیمے سے مسکرائی تھی۔

”کیسے ہیں آپ؟“ مروغا احوال دریافت کیا تھا۔

”پر فیکٹ آپ کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہوں۔“ وہ اخلاقاً مسکرائی تھی۔ دادا ابادونوں کو بغور دیکھ رہے تھے۔

”یہ آپ کا ضروری اسٹف تھا۔ میں نے لامعہ سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر فیوز کر دیا کہ اس کے پاس وقت نہیں۔ تب میں نے بذات خود انہیں آپ تک پہنچانا ضروری خیال کیا۔“

”آپ نے اچھا خیال کیا۔“ وہ مسکرائی تھی۔ یقیناً وہ اس کی وضاحت کے انداز سے محفوظ ہوئی تھی۔ یہ دادا پوتی اسے خاصا بڑی لے رہے تھے یا پھر وہی اس قدر چنڈ لگ رہا تھا۔ چند ثانیوں تک اپنے اندر تک جھانکا تھا۔ یقیناً یہ مجازاً آسان نہ تھا۔ کیسے ہوں گے سر بہت سے معرکے پانی ہو گئی تھی بہت سے مقامات پر مگر یہ مقام کوئی اتنا غیر اہم تو نہ تھا۔ وہ یوہی تو اس قدر ہونق نہ لگ رہا تھا۔ اندر کے تیور بھی تو کچھ کم مختلف نہ تھے۔ مقام خاص تھا۔ بھی تو اس قدر کمزور واقع ہو رہا تھا۔ یوہی خاموش رہ کر اس نے اپنی ہمتوں کو مجتمع کیا

خدا۔ پھر اسٹا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”آپ نے مجھے دادا جی کی برتھ ڈے کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ اب دیکھیے نا میں اس اہم ترین دن پر کوئی گفٹ تک نہیں لایا۔“ شکوے کا انداز خاصی اپنائیت لیے ہوئے تھا۔ جہاں وہ حیران ہوئی تھی۔ وہیں دادا ابادونوں نے تھے۔

”ہونٹ وری اس کی ضرورت نہیں تم آگئے ہو یہی کافی ہے۔“

”جی جی پی پی ریٹرنز آف دی ڈے۔“ عصفان علی خان نے وش کیا تھا وہ دھیمے سے مسکرا دیئے۔

”ہینکس، تم لوگ بیٹھو میں آتا ہوں ابھی۔“ وہ یقیناً دانستہ وہاں سے اٹھے تھے۔ لیکن ہاں کیک ضرور کھا کر جانا۔ بذات خود تمہیں دعوت دے رہا ہوں۔ جانتا ہوں اگر نہیں دوں گا تو میری پوتی میری جان کو آجائے گی۔“ وہ یقیناً اس لمحے شلفت انداز میں مذاق ہی کر رہے تھے۔ عصفان علی خان مسکرا دیا تھا۔ انابیہ کے لبوں پر بھی اس لمحے دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ دادا ابابا کے جانے پر وہ آہستگی سے چلتی ہوئی اس کے سامنے آن بیٹھی تھی۔

”ہائڈ مت کیجیے گا۔ میرے دادا ابابا کی طبیعت عام روش سے ہٹ کر ہے۔ وہ عام بزرگوں کی طرح نہیں۔ وہ میرے اچھے دوست ہیں۔ ان کی موجودگی میں مجھے کبھی کسی دوست کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔“

”اس معاملے میں تو خاصے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں دادا ابابا۔ یقیناً مانے کچھ حسد محسوس ہونے لگا ہے اس گھڑی ان سے۔“ وہ بڑی شگفتگی سے مسکرا رہا تھا۔ انابیہ شاہ بھی مسکرا دی تھی۔

”اب یہ مت کہیے گا۔ میرے پاس ایسا کوئی حق محفوظ نہیں۔“ اس کی سمت دیکھتے ہوئے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ وہ گویا ہوا تھا۔ انابیہ شاہ اس لمحے جیسے اخلاقاً مسکرائی تھی۔ پھر اسی انداز میں گویا ہوئی تھی۔

”دادا ابابا واقعی بہت اچھے ہیں۔ بابا کے بعد وہی ہمارے لیے سب کچھ ہیں۔ اس گھر کے نفوس بہت تھوڑے ہیں میں ماما اور دادا ابابا، مگر اس مثلث کے تینوں کونوں میں محبت کی بانڈنگ بڑی اسٹرونک ہے۔“ وہ کسی قدر اپنائیت سے اپنی فیملی کے متعلق مطلع کر رہی تھی۔

”اس معاملے میں تو آپ نے خاصا برا کیا۔ مجھے مطلع کر دیتیں تو آج ایک قابل فخر دوست میرے حلقہ احباب میں بھی شامل ہو جاتا۔ مجھے دلی افسوس ہے کہ میں یہاں ہوں اور دادا ابابا کے لیے کوئی گفٹ نہیں لاسکا۔“

”دوست فقط مادی اشیاء کے لین دین کے اصول پر استوار نہیں ہوتے۔ کچھ اور وصف بھی اس معاملے میں درکار ہوتے ہیں۔“

”مثلاً؟“ اسے دلچسپی سے تکتے ہوئے پوچھا۔ انابیہ شاہ چونکی تھی پھر ہونٹ پیچ کر دھیمے سے مسکراتے ہوئے شانے اچکا دیئے تھے۔

”ڈیپنڈ کرتا ہے۔ سینئر ہو کیا ہے۔“

”بتائیں گی نہیں؟“ بغور دلچسپی سے تکتے ہوئے استفسار کیا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”نہیں۔“ صاف انکار کیا تھا۔ اسے کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔

”کیوں؟“ آگاہی چاہتی تھی۔ ان جادوئی قلعوں میں اس وقت کسی قدر بے چینی سمٹ آئی تھی۔ انابیہ شاہ چہرے کا دھیان پھیر کر گئی تھی۔



”اس لیے کہ ایسی باتیں بیان نہیں کی جاتیں۔ سمجھی جاتی ہیں۔“

”اور اگر کوئی قطعاً جاہل مطلق ہو تو؟“ آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے استفہار کیا تھا۔  
شاہ نے اس مقابل بیٹھے شخص سے نگاہ یکدم ہی ہٹائی تھی۔ ساتھ ہی بڑے بے تاثر انداز میں شانے پائے دئے تھے۔

”سکھائیں گی نہیں مجھے؟“ مدھم دھیمے لہجے میں کوئی گزارش تھی۔ استدعا ہے پر نظر بڑی فرصت سے اس کی سمت تک رہی تھی۔ انابہ شاہ نے اس کی سمت ایک نگاہ سرسری انداز میں کی تھی۔

”کیا؟“ لمحہ بھر میں اس کی زبان سے پھسلا تھا۔ نظروں میں کسی قدر حیرت درآئی تھی۔ مقابل بیٹھا شخص چند ثانیوں تک خاموشی سے تکتا جیسے محفوظ ہوتا رہا تھا۔ پھر بہت دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔

”بہت انوکھے بھید ہیں کیا؟ شاید بھی آپ عام کرنے سے گریز برت رہی ہیں۔ سچ کہوں میرا تو شوق جنوں بڑھنے لگا ہے۔“ انابہ شاہ لب لہجہ کر مسکرا دی تھی۔

”لامعہ سے بھی بات ہوئی تھی میں نے اسے آنے کے لیے کہا تھا۔ شاید وہ بھی آجائے۔“ ذکر خاص کیا تھا مگر مقابل شخص کا انداز کسی قدر بے تاثر رہا تھا۔ بلکہ انداز کی قدر بچھ گیا تھا۔ کچھ لمحوں قبل والا وہ شوق اس لمحے معدوم ہو چکا تھا۔ اس بات کا کوئی جواب دیئے بغیر وہ چہرے کا زاویہ بدل گیا تھا۔ ابھی ماما اس کے ہاتھ

کا بیک کیا ہوا بلک فورسٹ لے آئی تھیں۔ انابہ نے عضنان علی خان کو ماما سے متعارف کرایا تھا۔

”بیٹا! لامعہ نہیں آئی تمہارے ساتھ؟“ ماما نے دریافت کیا تھا۔ وہ جوابا جانے کیوں انابہ شاہ کی سمت تکتے لگا تھا۔

”عضنان علی خان میری بکس کا اسٹف لوٹانے آئے تھے ماما۔ لامعہ شاید کچھ بڑی ہے۔ سہ پہر میں بات ہوئی تھی میری کہہ تو رہی تھی آئے گی۔“ جانے کیوں اس لمحے میں اس نے اس شخص کی نادانستہ حمایت کر دی تھی۔ وہ اس لمحے اس کی سمت تکتے لگا تھا۔

”برتھ ڈے کیک کٹ گیا تھا۔ اپنے دادا ابا کے ساتھ مسکراتی ہوئی سرشار سی وڑھ لڑکی اس گھڑی خاموشی مختلف لگ رہی تھی۔ اس کا یہ روپ خاصا نیا اور انوکھا تھا۔ عضنان علی خان کی نظریں بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ انابہ شاہ کو یا تو ان نظروں کی اضطرابی کیفیت سے کوئی سروکار ہی نہ تھا یا پھر وہ جان بوجھ کر ان نظروں کے حوالوں سے بچنا چاہ رہی تھی۔ جو بھی تھا یہ لمحے بیش قیمت تھے۔ ایک لمبی گید رنگ میں اس گھڑی

وہ شامل تھا۔ اس خاندان کا کھہ تھا۔ سب سے بڑھ کر وقت جن قریبوں کی داستان رقم کرنے سے گریزاں تھا وہی قریبیں اس لمحے میں چپکے چپکے اپنے بھید کھول رہی تھیں۔ وہ نظریں اس سے گریزاں تھیں۔

وہ چہرہ اس سے انجان تھا۔

وہ سراپا ان نظروں سے بیگانگی برت رہا تھا۔

مگر یہ احساس کم نہ تھا کہ وہ اس گھڑی اس لمحے میں شامل تھا۔ جب وہ اس کے ساتھ تھی۔ جب وقت اس کے ساتھ تھا۔ آج کا ایک ایک لمحہ اس کا تھا اور وہ اس پر سرشار تھا۔ انابہ شاہ حیران تھی ان مختصر لمحوں میں اس نے دادا ابا سے خاصی دوستی کر لی تھی اور جب جاتے سے وہ اسے اخلاقاً دروازے تک چھوڑنے کے لیے آئی تھی تو وہ مسکرا رہا تھا۔

”سراٹھا کر آسمان کی طرف دیکھو! آج چاند پھر آسمان پر نہیں ہے۔“ کھلے آسمان تلے اس کے سنگ کلا

وہ بہت آہستگی سے گویا ہوا تھا۔ وہ کسی قدر حیرت سے اس کی سمت تکتے لگی تھی۔ وہ بغور اس کی سمت تک رہا تھا۔ نظروں میں کسی قدر شرارت تھی اور لمحوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ!

”ہو بھی نہیں سکتا! آج پھر چاند زمین کے سفر پر ہے۔“ مدھم سی سرگوشی میں شاید کوئی اہم تھا یا پھر اس کی حیرت ہی دو چندی۔ ایک لمک اس کی سمت تکتی چلی گئی تھی۔

عضنان علی خان نے اس کی حیرت سے حفا اٹھایا ایک الوداعی نگاہ اس پر ڈال کر پلٹ گیا تھا۔ انابہ شاہ اسی طرح کھڑی رہی تھی۔ نظریں اس کی چوڑی پشت پر تھیں۔ وہ اسے اسی طرح تکتی چلی گئی تھی۔ وہ چلا گیا تھا۔ ارد گرد اب کوئی نہ رہا تھا۔ لان میں رات کی رانی اور گلابوں کی مہک عجب جادو سا جگ رہی تھی۔ جانے

کیا ہوا تھا۔ اس نے بہت ہولے سے سر کھلے آسمان کی سمت اٹھایا۔ متلاشی نظریں بادلوں میں یکدم ہی الجھنے لگی تھیں۔ بہت سے چمکتے تاروں بھرے خفاں میں اس لمحے کسی شے کی کمی تھی۔ بادلوں نے بہت کچھ چھپا دیا تھا یا پھر واقعی کچھ غیر موجود تھا۔ نگاہ لمحہ بھر کو پھٹتی تھی۔

”سراٹھا کر آسمان کی طرف دیکھو! آج چاند پھر آسمان پر نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ آج پھر چاند زمین کے سفر پر ہے۔“ مدھم سرگوشی نے یکدم اس کے گرد اپنا حصار باندھا تھا۔ وہ لمحہ بھر میں جیسے بیدار ہوئی تھی۔ سر دوبارہ جھکا یا تھا اور دوسرے ہی پل پلٹ کر اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆☆

دراڑ جب دلوں پر پڑتی ہے تو فاصلے صدیوں پر محیط ہو جاتے ہیں۔ فارحہ ان لمحوں میں فاصلوں کو صدیوں کی طرح پھیلنے ہوئے چپ چاپ دیکھ رہی تھی۔ غلط سوچا تھا اس نے غلط قیاس کیا تھا۔ کوئی طوفان آئے گا اور اسے سنگ سب کچھ بہا لے جائے گا! یہاں تو سب کچھ سناٹوں تلے دبنا چلا جا رہا تھا۔ خاموشیوں میں دفن ہو رہا تھا۔ بیگانگی مزید بڑھتی چلی گئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ قصور دار کسے

نمبرائے باپ کو بیٹے کو خود کو یا پھر اس وقت کو۔

اذہان حسن بخاری جب اسے میڈیسن دینے آیا تھا تو وہ کتنی دیر تک اسے چپ چاپ تکتی چلی گئی تھی۔

”مئی پلیز! دو انہ چھوڑا کیجیے۔ آپ کے لیے بہت ضروری ہے یہ آپ کو شاید یاد نہیں صبح آپ کو چیک اپ کے لیے بھی جانا ہے۔ آپ تیار ہو جائیے گا۔ میں آپ کو لے جاؤں گا۔“ دودھ کا گلاس ہاتھ میں پکڑے اس گھڑی وہ میڈیسن لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ فارحہ نے بہت خاموشی سے دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ سے لیا تھا اور ساری میڈیسن باری باری نگلی تھیں۔ مگر اذہان حسن بخاری اب بھی بدستور ایک سعادت مند بیٹے کی طرح اس کے سامنے موجود تھا۔ فارحہ نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ وہ اس گھڑی بغور اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ شفاف آنکھیں پر سکوت تھیں۔ روشن چہرہ بے تاثر تھا۔ پیشانی پر کوئی شکن نہ تھی مگر وہ جانتی تھیں سب کچھ پھر بھی اپنے معمول پر نہ تھا۔ وہ لمبا چوڑا شخص اس گھڑی بچوں کی طرح مضحل تھا فارحہ کے دیکھنے پر بہت آہستگی سے اس نے اپنا سر ماں کی گود میں دھر دیا تھا۔ وہ اس لمحے واقعی آزرده تھا۔ فارحہ

بیٹے کو چپ چاپ تکتی رہی تھیں۔ پھر بہت ہولے سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ دھر دیا تھا۔

”آئی ایم سوری مئی۔“ بہت ہولے سے اس کے لب ہلے تھے۔ انداز بہت تھکا ہوا تھا۔ شکست خوردہ

فارحہ کی آنکھوں میں یکدم ہی نمی اترنے لگی تھی۔

”مئی! میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ آپ نے ہی تو کہا تھا۔ ایک ٹھیک وقت میں تمہیں صبح نظر آئے اس



کے لیے کام کرو اور مستقبل کو اللہ کے حوالے کر دو۔ ماما مجھے بے حد عزیز ہے مُمی۔ میں اسے کسی مزید سامنے کی نذر نہیں کر سکتا تھا کوئی مزید زک پہنچتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک بھائی ہونے کے ناتے اس لمحے اس کے لیے اسٹینڈ لینا مجھ پر فرض تھا۔ میں نے جوتھی کیا۔ میرے خیال سے وہ غلط نہیں ہے اور.....“

”نہیں اذبان تم نے واقعی کچھ غلط نہیں کیا لیکن شاید کبھی بہت کچھ اختیار میں نہیں ہوا کرتا۔ جیسے وقت اس گھڑی ہماری مخالف سمت چل رہا ہے۔“ بہت دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

”لیکن مُمی کبھی قصور وقت کا بھی تو نہیں۔ ہم سبھی کچھ وقت کے سر تو نہیں ڈال سکتے۔“ بہت آہستگی سے وہ گویا ہوا تھا۔

”لیکن ایک دوسرے کو الزام دینے سے بھی تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

”مُمی کیا سب کچھ پہلے جیسا نہیں ہو سکتا، کیا وہ سارے سکھ واپس نہیں آ سکتے؟ وہ سارے اچھے دن مگر ہم نے مل کر ایک ساتھ گزارے؟“ اس کا لہجہ بڑھ رہا تھا۔

فارحہ خاموش رہی مگر بہت خاموشی کے ساتھ پلوں پر سے دوشفاف قطرے ٹوٹے تھے اور رخساروں پر سے پھلتے ہوئے دوپٹے میں نہیں مدغم ہو گئے تھے۔ اذبان حسن بخاری اسی طور سماں کی گود میں دھرے بیٹھا رہا تھا۔

”مُمی! جب میں چھوٹا تھا اور کبھی بہت ڈسہا رہی ہوتا تھا تو مجھے آپ کی آغوش میں سر چھپا کر بہت سکون ملتا تھا۔ ایک عجیب سی اسرتھ ملتی تھی۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں ہر طرح کے خطرے سے محفوظ ہوں اور پوری جانفشانی سے اب دنیا کا سامنا کر سکتا ہوں۔“ دھیمی آواز کسی قدر آرزو تھی۔ لیکن فارحہ کچھ نہیں بولی تھی۔

چپ چاپ چہرے کو تنگ رہی تھی۔ وہ اس لمحے کوئی معصوم بچہ تھا۔ دنیا کے سامنے تن کر کھڑا ہونے والا لہبا چوڑا مضبوط ذیل ڈول کا مالک شخص اس لمحے بے حد نحیف تھا۔ جیسے وہ اس گھڑی پھر کوئی بچہ تھا۔ فارحہ کا ہاتھ اس کے سر پر تھا۔ اس انتشار سے پر کیفیت میں اسے دیکھنا فارحہ کے لیے یقیناً تکلیف دے رہا تھا۔ اسے شکستہ حال دیکھنا ایک مشکل تجربہ تھا۔ اکلوتا بیٹا تھا وہ کس قدر عزیز تھا۔ وہ تو اس کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں پر بے چین ہو جایا کرتی تھی۔ اس لمحے تو وہ ایک کڑے امتحان میں مبتلا تھا۔

”مُمی! آئی لو! آئی لو! پاپا! آئی لو! مجھے اپنے گھر کو ملل دیکھنے کی عادت رہی ہے۔ پاپا کو ہمیشہ لیڈنگ پوزیشن پر دیکھتا رہا ہوں۔ مجھے کس اسکول میں جانا، کون سا بجٹک چوز کرنا ہے میرے لیے اچھی ایکنی وی کن ی ہے۔ مجھے کون سا گیم کھیلنا چاہیے۔ کیسے جو گز رہنے چاہیں کہ میرے پاؤں کے لیے آرام دہ رہیں مجھے کن کاموں سے راحت ملتی ہے۔ کن چیزوں سے مجھے خوشی مل سکتی ہے۔ کتنے کھلونے، کتنے بہت سے کھلونوں کا ڈھیر میں نے ہمیشہ اپنے کمرے میں دیکھا۔ کتنی بہت سی اشیاء جن کی مجھے ضرورت بھی نہیں تھی کیسے وہ میرے آگے ڈھیر کرتے چلے جاتے تھے۔ کیسے میری ایک خوشی کے لیے ہزاروں جتن کیا کرتے تھے۔ کتنا اہم جانا انہوں نے ہمیشہ مجھے کیا کچھ نہ کیا میرے لیے۔ کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے میری کیئر کی۔ میرا خیال رکھا۔“ کتنی آہستگی سے اس کی آنکھوں کے کناروں سے گرم گرم پانی نکل کر پھسلتا ہوا فارحہ کی گود میں جذب ہو رہا تھا۔

”مجھے یاد ہے مُمی جب ایک بار میں ٹیرس کی میز چھو سے پھسل کر گر گیا تھا تو ان کی جان پر بن آئی تھی اور جب میں جو بیئر کیمرج میں اپنی مخالف ٹیم سے باسکٹ بال کا بیچ ہار گیا تھا تو وہ میرے لیے کتنے افسردہ

رہے تھے۔ مجھے یاد ہے۔ مجھے یاد ہے مُمی! وہ اپنی تمام تر مصروفیات کو پس پشت ڈالے اگلے کئی دنوں تک مجھے ہم لے جا کر پریکٹس کراتے رہے تھے۔ جب تک کہ میں بال باسکٹ تک لے جانے میں پرفیکٹ نہیں ہو گیا تھا۔ کتنا ضروری اور اہم کام تھا وہ ان کے لیے۔ میری معمولی سی خامی بھی ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ کیسے وہ مجھے ہر طرح سے ہر کسی سے باوراد دیکھنا چاہتے تھے۔ میری اکاؤنٹس کی ٹیوٹر جب اچانک ہی ہمارے کئی تھیں تو پاپا کی بیٹی جان پر بن آئی تھی۔ کیسے وہ آفس سے آنے کے بعد گھنٹوں مجھے پریکٹس کرایا کرتے تھے۔ میں پرفیکٹ نہیں تھا مُمی بہت سی خامیاں تھیں مجھ میں۔ بہت سے عیب تھے مجھ میں مگر پاپا کی تعمیر نے کیسے مجھے ایک کوالٹی پرنسٹن بنائیں دی۔“

فارحہ کی آنکھوں کا پانی بہت ہو لے ہو لے رخساروں پر پھیل رہا تھا۔

”مُمی..... مُمی یاد ہے۔ سینئر کیمرج میں غلط لڑکوں کی صحبت میں جب پہلی بار میں نے سگریٹ کو چھوا تھا تو وہ کس قدر ریش رہے تھے۔ کتنے دنوں تک انہیں یہی فکر ستاتی رہی تھی۔ نو عمری میں اکثر ایڈ وچر میں لڑکوں سے شرارتیں سرزد ہوتی ہیں۔ لیکن میں جب کیپس پکنک میں ایک بار سمندر کی لہروں کی زد پر آیا تھا تو کتنی دیر تک وہ مجھے خود سے لپٹائے بچوں کی طرح آنسو بہاتے رہے تھے۔ حالانکہ یہ بات منکشف تھی ان پر کہ میں ایک اچھا سوکر ہوں۔ لیکن کس قدر خوفزدہ انداز میں انہوں نے اپنا چوڑا سا ہاتھ میرے سامنے پھیلا کر مجھ سے پر اس جابا تھا کہ آئندہ میں کبھی پانی میں نہیں جاؤں گا۔ میں جانتا تھا ان کے خوفزدہ ہونے کی وجہ مجھ سے ان کی بے تحاشا محبت تھی۔ وہ مجھے کسی معمولی تکلیف میں بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سو میں نے چپ چاپ ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھر دیا تھا اور پھر کبھی ان کے کہنے کے مطابق پانی کے قریب نہیں گیا تھا۔“ مضبوط لہجہ اس گھڑی بے حد شکستہ تھا۔ بہت سی مُمی آواز میں تھی اور آنسو تو فارحہ کی آنکھوں سے بھی بہہ رہے تھے۔

”مُمی! جب میرا قد ان کے قد کے برابر آیا تھا تو وہ مجھے اپنے ساتھ کھڑا کر کے قد کی لمبائی کو ناپتے ہوئے کس قدر مسرور ہوئے تھے۔ کتنی خوشی ہوئی تھی انہیں! ان کا بیٹا ان کے قدر کے برابر ہو گیا۔ آپ کو یاد ہے وہ کیا کہہ رہے تھے اس روز، مضبوط بازو ہوں میں ان کا..... کیسے بول رہے تھے۔ وہ آپ سے۔“

”دیکھو فارحہ میرا بیٹا جوان ہو گیا ہے۔ اس کا قد میرے قد کے برابر آ گیا ہے۔ اب مجھے کسی طرح کی فکری قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں بس اتنی فکر ضرور کرنی ہے کہ میں اب کچھ بڑا ہو گیا ہوں۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر وہ کس درجہ سرشاری سے مسکرا رہے تھے۔ کتنی خوشی ہوئی تھی انہیں میرے بڑے ہونے کی اور میں نے کیا کامی، کتنی تکلیف پہنچائی انہیں، وہ بچپن میں میری کوئی نا جائز بات بھی رد نہیں کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے معنی باتوں کو سنتے ہوئے گھنٹوں گزار دیتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو کشید کرتے رہنا ان کی عادت تھی۔ مجھے ہر طرح سے خوش رکھنے کی ذمہ داری تھی جیسے ان کی، مجھے آرزو دیکھنا سو ہاں روح تھا ان کے لیے۔ مگر میں..... مُمی! میں نے کیا کیا ان کے لیے۔ کیا کیا ان کے ساتھ مجھے تو مضبوط بازو بننا تھا ان کا۔ انہیں خوش رکھنا تھا ان کا ہر طرح سے خیال رکھنا تھا۔ جس طرح انہوں نے میرا ہمیشہ رکھا۔ جس طرح مجھے ہمیشہ اہم جانا، مجھے بھی تو مُمی میں تو بہت نالائق بیٹا ہوں۔ آپ کا بھی اور..... اور پاپا کا بھی۔ نہ میں آپ کو خوش رکھ پایا۔ نہ انہیں میں تو اپنے گھر کو ہی ٹوٹنے سے بکھرنے سے نہیں بچا پایا۔ پاپا نے مجھے سب کچھ دکھا دیا سب کچھ، مگر یہ نہیں بتایا کہ جب گھر ٹوٹنے لگتا ہے تو اس کی بنیادوں کو کیسے ٹھنڈے سے بچاتے



ہیں۔ کیسے اس مضبوط گھر کو گرنے سے باز رکھ سکتے ہیں۔ جب دل سے دل دور جانے لگتے ہیں اور فاصلے صدیاں بننے لگتے ہیں تو کس طرح کس طرح ان فاصلوں کو سمیٹا جاسکتا ہے۔ کس طرح صدیاں بننے سے روکا جاسکتا ہے۔ ایسا نہیں بتایا انہوں نے۔ انہوں نے نہیں بتایا کہ جب دلوں میں میل آجائے تو اسے کس طرح دھویا جاسکتا ہے۔ آئینے میں آئے بال کو کس طرح مٹایا جاسکتا ہے۔ کیسے وقت کی سیانی کو دھویا جاسکتا ہے۔ ایسا نہیں بتایا انہوں نے۔ ایسا کچھ بھی نہیں انہوں نے مجھے رول ماڈل تو بنا دیا مگر ہر طرح سے پرفیکٹ ایک کوالٹی پر سٹائی بھی دے دی۔ مگر اچھی اہم باتوں کو مجھ سے مخفی رکھ کے انہوں نے میری اندر بنی بنیادوں کو کسی قدر کمزور کر دیا ہے۔ مجھ سے بگاڑی برت کر خود سے دور کر کے مجھے بہت تنہا اور اکیلا کر دیا ہے۔ بہت زیادہ کمزور کر دیا ہے اور ایسے میں کیسے لڑوں میں کوئی تھا کہ تک اور کیسے لڑ سکتا ہے۔ اور خود اپنے آپ سے لڑنا بہت مشکل ہے نامی یہ تو پاپا نے مجھے بھی خود اپنے آپ سے لڑنے کی ترغیب تو دی ہی نہیں۔ کبھی اپنے آپ سے جنگ کرنا سکھایا ہی نہیں اور وہ تو..... وہ تو میرا اپنا آپ ہیں۔ بغاوت جب اپنے اندر سے ہے تو مٹی کس سے لڑوں میں کیسے لڑوں، لڑا بھی کیسے جاسکتا ہے۔ مجھ میں تو حوصلہ ہی نہیں سچ کہوں ہارنے لگا ہوں میں۔ شاید ہار چکا ہوں۔ اس مضبوط شخص کی آنکھیں اس لمحہ بھیگ رہی تھیں۔ کتنے ممکن سمندر اس لمحے ماں کی آغوش میں چپ چاپ مدغم ہو رہے تھے۔

”میرا پر اہلم یہ ہے مٹی میں آپ دونوں کو ایک ساتھ دیکھنے کا عادی رہا ہوں ایک ساتھ خوش دیکھتا رہا ہوں۔ مجھے آپ دونوں کی ایک ساتھ کی خوشی دیکھنے کی عادت یہی ہے۔ میں آج بھی آپ دونوں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری اسٹرنٹ آپ دونوں ہیں اور میں بھی مضبوط ہوں گا جب آپ دونوں ایک ساتھ مجھے نظر آئیں گے۔ میں آپ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی آزرہ نہیں کر سکتا۔ شکستہ نہیں دیکھ سکتا لیکن..... لیکن مٹی میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ پتا نہیں ایسا ہو بھی پائے گا یا نہیں اور اگر ہوگا تو کیسے اور کیونکر کوئی تدارک ہے بھی یا کہ نہیں۔ وہ ٹوٹا اعتبار وہ ٹوٹا گھر وہ سارے ٹوٹے مان کیسے جڑیں گے کس طور؟ شکستہ لہجہ واضح طور پر مٹی سے پرتھا اور فارحہ کے پاس اس لمحے کوئی تدارک نہ تھا۔ ماسوائے اپنا ماتا سے پر ہاتھ اس کے سر پر دھرے رکھنے کے وہ اس گھڑی کچھ کر نہیں پائی تھی۔ شاید اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

میرب سیال نے ہدایت کے مطابق اپنا ضروری سامان پیک کر لیا تھا۔ نیویارک کے کلائے میٹ سے واقف تھی۔ سو بھاری تعداد میں گرم پکڑے بھی رکھ لیے تھے۔ گوا سے کوئی لمبا چوڑا قیام نہیں کرنا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری کا بزنس ٹور تھا یہ۔ اس کا اپنا ایک شیڈول طے تھا۔ یقیناً اس کا ارادہ باضابطہ اسے ساتھ لے کر جانے کا نہ تھا۔ اس کی ہمراہی یقیناً مائی اماں کی بدولت عمل میں آئی تھی۔ جو بھی تھا اس کے لیے اہم یہ تھا کہ وہ اس وقت میں جب پاپا کے پاس اس کی موجودگی ضروری تھی وہ ان کے پاس جا رہی تھی اگرچہ وہ اس پر مسلط ہونا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ سو اس نے سامان سفر باندھ لیا تھا۔ جاتے وقت وہ بے جی سے بات کرنا نہیں بھولی تھی۔ وہ کسی قدر آزرہ تھیں اور اگر وہ ان کو ایسے میں بتائے بغیر چلی جاتی یا پھر اس کے جانے کی اطلاع سیف الرحمن سے بہت رسی انداز میں انہیں ملتی تو شاید انہیں بہت افسوس ہوتا۔ بھی اس نے ان سے بات کرنا ضروری خیال کیا تھا۔



”خوش تو ہے نا تو؟“ انہوں نے شاید ایک نئے تعلق کے متعلق فکر مندی سے اس سے دریافت کیا تھا۔ وہ جیسے اس گھڑی مجبوراً مسکراتی تھی۔

”ہاں بے جی سب ٹھیک ہے۔“ انہیں مطمئن کرنا چاہا تھا۔

”لڑکا تو اچھا ہے نا۔“ مجھے پسند تو ہے نا؟“ ان کی فکر اور انداز فطری تھا۔

”ہاں بے جی کہا مناسب ٹھیک ہے۔ میں آؤں گی تو آپ کی طرف چکر لگاؤں گی۔ آپ پاپا کے لیے دعا کیجئے گا اور ہو سکے تو ان کی خطاؤں کے لیے انہیں معاف کر دیجیے گا۔“ بے جی یقیناً دوسری طرف رونے لگی تھیں۔

”بے جی پلیز آپ روئیں نہیں۔“ اس نے ان کا حوصلہ بندھانا چاہا تھا۔ تبھی فون دوسری طرف سے سیف الرحمن نے لے لیا تھا۔

”سیفی! بے جی کا خیال رکھنا۔“ اس نے ان کی کیفیت کے پیش نظر تاکید کی تھی۔

”ہاں وہ تو میں رکھ لوں گا۔ مگر تمہارا خیال کون رکھے گا؟“ دوسری طرف وہ یقیناً شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ میرب نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔ بھی وہ گویا ہوا تھا۔

”اتنی سرد سرد آہیں خارج مت کرو۔ موسم پہلے ہی کافی سرد ہے اور میرا فریز ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

”تم فضول باتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔“

”خوش ہونا؟“ جانے کیا اگلوانا چاہا تھا۔ وہ اس کی شرارت سمجھ کر مسکرا دی تھی۔

”نہیں ہونا چاہیے کیا؟“

”کیوں نہیں مجھ سے بڑھ کر بھلا کون خیر خواہ ہوگا تمہارا۔“

”حسد کی بو کیوں آرہی ہے پھر؟“ میرب سیال نے جواباً چھیڑا تھا وہ ہنس دیا تھا۔

”میں حسد کر کے کیا کروں گا۔ اگر مجھے ایسے سردار صاحب مفت میں بھی ملیں تو میں ندیوں اور اگر لوں بھی تو پہلی فرصت میں بچ کر ریوڑیاں کھا لوں۔ وہ ان موصوف سے یقیناً زیادہ سودمند ہوں گی۔“

”سیفی۔“ اس نے ڈانٹنا چاہا تھا۔ مگر اس کے باوجود ہنسی اس کے لبوں پر آچکی تھی۔ بھی وہ لب بھینچ گئی تھی۔

”میرب۔“ اس نے بنیدگی سے پکارا تھا۔

”ہوں۔“

”اپنا خیال رکھنا۔“

”اور کیا؟“

”اور اس موقع کو کسی قدر اومل کرنے کی کوشش کرنا موسم اچھا ہے۔ دل پر اثر پذیر بھی ہو سکتا ہے اگر تم اسے اجازت دو۔ سردار صاحب کی سنگت کچھ اتنی بری بھی نہیں ہوگی۔ اب اپنے احساس بیدار رکھنا۔ دل ملنے کے کئی مواقع میسر ہوں گے۔ بشرطیکہ تم چاہو۔“

”سیفی! تم اپنے دادی اماؤں جیسے مشورے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔“

”سچا خیر خواہ ہوں تمہارا۔“

”اگر ایسا ہے تو بے جی کا خیال رکھنا۔ وہ روتی نہیں رہیں اب؟“

”اتنی فکر ہو رہی ہے تو آ کر چکر لگا جاؤ۔“

”ہاں۔“ وہ ابھی کچھ بولنے جارہی تھی جب اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے تبھی باقی کی بات اندر ہی دبائی تھی اور گویا ہوئی تھی۔

”سیفی! میں تم سے پھر بات کروں گی اوکے۔“

سردار سبکتگین حیدر لغاری بناسی سب کے اس کے قریب نہیں آتا تھا۔ یقیناً اس گھڑی بھی وہ اسے کوئی دہائی دیتا چاہتا تھا۔ میرب نے پلٹ کر اس کی سمت نگاہ کی تھی۔

”آریوریدی ناؤ۔“ ملل توجہ سے سنتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”ہوں۔“ اس نے میکا کی انداز میں سر اثبات میں ہلایا تھا۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری نے اسے سرسری انداز میں تکتے ہوئے سر ہلایا تھا اور پھر اس پر سے اپنا دھیان ہٹالیا تھا۔ میرب سیال نے ایک نظر دیوار پر لگے قیمتی وال کلاک پر ڈالی تھی پھر بہت آہستگی سے اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”سیس۔“ پہلا مخاطب تھا یہ۔ اس تعلق کے استوار ہونے سے حیدر لغاری سے کہا تھا۔ پہلی بار بذات خود اسے خود اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ وہ جو جانے کے لیے پلٹنے کو تھا، اس ایک دھیمی آواز پر یکدم ہی پلٹ کر سوالیہ انداز میں اس کی سمت ٹٹلنے لگا تھا۔ شاید پہلی ہی بار وہ دانستہ اس کی سمت دیکھنے پر مائل ہوا تھا۔ پہلی

ہی بار باضابطہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اس گھڑی اپنی پوری توجہ سے اس کی سمت تکتا ہوا اسے یقیناً بڑا عجیب لگا تھا۔ اسے متوجہ کر کے وہ یقیناً نفیوڑ ہوئی تھی۔ پتا نہیں واقعی اس شخص میں اتنا رعب تھا یا پھر وہ ہی اسے اتنا سر پر سوار کر رہی تھی۔ اس کے یکدم نگاہ جھکا لینے اور خاموشی سادھ لینے پر وہ کسی قدر اکتاہٹ کا

شکار ہوا تھا۔ شفاف آنکھوں میں کسی قدر ناگواری کی جھلک عود کر آئی تھی۔ میرب سیال کو بھی اپنی کمزور کیفیت بے حد بری لگی تھی۔ بھی وہ سر اٹھا کر کسی قدر اعتماد سے اس شخص کی سمت تکتے لگی تھی۔

”ابھی کچھ وقت ہے۔ میں ابی بے جی سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟“ پہلی درخواست تھی۔ اس خاص تعلق کے حوالے سے پہلی گزارش تھی۔ اس کی پابند تو نہ تھی تا حال کوئی ٹیوڈ دوسری جانب سے بھی

عائد نہ کی گئی تھیں؟

سردار سبکتگین حیدر لغاری اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس خاموشی پر شاید مایوس ہو کر سر جھکا گئی تھی۔ بے جی جس طرح آزدہ ہو رہی تھیں۔ اس کے پیش نظر اس نے ایسا ضروری چاہا تھا۔ لیکن اب اپنی

اس گزارش کے بے قدر ہو جانے کا شدید ترین احتمال ہوا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹنے والی تھی جب وہ گویا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے، لیکن زیادہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔“ پہلی اجازت تھی یہ پہلی باضابطہ گفتگو تھی۔ ان دونوں کے مابین۔ پہلا حکم تھا شاید جسے صادر کرنے کے بعد وہ پلٹا تھا اور وہاں سے چلا گیا تھا۔ میرب

سیال نے چند چابیوں تک جانے کیوں اس شخص کی چوڑی پشت کو تھکا تھا۔ پھر ضروری سامان لینے کے لیے کی طرف چل دی تھی۔ لوٹی تھی تو گاڑی سے ٹپک لگے وہ اس کا منظر تھا۔ مائی اماں کی کئی تاکیدیں تھیں۔

ضروری ہدایات تھیں۔ جنہیں سنتے ہوئے وہ مسلسل اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ سردار سبکتگین حیدر لغاری کا انداز بھی ہمیشہ کی طرح خاصا سرد تھا۔ کسی قدر لائق اور لیا دیا۔ ملل توجہ جانے اس کی کن کاموں اور لوگوں

کے لیے وقف تھی۔ اس لیے چوڑے شخص کی سمت ہلا ارادہ بنتی ہوئی وہ گاڑی میں بیٹھی تھی۔ سردار سبکتگین



حیدر لغاری جیسے اس کے اس فعل کا منتظر تھا۔ فوراً ہی مائی اماں سے مل کر وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ آگیا۔ ڈرائیور نے حکم پر گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ میرب سیال نے دھیان کھڑکی کی سرٹ پھیرنے سے بل براہ راست ڈرائیور کو بے جی کا ایڈریس بتانے کے ساتھ ضروری ہدایت دے دی تھی۔ سردار سنگھین حیدر لغاری نے اس کی سمت اس لمحے ایک بے تاثر نگاہ کی تھی اور چہرے کا رخ پھیر لیا تھا۔ ان کے پاس وقت واقعی زیادہ نہ تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اس کے اس اقدام پر وہ شخص کچھ خاص خوش بھی نہ ہوا تھا۔ شاید بھی جب گاڑی بے جی کے گھر کے سامنے رکی تھی تو اس نے سردار سنگھین حیدر لغاری سے گاڑی سے اترنے کی اور اپنے ساتھ چلنے کی کوئی درخواست نہیں کی تھی۔

رشتہ اس کا تھا۔ تعلق اس کا تھا۔ وہ کچھ کہتی بھی کیونکہ اس تعلق اس رشتے کی ابھی تک خود اس کے لیے ثانوی حیثیت تھی۔ پھر وہ کسی اور کو اس سلسلے میں انوالو کیوں کرتی۔ خاموشی سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر وہ گاڑی سے باہر نکلی تھی اور ابھی پلٹی بھی نہیں تھی جب دوسری سمت کا دروازہ کھلنے کی آہٹ نے اسے کسی قدر چونکا دیا تھا۔ سردار سنگھین حیدر لغاری اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اس لمحے گاڑی سے باہر نکل کر کھڑے ہوئے اس کے ہمراہ چلنے کا منتظر تھا۔ اس کی حیرت دو چندی۔

کوئی خوش آئند تبدیلی تھی یہ۔ پھر وقتی مصلحت کے تحت کوئی وقتی اقدام تھا۔ لیکن سردار سنگھین حیدر لغاری جب سے مصلحتوں کا باندھ ہونے لگا، وہ کیونکر دوسروں کی خاطر اپنی مرضی کی نفی کرنے لگا۔ کیا کچھ مروت اس میں بھی باقی تھی۔ مصلحت، مروت افعال سرانجام دینا اسے بھی آتا تھا۔ میرب سیال نے اس کی سمت ایک سرسری نگاہ کی تھی۔ پھر قدم اندر کی جانب بڑھا دیئے تھے۔ ”ماشاء اللہ دولہا تو بڑا سوہنا ہے تیرا۔“ بے جی اس سے ملنے کے بعد اس لمحے سردار سنگھین حیدر لغاری سے مل رہی تھیں۔ کس قدر بے بی چوں کی طرح اس لمحے وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ مائی اماں سے بہت انسیت تھی اسے۔ بزرگوں سے ادب و آداب سے ملنا یقیناً اسے آتا تھا۔ بے جی کی فطری تعریف پر وہ شاید دھیمے سے مسکرایا بھی تھا۔ میرب سیال کو بڑی خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

”خدا جوڑی سلامت رکھے۔ دل کو بڑی راحت ملی ہے۔ تم دونوں کو سامنے دیکھ کر۔ بڑا براہور ہا تھا جی۔“ بے جی نے محبت سے اسے تکتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اس گھڑی جسے مصلحتاً مسکرائی تھی۔ ”سیال سے بڑا گلا تھا مجھے مگر تیرا دولہا دیکھ کر ساری کلتیں دھل گئیں ساری عمر کے عیب دھو دیئے اس نے۔ اب میری جاؤں گی تو میری قبر بڑی ٹھنڈی رہے گی۔“

”خدا خواستہ ہے جی۔“ میرب سیال فوراً بولی تھی۔ ”خدا آپ کو لمبی عمر دے۔“ ”بیٹا کیا کروں گی لمبی عمر لے کر۔ اس عمر میں تو اپنی خواہش کم بچوں سے زیادہ وابستہ ہوتی ہیں۔ خدا تم لوگوں کو خوش رکھے۔ اس سے زیادہ ہی خواہش ہے نا حاجت۔“ بے جی اسے اپنے ساتھ لگا کر سردار سنگھین حیدر لغاری کی سمت نکلنے لگی تھیں۔ جو اس لمحے گھڑی کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”بے جی! ماموں مائی اور سیفی وغیرہ نظر نہیں آرہے؟“ ”سیفی تو کسی کام سے باہر گیا ہے۔ البتہ باقی سب لوگ ایک تقریب میں گئے ہیں۔ پہلی بار آئی ہو اپنی تنہیال اس تعلق کے بعد۔ سنگھین بیٹا کیا سوچ رہا ہوگا کوئی خاطر داری بھی نہیں کی۔“

”نہیں بے جی ایسی بات نہیں اچھوٹلی ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں تھا۔ مجھے بس آپ کی فکر ہو رہی تھی۔ آپ اپنا خیال رکھیے گا۔“ سردار سنگھین حیدر لغاری نے کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر اس کی نگاہ بدستور اس کی طرف تھی۔ وہ اس کے گھڑی پر نگاہ کرنے سے ہی جان گئی تھی کہ وہ اس لمحے کیا چاہ رہا ہے۔ ”بیٹا! مجھے اپنی اکلوتی نواسی بہت عزیز ہے۔ بہت خیال رکھنا ہے اس کا۔ یوں مجھ کو اس گھڑی ہماری جان تھمارے ہاتھوں میں ہے۔ جی جان سے عزیز رکھنا اسے۔ کبھی کوئی آزار مت دینا۔“ بے جی نے سردار سنگھین حیدر لغاری کے سر پر ہولے سے ہاتھ دھرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جانے کیوں اس لمحے اس کی جانب متوجہ تھی۔ بے جی کی ہدایت پر وہ اس کی سمت نکلنے لگا تھا۔ وہ دھیان پھیر گئی تھی۔ سردار سنگھین حیدر لغاری دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔

”جی آپ بے فکر رہیے۔“ ”ایک درخواست اور کروں گی۔“ ”جی ضرور مگر درخواست نہیں حکم کیجیے۔“ سعادت مندی بلا کی تھی۔ میرب سیال بری طرح چوکی تھی۔ اس جانب نگاہ بھی کی تھی مگر وہ اس گھڑی اس کی جانب متوجہ نہیں تھا ملل توجہ سے بے جی کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”بہت ترسی ہوں میں ہمیشہ میرب کے لیے۔ میری اکلوتی بیٹی کی نشانی ہے یہ۔ مگر حالات کچھ اے رہے کہ سیال نے اسے ہم سے زیادہ ملنے نہیں دیا۔ خیر ہمیں اس سے کوئی گلہ نہیں جو اس نے چاہا سو کیا۔ مگر بیٹا اب جب کہ میرب کی زندگی کے وارث تم ہو میں تم سے امید رکھوں گی کہ تم اسے ہم سے ملانے آتے جاتے رہا کرو گے۔ بہت تڑپا ہے دل اپنی بیٹی کے لیے۔ اب اور کی ہمت نہیں۔ عمر کی نقدی ختم ہونے کو آن پہنچی ہے۔ کب بلاوا آجائے گے خبر بس تم سے امید کروں گی کہ تم اسے محبت سے رکھو۔ اس کا خیال کرو اور کبھی بکھار ہم سے ملوانے لاتے رہا کرو۔“ بے جی کی درخواست پر اس نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ پھر دھیان پھیر کر میرب سیال کی سمت دیکھا تھا۔

”چلیں۔“ اور وہ جانتی تھی وہ اس کا توقع سے زیادہ وقت لے چکی تھی اور وہ یقیناً توقع سے زیادہ مروت کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ بھی اس نے فوراً قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔ سردار سنگھین حیدر لغاری اس گھڑی اس کے ہمراہ تھا۔ اس کے ہم قدم تھا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل اس نے اس کا بہت انوکھا روپ دیکھا تھا۔ جس کے متعلق یقیناً کم از کم وہ قیاس نہیں کر رہی تھی۔ بھی شاید حیرت بھری نگاہ اس لمحے اس کی سمت اٹھی تھی۔ اس کے اپنی جانب دیکھنے پر وہ قدرے چونکا تھا۔

”کس؟“ مختصر استفسار ہوا تھا۔ میرب سیال نے فوراً سر نشی میں ہلایا تھا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر فوراً اندر بیٹھ گئی تھی۔ سردار سنگھین حیدر لغاری نے دوسرے ہی لمحے اس پر سے نگاہ ہٹائی تھی اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ ڈرائیور نے حکم پر گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ میرب سیال چہرے کا رخ پھیر کر کھڑکی سے باہر نکلنے لگی تھی۔

☆ ☆

اس شام کے بعد سے اس نے ہر خیال کو سرسری لیا تھا۔ یکسر فراموش کر دیا تھا سب کچھ اور کچھ سوچنے لائق تھا بھی کیا۔ کوئی بات اس قدر معمول سے ہٹ کر بھی واقع نہ ہوئی تھی لیکن دھلتی شام میں جب وہ گرم



گرم کافی کے سب لیتی ٹیس پر کھڑی اس سرد موسم کو انجوائے کر رہی تھی جب چوکیدار کے گیٹ وا کرنے اور اندر پورچ میں آ کر رکنے والی گاڑی نے اسے چونکا دیا تھا۔ انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس سے قبل بھی یہاں کا چکر شاید لگا چکا تھا۔ ورنہ چوکیدار کی اجنبی یا نووارد کے آنے پر گیٹ اس طرح واہر کر نہیں کرتا تھا۔ وہ اس جانب اسی طرح دیکھ رہی تھی۔ جب عضنان علی خان نے گاڑی سے باہر نکل کر ہاتھ اٹھا کر اسے وش کیا تھا۔ اخلاق کا تقاضا یہی تھا کہ جواباً وہ بھی ہاتھ بلا دیتی اور وہ اس قدر ان میزڈ قطعاً نہیں تھی کہ گھر آئے مہمان سے بدسلوکی کی روداد دیتی۔ سولیوں پر دھبی سی مسکراہٹ سجا کر اس نے بہت آسٹیلی سے ہاتھ بلا دیا تھا۔ عضنان علی خان ہاتھ میں ایک پیکٹ لیے ٹیس کی بیرونی سیڑھیاں چڑھتا ہوا آ رہا تھا۔ یعنی انابییہ شاہ کو اب مہمان نوازی کے کچھ اور تقاضے بھی پورے کرنے تھے۔

سیڑھیاں چڑھ کر اس لمحے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔ چند ہی ثانیوں میں وہ اس کے مقابل تھا۔

”یہاں سے گزر رہا تھا۔ سوچا دادا ابا سے ملتا چلوں۔“ حال احوال کے بعد مدعا بیان ہوا تھا۔ یقیناً وہ دادا ابا سے دوستی کا گٹھ چکا تھا۔ وہ جواباً رہنمائی پھر شاید اخلاقاً مسکرائی تھی۔ دھیان اس کے ہاتھ میں تھے پیکٹ کی سمت گیا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ انابییہ شاہ کے دریافت کرنے پر وہ چونکا تھا۔

”دادا ابا کے لیے گفٹ ہے۔ اس روز میں انہیں کوئی گفٹ نہیں دے سکا تھا۔“

موصوف کو تعلقات استوار کرنے کے سارے کرشاید از بر تھے۔

”کیا ہے یہ؟“

”جیسے بورڈ۔“

”جیسے بورڈ؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔ تو کیا وہ دادا ابا کی دلچسپیوں سے بھی واقف تھا۔ وہ اگر اس کھڑی متاثر نہ ہوئی تو یقیناً اس سامنے کھڑے بندے کی ایفٹ کے ساتھ نا انصافی ہوتی۔ شاید بھی وہ مسکرائی تھی۔

”کھیلنے سے واقف ہیں؟“ بغور تکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

”حرج تو کوئی نہیں۔“

”کھیلنے میں باہار نے میں۔“ وہ یقیناً محفوظ ہو رہی تھی۔

”دونوں میں کھیلیں گے نہیں تو جیتیں گے کیسے اور ہاریں گے نہیں تو سیکھیں گے کیسے۔ جیتنے کے لیے کھیلنا تو بہت ضروری ہے ناں۔“ موصوف کی فلاسفی خاصی کمال کی تھی۔

”پھر تو لامعہ کے لیے زندگی خاصی دشوار اور مشکل ہوگی۔ جیسے کھیلنے والے دماغ سے چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔“ قیاس آرائی کی تھی مگر مقابل نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ہاں لیوں کی مسکراہٹ کچھ گہری ہو گئی تھی۔

”دادا ابا لاؤنج میں ہیں۔“ اطلاع دی تھی۔

”رہنمائی نہیں کر سکتی؟“

”لامعہ کو انگی تھا مگر چلنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے۔“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے مسکرا کر مطلع کیا تھا یا پھر باور کرایا تھا لیکن عضنان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”تمہیں ہر گھڑی لامعہ نامہ الاپنے کی عادت کیوں ہے۔“ وہ یکدم پٹری سے اتر آیا۔ وہ چلتے چلتے یکدم رکی تھی۔ عضنان علی خان بغور تکتا رہا تھا پھر مسکرا دیا تھا۔ انابییہ شاہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ بھی عضنان علی خان دلچسپی سے اسے دیکھتا ہوا گویا ہوا تھا۔

”دادا ابا خاصے اچھے دوست ہیں۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا۔“

”وہ جیسے پلیئر بھی بہت عمدہ ہیں۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”ڈرار ہی ہیں آپ مجھے۔“ وہ بغور اس کی سمت تکتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”نہیں مطلع کر رہی ہوں۔ وہ سامنے دادا ابا موجود ہیں۔ آپ جا سکتے ہیں۔“ اسے لاؤنج میں چھوڑ کر وہ واپس پلٹ گئی تھی۔ عضنان علی خان مسکرایا تھا پھر آگے بڑھ گیا تھا۔

”عشق مانگے امتحان کیا کیا۔“

انابییہ کافی لمے کر آئی تھی جب خاصائف میچ جاری تھا۔ عضنان علی خان اور دادا ابا مکمل توجہ سے شطرنج کے مہروں کو گھور رہے تھے۔ وہ مسکرا دی تھی۔

”دادا ابا! اگر لامعہ کو کبھی لگا کہ اس کا منگیتر بہت ذہین و فطین ہے تو اس کا سہرا یقیناً آپ کے سر ہوگا۔“

کافی کنگ ان کے سامنے رہتی ہوئی وہ یقیناً ان کی کیفیت سے محفوظ ہوئی تھی۔ عضنان علی خان نے فقط ایک نگاہ کی تھی۔ کہا کچھ نہیں تھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی جب مامانے اسے آواز دی تھی۔

”بیٹا تمہارا فون ہے۔“

”آ رہی ہوں ماما۔“ ماما کو آواز دے کر وہ عضنان علی خان کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”شطرنج واقعی خاصا مشکل کھیل ہے نا۔“ اپنی مستند رائے دے کر وہ بناس کا جواب سننے پلٹ گئی تھی۔ عضنان علی خان اسے فقط دیکھ کر رہ گیا تھا۔

انابییہ شاہ کو اس شخص کی کیفیت یقیناً محفوظ کر رہی تھی۔ دادا ابا پچھلے پچاس برسوں سے جیسے کھیل رہے تھے۔ انہیں ہرانا یقیناً آسان نہ تھا۔ وہ بھی عضنان علی خان جیسے قطعی نا بلد شخص کے لیے جیسے جیسے کی ابجد بھی معلوم نہ تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی فون اسٹینڈ کی طرف آئی تھی۔ دوسری طرف روزی کی آواز سن کر وہ بری طرح چونک پڑی تھی۔

”آہ! اوزی تم مامانے مجھے بتایا تک نہیں۔ کتنے بے ایمان شخص ہوتم۔ یقیناً تمہی نے انہیں بتانے سے باز رکھا ہوگا۔“ دوسری طرف اوزی ہنس دیا تھا۔

”بتا دیتا تو تمہارے ایکساٹمنٹ کیسے دیکھتا۔“

”بہت مزہ آتا ہے تمہیں مجھے پریشان کر کے۔“

”یقیناً لیکن تمہیں خوش دکھ کر مجھے زیادہ لطف آتا ہے۔“ اوزی دوسری طرف مسکرایا تھا۔

”ماچسٹر کا موسم کیسا ہے؟ زیادہ ٹھنڈ تو نہیں؟ اور تم اپنا خیال رکھ رہے ہو یا نہیں؟“

”ایوری تھنک از فائن۔ اینڈ ان کنٹرول۔ تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟ پچھلی باری کی طرح کہیں اس بار بھی فیل تو نہیں ہو گئیں؟“

”اوزی! میں فیل نہیں ہوئی تھی۔ فقط میرے مارکس کم آئے تھے۔ میں تمہاری طرح کوڑھ مغز نہیں ہوں۔“ اس نے اپنا دفاع کیا تھا۔ دوسری طرف اوزی ہنستا چلا گیا تھا۔



”اچھا سنو تمہارے لیے کیا لاؤں؟“  
 ”تم آرہے ہو؟“ وہ حیرت سے چینی تھی۔ دادا ابا اور عصفان علی خان نے بیک وقت اس کی سمت دیکھا  
 تھا مگر وہ اس گھڑی بے حد مگن تھی۔ کسی بھی رسمی انداز کے بغیر اس کے چہرے پر اس لمحے بڑے پتھر  
 احساسات تھے۔ وہ اس گھڑی جس سے بھی مخاطب تھی بہت دل سے مخاطب تھی۔

”اوہ گاڈ اوزی تم آرہے ہو!“  
 ”تمہارا کیا خیال ہے میں سدا جوگ لے کر نہیں پڑا رہوں گا۔“  
 ”ارادہ تو خیر تمہارا کچھ ایسا ہی تھا۔ اب اگر آرہے ہو تو جی کڑا کر کے آنا۔“  
 ”میرا حوصلہ بندھانے کے لیے تم ہوتا۔“  
 ”تمہیں ہر مرض کی دوا میں کیوں نظر آتی ہوں؟“  
 ”کیونکہ تم مجھ سے زیادہ جینکس ہو۔“  
 ”کیا لاؤ گے میرے لیے؟“

”کیا لاؤں؟“  
 ”تم خود آ جاؤ۔“  
 ”اتنی رعایت۔ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔“ اوزی کا ماتھا ٹھکا تھا۔ وہ ہنس دی تھی۔  
 ”کب آرہے ہو؟“  
 ”یہ نہیں بتاؤں گا۔“

”ہر بار کی طرح اس بار بھی سر پر انڈو گے۔ پچھلی بار بھی ساری رات بیٹھی جاگتی رہی تھی اور جب تم  
 آئے تھے تو پانی کی پوری بالٹی میرے اوپر انڈیل کر اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ بہت اسٹوپڈ ہو تم۔“ پچھلے  
 برس کا حوالے دیتے ہوئے اس کا منہ کسی قدر کڑوا ہو گیا تھا لیکن دوسری طرف اوزی ہنس دیا تھا۔  
 ”چلو برا مس کرتا ہوں۔ اس بار پانی کی پوری بالٹی نہیں انڈیلوں گا۔“  
 ”یعنی تم پھر کسی دھماکے دار سر پر انڈو گے ساتھ ہی وارد ہو گے۔ ماما کو آگاہ کر دیتی ہوں میں۔ بتا رہی  
 ہوں تمہیں میں۔ قطعاً نہیں جاگوں گی اب۔ مزید بے وقوف نہیں بننا ہے مجھے۔“  
 ”مزید کیا مطلب؟“ اوزی کا قبچہ بڑا بے ساختہ تھا۔ وہ مسکرا دی تھی۔  
 ”اٹس ٹوچ اوزی۔ فون پر ہوا اس لیے لحاظ کر رہی ہوں۔ ورنہ.....“  
 ”ورنہ کیا؟ دیکھو پچھلی بار کی طرح اس بار بلبے کا استعمال مت کرنا۔ کہنے کو تم ایک دھان پانی کی نازک  
 لڑکی ہو مگر شارٹ لگانے میں تمہارا انداز بالکل انضمام والا ہے۔“ اوزی نے دہائی دی تھی۔ انا بیہ شاہ ہنس  
 دی تھی۔

”بھئی تو کہہ رہی ہوں شرافت سے وقت بتا کر آؤ۔ اچھا سا استقبال کروں گی۔“  
 ”اس ویک میں کسی بھی دن اس سے زیادہ نہیں بتاؤں گا۔“  
 ”اوکے لیکن اسی ڈیوریشن میں آ جانا۔ میں ماما کو مطلع کر رہی ہوں۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ دادا ابا کو میرا سلام دینا۔“  
 ”اوکے۔“ وہ فون رکھ کر سرشاری مڑی تھی۔



”ماما! اوزی آرہا ہے۔ دادا ابا اوزی آرہا ہے۔“

”اچھا کب؟“ دادا ابا جہاں متوجہ ہوئے تھے وہیں عضنان علی خان نے بھی بغور اس کی جانب دیکھا تھا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھلک رہی تھی۔ جو بھی تھا۔ اس کے آنے کی خوشی اس کے چہرے پر فہم تھی۔ انا بیہ شاہ کی نظر اس پر پڑی تھی بھی وہ لمحہ کچھ کو ساکت ہوئی تھی۔ یقیناً اس ایک لمحے میں وہ میسر بھول گئی تھی کہ اس لمحے اس گھر میں ایک قدرے اجنبی شخص بھی براجمان ہے۔ شاید بھی اس نے اپنی اکساٹمنٹ پر کسی درجہ قابو پایا تھا اور دھیمے سے مسکرائی تھی۔

”اسی ویک اسی ویک میں حسب معمول سر پرانز دے کر آنے والا ہے وہ۔“ دادا ابا کو مطلع کر کے اس نے جیس بورڈ پر نگاہ کی تھی۔ جہاں بازی اختتام پذیر ہو چکی تھی۔

”ہوا زوی وز؟“ سوالیہ نظروں سے دادا ابا کی طرف دیکھا تھا۔ جتنی گیم ابھی ہوئی تھی اس کے مطابق اتنی جلد نتیجہ متوقع نہیں تھا۔ یہ بات اس کے لیے یقیناً حیرت کا باعث بنی تھی۔

”عضنان علی خان۔“ دادا ابا مسکرائے تھے۔

”عضنان علی خان؟“ زیر لب دہراتے ہوئے انا بیہ شاہ کو شدید ترین حیرت ہوئی تھی۔ عضنان علی خان بہت خاموشی کے ساتھ بیٹھا بغور اس کی سمت تکتا رہا تھا۔ انا بیہ شاہ نے حیرت سے نگاہ اس پر کی تھی۔ اس شخص کی آنکھوں میں اس لمحے ایک خاص چمک تھی۔ لبوں پر بڑی دھیمی مسکراہٹ تھی۔

”ہی از اے ریٹائی جینٹلس پرسن۔“ یقیناً عضنان علی خان شطرنج کا ایک ماہر کھلاڑی ہے۔“ دادا ابا کے کمٹس اس کے تقاضا میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ انا بیہ شاہ کی حیرت برحق تھی۔ وہ واقعی ایسا ایکلیکٹ نہیں کر رہی تھی۔ دادا ابا نماز پڑھنے کے لیے جانے سے قبل اسے سراہنا نہیں بھولے تھے۔

”میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آتے جاتے رہا کرو۔“ یقیناً خوب جے گی ہماری تمہاری۔“ اور انا بیہ شاہ ایک ملک اس کی سمت متبقی جا رہی تھی۔ دادا ابا کے جانے کے بعد عضنان علی خان مسکرایا تھا۔

”خواب و خیال کی کیفیت سے باہر آ جاؤ۔ یہ خواب ہی آنکھیں جو دیکھ رہی ہیں وہ یقیناً خواب نہیں ہے۔“ مدہم لہجے میں ایک خاص تقاضا تھا۔ آنکھوں میں واضح چمک تھی۔ لبوں کی دھیمی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ اس گھڑی اپنی جیت پر کس درجہ سرشار تھا۔ اس کی سمت بغور تکتا ہوا بہت ہولے سے گویا ہوا تھا۔

اس کی آنکھیں بتاؤں کیسی ہیں؟

جھیل سیف الملوک جیسی ہیں

وہ مکمل طور پر مسرور تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل دھواں دھار بولنے والی لڑکی کی زبان اس قدر گنگ تھی۔

”تمہارے وصف تو نرالے ہیں۔ ان آنکھوں کی ایک جنمنش سے ہی فقط دنیا زیر و زبر ہو سکتی ہے۔ تمہیں افعال و اعمال سے کیا غرض۔ تمہاری کرشمہ سازیاں تو اس سے بھی سوا ہیں۔ کتنے انوکھے ہجیدوں سے واقفیت ہے تمہاری۔ ایک عام سے بندے کی سوچ کی تور سائی بھی تم تک ممکن نہیں۔ کتنے انوکھے چہانوں میں بستی ہو تم، کتنے انوکھے ٹھکانے ہیں تمہارے۔“ عضنان علی خان کی ذہنی رو پھر شاید بھٹک رہی تھی۔ وہ اس گھڑی پھر شاید پٹری سے اتر رہا تھا۔ بلکہ شاید اتر چکا تھا۔ انا بیہ شاہ اب تک جو اسے خاموشی سے ساکت سی دیکھ رہی تھی۔

”کھانا کھا کر جانے کا ارادہ ہے؟“ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اسے بغور دیکھتے ہوئے سرفنی



میں ہلا دیا تھا۔  
 ”نہیں پھر کبھی آج تو فقط حیات سے سرشار ہوں۔“ وہ اسی طرح کھڑا تھا جب مادا ہاں آئی تھیں۔  
 ”تم کھڑے کیوں ہو بیٹا بیٹھو نا کھانا کھا کر جانا۔“  
 ”نہیں آئی پھر بھی سہی۔“ وہ بولا تھا۔ پھر ایک نگاہ اس کی طرف کی تھی۔ دھن سے مسکرایا تھا اور پھر پلٹ کر قدم بڑھا دیئے تھے۔

☆☆☆

”بھابھی کتنی عجیب بات ہے۔ آپ نے سردار بنگلیں حیدر لغاری کی شادی کر کے دلہن سمیت اسے ہنسی مون کے لیے بھی بھجوا دیا اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ وہ تو اس روز عصفان نے اسے ہونٹ میں دیکھا تو تب حقیقت کھلی ورنہ شاید آپ تو اپنی بیٹی سے یہ بھی مخفی رکھتیں۔“ فاطمہ خان نے مائی اماں سے شکوہ کیا تھا۔ وہ بڑی رسائیت سے مسکرا دی تھیں۔

”بھلا ایسی باتیں بھی کبھی مخفی رہ سکتیں ہیں فاطمہ۔ بتایا تو تھا تمہیں۔ سیال صاحب کی پیاری کے متعلق۔ انہی کی اکلوتی بیٹی ہے میرے وہ علاج کی غرض سے باہر جا رہے تھے سو یہاں چھوڑ گئے۔“ اور وہ جو عصفان کو خود بنگلیں نے مطلع کیا؟ “فاطمہ خان نے استفسار کیا تھا۔

”یہی تو بتا رہی ہوں۔ سیال صاحب کو علاج کی غرض سے بیرون ملک جانا تھا۔ اگرچہ رشتے کی بات تو اس سے قبل ہی چلی تھی۔ مگر انداز سیرسری تھا۔ سیال صاحب جب جا رہے تھے تو ان کا ارادہ فقط مگنی کا ہی تھا مگر مجھے میرے اس قدر پسند آئی تھی کہ میں اسے ہرگز کھونا نہیں چاہتی تھی۔ سو میں نے ان کے سامنے نکاح کی تجویز رکھی تو انہوں نے بھی انکار نہیں کیا۔ اس طرح میرے بنگلیں کی منکوحہ ہو گئی۔ ابھی باضابطہ کچھ کیا کہاں ہے۔ پھر کاہے کا ڈھنڈورا پیٹنا۔ سیال صاحب صحیح سلامت لوہیں گے تو پھر باضابطہ اس بات کا اعلان کریں گے۔ فی الحال تو وہ دونوں سیال صاحب کی عیادت کو ہی گئے ہیں۔ میرے بہت ارزدہ ہو رہی تھی۔ بنگلیں حیدر بھی بڑے ٹور پر جا رہا تھا۔ میں نے میرے کو بھی ساتھ کر دیا۔“

”بنگلیں حیدر نے عندیہ دے دیا تھا نکاح کے لیے؟“ فاطمہ پھوٹی تھیں۔ بھتیجے کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں۔ ”بھئی کسی قدر حیرت سے دریافت کیا تھا۔ مائی اماں مسکرا دیں تھیں۔

”فاطمہ گھوڑا چاہے لاکھ سرکش ہوا اپنے سائیں سے سرکشی نہیں کر سکتا۔ چاہے لاکھ ہاتھ بیر مارے مگر سائیں جانتا ہے کہ اسے کس طرح قابو کیا جا سکتا ہے۔“

”سردار بنگلیں حیدر لغاری کو پسند تو ہے نا لڑکی؟“ فاطمہ خان کو تشویش ہوئی تھی۔ مائی اماں مسکرا دی تھیں۔

”میرے میں ناپسند کرنے والی کوئی بات نہیں۔ سب سے بڑھ کر مجھے اس لڑکی میں بہت خاص شے نظر آئی ہے فاطمہ۔ بہت سی لڑکیوں کو دیکھا ہے میں نے مگر میرے کو دیکھ کر جانے کیوں مجھے لگا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو میرے بنگلیں حیدر لغاری کو سمجھ سکتی ہے۔ سب کچھ اپنے رنگ میں رنگ سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ ایک دن ایسا سب کر گزرے گی۔“ مائی اماں کا لہجہ پر یقین تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے بھابی مگر بنگلیں حیدر۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔ مائی اماں نے انہیں مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

”تمہارے خدشے بے جا نہیں ہیں فاطمہ۔ کسی قدر فکرمند میں بھی تھی۔ مگر اب مجھے لگنے لگا ہے کہ ایسا ہینا ہو سکتا ہے۔ وہ لڑکی بڑی کرشمہ ساز ہے۔ وہ حالات کو اپنے بس میں کر سکتی ہے۔ پہلے پہل مجھے بھی لگا تھا میں نے کسی معصوم لڑکی کے ساتھ نا انصافی کی ہے لیکن اب مجھے ایسا کوئی پچھتاوا نہیں۔ فاطمہ مجھے لگتا ہے۔ یہ وہی لڑکی ہے جس کی ضرورت بنگلیں حیدر جیسے شخص کو تھی۔ یہ وہی لڑکی ہے جو اسے مکمل کر سکتی ہے۔“

فاطمہ خان نے سر ہلایا تھا۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ فاطمہ بولی تھیں بھی مائی اماں نے ان کی سمت تکتے ہوئے کہا۔

”تم سناؤ بیٹے کی شادی کب کر رہی ہو؟“

”ابھی کہاں بھابی آپ تو جانتی ہیں آج کل کے بچوں کے مزاج کو عصفان بھی کہاں حق میں تھا اتنی جلد شادی کے۔ وہ تو بہنوں کے اور میرے کہنے پر مگنی کی زنجیر پیروں میں پہن لی۔“

”تو زبردستی کیوں کر رہی ہو بیٹے۔ عصفان علی خان تو ماشاء اللہ خاصا سلجھا ہوا بچہ ہے۔ اس معاملے میں تم تو ایک خوش نصیب ماں واقع ہوئی ہو۔ کر دو جہاں کہتا ہے۔ میرے بنگلیں حیدر کا تو سرے سے معاملہ ہی مختلف تھا، ورنہ کیا عجب تھا کہ جس لڑکی کے لیے کہتا میں اسے بہو بنا کر گھر نہ لے آتی۔“ اک سرد آہ کے ساتھ مائی اماں گویا تھیں۔ فاطمہ نے بھابی کے ہاتھ پر بہت ہولے سے ہاتھ دھر دیا تھا۔ انداز تسلی دینے والا تھا۔

”ماشاء اللہ سمجھ دار اور سعادت مند تو اپنا بنگلیں حیدر بھی بہت ہے۔ بس آزاد معاشرے کا کچھ بگاڑ اس کی شخصیت میں بھی آ گیا ہے۔ خیر چھوٹی موٹی خامیاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ عیبوں سے پاک تو صرف خدا کی ذات ہے اور پھر یہ چھوٹی موٹی خامیاں تو دور کی جا سکتی ہیں۔ ان تمام باتوں کے برعکس بنگلیں حیدر میں بہت سی عمدہ صفات بھی موجود ہیں۔ جو شاید کسی دوسرے شخص میں ناپید ہوں۔ عصفان علی خان بنگلیں حیدر کے کچھ برعکس واقع ہوا ہے۔ آپ پسند کی شادی کی بات کر رہی ہیں۔ بہنیں تو پوچھ پوچھ کر ہار گئیں مگر اس نے مجال ہے جو ایک بھی لڑکی کا نام لیا ہو۔ سرے سے اس کی زندگی میں کوئی موجود ہی نہیں تھی۔“

”بھئی تو بہنوں کی اور ماں کی مشرتہ کہ پسند پر چپکے سے سر بھگادیا۔“ فاطمہ خان مسکرا رہی تھیں۔

”خیر لامعہ بچی ہے تو اچھی۔ مگنی کی تقریب میں خوب بچ رہی تھی عصفان کے ساتھ۔“ مائی اماں نے سراہا تھا۔

”بس بھابی خدا سے یہی دعا ہے کہ وہ جوڑی سلامت رکھے۔ اس تعلق کو سدہا بنائے رکھے۔“

”آمین۔“ مائی اماں نے بھی اس دعا کی قبولیت کے لیے لب کھولے تھے۔

☆☆☆

”اگینے آپ نے کبھی معجزے ہوتے دیکھے ہیں؟“ اذہان حسن بخاری نے گرم کافی کا سپ لیتے ہوئے کھلے آسمان کی دستوں کو دیکھا تھا۔ اگینے نے اس کی سمت بغور دیکھا تھا پھر مسکرا دی تھی۔

”شاید۔“ بولی تو آواز بہت دھیمی تھی۔ اذہان حسن بخاری کافی کا بھاپ اڑاتا کپ ہاتھ میں لیے اس کی سمت پر خیال نظروں سے نکلنے لگا تھا۔

”شاید بھی کہیں کسی زمین پر ہوتے ہوں، ہوئے ہوں مگر میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے ایسی کرشمہ



سازیاں نہیں دیکھیں۔“ اگینے مدھم لہجے میں کہتی ہوئی مسکرائی تھی۔ اذہان حسن بخاری بھی مسکرا دیا تھا۔ تبھی اگینے مزید گویا ہوئی تھی۔

”شاید مجھے چاند پر ہوتے ہیں گماں میں حسین تر و لعل ترین۔ دیکھو تو خوب صورت سوچیں تو دلکش ترین مگر رسائی سے بہت پرے دسترس سے کہیں باہر۔ سچ کیوں میں نے تو آج تک کوئی تارا بھی ٹوٹے نہیں دیکھا۔ جن کے ٹوٹنے پر کوئی دعا بروقت یہ سوچ کر مانگی جاسکے کہ اس ایک قیمتی لمحے میں مانگی جانے والی وہ دعا پوری ہو جائے گی۔“

اذہان حسن بخاری نے شاید اس کی بات کے ہی ضمن میں اس لمحے بے دھیانی میں سراٹھا کر کھلے آسمان کو بغور دیکھا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے مسکرا دیا تھا۔

”سچ کیوں آج تک میں نے بھی کوئی تارا ٹوٹے نہیں دیکھا۔ اس ضمن میں یقیناً ہمیں ناسا والوں کی خدمات لینا چاہئیں۔ آخر یہ بھید کھلے ایسا ہے بھی یا کہ نہیں۔ سچ میں کوئی ایسا تارا ہے کہ جس کے ٹوٹنے پر کوئی خواہش پوری ہونے کی یقین دہانی ہو سکے۔“ وہ مسکرا دیا تھا اگینے بس دی تھی۔ اذہان حسن بخاری اسے بغور تنکے لگا تھا۔ اگینے نے کافی کاسپ لیا تھا۔ اس پر نگاہ کی تھی اور لب بھینچ کر مسکرائی تھی۔

”زندگی کی الگ کہانی ہے۔ زندگی چاند تاروں میں نہیں بستی زندگی میں بستی ہے۔ بہلاوے بہت خوب صورت سہی گرد دل کو داغ کو باور کرانا بہت مشکل ہے۔ حقیقت کا ادراک بہت برا ہوتا ہے۔ آگاہی بہت بری ہوتی ہے، آنکھیں بند کر کے چلنا آسان ہے۔ اندھیرے میں کسی بات کا احساس نہیں ہوتا، سب رنگ ایک جیسے لگتے ہیں مگر۔۔۔ مگر آگاہی ان سب باتوں کی مکمل فہم کرنی ہے۔“

”آپ کو ایسا لگتا ہے۔“ اذہان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے بغور اسے دیکھا تھا۔ اگینے نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر مسکرا دی تھی۔

”تم سے بڑی ہوں۔ جھوٹ تو قطعاً نہیں بول سکتی۔“

”کس نے بتایا آپ کو ناسا والوں نے یا خود آپ نے؟“ جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ شگفتگی سے مسکرا دیا تھا۔

”اوہ کم آن۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ اذہان حسن بخاری خاموشی سے اس کی سمت تنکے لگا رہا تھا۔ اگینے نے کافی کاسپ لیا تھا پھر اس کی سمت نگاہ کی تھی۔

”ہماری عمر کے ہولو۔ پھر پوچھیں گے۔ ابھی بہت چھوٹے ہو تم اور تجربہ وقت کے ساتھ آتا ہے۔ اس کا کوئی شارت کتب نہیں ہے۔“ اذہان حسن بخاری نے کافی کاسپ لیتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”شاید آپ سچ کہہ رہی ہیں۔“ وہ ایک لمحے میں ہم خیال ہوا تھا۔ اگینے خاموشی سے سر جھکا کر کافی کے سپ لینے لگی تھی۔ تبھی اذہان حسن بخاری کے پرس ڈسبٹ سیل پر رنگ ٹون بجی تھی۔

”ایکسپوزی۔“ اس نے ایک لمحے میں معذرت کرتے ہوئے موبائل کان سے لگایا تھا۔

”جی چا جو کیسے ہیں آپ؟“ دوسری طرف فیض چا جو تھے۔

”پریٹلنی آل رائٹ۔ تم کیسے ہو؟ باقی سب لوگ کیسے ہیں؟“

”سب ٹھیک ہیں چا جو۔ کب آ رہے ہیں آپ واپس؟“ اس نے دریافت کیا تھا۔

”صبح بھائی سے بات ہوئی تھی تو وہ بھی کان بچ رہی تھیں۔ سیمینار تو کب کا منٹ چکا۔ انہیں بھی تشویش ہو رہی تھی کہ کہیں میں نے یہیں یو ایس اے میں قیام کا ارادہ تو نہیں کر لیا۔ انہوں نے تو یہاں تک پوچھ لیا

کہ کہیں میں اپنے ساتھ کوئی گوری ووری تو نہیں لا رہا۔“ فیض چا جو بہت فریڈلی تھے۔ اس لمحے بھی وہ ہنس رہے تھے۔ اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”پھر کیا کہا آپ نے؟“

”مجھے تو بہت سی گوریاں پسند آ گئی ہیں۔ مگر معاملہ یہ ہے کہ میں بھی تو ان کو پسند آ جاؤں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔

”چا جو! کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ آپ کسی جارج کلونی سے کم ہیں کیا۔“ اس کا موازنہ بہت خوب تھا تبھی فیض چا جو کھلکھلا کر ہنس دیے تھے۔

”آف کورس اگلے بیس برسوں تک میں بھی ٹاپ موسٹ ایبل پیچلر گارڈ میں شمار ہوں گا۔“

اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔ تبھی انہوں نے قدرے سنجیدہ ہو کر دریافت کیا تھا۔

”بھائی سے میں نے کچھ دریافت نہیں کیا۔ مگر مجھے بڑی فکر ہو رہی تھی۔ سعد بھائی کی طرف سے سب کچھ ٹھیک ہے نا؟“ وہ اصل مدعا پر آئے تھے۔ اذہان حسن بخاری لب بھینچ گیا تھا۔ چند ثانیوں تک خاموش رہا تھا۔ پھر سر اثبات میں ہلادیا تھا۔

”سب ٹھیک ہے چا جو۔“ اجمد مدھم تھا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو؟“ فیض بخاری کا انداز کسی قدر فکر مند تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ تبھی وہ بولے تھے۔

”میں یہاں آنا نہیں چاہ رہا تھا۔ ان دنوں جو گھر کی حالت تھی۔ یقیناً اس میں سب کچھ چھوڑ کر جانا بہت آکر ڈلگ رہا تھا۔ مگر فارحہ بھائی نے اپوز کیا تو مجھے آنا پڑا۔ بات تو کچھ دنوں کی تھی مگر میرا سارا دھیان اسی طرف لگا رہا۔ فیملی کراسس میں ہو تو پھر شاید چھوٹی چھوٹی باتوں اور واہموں میں دل کو الجھنے سے باز نہیں رکھا جاسکتا اور میری فیملی تو درحقیقت مشکل میں ہے۔“ فیض بخاری بہت پریشان لگ رہے تھے۔

”نہیں چا جو یہاں سب ٹھیک ہے۔ آپ کب آ رہے ہیں؟“

”بہت جلد جان، تم اپنا اور بھائی کا خیال رکھنا۔“ بہت محبت سے وہ گویا تھے۔

”جی چا جو۔“ سلسلہ منقطع کر کے اس نے اگینے کی سمت دیکھا تھا۔ جو اس لمحے اسی کی سمت بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ جانے کیوں نظر پھیر گیا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب کا فون تھا؟“ فیض بخاری کے متعلق دریافت کیا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

”ہوں۔“

”موصوف مشہور و معروف ہارٹ اسپیشلسٹ بن چکے ہیں۔“ متاثرہ انداز میں شانے اچکا کر تجزیہ کیا تھا۔ اذہان نے سر اثبات میں ہلادیا تھا۔

”ہوں۔“

”ابھی تک شادی نہیں کی؟“ اسے شاید حیرانی ہوئی تھی۔ اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”کہیں جوگ ووگ تو نہیں لے لیا؟“ مسکراتا ہوا انداز یقینی نفی تھی تبھی اذہان حسن بخاری کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ تبھی وہ گویا ہوئی تھی۔

”میری عمر 35 برس ہو چلی ہے اور موصوف مجھ سے تو چند برس بڑے ہی ہیں۔ جب میں پرائمری میں



## حج کی فضیلت

اللہ عزوجل کا ارشاد پاک ہے:

”اور لوگوں پر خدا کا یقین ہے کہ جو اس کے گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہے وہ اس کا حج کرے اور اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ سارے جہان والوں سے بے نیاز ہے۔“

اور شان لوگوں کو بھیجے جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں احترام والے گھر کی طرف جا رہے ہیں۔

”حج اور عمرے کو بخش اللہ عزوجل کی خوشنودی کیلئے پیدا کرو۔“

اور سرخ کے لیے زور اور ساجھ اور سب سے بہتر زور اور تقویٰ ہے۔

ولا جدال فی الحج اور لڑائی جھگڑنے کی باتیں نہ ہوں۔

پھر جب تم حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباء اجداد کا ذکر کرتے تھے اسی طرح اب اللہ کا ذکر کرو بلکہ اس سے بڑھ کر۔

حج کا سفر کرنے والے مسافر خدا کے خصوصی مہمان ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حج کے ذریعے دونوں جہان کی سعادت نصیب ہوتی ہے اور سعادت لوگ کامیاب اور کامران ہوتے ہیں۔ حج ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے انسان خدا کی نافرمانی سے بچتا ہے۔ بندہ جبراسود پر ہاتھ رکھ کر اس عہد کی تجدید کرتا ہے جو اس نے عالم ارواح میں اپنے رب کے سامنے ”قاولی“ کہہ کر اپنی بندگی اور خالق کے سامنے خالق ہونے کا اقرار کیا تھا۔

بندہ دوران حج پر اس بات پر عمل کرتا ہے جو اس کے لیے سرمایہ آخرت ہے۔ مخلوق کی بے پناہ اثر و دام نفہر کی صعوبتوں اور زخموں میں قدم قدم پر بھیس لگنے کے باوجود فراخ دلی اور پناہ سے کام لیتا ہے۔ ہر ایک کے ساتھ معنود و رکنز اور فیاضی کا برتاؤ کرتا ہے اور اس سے برملا اللہ تعالیٰ کا اس حکم کی پابندی ہوتی ہے۔ ولا جدال فی الحج

احرام باندھنے کے بعد ہر نماز کے بعد ہر بلندی پر چڑھتے ہوئے اور ہر پستی کی طرف اترتے وقت اور ہر ناقلے سے ملنے وقت اور ہر صبح کو نیند سے بیدار ہو کر حاجی حضرات تلبیہ پڑھتے ہیں۔

آئے ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہو کر اپنے اللہ کے حضور حاضر ہوں۔

لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنَّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكُ لَا شَرِيكَ لَكَ

میں حاضر ہوں خدا یا میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں بیٹک ساری تعریف تیرے ہی لیے ہے ”نعت تیری ہی ہے“

ساری بادشاہی تیری ہی ہے تیرا کوئی شریک نہیں۔

(صفیہ یوسف صفیؑ..... کراچی)

”یوری تھنک از فائن بیٹا دیکھو میری طرف“ لگ رہا ہوں ناتندرست؟ اچھا یہ بتاؤ آپ خوش تو ہونا۔

سبکدلی خیاں تو رکھ رہا ہے تمہارا۔ حمیدہ بیگم سے کہہ دیا تھا میں نے اپنی امانت سوپ کر جا رہا ہوں۔

تندرست ہو کر لوگوں کا تو بڑی دھوم دھام سے خود اپنے ہاتھوں سے آپ کو سونپوں گا۔ تب تک وہ میرے

بچے کا خیال رکھیں۔ ”وہ شاید اس کا دھیان بٹانا چاہ رہے تھے مگر وہ بہت آزرده سی سر اٹھا کر ان کی طرف

تلخگی تھی۔“

”پاپا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”کیوں؟“ اسے بچوں کی طرح پکارتے ہوئے وہ مسکرائے تھے۔ ”بیٹا ٹھیک تو ہے سب۔“ ان کے

باور کرانے پر بھی اس کے اندر کی کیفیت نہیں بدلی تھی۔ ”بھی اس کے ہاتھ تمام کر مظهر سیال کو گویا ہوئے تھے۔“

”ان چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے جب بچپن میں تم میرے لیے دعا کیا کرتی تھیں تو میں ہر تکلیف سے

نکل آیا کرتا تھا۔ مجھے یقین ہے اگر آج بھی میری بیٹی میرے حق میں دعا کرے گی تو وہ رایگاں نہیں جائے

گی۔“ پاپا کے حوصلہ بندھانے کے باوجود اس کی آنکھوں سے نمی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”ختمی تو بہت جینا ہے مجھے۔ اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرنا ہے۔“ فانی کی دلہن کو

گھرانے لانا ہے۔ نواسے نواسیوں پوتے پوتیوں کو گود میں کھانا ہے۔ ابھی اتنی جلد ہرگز نہیں جانا ہے مجھے۔ تم

تھی تو انہوں نے مجھے اسٹینڈرڈ پوزیشن کے ساتھ پاس آؤٹ کیا تھا۔ ”وہ فون پر اس کی گفتگو ایک طرف طور پر رہی تھی۔ اتنی بھدرا تھی کہ لفظ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ سکتی تھی۔ وہ اس کا موز بھی بھانپ گئی تھی شاید۔“ سچی ماحول کی اور اس کے اندر کی کشاف شاید معدوم کرنے کو اس گھڑی بے معنی گفتگو بھی خاصہ اٹھاک سے کر رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”فیض چاچو تو خاصے پیڈم تھے ان دنوں۔ بہت سی لڑکیاں فدا تھیں ان پر۔ آپ نے کبھی انہیں اس زاویے سے نہیں دیکھا؟“ دوستانہ انداز میں دریافت کیا تھا۔ اگینے کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ اذہان حسن بخاری بغور اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”بہت تک چڑھا اور خطی تھا وہ ان دنوں۔ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا تھا۔ مجھے اسے چھیر کر بڑا اظف آتا تھا۔ بہت بنا تھا وہ کہ ذہین ہو پوزیشن ہولڈر ہو ڈاکٹری پڑھ رہا ہوں، کچھ کچھ پیڈم بھی ہوں۔“ موصوف کی گردن ہمیشہ یوں تھی لیکن میرے سامنے اس کی ساری کلف اتر جاتی تھی۔ قیاح کہہ کر چھپتی تھی اسے۔ ”وہ مسکرائی ہوئی گزشتہ وقت کے پردے چاک کر رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری کھلکھلا کر ہنستا چلا گیا تھا۔“

”اگینے! میرے چاچو اچھے خاصے معقول شخص ہیں۔“ دفاع کیا تھا۔

”ہاں تو میں کب انکاری ہوں۔ میں بھی سچ کہہ رہی ہوں تم ان سے پوچھ سکتے ہو۔“ اگینے بولی تھی اور وہ مسکرا دیا تھا۔ اگر اگینے کا مقصد اس کی ٹینشن ریلیف کرنے کا تھا تو وہ یقیناً اس ضمن میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس لمحے اذہان حسن بخاری کے چہرے پر بڑی شفاف مسکراہٹ تھی۔ اسے مطمئن دیکھ کر اگینے کو خوشی ہوئی تھی۔

☆☆

میرب سیال نے اپنے وہاں پہنچنے کی پیشگی اطلاع نہیں دی تھی۔ زو بار یہ اسے دیکھ کر قدرے حیران ہوئی تھی۔

”اچھا کیا آگئی ہو تم۔“ لیکن تمہیں اطلاع تو دینا چاہیے تھی۔“ زو بار یہ کا انداز ہمیشہ کی طرح کسی قدر سرد تھا۔ میرب سیال انہیں فقط دیکھ کر رہ گئی تھی۔ سبکدلی حیدر لغاری نے ایک نگاہ کی تھی اس پر پھر زو بار یہ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”میں ایک بزنس اسائنمنٹ کے لیے آرہا تھا۔ مائی اماں کا خیال تھا اس وقت میں انہیں بھی سیال صاحب کے پاس ہونا چاہیے۔ مجھے مائی اماں کے خیال سے اختلاف نہیں ہوا۔“ مضبوط لہجے میں کہتا ہوا شاید وہ اسے ڈی فنڈ کر رہا تھا۔ میرب سیال نے کسی قدر چونک کر اس کی سمت نگاہ کی تھی۔ مگر اس لمحے وہ اس کی سمت متوجہ نہ تھا۔ وہ بہت خاموشی کے ساتھ سر جھکا کر آگے بڑھ گئی تھی۔

پاپا اس سے مل کر خوش تھے۔ کتنے لمحوں تک اسے اپنے ساتھ لگائے بیٹھے رہے تھے اور ان کا لمس اس نے بھی تو کتنے دنوں بعد محسوس کیا تھا۔ کس قدر سکون مل رہا تھا آنکھوں سے بہت خاموشی کے ساتھ گرم گرم پانی بہہ رہا تھا۔

”بچہ ٹھیک ہے سب کچھ تم کیوں رو رہی ہو؟“ پاپا نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیمے سے مسکرا کر کہا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ بھی مظهر سیال گویا ہوئے تھے۔



ہر طرح کی فکر دل و دماغ سے نکال دو۔“ پاپا نے اس کی پیشانی پر بہت آہستگی سے اپنے پیار کی مہر ثبت کی تھی۔ اس کے آنسوؤں کی شدت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

یکدم آہٹ ہوئی تھی۔ شاید کوئی اس کے قریب تھا۔ خوشبو نتھنوں میں گھسی تھی۔ تاثر بردار اچانا پچانا تھا۔  
”ہمت سے کام لیں۔ اس طرح آپ سیال صاحب کا حوصلہ نہیں بڑھا سکتیں۔“ کوئی اس کے قریب کھڑا مخاطب تھا۔ اس کے حواس لمحہ بھر میں بیدار ہوئے تھے۔ یقیناً یہ آواز یہ لہجہ سردار بکٹینگین حیدر لغاری کا ہی تھا۔ وہ بہت آہستگی سے پاپا سے الگ ہوئی تھی۔

”ٹھہرے کہاں ہو تم لوگ؟“ پاپا نے دریافت کیا تھا۔

”ہول میں۔“ انا یہ شاہ نے بہت آہستگی سے جواب دیا تھا۔ تبھی زو باریہ بولی تھی۔

”تم ہمارے ساتھ بروک لین میں کیوں آ کر نہیں رہتے۔ یہ زیادہ بہتر رہے گا۔“

زو باریہ کی پیشکش یا پھر مشورے پر اس نے بہت بلا ارادہ سر اٹھا کر سردار بکٹینگین حیدر لغاری کی سمت نگاہ کی تھی۔ وہ بہت بے تاثر سا چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔ یعنی فیصلہ اس کے ہاتھ ٹھہرا تھا۔ تمام حق وہ محفوظ رکھتی تھی۔ تمام مرضی اس کی تھی۔ ایک لمحے میں اسے فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے بہت آہستگی سے سر نی میں ہلا دیا تھا۔

”نہیں۔“ ہم زیادہ دنوں کے لیے نہیں آئے۔ دو ایک دن میں شاید ان کا کام منٹ جائے اور ہمیں واپس لوٹنا پڑے۔ آپ کو خواہ مخواہ زحمت ہوگی۔“ اس نے زو باریہ سے کہتے ہوئے ایک نگاہ سردار بکٹینگین حیدر لغاری کی سمت کی تھی۔ لیکن وہ شخص ہمیشہ کی طرح بے تاثر تھا۔ اس کا دھیان قطعاً اس کی سمت نہ تھا اور ایسا کوئی فیصلہ کر کے اسے اس کی حمایت یا ستائش تو قطعاً حاصل نہ کر رہی تھی۔ سردار بکٹینگین حیدر لغاری سے اس کے تعلقات اگر بہت سرد مہری لیے ہوئے تھے تو زو باریہ سے بھی کوئی خاص انیت نہ تھی۔ وہ پہلے ہی بہت منس تھی مزید کوئی اسٹریس لینا نہیں چاہتی تھی اور زو باریہ کے ساتھ رہنے کا مطلب تھا اپنے لیے لمحہ بھر کی ٹینشن کری ایٹ کرنا۔

پاپا سے ملنے کے بعد وہ سردار بکٹینگین حیدر لغاری کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔ دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے گاڑی تک آئے تھے۔

”ٹھینکس۔“ میرب سیال نے گاڑی میں بیٹھ کر اس کی سمت نگاہ کر کے بہت آہستگی سے کہا تھا۔ وہ چونکتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی سمت تنگے لگا تھا۔

”فور سپورٹنگ می۔“ اس کے ساتھ وہ چاہے جو رویہ روا رکھتا مگر وہ قطعاً نہیں چاہتی تھی کہ وہ پاپا کے سامنے کسی طرح کی بیگانگی یا سرد مہری کا مظاہرہ کرے۔ تبھی بہت مشکور سی اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

سردار بکٹینگین حیدر لغاری نے چہرے سے بھرپور تاثر دیتے ہوئے بے نیازی سے شانے اچکا دیئے تھے۔ لیکن میرب سیال نے اس کی سمت سے نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔

”آج پاپا سے مل کر مجھے جو راحت ملی وہ فقط آپ کے باعث ممکن ہوئی اگر آپ مجھے ہمراہ نہیں لاتے تو شاید اس وقت میں پاپا سے مل نہیں پائی۔ جس لمحے انہیں میری ضرورت تھی۔“ وہ مشکور سی بول رہی تھی۔ سردار بکٹینگین حیدر لغاری کچھ نہیں بولا تھا۔

”یہ رشتے بہت عجیب ہوتے ہیں۔ جتنے دل کے قریب ہوتے ہیں۔ اتنا ہی کمزور بھی کر دیتے ہیں۔“

ایک وقت یہ دو احساسات سے دوچار کرتے ہیں۔ مضبوطی اور کمزوری سے۔“ اس شخص سے اس کا تعلق بڑا واپسی تھا۔ سرد مہری میں لپٹا۔ بے تاثر انداز لیے۔ پھر جانے کیوں وہ اس سے اتنی خاص نوعیت کی گفتگو کر رہی تھی۔ شاید وہ واقعی اس کی مشکور تھی۔

سردار بکٹینگین حیدر لغاری بھی شاید مروت کے تقاضوں سے واقف تھا۔ متواتر اس کی سمت توجہ سے نکلتا رہا تھا۔ شاید وہ اس کی جانب سے مزید کچھ بولنے کا منتظر تھا مگر میرب سیال اب کے کچھ نہیں بولی تھی۔ سردار بکٹینگین حیدر لغاری بہت آہستگی سے نگاہ پھیر گیا تھا۔ بہت مختصر سا تعلق تھا اس کا۔ بہت مختصر دنوں کا ساتھ تھا۔

کتنا کچھ جان پائی تھی وہ اس کے متعلق۔ کتنا منکشف ہوا تھا وہ اس پر۔ اگر کوئی قیاس کرتی تو یقیناً غلط ہوتا یا پھر جو بھی تھا وہ بے مہر نہیں تھا۔ بے تاثر نظر آتا بھی تھا تو شاید تھا نہیں یا پھر وہ محض انسانیت کے ناتے اس لمحے بنا کسی غرض کے اس کے ساتھ تھا۔ میرب سیال اس کی سمت سے نگاہ ہٹا گئی تھی۔ تبھی ہماری آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرانی تھی۔

”پریشانیوں کے متعلق سوچنے سے پریشانیاں مزید بڑھتی ہیں۔ سوڈونٹ بی سکیئر۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔“ بہت مدھم لہجے میں کہتا ہوا وہ اس لمحے اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔ میرب سیال ساکت سی اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ وہ بغور اس کی سمت نکلتا ہوا گویا تھا۔

”اگر آپ کو سیال صاحب کی ہمت بندھانا ہے تو خود آپ کو مضبوط نظر آنا ہوگا۔ آنسو انسان کو بہت کمزور کر دیتے ہیں۔ خود کو بھی اور اسے بھی جس کا حوصلہ بندھانا مقصود ہو۔ آپ کو اپنی ہمت توڑنا نہیں چاہیے۔ اس سے سیال صاحب کو یقیناً تکلیف ہوگی۔“ لفظ بہت نرم تھے۔ مگر انداز بہت دوستانہ نہ تھا لیکن ان آنکھوں میں کسی قدر نرمی ضرور تھی۔

میرب سیال خاموشی سے تنگی رہی تھی۔ کوئی رسم دوستی نہیں تھی۔ فقط مروت تھی۔

اور وہ کچھ زیادہ ایکسپلکٹ بھی نہیں کر رہی تھی۔ شاید تبھی جب وہ خاموش ہوا تھا۔ وہ بھی بہت آہستگی سے چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔

دل بہت سنبھلا نہ تھا۔ مگر اس دل جو بی پر کسی قدر ڈھارس ضرور بندھی تھی۔ وہ بہت خاموشی سے بیٹھی تھی جب یکدم سردار بکٹینگین حیدر لغاری کا پرسنل سیل بجنا تھا۔

میرب سیال کا دل یکبارگی دھڑکا تھا۔ ایک لمحے میں اس نے سردار بکٹینگین کی سمت نگاہ کی تھی۔ وہ کسی سے مخاطب تھا۔

(باقی آئندہ)





## ملا بھلتی کھلیا

شیم عثمان صدیقی

نئی زندگی ہو نیا ہم سفر ہو  
گلوں سے بھی اب تیری ہر ڈگر ہو  
ادھر موڑ لیں رخ ہوا میں بھی اپنا  
تیرا ریشمی اڑتا آچل جدھر ہو

سارا کمرہ بکھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی ڈائری تلاش کرنے میں مصروف تھی۔ الماری کے کپڑے بیڈ پر بکھرے پڑے تھے۔ اس نے اپنے پرس کی ایک ایک چیز فرش پر بکھرا دی تھی۔ ڈائری کہاں لگی چھلاوا ہو گئی تھی؟

اسے اچھی طرح یاد تھا ڈائری اس نے پرس ہی میں رکھی تھی۔ وہ ڈائری کہیں اور رکھتی ہی نہیں تھی۔ چھوٹی سی ڈائری تھی۔ کافی دنوں سے اس نے ڈائری میں کچھ لکھا ہی نہیں تھا، بس ایک دم ڈائری کا خیال آیا تو وہ بے چین ہو گئی۔ پرس میں موجود نہ پا کر وہ ادھر ادھر بھی تلاش کر رہی تھی۔ شاید کہیں اور رکھ دی ہو۔

شام کا ملگیا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے آفس سے گھر میں داخل ہوئی تھی اور سارا کمر الٹ پلٹ کر ڈالا تھا۔ سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔

”ارے سدرہ کچھ سنا تم نے؟“ صولت آپا نے

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔  
”آپا! پلیز اس وقت میں کچھ سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر جھجکا کر کہا تو وہ کمرے کی بدتر حالت پر ایک نظر ڈال کر بولیں۔

”یہ کمرے کا کیا حشر کیا ہے تم نے؟“  
”صولت آپا! میری ڈائری کیس مل رہی نہ جانے کہاں گم ہو گئی ہے۔“  
”تو بے سدرہ ڈائری کی تلاش میں تم نے یہ کیا؟“

”آپا! وہ ڈائری کتنی اہم ہے آپ نہیں جانتیں۔“  
اس نے ان کی بات کاٹتے ہوئے پریشان لہجے میں کہا۔

”ہاں میں جانتی ہوں بڑی اہم ہے۔ تمہارے پسندیدہ اشعار، غزلیں اور روزانہ کی کتھا یہی تحریر کرتی ہوتا۔ ابھی تم تھکی ہوئی آئی ہو اور فضول مغز ماری کر رہی



ہو۔“ صولت آپا نے بڑے اطمینان سے کہا تو وہ بولی۔  
 ”کیا ڈاڑی آپ کے پاس ہے؟“  
 ”تو یہ ہے سدرہ مجھے کیا پڑی ہے۔ تمہاری ڈاڑی  
 کی تہی تو اول جلول کام کرتی ہو۔ ایسی چیزیں ہر وقت  
 برس میں رکھنے کی تو ہوتی نہیں ہیں گھر میں تلاش  
 گر رہی ہو۔ ایسا تو نہیں ہے کہ تم اپنے آفس میں بھول  
 آتی ہو یا پھر کہیں تم نے گرا دی ہو پرس میں ہاتھ ڈال  
 کر تو چیزیں نکالتی ہو، کل صبح تم اپنا پین صحن میں گرا گئی  
 تھیں ایک چیز نکالتی ہو تو دوسری گرا دیتی ہو۔“  
 ”اوہو۔“ اس نے زیر لب کہا اور وہ صوفے  
 پر بیٹھ گئی۔ ”آپ کا خیال درست ہو سکتا ہے مگر ڈاڑی  
 اتنی بھی چھوٹی نہیں ہے کہ گرے اور مجھے پتانہ چلے۔“  
 ”ضروری نہیں ہے میں نے تو ایک خیال ظاہر کیا  
 ہے ہو سکتا ہے گھر میں ہی ہو۔ خیر خاک ڈالو سال  
 رخصتی کے آخری مراحل میں ہے۔ نئی ڈاڑی خرید  
 لینا۔“ آپا صولت نے اتنی سادگی سے کہا کہ وہ پریشانی  
 کے باوجود آپا صولت کی سادگی پر مسکرا کر رہ گئی۔ پھر  
 ایک دم بولی۔ ”آپ کچھ پٹانے آتی تھیں۔“  
 ”ہاں وہی تو بتانے آئی تھی مگر تم تو اپنا ہی مسئلہ لیے  
 بیٹھی ہو۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”اب زیادہ سہنس پیدا کرنے کی ضرورت نہیں  
 ہے پتا بھی چلیں۔“  
 ”تمہارا پرپوزل آیا ہے۔“  
 ”میرا کیا آپ کا؟“ اس نے چونک کر ان کی طرف  
 دیکھا۔  
 ”نہیں اس بار تو تمہارا ہی آیا ہے اور اس پرپوزل  
 نے اماں کا غصہ سا تو اس آسمان پر پہنچا دیا ہے۔“  
 ”اماں کا غصہ؟ میں سمجھی نہیں۔“ سدرہ نے کچھ نہ  
 سمجھتے ہوئے کڑکا۔  
 ”بات ہی غصے والی ہے۔ محسن رحمانی کا پرپوزل آیا  
 ہے۔“ صولت آپا ناک بھوں چڑھا کر بولیں۔  
 ”کیا؟“ اس کا دل اٹھ پھل ہونے لگا۔

”ارے تم فکر نہ کرو اماں نے تو بواشا کرہ کو وہ ہے  
 حساب سنائیں کہ ان کے چہرے پر تو بوائیاں اڑنے  
 لگیں۔ تم رنڈوے کا رشتہ میری سدرہ کے لیے لے کر  
 کیسے آؤ گی؟“ بواشا کرہ تو اپنا برقع سنبھالتی خاموشی  
 سے نکل گئیں اور اماں کی بڑبڑاہٹ بہت دیر تک جاری  
 رہی۔ ”ویسے حیرت ہے یہ مرد ذات بڑے بے دانا  
 ہوتے ہیں۔ نمرہ باجی کا اچھی کفن بھی میلانیں ہوا  
 صرف تین مہینے ہوئے ہیں۔ وہ بھی حادثاتی موت۔“  
 صولت آپا تو نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ وہ تو بس یقین  
 و بے یقینی کی سی کیفیت سے گزر رہی تھیں۔ ”محسن  
 رحمانی کیا واقعی تم مجھے پسند کرتے ہو کیا تم مجھے اس  
 قابل سمجھتے ہو کہ میں تمہاری لائف پارٹرن بنوں۔ چند  
 ہفتوں سے میں محسوس تو کر رہی تھی کہ تمہاری نظریں  
 میرے تعاقب میں لگی رہتی ہیں۔ شاید نمرہ کی زندگی  
 میں بھی ایسا ہی تھا مگر تم نے بھی کسی بات سے اشارہ  
 بھی نہیں دیا کہ تم مجھے پسند کرتے ہو۔“ کہتے ہیں دل کو  
 دل سے راہ ہوتی ہے۔ شاید جب میں نے تمہیں اللہ  
 سے مانگا تھا وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ جیسی تو خود بخود  
 رشتہ بنتا چلا گیا۔ اماں کا غصہ بھی اپنی جگہ درست ہے  
 کہ وہ اپنی حسن خوبصورتی سے مالا مال بیٹی کو ایک  
 رنڈوے سے کیسے بیاہ دیں جس کی ایک معصوم سی بیٹی  
 بھی ہے۔ مگر اماں آپ اپنی اس جیتی اور حسین بیٹی  
 کے خوابوں سے بے خبر ہیں کہ جس نے محسن رحمانی کو  
 دل میں اس وقت بسایا تھا جب اسے یہ بھی خبر نہیں تھی  
 کہ محسن رحمانی نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ ایک دو  
 سالہ بیٹی کا باپ بھی ہے۔ وہ وجہ پر کشش  
 شخصیت، دراز قد، سڈول جسم، سرخ و سفید رنگت، جھوڑی  
 پرکشش سمندر کی طرح گہرائی لیے آنکھیں، وہ پہلی ہی  
 نظر میں اس کی شخصیت کے سحر میں کھوس گئی تھی۔  
 اس دن ویک اینڈ تھا۔ وہ شام کو بالکونی میں کھڑی  
 تھی جیسی وہ اپنے اپارٹمنٹس کے فلیٹ سے نکل کر اپنی  
 گاڑی باہر نکال رہا تھا پہلے وہ چوکیدار سے کچھ باتیں

کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے گیلری میں کھڑی اسے  
 دیکھ رہی تھی پھر تو جیسے وہ اس کے لیے بے چین رہنے  
 لگی۔ اسے اس کے آنے جانے کا وقت معلوم ہو گیا  
 تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی۔ اسی کے خیالوں  
 میں کھلی رہتی۔ آفس سے آکر اپنے کمرے میں گھر  
 جاتی۔ تنہا بیٹی اسی کے بارے میں سوچتی رہتی، جس  
 کے نام سے بھی واقفیت نہیں تھی۔ ایک شام وہ آفس  
 سے گھر پہنچی تو اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے  
 بری طرح چونکی وہی خوب صورت نوجوان سیڑھیاں  
 اتر رہا تھا۔ اس کے ساتھ سانوئی سی رنگت کی اسارٹ  
 ی لڑکی آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگائے چھوٹی سی بچی کو کو  
 میں اٹھائے اسی کے ساتھ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اسے  
 دیکھ کر اخلاقا مسکرائی سدرہ بھی مسکرا دی۔ ابھی سدرہ  
 کچھ کہنے والی تھی کہ بچی روئے لگی۔  
 ”محسن اسے لویہ تمہارے پاس آنے کو کہہ رہی  
 ہے۔“  
 ”اوہ بیٹا۔“ محسن کی گھمبیر آواز اس کے کانوں  
 سے ٹکرائی۔ اوہو ایک لمحے میں دل چٹکانا چور ہو گیا۔  
 آنکھوں میں کرجیاں سی چھلے لگیں۔ دل کو نہ جانے کیا  
 ہونے لگا تھا۔ نہ جانے کیسے وہ مرے مرے قدم اٹھاتی  
 اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچی۔ دل اس حقیقت کو  
 ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ وہ گھر  
 کے اندر داخل ہوئی تو صولت آپا چائے کی ٹرے لیے  
 اماں کے کمرے میں جا رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر بولیں  
 میرا اندازہ اتنا درست ہے۔ میں دروازہ کھول تین  
 کپ چائے نکالتی ہوں اور تم اسی وقت آتی ہو۔ ویسے  
 حیرت کی بات ہے تمہیں بس ہمیشہ ہی وقت پر ملتی ہے  
 اور تم وقت سے ٹم گھر آ جاتی ہو کہ نہ ایک منٹ کم نہ  
 زیادہ۔“ صولت آپا اپنی رو میں بولے چلی جا رہی  
 تھیں۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔  
 پرکھ کر کہنے لگے قدموں آگئی۔  
 ”سدرہ! منہ دھو لو تو چائے پی لو۔“

”نہیں اماں! دل نہیں چاہ رہا آج چائے کو۔“ وہ  
 وہیں اماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ ”ویسے اماں  
 صولت آپا کیوں بھول جاتی ہیں۔ میں بس سے نہیں  
 آتی، آفس کی گاڑی اپنے وقت پر ڈراپ کرتی ہے۔“  
 اماں مسکرانے لگیں۔ ماں کی آغوش بھی کتنی پرسکون  
 ہوتی ہے صرف زانوں پر سر رکھنے سے کتنا سکون مل رہا  
 تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا اماں سے لپٹ کر روئے اور  
 دل کی ساری بھڑاس نکال دے مگر نہیں روئے کا سبب  
 کیا بتلائے گی۔ وہ اپنے آنسو دل کے اندر اتارنے  
 لگی۔  
 ”کیا بات ہے سدرہ آج بہت تھک گئی ہو۔“ ماں  
 نے پوچھ ہی لیا۔  
 ”ہاں اماں! کچھ کام بڑھ گیا ہے۔ آفس میں نئے  
 منبج آئے ہیں۔“ اس نے صاف جھوٹ بولتے ہوئے  
 بات بنائی۔ ”سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔“  
 ”لو چائے پی لو۔“ صولت آپا نے کہا تو اس نے نفی  
 میں گردن ہلا دی بولی کچھ نہیں۔  
 ”ارے سدرہ آج نمرہ باجی آئی تھیں۔“  
 ”کوئی نمرہ باجی؟“ صدمہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔  
 ”ارے وہی جو پچھلے مہینے سینڈ فلور پر شفٹ ہوئی  
 ہیں۔ بتا رہی تھیں گلشن میں اپنا بنگلہ ہے، مگر اکیلی  
 ہونے کی وجہ سے انہوں نے رہائش کے لیے فلیٹ لیا  
 ہے۔ ان کے شوہر محسن رحمانی ڈی ایس پی ہیں ویسے  
 وہ لگتے بھی بڑے رعب والے ہیں، دیکھا ہے نام  
 نے۔ نمرہ باجی تو بڑی خوش اخلاق ہیں اتنی اچھی ہیں  
 پتا ہی نہیں چل رہا تھا وہ ہمارے گھر پہلی بار آئی ہیں۔  
 ہنستی ہوتی کتنی اچھی لگ رہی تھیں۔ کیوں اماں کیسے  
 موتی جیسے باریک دانت ہیں۔“  
 ”صولت آیا! فضول کی تعریف کیے جا رہی ہیں  
 ابھی میں نے دیکھا ہے عام سی شکل صورت ہے بے  
 جوڑ پکل۔“ نہ جانے کیسے اس کے منہ سے نکل گیا۔  
 ”اے ہے تم نے کہاں دیکھ لیا؟“ اماں فوراً



بولیں۔

”ابھی جب میں آرہی تھی تو وہ لوگ جارہے تھے۔ مجھے تو ذرہ برابر بھی اچھی نہ لگی۔ ویسے مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی تھیں۔ لگتا ہے آپ نے غائبانہ تعارف کرادیا تھا۔“

”ارے کوئی ایسا ویسا۔“ صولت آپا نے ہنس کر کہا۔

”ہاں جی بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔“ سدرہ آہستہ سے بولی۔

”اصل خوب صورتی تو انسان کے اندر ہونا چاہیے۔ بظاہر وہ خوب صورت نہیں ہے مگر باطن تو خوب صورت لگتا ہے۔“ اماں بولیں۔

”ماں! پہلی ملاقات میں آپ ان کی اتنی تعریف کر رہی ہیں۔“

”تم نے ایک بار بات کر لی نا تو ان ہی کے قصیدے پڑھو گی۔“ صولت کے لہجے سے پتا چل رہا تھا وہ بہت متاثر ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ انجانے میں ایک ایسے شخص کو

دل میں بسا بیٹھی تھی جو اس کی دسترس سے بہت دور تھا۔ وہ تو ہمیشہ اپنی من مانی کرتی آئی تھی جو مانگا اماں نے حاضر کر دیا۔ اماں سدرہ کی بڑی سے بڑی خواہش

بھی کسی نہ کسی طرح پوری کر دیتی تھیں۔ اماں کے انتقال کے بعد صولت آپا نے اماں کا ہاتھ بٹانے میں پورا

ساتھ دیا۔ اماں نکلے بھر کے کپڑے سینے لگی تھیں۔ صولت آپا بھی اماں کے ساتھ لگ گئیں۔ اب اماں

صرف کنگ کرتی تھیں۔ آپا صولت سلائی۔ سدرہ صولت آپا سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ بی اے کے بعد

اس کا اصرار بڑھا کہ وہ ماسٹر کرے گی۔ اماں کی گنجائش نہیں تھی آگے پڑھانے کی مگر سدرہ کے شوق

نے انہیں مجبور کر دیا اور پھر اس نے ماسٹر کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ صولت آپا نے کہا بھی اماں

پڑھائی کے اخراجات پورے ہونا ناممکن ہو جائیں گے۔

اتنی مہنگی کتابیں آتی ہیں۔ رجسٹریشن فیس وغیرہ الگ۔ سدرہ نے ایک نہ کی۔

”ٹھیک ہے میں بھی بیٹھ کر لیتی ہوں۔“ اور پھر واقعی سدرہ اپنی دوست غمیرہ کے ساتھ بیٹھ کر لکھنے لگی۔ گھر کے قریب ہی تھا ایک گھنٹہ پڑھنا ہوتا تھا۔ وہ بچوں کے بیٹھنے میں پڑھانے لگی۔

وقت دے دے پاؤں گڑ گیا۔ اب اس کے پاس ماسٹر کی ڈگری تھی۔ اسے جلد ہی جاب مل گئی ایک بڑی پرائیویٹ فرم میں۔ گھر کے حالات تیزی سے بدل

رہے تھے مگر صولت آپا کا کوئی مناسب رشتہ نہیں آ رہا تھا۔ ادھر بوا شا کرہ سدرہ کے رشتوں کی لائن لگائے ہوئے تھیں۔ مگر سدرہ کا ایک ہی جواب تھا۔ وہ اسی

سے شادی کرے گی جو اس کی طرح خوب صورت ہو گا۔ اسے بے جوہر پکلی پسند نہیں تھے اور اماں اس کی

ایسی منطق سے نالاں تھیں۔ عمر کی ستائیس بھائیوں دے پاؤں نکل گئی تھیں مگر وہ اپنے فیصلے میں کوئی ترمیم

نہیں کر رہی تھی۔

”صولت آپا کی طرف سے تو اماں ناامید ہوتی چکی تھیں پھر بھی امید کی دور ہاتھ میں مضبوطی سے

تھامے ہوئے تھیں۔ وہ سدرہ کی بھی گزرتی عمر کے خوف سے پریشان تھیں، مگر وہ سنی کہاں تھی اور پھر جو

آئیڈیل کی صورت میں نظر آیا وہ اس کی دسترس سے اتنا دور تھا وہ دل تھام کر رہ گئی۔ پھر نہ جانے اس کے

دل میں کیا آئی کہ اس نے اچانک نمبر سے دوستی بڑھا لی۔ اس سے آکر وہ نمبر کے گھر چلی جاتی۔ صولت آپا

کہتیں۔ ”کیوں میں نے کہا تھا نا تم تو یقین ہی نہیں کر رہی تھیں۔ میری بات کا اب ان ہی نمبر باجی کا وہ

بھر رہی ہو۔“ آہستہ آہستہ وہ حسن رحمائی سے بھی بے تکلف ہوتی جا رہی تھی باتوں باتوں میں جس دن اسے

یہ معلوم ہوا نمبر اور حسن کی لومیر نے دل ہی دل میں وہ بڑی حیران ہوئی تھی۔ ”حسن رحمائی تمہیں نمبر میں

کیا نظر آیا، کہاں تم اور کہاں یہ معمولی لڑکی۔“ وہ سوچا

کر رہی تھی۔ وہ بہت سوچتی اپنے دل کو سمجھاتی کہ جو وہ چاہتا ہے وہ ناممکن ہے، مگر دل کا اصرار بڑھتا گیا۔ اسے حاصل کرنے کا۔ کسی طرح وہ راستہ تلاش کرنے

میں لگ گئی۔ کون سے راستے سے وہ حسن رحمائی کو حاصل کر سکتی ہے ہاں کیوں نہیں وہ بلا کی حسین ہے۔

سرخ سفید رنگت، ستواں ناک، کتلی چہرہ بڑی بڑی کالی آنکھیں، ریشم جیسے سنہرے بال، کہیں بھی تو بنانے

والے نے کمی نہیں چھوڑی تھی۔ وہ جب بھی نمبر کے گھر جاتی نمبر کھلے دل سے اس کے حسن کے قصیدے

پڑھتی۔ کبھی کبھی تو حسن رحمائی سے بھی کہہ دیتی دیکھو حسن سدرہ پر یہ رنگ کتنا چل رہا ہے اور حسن بھی بڑی

بے تکلفی سے کہہ دیتا۔ ”اللہ میاں نے اسے خاص فرشتوں سے خاص مٹی سے بنایا ہے۔“ حسن کی بات

سن کر سدرہ کھل اٹھتی۔

حسن کو بیٹھا بہت پسند تھا وہ اکثر صولت آپا سے فرمائش کر کے کوئی میٹھی ڈش بولا لیتی اور بے چاری

صولت آپا اس کے کہنے پر بنانے بیٹھ جاتیں اور وہ ڈش کو بڑی خوب صورتی سے سجا کر نمبر کے فلیٹ کی

یڑھیاں پھلاتی چلی جاتی۔ صولت آپا کا موڈ بگڑ جاتا۔ ”دیکھا اماں لو کی کا حلوہ اتنی محبت سے اس نے

نمروہ باجی کے لیے بنوایا تھا۔ آدھے سے زیادہ تو یہ ادھر لے گئی۔ اب لو گئی پورے ایک گھنٹہ بعد جب تک

ان کے گھر کا روز ایک چکر نہ لگائے“ لگتا ہے اس کا کھانا بہتر نہیں ہوتا۔“ صولت آپا بڑبڑاتی ہوئی کچن

میں روٹی پکانے چلی گئیں۔

”اری سدرہ او سدرہ۔“ اماں نے اسے فلیٹ کا دروازہ کھول کر وہیں سے آواز لگائی۔ ”ایک گھنٹے سے

زیادہ ہو گیا ہے وہیں جم کر رہ گئی ہے۔“ وہ اماں کی آواز سن کر اپنی عادت کے مطابق دھم

دھم کرتی یڑھیاں پھلاتی گھر میں داخل ہوئی۔

ساتھ تھوڑی سی گپ شپ کر لیتی ہوں اور وہ لا ریب تو اتنی پیاری باتیں کرتی ہے۔“

”سدرہ! یہ کیا نمبر نمبر لگائے رہتی ہو۔ وہ تم سے کہیں بڑی ہیں۔“

”ارے نہیں صولت آپا۔ مجھ سے ایک دو سال چھوٹی ہی ہوں گی۔“

”ہاں دودھ پیتی پیتی ہیں۔ تم کو سب کی اماں بننے کا بڑا شوق ہے۔“

”چلے مان لیتے ہیں مگر صولت آپا۔ آپ سے تو وہ چھوٹی ہی ہیں۔ تم از کم آپ بھی نمبر باجی نہ کہا کریں۔“

”اچھا چلو فضول بحث نہیں کرو۔“ صولت آپا نے کھانے کے لیے دسترخوان بچھاتے ہوئے کہا۔ ”چلو

اب فافٹ دسترخوان پر آ جاؤ۔“

”مگر میں نے تو نمبر کے ساتھ کھا لیا۔“ سدرہ نے بڑے اطمینان سے کہا تو اماں کو ایک دم غصہ آ گیا۔

”سدرہ! یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ تم۔۔۔۔۔“

”او میری پیاری اماں! پہلا اتفاق ہے میں لو کی کا حلوہ لے کر گئی تو نمبر ڈاننگ ٹیبل پر کھانا لگا رہی تھیں۔

بس زبردستی مجھے بھی کھانے کے لیے بٹھالیا۔ اب اتنی محبت سے کوئی آفر کرے تو اچھا نہیں لگتا انکار کرنا۔

زرگی کو فٹے بہت لذیذ بنے ہوئے تھے اور صولت آپا! لو کی کے حلوے کا تو خوب ڈنکا بجا۔ نمبر کہہ رہی تھیں

کل ہی حسن نے مجھ سے کہا تھا لو کی کا حلوہ بنانا اور تم آج بنانا لیں۔ حسن رحمائی بھی کہہ رہے تھے تمہاری آپا

لگتا ہے کھانا بنانے میں ماسٹر ہیں۔ واقعی حلوے نے خوب تعریف کروائی۔“

”کیا حلوہ حلوہ لگا رکھا ہے۔“ صولت آپا ایک دم چڑ کر بولیں تو سدرہ بھی ان کی شکل دیکھ کر ایک دم

خاموش ہو گئیں۔ وہ دونوں ماں بیٹی خاموشی سے کھانا کھانے لگیں۔ صولت آپا نے مٹر قیمہ بنایا تھا۔ وہ



خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔  
وہ بڑی بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی، جیسی  
صورت آپا کمرے میں داخل ہوئیں۔

”ارے یہ کیا کر رہی ہو؟“  
وہ کچھ نہیں بولی۔ کچھ دیر اسی طرح ٹہلنے کے بعد وہ  
صوفے پر بیٹھنے ہوئے بولی۔

”سارا دن چیخ پر بیٹھے بیٹھے میری ٹانگیں سن سی ہو  
جاتی ہیں۔ اس لیے تھوڑا سا اپنے کمرے ہی میں ٹہلنے  
لگی۔“

”اگر ایسی بات ہے تو چلو چھت پر چلتے ہیں مزا  
آئے گا۔ ٹھنڈی ہوا میں۔“  
”نہیں، پھر کسی دن چلیں گے۔ مجھے تو اب نیند  
آ رہی ہے۔“

”کیا بات ہے اتنی جلدی نیند کیوں آ رہی ہے۔  
ابھی تو تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں۔ تم تو آنے  
کے ساتھ وہاں چلی جاتی ہو اور سدرہ مجھے تمہارا ان کے  
یہاں جانا پسند نہیں، سبھی کچھ تو اچھا لگتا ہے مگر روز  
روز کا آنا جانا قدر کھودیتا ہے۔ ویسے بھی ان دونوں  
میاں بیوی کے بیچ میں تم بڈی بننے کے لیے روز بیچ  
جاتی ہو۔“

”ارے ارے ان دونوں کے بیچ تو پہلے ہی ایک  
بڈی موجود ہے لاریب۔“ سدرہ نے ہنس کر کہا تو  
صورت آپا بولیں۔

”جست مت کیا کرو۔ بس مجھے اچھا نہیں لگتا۔“  
”مگر مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے۔“ اس نے کھوئے  
کھوئے انداز میں کہا۔

”فلٹوں میں رہنے والے ایک دوسرے پر بڑی  
کڑی نظر رکھتے ہیں۔ سامنے والی آنٹی زبیدہ کہہ رہی  
تھیں۔“ صورت آپا کہتے کہتے رک گئیں۔

”کیا کہہ رہی تھیں؟“ وہ صورت آپا کی طرف دیکھ  
کر چوکتے ہوئے بولی۔  
”یہی کہہ رہی تھیں سدرہ اور نمرہ کی تو خوب دوستی

ہو گئی ہے۔ سدرہ آفس سے آکر زیادہ وقت ادھر ہی  
گزارتی ہے۔ میں تو سبھی جانتی بھی ہوں تو دن میں ہو  
آتی ہوں شام میں تو ڈی ایس بی میں رحمانی آجائے  
ہیں۔ ان کے سامنے جاتے اچھا نہیں لگتا۔“

”اوہو، ابھی چھوڑیں صورت آپا، آنٹی کی تو عادت  
ہے ہر کسی سے جھلس ہونے کی۔ زبیدہ آنٹی میری یا  
آپ کی عمر کی ہیں جو میں ان سے دوستی کروں۔ ان کی  
تو عادت ہے ہر کسی کی ٹوہ میں گئی رہتی ہیں۔ اکثر آتے  
جاتے میں انہیں دروازہ کھولے کھڑا ہی دیکھتی ہوں۔“

”کون کدھر جا رہا ہے؟ کس کے یہاں کیا ہو رہا ہے۔“  
”اچھا ابھی چھوڑ دو، تمہیں کچھ سمجھانا بہت مشکل  
ہے۔ تم یہ بتاؤ تمہارا آفس ورک کیسا چل رہا ہے۔“

”ارے آج کل تو نے ٹیچر صاحب جب سے  
آئے ہیں بس وہ فالکوں میں پرائے میجر کی غلطی چیک  
کرنے میں مصروف ہیں۔ اپنے نمبر بڑھانے کے چکر  
میں۔“ آپا صورت اس کے قریب ہی بستر پر لیٹ گئیں  
اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اماں عشاء کی نماز  
پڑھنے کھڑی ہو گئی تھیں۔

”تین دن سے وہ چھٹی پر تھی۔ سارا دن اپنے  
کمرے میں بند سوچوں میں گم رہنے لگی تھی۔ سن  
رحمانی کے دل تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی۔ آج  
صبح ہی سے وہ بہت اپ سیٹ کی تھی۔ ناشتہ بھی اس  
نے بے دلی سے کیا۔“

”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ماں نے فکر مندی سے  
اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بس اماں سر کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ سوچ رہی  
ہوں ایک ہفتے کی اور چھٹی لے لوں۔“ اس نے کہا۔  
”مل جائے گی چھٹی؟“

”ہاں کیوں نہیں پورے سال میں نے ایک بھی  
چھٹی نہیں کی ہے۔“  
”ارے ہاں آج تو تمہاری دوست عمیرہ کی شادی  
بھی ہے جانا نہیں۔“

”ہاں شاید نہیں۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا  
”تو صحت آپا بڑھائیں۔“ عجیب لڑکی ہے شاید سے کیا  
براد ہے؟“ وہ کچھ نہیں بولی اپنے کمرے میں چلی  
آئی۔

دوپہر ڈھل رہی تھی تو وہ نمرہ کے فلیٹ کے  
دروازے پر ٹیل بجار رہی تھی۔ نمرہ نے دروازہ کھولا۔  
”بھی دو دن سے تم کہاں تھیں ہم تو تمہارے  
عادی ہو گئے ہیں۔ محسن بھی کہہ رہے تھے۔ سدرہ نہیں  
آئی۔“ نمرہ کہتی ہوئی اسے اپنے کمرے میں لے  
آئی۔ کپڑے پر لیس کے لیے استری اسٹینڈ پر پھیلے

ہوئے تھے۔ استری کا تار نکلا ہوا تھا۔ نمرہ اسے بیٹھنے کا  
اشارہ کرتی ہوئی استری کے اندر کا تار جوڑنے کی  
کوشش کر رہی تھی۔

”ارے نمرہ ہماری استری لے لو چھوڑو اسے۔“  
”نہیں یا سدرہ اچھی خاصی چل رہی تھی۔ پتا نہیں  
شاید بلب فیوز ہو گیا ہے اس کا۔ اندر کا تار کھل جاتا  
ہے میں جوڑ لیتی ہوں۔ پورا سوٹ تو ہو گیا ہے۔ صرف  
دوپٹہ رہ گیا ہے۔“ استری کا پلگ سوچ بورڈ میں لگا ہوا  
تھا سوچ بند تھا۔

”اور تم سناؤ آج اس وقت کیسے نظر آ رہی ہو؟“  
نمرہ نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو دو دن سے چھٹی پر ہوں۔ سر میں درد بہت  
ہے۔ بس دل چاہا چھٹی ماری ہے۔“ وہ مسکراتے  
ہوئے بولی۔ ”ارے نمرہ لاریب نظر نہیں آ رہی۔“

”ہاں کل سے امی کے پاس ہے۔ کل میں گئی تھی  
نا تو لاریب رک گئی تھی۔“

”رہ جاتی ہے تمہارے بغیر؟“ سدرہ نے پوچھا۔  
”ہاں بھائی کے بچے ہیں نا۔“  
”مگر اتنی چھوٹی تو ہے۔“

”ہاں آج لے آؤں گی۔ جی تو کپڑے پر لیس  
کر رہی تھی۔ محسن آئیں گے تو ان کے ساتھ جاؤں  
گی۔ کہہ رہے تھے جلدی آئیں گے۔ ویسے آج ہم

دونوں کی شادی کی تیاری اپنی ورسری ہے۔ آج کا ڈنر  
فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوگا۔“  
”اکیلے اکیلے۔“ سدرہ ایک دم چپکی۔  
”تم بھی چلو ہمارے ساتھ امی کے یہاں سے  
لاریب کو لیں گے پھر ڈنر پر جائیں گے۔“

”او او۔“ ایک خیال آتے ہی وہ بری طرح چوکی  
تھی۔ ”مجھے بھی آج ایک دوست کی شادی میں جانا  
ہے۔“

”پھر تو اصرار نہیں کروں گی۔“ نمرہ نے مسکراتے  
ہوئے کہا۔  
”ابھی دوپہر تک تو تم کہہ رہی تھیں کہ شادی پر نہیں  
جاؤ گی۔ اب چلنے کا اصرار کر رہی ہو۔“ صورت آپا نے  
جھنجھلاتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

”کھ میں بیٹھے بیٹھے گھبراہٹ ہو رہی ہے اور پھر  
عمیرہ کا فون آیا تھا اس کے ساتھ مجھے پارلر بھی جانا  
ہے۔“

”پھر تو تم ہی جاؤ خوار ہونے اور کوئی نہیں ہے  
جانے کے لیے جو تم کو بلایا جا رہا ہے۔“  
”بھئی صورت آپا دوستی میں ایسا ہوتا ہے۔ ایک تم  
اکلوتی دوست ہو کیا عمیرہ کی۔“

”ٹھیک ہے نہیں جانا ہے تو نہ جائیں۔“  
”جاؤ صورت چلی جاؤ یہ اکیلی کہاں جائے گی اور  
پھر واپسی میں بھی دیر ہو جائے گی۔ شادی میں تو دیر  
ہوتی ہی ہے۔“

”مگر اماں تیار ہو کر جانا ہوگا ابھی وقت ہی کیا ہوا  
ہے۔“

”چار بجے ہیں۔ بھئی تیار ہو کر نہیں جانا ہے۔ میں  
بھی اپنے کپڑے رکھ رہی ہوں۔ آپ بھی رکھ لیں۔  
وہیں پارلر سے تیار ہو جائیں گے۔ ہم دونوں بھی۔  
عمیرہ نے یہی کہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں اس کا بھائی  
گاڑی لے کر آ رہا ہے۔“

”چلو پھر ٹھیک ہے۔“ صورت آپا کپڑے نکالنے  
لگی۔

”چلو پھر ٹھیک ہے۔“ صورت آپا کپڑے نکالنے  
لگی۔



الماری کی طرف بڑھ گئیں۔  
اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی گھر سے کہیں دور نکل جائے۔

ایک بجے رات کو ان دونوں کی وابستگی ہوئی۔ عمیرہ کے بھائی نے انہیں گھر ڈراپ کیا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی گاڑی سے اترتی۔ صولت آپا جیسے ہی زینے کی طرف بڑھیں تو چوئیں رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تمام فلیٹ والے جاگ رہے تھے نیچے گراؤنڈ میں لوگ جمع تھے۔ صولت آپا تیزی سے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ سدرہ بھی آگے بڑھی۔ زبیدہ آنٹی اور کئی خواتین ان کے دروازے پر کھڑی نظر آئیں۔ سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ”کیا ہوا ہے؟ یہ رونے کی آواز کس کے گھر سے آ رہی ہیں؟“ سدرہ نے پوچھا تو زبیدہ آنٹی بولیں۔ ”نمرہ وہ نمرہ مرگئی نا۔“

☆ ☆  
نمرہ کے دسویں کے بعد اس کی والدہ اور بھائیاں بھی اپنے اپنے گھر رخصت ہو گئیں۔ لاریب کے لیے نمرہ کی والدہ نے اپنے گھر کی پرانی ملازمہ جمیلہ کو محسن رحمانی کے گھر بھیج دیا تھا۔ وہ تو لاریب کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ مگر محسن کا کہنا تھا کہ وہ لاریب کے بغیر نہیں رہ سکیں گے اور پھر ان کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوگا کہ وہ روزانہ لاریب سے ملنے سسرال جائیں۔ ان کی ساس نے اسی وجہ سے اپنی پرانی بوڑھی ملازمہ جمیلہ کو یہاں بھیجا تھا کہ وہ لاریب کا اور محسن رحمانی کا بہت اچھی طرح خیال رکھے گی پھر وہ قابل اعتماد عورت تھی۔ اسی لیے محسن رحمانی بھی اسے رکھنے پر آمادہ ہو گئے۔

”نمرہ مرگئی؟“ دونوں بہنوں نے ایک ساتھ کہا۔ ”مگر کیسے؟“ صولت آپا رو دینے کو کہیں۔ ”بجلی کا کرنٹ لگ گیا تھا۔ گھر میں کوئی تھا نہیں۔ محسن رحمانی آئے تو تیل بجاتے رہے دروازہ نہیں کھلا۔ سب فلیٹ والے جمع ہو گئے۔ کسی طرح دروازے کا لاک توڑا تو اندر خوفناک منظر تھا۔ اتنا کہہ کر وہ عورتیں بھی رو ہانسی ہو گئیں۔

”ابھی چھ مہینے تو ہوئے تھے ان لوگوں کو یہاں آئے ہوئے۔ مگر نمرہ نے سب کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔“ ایک خاتون روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ”نمرہ کی ماں بہنوں کی بری حالت ہے۔ محسن رحمانی کو تو جیسے چپ لگ گئی ہے۔ ہنستا ہنستا گھرا جڑ گیا تھا۔ اتنی چھوٹی سی بچی ہے لاریب بن مایں کے کیسے رہے گی۔“

سدرہ کی بری حالت ہو رہی تھی۔ اس سے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ آنسو تیزی سے رخساروں پر پھیل رہے تھے۔ ”سدرہ اپنے آپ کو سنبھالو اوپر چلو کپڑے



دوسرے لمحے وہ محسن رحمانی کے فلیٹ کی بیل بجاری تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ملازمہ جیلہ نے دروازہ کھولا۔  
”آؤ بیٹی کسی ہو؟ لاریب ابھی تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔“

”صورت آبا اور امی تو ادھر نہیں آئیں؟“

”اندر آ جاؤ۔“ ملازمہ نے دروازے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا۔ تو وہ اندر چلی آئی۔

”لاریب دوڑ کر آئی اور اس کی ناگوں سے لپٹ گئی۔ اس نے اسے گود میں اٹھالیا۔

”صورت بی بی ابھی کچھ دیر پہلے آئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں امی کو بخار ہو گیا ہے ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہی ہوں۔“ جیلہ نے بتایا۔

”لاک کی چابی دے کر کڑھی ہیں صورت آپا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں چابی تو نہیں دی۔ تم آرام سے بیٹھو، ابھی آ جاؤں گی۔ میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔“

”نہیں رہنے دیں بوجیلہ۔“

”بس دو منٹ میں تو بنے گی۔“ وہ کہتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی، سدرہ اپنا پرس شانوں سے اتار کر نی

وی لاؤنچ میں بیٹھ گئی۔ لاریب اس کے پرس کو لے کر بیٹھ گئی۔ سدرہ اپنے ہی خیالوں میں گم بیٹھی تھی۔ کیسا

اجڑا ہوا گھر لگ رہا تھا۔ پورے گھر میں عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے جیسے اس کے دل کو کچھ

ہونے لگا۔ بھی بیل تھی تو جیلہ بوانے لپک کر دروازہ کھول دیا۔ محسن رحمانی اندر داخل ہوئے۔ ایک اچھتی

سی نظر اس پر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔ تو ان کی نظر لاریب پر پڑی جو بڑے مزے سے

سدرہ کا پرس گلے میں ڈالے بیٹھی تھی۔

”آؤ بیٹا۔“ انہوں نے اس کے گلے سے پرس نکال کر وہیں ٹیبل پر رکھا اور اسے لیے کمرے میں آ گئے۔ اتنی دیر میں بوجا جائے لے کر آ گئیں۔

”اچھا بوا اب میں چلتی ہوں۔“

”ارے چائے بن گئی ہے تو تم جا رہی ہو۔ آرام سے بیٹھو۔ صورت بی بی ادھر ہی آئیں گی۔ اگر دیر ہوگی

تو۔“ وہ چائے کا گپ اے تھاتے ہوئے بولیں اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں کچھ ہی دیر بعد صورت آئیں۔

”مجھے پتا تھا تم آ چکی ہوگی۔“ انہوں نے محسن فلیٹ میں آتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم کھڑی ہو گئی

لاریب نے اس کا پرس پھر اٹھا لیا تھا۔ وہ اپنا پرس لینے محسن کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

”لاریب لاریب میرا پرس دیں۔“

”بینا دیجیے آئی کا پرس شاہاب۔“ محسن رحمانی نے کہا تو لاریب نے فوراً ہی پرس وہیں پیچر پر چھوڑ دیا۔

سدرہ نے جلدی سے پرس اٹھالیا اور ایک نظر محسن رحمانی پر ڈالتی ہوئی خاموشی سے فلیٹ سے باہر آ گئی۔

لاریب کو بوجیلہ سلا کر ان کے کمرے میں لٹانے آئیں تو دیکھا محسن رحمانی البم لیے بیٹھے تھے انہیں بوا

کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ بوجیلہ لاریب کو ان کے بستر پر لٹا کر دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئیں۔

سارا دن بوجیلہ لاریب کو سنبھالتی تھیں لیکن رات میں محسن رحمانی اسے اپنے پاس ہی سلاتے تھے۔ وہ ان

کے بغیر سوئی بھی نہیں تھی۔ اب لاریب ہی تو ان کی کل کامیاب تھی۔ ان کا دل غم سے چورتھا مگر یہ لاریب

ہی تھی جس کی معصوم شوخ حرکتوں سے ان کے بولوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی مگر جب اکیلے ہوتے، نمرہ کی یاد

ستانے لگتی۔ وہ تمام رات جاگتے رہتے۔ اس کے ساتھ گزارے ایک ایک لمحے کو یاد کرتے رہتے۔ اس

کے بغیر زندگی ویران سی لگنے لگی تھی۔

وقت کا کام ہے گزرتا، جو کسی کے لیے نہیں رکتا۔ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان دنوں محسن رحمانی کچھ زیادہ

مضطرب نظر آنے لگے تھے۔ اب تو تین مہینے ہونے کو آ رہے تھے مگر نمرہ کی جدائی کی کک اور بڑھ گئی تھی۔

بوجیلہ دیکھ رہی تھیں۔ ایک ہفتے سے محسن رحمانی کی

بھی حالت تھی۔ وہ کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھا رہے تھے۔ لگتا تھا کسی سوچ میں گم ہیں۔

ایک دن بوا پوچھ ہی بیٹھیں۔ وہ اپنے کمرے میں تھے۔ ان کے سامنے ہی لاریب بیٹھی کھیل رہی تھی۔

”محسن میاں! کھانا لگا دیا ہے کھا لیں۔ لاریب بیٹا ادھر آؤ میں تمہیں دلیہ کھلا دوں۔“ انہوں نے لاریب کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ محسن رحمانی خاموش بیٹھے

تھے۔

”محسن میاں! کیا بات ہے میں دیکھ رہی ہوں آج کل تم بہت پریشان ہو۔ کوئی مسئلہ ہے کیا؟“

”ہاں میں زندگی کے بڑے ٹھن دورا ہے پر کھڑا ہوں۔ میں نے اپنی دس سالہ پولیس آفیسر نہ زندگی

میں بہت سے مجرم پڑے ہیں۔ بڑے بڑے مجرموں سے جرم کا اعتراف کرانے میں کامیاب رہا ہوں۔

مجرم کی شکل دیکھ کر میں اس کے جرم کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہوں۔ مگر ایک بڑا مجرم میری آنکھوں میں دھول

جھونکنے میں کامیاب ہو گیا۔“ محسن رحمانی نے ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے کہا تو بوجیلہ بولیں۔

”ہاں بیٹا ایک کیا بہت سے مجرم ایسے ہوتے ہیں۔ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر صاف بیچ

جاتے ہیں۔ ایسا تو ہوتا رہتا ہے۔ چھوڑو بیٹا، تم چلو کھانا کھاؤ۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

”نہیں بوا میں اسے چھوڑوں گا تو نہیں۔ جرم کی سزا تو ضرور دوں گا۔ میرے ہاتھ تو لگ جائے“ چاہے

نہیے کتنا ہی انتظار کرنا پڑے اس نے ایک بڑے پولیس آفیسر کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی

سے۔“ محسن رحمانی کہتے ہوئے بوجیلہ کے ساتھ ڈانٹنگ ٹیبل پر آ گئے۔

”میں وہ وہ کھاؤں دی (گی)“ لاریب نے کسٹرڈ کی ڈش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بوا کسٹرڈ بنایا ہے تو دے دیں لاریب شوق سے کھاتی ہے۔“

”میں نے نہیں بنایا، وہ سدرہ بنا کر لائی تھی۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے تک تو لاریب کے

ساتھ ہی کھیل رہی تھی۔“ بوانے کہا تو محسن رحمانی کچھ دیر تو خاموش رہے پھر اپنی پلیٹ میں بریانی ڈالتے ہوئے بولے۔

”لاریب سدرہ سے بہت مانوس ہے۔ نمرہ کے سامنے بھی لاریب کی کئی گھنٹے سدرہ کے گھر رہتی تھی۔“

”ہاں تو اب بھی یہی ہوتا ہے۔ دن میں اکثر صورت بی بی لے جاتی ہیں اور شام میں سدرہ آفس

سے آتی ہے تو لاریب کے لیے ڈھیر ساری ٹافیاں لے کر آتی ہے یا پھر اس کو اپنے پاس لے جاتی ہے۔

ابھی یہ کسٹرڈ دینے آئی تھی تو کہہ رہی تھی۔“ نمرہ کہتی تھی محسن کو کسٹرڈ تو اتنا پسند ہے اگر روز بھی مل جائے تو

انکار نہیں کرتے۔“

”ہاں بوا، نمرہ تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن کسٹرڈ بنا لیا کرتی تھی۔ بھی بنانا کا تو کبھی مینگو کا۔ یہ کسٹرڈ

سدرہ نے نہیں صورت نے بنایا ہوگا“ سدرہ ان ہی سے بھولی ہے۔ ایک بات کہنا چاہ رہا تھا بوا میں۔“ محسن

رحمانی نے ٹپکٹن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اُمّی فلیٹوں میں بوا شا کر رہتی ہیں جو رشتے وغیرہ کرائی ہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ بوانے

چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش تھے جیسے سوچ رہے ہوں کہ یہ بات جو وہ کہنا چاہ رہے ہیں بوا سے

کیسے کہیں۔ مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے بوجیلہ ہی سے پہلے بات کرنی ہوگی۔“

”ہاں بولو کوئی کام ہے۔ بوا شا کرہ سے تو ایک بار میں بھی ملی ہوں۔“ بوجیلہ نے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لاریب کے لیے۔ بوا لاریب کو قدم قدم پر ایک ماں کی ضرورت

پڑے گی میں نہیں چاہتا میری لاریب زندگی کے کسی بھی موڑ پر بحرِ وحی کا شکار ہو، میں اسے ایک اچھی ماں دینا



”مما! ممما! دیکھیے میں نے ایم بی بی ایس میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔“ لاریب نے ماں کے سامنے اخبار پھیلاتے ہوئے کہا۔ محسن رحمانی نے فخر سے بیٹی کی طرف دیکھا۔

”ہاں آج میری لاریب ڈاکٹر بن گئی ہے۔ بس اب اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کریں۔ بیگم ڈاکر کی بار اشاروں اشاروں میں اپنے اکلوتے بیٹے طلحہ کے لیے کہہ چکی ہیں۔ طلحہ تو پچھلے سال ہی لندن سے سرجن کی ڈگری لے کر آیا ہے اور اب بیگم ڈاکر بھولانا چاہ رہی ہیں۔“ سدرہ نے محسن رحمانی کی طرف مسکرا کے دیکھ کر کہا۔ محسن رحمانی جو اس عمر میں بھی اپنی پروقار اور پرکشش شخصیت میں اور اضافہ کر چکا تھا سدرہ تو اس پر آج بھی اتنا ہی فدا محسن سدرہ کے حسن میں وہ بات نہ رہی تھی اس نے محسن رحمانی کے ساتھ بڑی کڑی زندگی گزاری تھی۔ لاریب کو اس نے بھی ماں کی کمی محسوس ہونے نہیں دی تھی۔ لاریب جانتی تھی کہ وہ اس کی سوتیلی ماں ہے۔ محسن رحمانی نے یہ بات اسے جیسی بتا دی تھی جب اس نے سوچنے سمجھنے کی حدود میں قدم رکھا تھا تا کہ اسے اچانک انکشاف پر صدمہ نہ ہو مگر لاریب سدرہ کے متاثرہ بے سلوک سے یہ فراموش کر چکی تھی کہ اس کی ماں سوتیلی ہے۔

نمرہ کی موت کو بائیس سال گزر جانے کے باوجود محسن رحمانی اسی کا تھا۔ اس نے شادی کی رات سے لے کر اب تک سدرہ سے محبت کا ایک لفظ ایک جملہ نہیں کہا تھا اور سدرہ نے اس کی طرف سے محبت کے ایک جملے کے لیے بائیس سال گزار دیئے تھے۔ وہ سمجھتی تھی ایک دن وہ ضرور آئے گا جب محسن رحمانی نمرہ کو بھول جائے گا اور وہ اپنی محبت کا چراغ جلانے میں کامیاب ہو جائے گی مگر نہیں! بائیس سال کی رفاقت، قربت کے باوجود وہ خالی ہاتھ ہی خالی گود تھی۔ اس کے جذبات بوڑھے ہو چکے تھے مگر محسن

سدرہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ تو ہوا میں اڑ رہی تھی۔ جسے چاہا وہ اس کا ہونے والا تھا۔ اماں سے اس نے سنا محسن رحمانی بالکل سادگی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی ماں کے سامنے۔ ”امی سمجھنے کی کوشش بیچہ ابھی نمرہ کی موت کو صرف تین ماہ گزرے ہیں تو وہ دھوم دھام کیسے کر لیں۔ لوگ کیا باتیں نہیں بنا رہے۔“

”تو نہ کرے شادی۔ لوگ تو اب بھی باتیں بنا رہے ہیں کہ صرف تین مہینے بعد ہی شادی کر رہے ہیں محسن رحمانی۔ سنا تھا لو میرج تھی۔ نمرہ کی آنکھ بند ہوتے ہی شادی رچانے بیٹھ گئے۔“ ماں نے تپ کر کہا۔

”تو پھر سوچیے اگر وہ دھوم دھام کریں گے تو لوگ کیا کہیں گے انہیں۔ بس میں نے کہہ دیا ادھر بھی کوئی بلہ لگد نہیں ہوگا۔“

”سدرہ! تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ صولت آپا نے اسے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ماں کے گلے میں بانٹیں ڈال کر بولی۔

”اماں! اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے۔ سوچئے اور غور کیجئے۔ شادی جس طرح کرنا چاہ رہی ہیں اس طرح تو اچھی خاصی بڑی رقم صرف ہو جائے گی۔ ابا نے اپنی گورنمنٹ جاب کی کمائی سے جو ہم دونوں بہنوں کے لیے چھوڑا ہے نا وہ صرف میری شادی پر ختم ہو جائے گا۔ پھر یہ سات ہزار جو میرے آتے ہیں یہ بھی بند ہو جائیں گے۔ میں تو جاب چھوڑ دوں گی۔ ہو جا ہے آپ لوگ کیا کریں گی اماں میری مائیں سادگی سے رخصت کر دیں۔ کچھ رقم میری بھی بینک میں جمع ہو گئی ہے۔ ایسے نکال لیتی ہوں۔ سادگی سے کرنے کے لیے یہ رقم بہت ہوگی۔ جائے صولت آپا! محسن رحمانی سے کہہ دیجیے سب کچھ سادگی سے ہوگا۔“ اس نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے اماں کو پلٹا لیا۔ وقت بڑی تیزی سے پرواز کر گیا تھا۔

پاس پہنچیں تو وہ ایک دم خاموش سے ہو گئے۔ ان کے سامنے انہوں نے کوئی تہرہ نہیں کیا۔ مگر دو تین دن کے بعد وہ خود سدرہ کی ماں کے پاس پہنچ گئے۔ سدرہ اس وقت آفس سے نہیں آئی تھی۔

صولت آپا کو سدرہ نے بتا دیا تھا کہ محسن رحمانی کو پسند کرتی ہے اور اس رشتے پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ صولت آپا نے ساری بات ماں کو بتا دی تھی۔ بس وہ اتنا ہی کہہ کر گئی اس کے قہقہے میں محسن رحمانی ہی ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس لڑکی کی عقل پر پتھر پڑ چکے ہیں۔

اور اب محسن رحمانی کو اپنے گھر دیکھ کر وہ سمجھ چکی تھیں کہ وہ کس لیے آئے ہیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ اماں نے ہاں بھرتے ہوئے رشتہ منظور کر لیا۔

محسن رحمانی نے کہا۔ ”شادی بالکل سادگی سے ہو گی۔“

”واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں سدرہ کی شادی سادگی سے کروں ہمارا اتنا بڑا خاندان ہے۔ کیا میں کسی کو نہیں بلاؤں گی ہمارے گھر کی یہ پہلی شادی ہوگی اور بہت دھوم دھام سے ہوگی۔“

”آپ اپنے یہاں کچھ بھی کریں! لیکن میری طرف سے بارات میں میرے صرف چند دوست آئیں گے۔“

”ٹھیک ہے وہ تمہاری مرضی ہے۔“ صدر کی ماں نے کہا۔ ”مگر ہمیں کچھ وقت تو دو۔ شادی کوئی کھیل تو نہیں ہے۔ تیاری کرنی ہوگی۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہیے آئی صرف سدرہ کوئی جھنڈ وغیرہ نہیں دیجیے گا۔“ صولت چائے لے کر آگئی اس کے ساتھ ناشتے کی ٹرے بھی تھی۔

”چلیے مبارک ہو منہ میٹھا کر لیں۔“ صولت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو محسن بھی بولے سے مسکرا دیئے۔

چاہتا ہوں۔ جو اس سے ایک سگی ماں کی طرح محبت کرے۔“

”مگر بیٹا! ایک بات کہوں تمہیں بیوی تو مل جائے گی مگر لاریب کو ماں نہیں ملے گی۔ ضروری نہیں آنے والی اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔“

”نہیں بوا جیل! آپ کا خیال غلط ہے۔ مجھے یقین ہے وہ اسے ماں کی کمی کا احساس بھی ہونے نہیں دے گی۔“

”کیا تمہاری نظر میں ہے کوئی ایسی لڑکی؟“

”ہاں بوا! سدرہ۔“

”سدرہ؟“ بوا اس کا نام لے کر بددائیں۔

”ہاں پھر تو تمہارا خیال درست ہے مگر کیا سدرہ کے گھر والے یہ شادی کرنے پر راضی ہو جائیں گے اور خود سدرہ؟“

”بوا! آپ شاکرہ کو کل بلا کر لائیے گا میں خود ان سے بات کروں گا۔ اگر ان کے ذریعے بات نہ بنی تو میں خود سدرہ کی ماں سے رشتہ مانگنے جاؤں گا۔ مجھے

سدرہ جیسی ہی لڑکی لاریب کے لیے چاہیے۔“

”بیٹا! ایک بات کہوں ضروری نہیں کہ شادی کے بعد بھی سدرہ لاریب کو اسی طرح محبت دے۔ اگر تم صولت سے کرو شادی تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ صولت

ایک گھریلو لڑکی ہے۔ عمر تھوڑی زیادہ ہے اور شاید اسی وجہ سے صولت کی ماں انکار بھی نہیں کریں گی۔ مگر سدرہ کی بات دوسری ہے۔ وہ فیشن ایبل لڑکی ہے ایک اچھی فرم میں اعلیٰ پوسٹ پر جاب کر رہی ہے۔ ماسٹرڈ

اس نے جاب کرنے کے لیے ہی کیا تھا۔ بڑا بلہ گلہ کرنے والی شوخ لڑکی لگتی ہے۔ شادی کے فوراً بعد بچی کی ذمہ داری سنبھال نہیں سکے گی۔ ویسے تمہاری مرضی۔“

”نہیں بوا! آپ کا خیال غلط ہے۔ بس آپ کل ہی بوا شاکرہ کو مجھ سے ملوائیں۔“



رحمانی کی محبت آج بھی اس کے دل میں ویسے ہی جوان تھی کہ سچی محبت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ بدلتے موسموں کا اس کی محبت پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو گئے تھے۔

اس نے اپنے آپ پر کم اور لاریب پر زیادہ توجہ دی تھی۔ وہ ہر طرح محسن رحمانی کو خوش کرنا چاہتی تھی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہی تھی۔ زندگی کی ہر آسائش ہر سہولت میسر تھی۔ شادی کے فوراً بعد ہی وہ فلیٹ چھوڑ کر محسن رحمانی اس کے ساتھ اپنے گلشن والے بنگلے میں آ گئے تھے۔ انہوں نے اسے اس بید روم کو جس میں نہرہ رخصت ہو کر آئی تھیں۔ لاک کر دیا تھا مگر روزانہ رات کے کسی بھی پہر میں وہ آدھے ایک گھنٹے اسی بید روم میں بند ہو کر گزارتے تھے۔ سدرہ نے بھی مداخلت نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی دکھنا زہ ہے وقت لگے گا اسے بھولنے میں۔

مگر وقت جیسے جیسے گزرتا گیا یہ احساس بڑھتا گیا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اسے لگتا تھا وہ کڑی دھوپ میں سفر کر رہی ہے۔ جہاں کوئی سایہ نہیں ہے۔ اسے حاصل کر کے بھی وہ یکطرفہ محبت کی آگ میں اکیلی سلگ رہی تھی مگر اسے یقین تھا محبت کی اس یکطرفہ آگ پر جب محسن رحمانی کی محبت کی پھوار پڑے گی تو وہ سرشار ہو جائے گی۔

مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ آج لاریب ڈاکٹر بنی اس کے سامنے اخبار پھیلائے کھڑی تھی۔ اب اس کو اس کی شادی کی فکر ہو چلی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی گزرے سالوں کا منظر آنکھوں میں گھوم گیا۔ سدرہ نے خیالات کو ذہن سے جھٹکا تو اس کی نظر محسن رحمانی پر پڑی وہ اسی کو دیکھ رہے تھے۔

”کہاں چلتی گئی تھیں لاریب کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے؟“

”ڈیڈی! ممائیے ہی اکثر بات کرتے کرتے خیالوں میں کھو جاتی ہیں۔“ لاریب نے ہنس کر کہا تو

سدرہ ہولے سے مسکادی۔

ابھی وہ لوگ یہ باتیں کر رہے تھے کہ بنگلے کے گارڈ نے اکثر کام پر اطلاع دی بیگم ڈاکٹر اور ڈاکٹر طلحہ آئے ہیں۔

”اچھا محمد سے کہو ڈرائنگ روم میں بیٹھائے میں آ رہی ہوں۔“ سدرہ نے کہتے ہوئے ریسہ در رکھا۔

”بیگم ڈاکٹر اور ڈاکٹر طلحہ آئے ہیں۔“ سدرہ نے محسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو محسن سدرہ کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ ”لاریب تم بھی آؤ۔“

”چلیے ممائیے میں ابھی آتی ہوں۔“ لاریب کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔

”السلام علیکم“ بیگم ڈاکٹر کیسی ہیں آپ؟“ سدرہ پر جوش انداز میں سلام کرتی ہوئی ان سے گلے لگ گئیں۔ ڈاکٹر طلحہ محسن رحمانی سے ہاتھ ملانے لگے۔

”محسن بھائی یہ میرا بیٹا ہے طلحہ۔“

”جی! ابھی ان ہی کا ذکر کر رہی تھیں سدرہ کہ بیگم ڈاکٹر کے بیٹے طلحہ نے لندن سے ڈگری لی ہے۔“ محسن نے کہا۔ تو بیگم ڈاکٹر بولیں۔ ”اور اس وقت میں لاریب اور آپ دونوں کو خوش کرنے آئی ہوں۔“

”شکریہ بیگم ڈاکٹر۔ ماشاء اللہ لاریب نے بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔“ اتنی دیر میں لاریب بھی آ گئی تھی۔

”آداب آئی۔“ وہ کہتی ہوئی ان کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”محسن بھائی آپ کی لاریب تو ہو بہو آپ پر لگی ہے۔“ انہوں نے گولڈ کا بریڈسلٹ اس کی کلائی میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہاری کامیابی پر چھوٹا سا گفٹ۔“

طلحہ کی نظریں لاریب پر تھیں واقعی وہ بہت خوب صورت ہے۔ ممی کا انتخاب لا جواب ہے۔ وہ دل ہی دل میں ماں کے انتخاب کی داد دے رہے تھے۔

”سدرہ! تمہیں یاد ہے میں کئی بار کہہ چکی ہوں لاریب مجھے بہت پسند ہے اور آج تو میں آئی اسی لیے ہوں تاکہ کھل کر رشتے کی بات کر سکوں۔ طلحہ اور لاریب کے رشتے کی بات۔“ لاریب نے ایک نظر ڈاکٹر طلحہ پر ڈالی اور مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر آ گئی کہ اب اس کی شادی کا تذکرہ شروع ہو گیا تھا اور وہاں بیٹھنا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔ وہ چمن کی طرف آ کر ملازمہ کو کچائے اور ناشتے کے لوازمات کا آرڈر دینے لگی۔

”محسن! ہماری لاریب کا نصیب بہت شاندار ہے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ڈاکٹر طلحہ جیسے قابل سرجن کا پرپوزل آ گیا۔ دیکھو محسن ایک دو روز میں بیگم ڈاکٹر کو جواب دے کر مطمئن کر دو۔ اچھے رشتے روز روز نہیں آتے۔ یہ ہماری لاریب کا پہلا پرپوزل ہے۔ مگر انکار کی کہیں بھی گنجائش نہیں۔ پھر ڈاکٹر حسین آپ کے کو لیگ رہ چکے ہیں پرانی جان پہچان ہے۔“

”ہاں سدرہ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ تم ایسا کرو کل ان لوگوں کو فون کر کے بتا دینا ہمیں طلحہ کا پرپوزل منظور ہے۔“

”کاش آج نہرہ زندہ ہوتی۔“ سوچ کر ہی ان کے دل میں ایک میس سی اٹھی۔ اچانک سینے میں درد سا ہونے لگا تھا۔ وہ دوپہر سے ہو گئے۔

”کیا ہوا محسن؟“ سدرہ ان پر جھک گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ”میں ڈاکٹر کو فون کرنی ہوں۔“

”نہیں نہیں تم تو بلا وجہ رونے بیٹھ جاتی ہو۔ ایسے ہی کہیں درد سے ٹھیک ہو جائے گا۔“ محسن نے آہستہ سے کہا سدرہ بیٹھی رہی ان کے قریب۔

”سدرہ پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ کچھ دیر کے لیے اچھا تم بیٹھی رہو۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں محسن؟“ وہ بھی ایک دم کھڑی ہو گئی۔

جسٹ فار می

تم اکثر مجھے یاد آؤ گے

ہو گا یوں کہ جب اچانک

میری نگاہ دو سچے سورج پر پڑے گی

تمہاری مسکراتی شوخ آنکھیں میرے دل کو

لے تجا شاید آئیں گی

بیٹھے بیٹھے یوں تیری باتیں تیری ادائیں یاد کروں گی

تو

بے ساختہ میرے ہونٹوں پر مسکرائیں کھر جائیں گی

میرے اچھی مہربان دوست

ہر موسم میں ہر رت میں

ہر خوشی میں ہر دکھ میں

تم اکثر مجھے یاد آؤ گے

(روٹی گیلانی..... جز نوالہ)

”میں کہیں نہیں جا رہا۔“ انہوں نے بھٹلا کر کہا اور تیزی سے نہرہ کے بید روم کی طرف بڑھ گئے۔ آج کئی سال بعد انہوں نے اس بید روم کا رخ کیا تھا۔ سدرہ وہیں کی وہیں جی رہی تھی۔

”تو تمہیں نہرہ یاد آ رہی ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے ہونٹ کاٹ لیے۔ وہ ٹڈھال سی ہو کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

آج محسن رحمانی کے بنگلے پر بڑی رونق نظر آ رہی تھی۔ رونق تو کئی دن سے پھیلی ہوئی تھی۔ کل رات تو بہت ہی ہلکے ہوتار ہا تھا طلحہ کی طرف سے مہندی آئی تھی۔ آج ان لوگوں کو جانا تھا۔ مہمان بنگلے پر آنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ جلد سے جلد مہندی سے واپس آنا چاہتے تھے کہ کل بارات تھی۔ اسی لیے انہوں نے مہمانوں کو وقت پر پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ سدرہ آج سلک کی گر بن ساڑھی میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔

محسن رحمانی لان میں کھڑے ملازموں کو ہدایات دے رہے تھے کہ انہیں کون کون سے کام نہنانے ہیں۔

”محسن! سب آچکے ہیں بس چلنے کی تیاری مکمل



March\*2004\* 180

Aanchal

ہیں اراد کیا سدرہ نیم، دور ہو جاو میری سسروں



# پیت کی پیت سائیکس

نازیہ نازی

جانے یہ عشق ہے یا کوئی کرامت اپنی  
چاند لے کے چلے آئے ہیں تری گلیوں میں

دھوپ کے دشت میں آگے سائیاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے  
اورھ لیں گے کسی دن زمیں آسماں ڈھونڈتے ڈھونڈتے  
زخم جاں کے جزیرے بھی تھے جا بجا جن سے کمر اگے  
دل کے باتال میں ایک درہ نہاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے  
پورا گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس قدر شور  
برپا تھا کہ کان پڑی آواز تک سنائی نہ دیتی تھی۔  
مہندی کا فنکشن اپنے عروج پر تھا۔ نشاء نے ایک  
مرتبہ پھر آئینے میں اپنا بھرپور جائزہ لیا۔ حسین تو وہ  
پہلے ہی بہت تھی۔ آج تو اس پر ٹوٹ کر روپ آیا  
تھا۔ سر سے پاؤں تک قیامت ہی قیامت تھی۔  
آئینے پر آخری مطمئن نظر ڈالنے کے بعد وہ کمرے  
سے باہر نکل آئی۔ رات دھیرے دھیرے اپنے  
پچھلے سفر کی تیاری پکڑ رہی تھی۔

اس کی تمام کزنز اپنی اپنی موج مستیوں میں گم  
تھیں۔ رات کے تقریباً تین بج چکے تھے اور کوئی



خیال رکھتا تھا اتنا ہی اسے سنا کر مزا لیتا تھا اور نشا ہمیشہ منہ پر ہاتھ پھیر کر بدلہ لینے کی دھمکی دے کر رہ جاتی۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ سوچ رہی تھی کہ کاشان سے اپنا بدلہ کیسے چکائے اور آج خدا نے اسے ایسا ایک موقع عطا کر دیا تھا۔ بجلی کے کوندے کی طرح ایک شرارت اس کے ذہن میں آئی اور وہ ہنس پڑی۔

بڑی ہوشیاری کے ساتھ وسیع لاؤنج کی گہنائی پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر ایک چھوٹی سی پلیٹ میں تھوڑی سی مہندی لیے وہ اوپر چلی آئی جہاں کارنر والے کمرے میں کاشان نے اسے اپنے سونے کی اطلاع فراہم کرتے ہوئے صبح سے پہلے ڈسٹرب نہ کرنے کی نصیحت بھی کی تھی۔ وہ انہیں ہاتھ سے دوپٹہ سنبھالے بائیں ہاتھ میں مہندی کی پلیٹ لیے دے دے قدموں سے وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

سنگل بیڈ پر کاشان بے خبر سو رہا تھا۔ دایاں بازو اس نے آنکھوں کے اوپر رکھا تھا جب کہ بائیں ہاتھ سینے پر تھا۔ ایک دھیمی سی مسکراہٹ نشاء کے لبوں کو چھوٹی۔ چھن چھن چھن چھن کی کھنک سے جلتنگ سے بچ اٹھے۔ احتیاطاً اس نے دروازہ بند کر لیا کہ مبادہ کوئی تھرڈ پرسن آکر اس کے منصوبے کے رنگ میں جھگ ہی نہ ڈال دے۔

سرخ و سفید رنگت، خوب صورت تیکھے نقوش، سیاہ ریشمی بال اور تازہ شیوہ وہ جاگتے میں جھٹکا خوب صورت لگتا تھا سوتے میں اس سے کہیں بڑھ کر پیارا نظر آتا تھا۔

”ہائے صبح جب موصوف رنگین چہرہ لیے، سب سے ملیں گے، تو کتنا مزا آئے گا؟“ اپنے تصورات پر دل ہی دل میں خوش ہوتی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے پلیٹ سے تھوڑی سی مہندی نکالی اور جو تہی کاشان کے خوب

صورت گال پر لگانے کی کوشش کی۔ اس نے بڑی پھرتی سے ہاتھ بڑھا کر اس کی کٹائی پکڑ لی۔ سرخ سرخ متورم آنکھیں، جیگہ نیند سے بیدار ہونے کی چٹکی کھا رہی تھیں۔ نشاء تو اپنی جگہ بھونچا رہ گئی۔

”وہ میں..... میں تو تمہارے مہندی لگانے آئی تھی۔ تم نے لگائی نہیں تھی ناں! اکیس..... سرخ سرخ لہو لہو لگا ہوں کو خود پر مرکوز پا کر قدرت سے بولکھلاتے ہوئے وہ فوری طور پر یہی بہانہ کھڑکی۔

”اچھا..... واقعی؟“ قدرے حیران لگا ہیں اس پر جماتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا تو نشاء شیشا کر رہ گئی۔

”تو تم کیا سمجھ رہے ہو میں تم سے جھوٹ بول رہی ہوں۔“ ایک دم بھڑک کر اپنی شرارت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ ذرا متاثر نہ ہوا۔

”نہ..... نہ..... نہ میڈم، ہماری یہ مجال کہاں ویسے اس محبت اور نوازش کا شکریہ چلیے اب جلدی سے لگا دیجیے مہندی۔“ اس کا ہاتھ چھوڑ کر وہ خاصی سہولت سے بولا تو نشاء غصے سے اسے گھور کر رہ گئی۔ جو اپنی چوڑی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائے ہوئے تھا۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا؟ کوئی اوپر آ گیا تو؟“ روانی میں وہ کہہ گئی تو ایک دھیمی سی مسکراہٹ کاشان کے لبوں کو چھو گئی۔

”تو آجائے ناں تم کیوں ڈر رہی ہو تم کسی غلط مقصد سے تھوڑی آئی ہو۔“ وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ نشاء ابھ کر رہ گئی۔ اپنی ہی شرارت اتنی مہنگی پڑ جائے گی اس نے فطرتی نہیں سوچا تھا۔

”وہ اصل میں کاشی میں تو تم سے بدلہ لینے آئی تھی۔ اسی لیے مہندی تمہارے ہاتھوں پر نہیں گالوں پر لگانا چاہتی تھی مگر مجھے کیا پتا تھا تم اتنے گنے ہو ایسے جاگ جاؤ گے، عین وقت پر۔“ کوئی راہ فرار نہ پا کر بالآخر ہمیشہ کی طرح اسے اپنے

جرم کا اعتراف کرنا پڑا تو کاشان کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”تو اصل بات یہ تھی۔ ویسے جناب بھلا ہو آپ کی ان حسین چوڑیوں اور متورم کھلکھلاہٹ کا کہ میں عین وقت پر جاگ کر چور کو موقع واردات پر گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ورنہ صبح تک تو میں بے چارہ ہر کسی سے منہ چھپائے پھر رہا ہوتا اور لوگ مفت میں حیران ہوتے کہ شادی تو احمد کی ہو رہی ہے۔ پھر یہ کاشان صاحب کیوں شرمائے پھر رہے ہیں۔ بھلا بتاؤ میں کس کس کو پکڑ کر حقیقت حال سے آگاہ کرتا۔ خیر جناب آپ چونکہ یہاں برے ارادے سے آئیں لہذا آپ کو سزا تو ضرور ملے گی۔“ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر وہ اس کی حالت زار سے محفوظ ہوتے ہوئے بولا۔ تو نشاء ایک دم تپ گئی۔

”یہ کیا میزبانی ہے اور مجھے کس چیز کی سزا ملے گی۔ میں شرافت سے اپنی شرارت مان تو چکی ہوں۔“ ایک دم گھبرا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو کاشان نے پھر سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”دیکھو کاشی، برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں بلاوجہ تم سے الجھ پڑوں ہاتھ چھوڑو میرا۔“ غصے کی سرفی سے اس کا چہرہ لال ٹماڑ جیسا ہو گیا۔ کاشان نے بے حد دلچسپی سے اس کا یہ روپ دیکھا۔

”فرض کرو اگر میں نہ چھوڑوں تو تم کیا کر لو گی۔“ وہ اس وقت بھر پور شرارت کے موڈ میں تھا۔ نشاء کا دل چاہا کہ کوئی چیز اس کے سر پر دے مارے یا اس کا گلا ہی دبا دے۔

”دیکھو اگر تم نے ایک سیکنڈ کے اندر اندر میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تو میں چیخ چیخ کر سارے گھر والوں کو یہاں اکٹھا کر لوں گی۔“ شہادت کی انگلی اٹھا کر خاصے خطرناک تیوروں سے اسے وارن کرتی وہ

کاشان کو بے حد اچھی لگی۔

”ایز یوش میڈم، ویسے گھر والے آپ سے پوچھیں گے کہ آدھی رات کے وقت آپ یہاں کیا کر رہی تھیں تو کیا جواب دیں گی آپ؟ کیونکہ ظاہر ہے میں تو آپ کو اٹھا کر یہاں تک لایا نہیں آپ اپنی مرضی سے اپنے ہی قدموں پر چل کر یہاں تشریف لائی ہیں۔“ وہ بھلا اس کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے والا کہاں تھا۔ الناء نشاء کو ہی سوچ میں ڈال دیا۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ تب ہی چہرے پر جلال کی جگہ معصومیت نے لے لی اور وہ اس کی منت سماجت پر اتر آئی۔

”کاشی، پلیز مجھے معاف کر دو تم تو میرے اتنے اچھے دوست ہو پلیز جانے دو مجھے۔“ وقت پڑنے پر گدھے کو باپ کہنے کی نوبت آ چکی تھی سو وہ بھی ساری اکڑ بھول کر جیسی سے درخواست کرنے لگی اور اس سے پہلے کہ کاشان کوئی جواب دیتا

سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔ نشاء نے بے حد گھبرا کر کاشان کی طرف دیکھا جو خود ساری شوخی شرارت بھول بھال کر فکر مند ہو گیا تھا۔

لاکھ وہ اسے ستاتا مگر اس کی عزت کاشان کو اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ جلدی سے اس نے نشاء کو بازو سے پکڑ کر بیڈ پر لٹا دیا اور اپنا کمبل اس پر ڈال دیا۔ فوری طور پر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا اور مبین انکل اندر چلے آئے۔ مبین، شفع، نشاء اور کاشان دونوں کے مشترک خالو تھے۔ انہیں دیکھ کر ہی کاشان کا رنگ زرد پڑ گیا کہ اگر انہیں نشاء کی یہاں موجودگی کا ذرا سا بھی شک پڑ گیا تو بات کہاں کی کہاں جا پینچے گی۔

”انکل آپ؟ اس وقت یہاں؟“ خٹک لبوں پر زبان پھیر کر وہ بمشکل کہہ سکا۔ نشاء کی شرارت



اسے کافی بھاری پڑ رہی تھی۔

”ہاں برخوردار وہ اصل میں میں تم سے کل برات وغیرہ کے انتظامات کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔ احمد کا تو خیر سے کوئی مسئلہ نہیں مگر مثال بیٹی کی برات کا استقبال تو شایان شان طریقے سے ہونا چاہیے کہ نہیں۔ احمد اور طحہ کو تو تم جانتے ہو کتنے لاپرواہ ہیں۔ پھر بیٹے کل کا سارا انتظام تم ہی کو سنبھالنا ہے ناں اسی لیے میں تمہارے پاس چلا آیا۔“

”میں انکل کو ملنے کے بے حد شوقین تھے۔ ہمیشہ اپنی بات کی تفصیلی تشریح کر کے دم لیتے اور کاشان جو شہید تھکن کے باعث صبح کی مصروفیت سے معذرت کر لینے کا پکارا ارادہ کر چکا تھا۔ اب ان سے جان چھڑانے کے لیے زور زور سے سرانبات میں ہلا دیا۔“

”ہاں! انکل کیوں نہیں میں آپ کی مدد نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں صبح سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ جلد سے جلد انہیں وہاں سے رخصت کرنا چاہتا تھا کیونکہ ایک تو نشاء کمل کے اندر اسے چٹکیاں کاٹ رہی تھی کہ انکل کو جلدی رخصت کرو۔ دوسرا وہ جانتا تھا کہ اگر انکل کو ذرا سا بھی موقع دیا گیا تو وہ پتا نہیں کون کون سی باتیں کھیر کر بیٹھ جائیں گے۔

”شاباش بیٹے مجھے تم سے یہی امید تھی۔ میں اب چلتا ہوں بلکہ میرا خیال ہے میں تمہارے ساتھ ہی لیٹ جاتا ہوں۔ نیچے تو اتنا شور ہو رہا ہے کہ سونا ممکن ہی نہیں۔“ مبین انکل دروازے کی سمت بڑھتے بڑھتے ایک دم سے واپس پلٹ آئے تو کاشان کی جان پر بن آئی۔

”نہیں نہیں انکل! آپ پلیز نیچے ہی چلے جائیے کیونکہ میں تو سوئے میں اتنے خوفناک خراٹے لیتا ہوں کہ آپ ایک منٹ بھی نہیں سو سکیں

گے۔ نیچے کا شور تو کچھ اب ختم ہوا ہی چاہتا ہے۔ جب کہ میں تو ساری رات آپ کو سونے نہیں دوں گا۔“ اس نے کچھ ایسے خوفناک انداز میں انہیں ڈرایا کہ بے چارے انکل کو اپنا ارادہ تبدیل کرنا ہی پڑا۔ ان کے کمرے سے باہر نکلتے ہی کاشان نے سکون کا سانس لیا۔ پھر قدم بے رہی سے نشاء کو دیکھتے ہوئے ڈپٹ کر بولا۔

”تمہیں یہ بے کاری شرارتیں سوچنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔ لے کر جان پر بنا دی میری۔“

نشاء کو اپنی غلطی کا احساس بخوبی ہو چکا تھا۔ لہذا سر جھکا کے خاموشی سے سنتی رہی تو کاشان کو اس ادا پر بھی نوٹ کر پیا آ یا۔

”چلو اب جاؤ نیچے اور آئندہ اپنے پاؤں پر پی گھماڑی مارنے کی کوئی حماقت مت کرنا۔“ اس سے پہلے کہ اس سے کوئی خطا سرزد ہو جاتی، وہ رخ پھیر کر خاصے رعب سے بولا۔ نشاء خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر جو بھی دروازے تک آئی کاشان نے پیچھے سے پکار لیا۔ وہ بے حد حیرانی سے واپس پلٹی۔

”اور آئندہ اتنی محنت سے تیار ہو کر خوب صورت بننے کی بھی کوئی ضرورت نہیں جیسی ہو ویسی رہا کر ڈاو کے۔“

جائے وہ تعریف کر رہا تھا یا نصیحت نشاء کچھ دیر الجھی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر سر جھٹک کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

☆☆

شادی بخیر و عافیت گزر گئی۔ کاشان تاحال مصروف تھا مگر نشاء نے فراغت پاتے ہی فوراً آفس جوائن کر لیا۔ تقریباً سات اٹھ روز کے بعد وہ جونہی اپنے کمپن میں داخل ہوئی اس کی بیٹ فرینڈ عاشی لپک کر اس کے قریب چلی آئی۔

”ہیلو ڈیر فرینڈ کہو دو عدد کرنرز کی شادی کا فنکشن کیسا رہا؟“

”اے ون! دن۔“

”جناب میرے پاس بھی تمہارے لیے ایک اے ون بیو ہے؟“

اس نے مخصوص ٹھکنے لہجے میں وہ چپکی تو نشاء نے قدرے تجسس نگاہوں سے اسے دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو کیا؟ اس کی استغناء مہ نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے وہ خود ہی شروع ہوئی۔

”جناب! ہمارے قابل احترام باس سر عباس نقوی دل کے عارضے کے سلسلے میں پرسوں لندن اپنے بڑے بیٹے کے پاس تشریف لے جا چکے ہیں اور یہاں ان کی غیر موجودگی میں یہ آفس ان کے لاڈلے سپوت جناب یاور نقوی صاحب سنبھالیں گے۔ بلکہ سنبھال رہے ہیں۔ اف نشاء تم انہیں ایک نظر دیکھو گی ناں تو سانس لینا بھول جاؤ گی۔ یار کیا غضب کی پر سنائی ہے۔ لگتا ہے خدا نے بڑی ہی فرصت سے کسی فارغ نام میں دل لگا کر بنایا ہے۔ غرور اس بندے پر بجا ہے۔ مگر ظالم مغرور ہے نہیں۔ بے حد فرینڈ کی طبیعت ہے ان کی۔ تم ان سے ملو گی ناں تو اپنا پرن بھول جاؤ گی۔“ ایک ہی سانس میں وہ بڑی اجتماعی کے ساتھ یاور نقوی کے قصیدے پڑھنے میں مگن تھی جب بھاری قدموں کی چاپ پست پر ابھری۔

”محترمہ! میرے خیال میں مبالغہ آرائی کافی ہو گئی۔ اب پلیز آپ اپنا کام کرنا شروع کر دیجیے۔“ وہ اس کی ساری باتیں سن چکا تھا۔ عاشی تو مارے شرم کے پانی پانی ہو گئی۔ سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنا دو بھر ہو گیا۔ جبکہ ایک محظوظ سی مسکراہٹ نے نشاء کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔

اور آپ محترمہ ان سے فارغ ہو جائیں تو پلیز میرے آفس میں تشریف لے آئیے گا۔ کافی کام

ادھورے پڑے ہیں۔“ اگلے ہی پل وہ اس کی طرف گھوما تھا اور خاصے نپے تلے انداز میں علم صادر کر کے یہ جاوہ جا۔

عاشی نے جتنا قصیدہ اس کی خوب صورت شخصیت کا پڑھا تھا۔ اس سے کہیں بڑھ کر تو اس کی آواز پیاری تھی۔ ایک پل کے لیے تو وہ کھوئی گئی۔ کتنی سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا وہ جسے محض خوب صورت لگنا، مدھر میٹھا میٹھا بولنا، ہی نہ آتا تھا بلکہ سامنے والے بندے پر جا دو کرنا بھی آتا تھا۔ ایسے ہی شخص کے تو خواب دیکھتی تھی وہ۔ جو بے حد خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد مالد ر بھی ہو اتنا اثر و رسوخ رکھتا ہو کہ دنیا جھک کر سلام کرے وہ کب کا وہاں سے جا چکا تھا مگر اس کے یقینی پرفیوم کی مہک تاحال نشاء کو مدہوش کیے ہوئے تھی۔

”اُف آج تو بے چھنے۔“ عاشی نے ہنستے ہوئے اسے کہنی ماری تو وہ خیالات سے چوکی۔ پہلو میں موجود دل اب بھی دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ ٹانگیں الگ کانپ رہی تھیں۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ کسی کے زیر اثر آئی تھی۔ ورنہ آج تک اپنے حسن کے زعم میں وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ حتیٰ کہ کاشان کو بھی نہیں۔ جو اپنی خور و پر سنائی کے باعث کسی بھی اچھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا تھا۔ محبت کسی آکنو پکس کی طرح دل وادی پر حملہ کر کے وہاں اپنے نیچے گاڑ لیتی ہے۔ یہ تو اس نے ہزار کہانیوں میں پڑھا تھا مگر آج بذات خود اس کا حقیقی تجربہ اس کے ساتھ پہلی مرتبہ ہوا تھا اور وہ اپنی اس کیفیت پر بے حد کنفیو تھی۔

بمشکل خود پر کنٹرول پا کر وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اسے فون پر محو گفتگو پایا۔ اسے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت دینے کے بعد وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ بھی دے چکا تھا۔ نشاء نے خاصی گہری نگاہوں سے اس کا تفصیلی جائزہ



لیا۔ بلیک تھری پیس سوٹ میں خاصی نفاست سے تیار ہوئے وہ بے حد دل کش لگ رہا تھا۔

”جی مس نشاء احمد! کیسے لکھی رہی آپ کے کزنز کی شادی؟“ جوہنی وہ فون سے فارغ ہوا تو جہاں اس کی جانب مبذول کر لی جو بڑی گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

”بہت اچھی رہی سر۔“ مختصر جواب یہی دے سکی۔

”او کے آج سے آپ اپنی ڈیوٹی سنبھال لیں“ میں کام کے سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی ہرگز برداشت نہیں کر سکتا، لہذا پلیز اپنی مکمل توجہ اپنے کام پر مرکوز رکھیے اور ہاں آپ کو کسی قسم کا کوئی مسئلہ ہو پریشانی ہو یا کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو آپ بلا تکلف مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں۔ او کے۔“

چنانچہ وہ روڈ انداز میں بول رہا تھا یا اپنا سائٹ بھرے انداز میں نشاء دھیان ہی نہ دے سکی، وہ تو اس کی آنکھوں کے سحر میں گھوٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہلتے ہونٹ اس کی توجہ اپنی جانب کھینچے ہوئے تھے۔ پھر وہ اس کی بات کیسے سمجھ سکتی تھی۔ لہذا خاموشی سے سر ہلا کر رہ گئی۔

”گڈ۔۔۔۔۔ اب آپ پلیز جائیے اور اپنا کام شروع کیجیے۔“ اسے دوبارہ آرڈر دے کر وہ فون کے نمبر پر لیں کرنے لگا۔ تو نشاء خاموشی سے آخری نظر اس پر ڈال کر باہر نکل آئی۔

”کیوں کیسے جناب کیسے لگے ہمارے نیویاس“ اچھے لگے ناں؟“ عاشی بے حد کھلندڑی لڑکی تھی۔ ذرا جو ایک منٹ خاموش بیٹھ جاتی، کبھی کبھی تو نشاء کو لگتا کہ وہ سب کو دھوکہ دے رہی ہے۔ اس کا لباس بول چال رنگ ڈھنگ اسے کسی طرح ایک عام سی غریب لڑکی ظاہر نہیں کرتے تھے۔ نشاء نے گھور کر اسے دیکھا۔ تو وہ پھر سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ نشاء کو مجبوراً اپنا سر جھکا نا پڑا کہ مبادا کہیں وہ

اس کے دل کا چور پکڑ ہی نہ لے۔ اس روز وہ تمام وقت خاموشی سے سر جھکائے اپنا کام کرتی رہی تھی۔

اگلے دن وہ ابھی آفس آئی ہی تھی کہ یاور نقوی نے اسے بلا بھیجا۔ عاشی آج پچھٹی پر تھی اسے کافی گھبراہٹ ہوئی، سرے سرے سے قدم اٹھاتی وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو یاور نقوی کو خاصے غصے میں پایا۔

”محترمہ! ناظم دیکھ رہی ہیں آپ پورے گیارہ منٹ لیٹ ہیں آپ اور اوپر سے یہ فائل دیکھیے کل کتنی غلطیاں کی ہیں آپ نے؟“ اس کے اندر داخل ہوتے ہی وہ شروع ہو گیا تھا۔ نشاء تو مارے خوف کے ہم کر رہ گئی۔ آنکھیں فوراً آنسوؤں سے بھر آئیں مگر اس نے مطلق پرواہ نہ کی۔ الٹا مزید گرج کر بولا۔

”دیکھیے میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں کام میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کرتا۔ پھر یہ لاپرواہی کیوں؟“

”سوری سر آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ سر جھکا کے بھرائے ہوئے لہجے میں وہ بمشکل کہہ پائی۔

”او کے مگر کل کیوں ہوا؟“ وہ باقاعدہ جرج پر آمادہ تھا۔ نشاء، الجھ کر رہ گئی مگر کوئی نہ کوئی جواب تو دینا ہی تھا۔

”کل میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“

اس کے دھیسے لہجے پر کہنے سے یاور نے خاصی حیرانی سے اسے دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔

دن اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہے تھے اور نشاء ہرگز رتے دن کے ساتھ یاور کی محبت میں آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ خوب صورت زندگی کے سہانے خوابوں نے اسے اپنا آپ ہی بھلا دیا تھا۔ کاشان پہلے کی طرح اسے چھیڑتا تنگ

کر رہا مگر نشاء نے اس کی حرکتوں پر چڑیا ہی چھوڑ دیا تھا اور یہی بات کاشان کو فکر مند کر گئی تھی۔ وہ کچھ دیر پر مجبور ہو گیا تھا۔

نشاء جو پہلے ہفتے میں دو تین چھٹیاں کرنا ضروری سمجھتی تھی اب چھٹی کے بعد اسے گھر کاٹ کھانے کو دوڑنا تھا۔ حالانکہ یاور نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی، کبھی نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں مگر وہ پھر بھی اسی برندا تھی۔ آفس میں اس کی موجودگی ہی نشاء کے لیے کسی نشے سے کم نہیں تھی۔ اس روز بھی وہ سر جھکائے خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھی جب یاور نے اسے آفس میں آنے کی ہدایت کی۔ دروازے پر ناگ کر کے اجازت طلب کی اور اندر چلی آئی تو یاور نقوی کو کسی سوچ میں ڈوبے پایا مگر اسے دیکھتے ہی وہ سیدھا ہویا تھا۔

”آئیے مس نشاء بیٹھیے پلیز۔“ اس کا رویہ آفس کے تمام ورکرز کے ساتھ دوستانہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آفس کے تمام لوگ اس کی کمپنی کو بے حد انجوائے کرتے تھے۔

”دیکھیے مس نشاء کل ہم ایک اہم ڈیل کے سلسلے میں ایک پارٹی میں شرکت کر رہے ہیں۔ مسٹر منصور احمد کے گھر پارٹی ارنج کی جا رہی ہے آپ کل شام ٹھیک سات بجے میرے ساتھ وہاں چل رہی ہیں او کے۔“

وہ ہمیشہ سے اپنی بات دو ٹوک لہجے میں کہنے کا عادی تھا۔ نشاء نے تا بعد اری سے سر جھکا کر رضا مندی دے دی۔ دل ایک انوکھی سی خوشی کی سرشاری میں ڈوب گیا۔ وہ اس کے آفس سے نکلی تو بہت مسرور تھی اور یہ منظر کاشان نے بہت غور سے دیکھا تھا۔

اگلے روز ٹھیک شام سات بجے وہ یاور نقوی کے ساتھ اس کی قیمتی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی

گویا ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ بلیک جارجٹ کے خوب صورت سوٹ پر بلیکس کے کام نے چار چاند لگا دیئے تھے۔ یاور نقوی نے پہلی مرتبہ اسے کافی سانس دیکھا۔ خود وہ گھرے تھری پیس سوٹ میں نفاست سے تیار ہوئے بے حد وجہ لگ رہا تھا۔

وہ لوگ منصور احمد کے گھر پہنچے تو وہاں کافی گید رنگ ہو چکی تھی اور نقوی کے شانہ بشانہ قدم سے قدم ملا کر چلنا اسے بے حد اچھا لگ رہا تھا اور آج تو یاور نقوی بھی اپنی سنجیدگی کے خول کو توڑ کر بہت ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا ہوا۔ دوست احباب سے چھیڑ چھاڑ بھی مذاق کرتا ہوا وہ اسے فوٹ کر پیارا لگ رہا تھا۔ تب ہی وہ اسے بازو سے تھام کر ایک تنہا کھڑی لڑکی کے قریب لے آیا۔

”نشی! ان سے ملو یہ ہیں مس نوین آفندی“ میری فرسٹ کزن اور نوین یہ نشاء ہے میری بے حد اچھی دوست۔“ یاور کے الفاظ تھے کہ کہتے پھول۔ وہ تو ہونفون کی طرح منہ اٹھائے اسے دیکھتی رہ گئی۔ جو کسی پر کشش سی لڑکی سے اسے مسکرا کر متعارف کروا رہا تھا۔

”ہیلو۔“ اس کے مقابل کھڑی وہ بظاہر عام سے نقوش والی لڑکی تھی مگر دیکھنے میں خاصی پرکشش لگتی تھی۔ نشاء نے سرسری انداز میں اسے دیکھ کر ہاتھ ملایا۔

”ایکسیوزمی“ میں ابھی آئی۔“ اس سے ہاتھ ملانے کے فوراً بعد وہ لڑکی وہاں سے ہٹ گئی۔ نشاء کو اس کے لہجے کی کپکپاہٹ اور آنکھوں میں تیرنی نمی واضح محسوس ہوئی مگر اس نے سر جھٹک دیا۔ یاور نقوی نے بے ساختہ ہی ایک زبردست قہقہہ لگایا تھا اور وہ حیرانی سے ٹکڑ ٹکڑ اسے بے وجہ ہنستے دیکھتی رہی۔



پارٹی ابھی جاری تھی جب کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد یاور اس کے قریب آکھڑا ہوا۔  
”چلیں۔“

خوب صورت نگاہوں میں کئی جگنو مقید تھے لبوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ بھی اور وہ اس سے نہایت شائستگی کے ساتھ مخاطب تھا۔ نشاء نے اثبات میں سر ہلادیا اور پھر جب وہ گاڑی میں اس کے برابر آکر بیٹھی تو لب خود بخود ہی وا ہو گئے۔

”سر آج میں نے پہلی مرتبہ آپ کو بے حد خوش دیکھا ہے اور آپ شاید نہیں جانتے جب آپ خوش ہوتے ہیں تو کتنے اچھے لگتے ہیں۔“ بزدل اور ڈری سہی تو وہ بھی نہ رہی تھی مگر یاور نقوی جسے دیکھتے ہی وہ سن ہو جایا کرتی تھی۔ اس سے ایسا اظہار تو یقیناً بہادری ہی تھا۔

”واقعی۔“ کمال ہے مجھے آج تک پتا ہی نہیں چلا۔“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے اس نے گردن موڑ کر حیرانی سے نشاء کو دیکھا اور پھر سے ہنس پڑا تھا۔ اب کے نشاء اپنی آنکھوں کو اسے جی بھر کر دیکھنے سے باز نہیں رکھ پائی۔ تھوڑی سی ڈرائیونگ کے بعد یاور نے ایک آکس کریم پارلر کے باہر گاڑی روک دی۔ نشاء حیران حیران سی قدرے مسرور اس کے ہمراہ اندر چلی آئی۔

”تمہیں پتا ہے نشاء آج میں اتنا خوش کیوں ہوں؟“ قدرے پرسکون سے گوشتے میں اس کے بالکل سامنے بیٹھا وہ کہہ رہا تھا۔ نشاء نے نفی میں سر ہلادیا تو وہ پھر ہنس پڑا۔  
”یہ تم کیامن میں گڑلے کر بیٹھ گئی ہو۔ کچھ تو منہ کو زحمت دو بھئی۔“

نشاء کے لیے اس کا آپ سے تم پر آنا ہی قبول نہیں ہو رہا تھا تو وہ بولڈنکس کا مظاہرہ کیسے کرتی، کیسے بتاتی کہ وہ یاور ہے کا شان نہیں جس کے

اس کے ساتھ ہر وقت کا ملاپ ہزار کہانیوں کو جنم دے رہا ہے۔ وہ بے حد جلا ہوا تھا۔ تب ہی لہجے میں اتنی گڑبگڑ تھی کہ فوراً کام کی بات پر آ گیا۔ نشاء نے اندر اٹھنے والے غصے کا اہمال دبا نہ سکی۔

”میں اپنے کسی عمل کے لیے جواب دہ نہیں ہوں سر کا شان۔ یہ میری زندگی ہے جسے میں جیسے چاہوں بسر کروں کسی کو کوئی اعتراض ہے؟“  
”ہاں ہے اعتراض مجھے اعتراض ہے۔ کیونکہ میں تمہارا دوست ہوں، کزن ہوں، دفتر کے لوگوں کی غلط باتیں، ریکرڈ، جملے تمہارے حوالے سے نہیں سن سکتا میں۔“ وہ بے حد تپ کر بولا تھا۔ نشاء نے قدرے سلگ کر اسے دیکھا۔

”جسٹ اسٹاپ اٹ کاشی، تمہیں میری فکر میں دبا ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں اور جہاں تک دفتر کے لوگوں کی بات ہے تو دنیا کا تو کام ہی بات کا بجنڈا بنانا ہے میری بلا سے وہ جو چاہیں فرض کرتے پھر بس مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ بے حد تپ کر وہ بولی تھی۔ لہجہ خاصی حد تک غضب ناک ہو گیا۔ ایک جھٹکے سے وہ اٹھی تھی مگر جاتے جاتے پھر واپس پلٹی۔

”اور ہاں تم میرے کزن ہو، کزن بن کر رہو“ شوہر بننے کی کوشش مت کرو۔“ کوئی یاور نقوی پر اٹلی اٹھا ہے وہ کہاں برداشت کر سکتی تھی، کا شان دھواں آنکھوں سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ یاور نقوی کے لیے اتنی ایووشنل ہو جائے گی کا شان کو اس کا تصور بھی نہیں تھا۔ یہ اس کی وہ کزن تھی جو ہمیشہ اپنا ہر دکھ ہر خوشی صرف اسی سے شیئر کرتی تھی۔ کا شان کو بخوبی یاد تھا کہ کچھ برس پہلے جب ایک دن اسے بخار نے جکڑ لیا تھا تو وہ بیٹھی پریشان ہوئی تھی۔ رات بھر اس کے سر ہانے بیٹھی ماتھے پر چھنڈی پٹیاں رکھتے روئی رہی تھی اور ایک مرتبہ جب وہ لوگ کافی سارے کزنز کے

ساتھ شامی علاقہ جات کی سیر کو گئے تھے اور کا شان بو نہیں جان بوجھ کر ایک بھاڑی سے پھسل پڑا تھا تو نشاء کے چہرے کا رنگ کیسے سفید پڑ گیا تھا۔ کتنی بلند چیخ ماری تھی اس نے اور جب کا شان نے اسے بتایا کہ وہ اسے محض تنگ کر رہا تھا تو وہ کتنا لڑی تھی اس سے تین دن تک کلام نہیں کیا تھا۔ کا شان کو اس کی ایک ایک ادایا داری تھی اور آج وہ کتنے روڈ انداز میں تکلیف دہ جملے کہہ گئی تھی۔ جیسے کا شان کا اس پر کوئی حق ہی نہ ہو وہ اس کا کچھ لگتا ہی نہ ہو۔ بے اختیار ہی اس کی پلکیں بھیگ گئیں اور وہ اٹھ کر سیدھا گھر چلا آیا۔

اماں اب وقتاً فوقتاً اس کی شادی کا تذکرہ چھیڑے رکھتی تھی اور وہ ایسی باتیں سن کر افسردہ سا ہو جاتا۔ نشاء کا اس روز والا انداز ذہن سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔ مگر اماں کو کون روکتا۔ وہ جب کسی بات کی ٹھان لیتیں تو ہرگز پیچھے نہیں ہٹتی تھیں۔ اتوار کا دن تھا۔ لہذا اماں کو رخصت کرنے کے بعد وہ صحن میں ہی چار پائی ڈال کر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں نیند غالب آنے لگی تو اس نے پلکیں موندھ لیں اور ابھی اسے سوئے شاید چھ سات منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ جب اچانک آنکھوں پر کسی کے ٹھنڈے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا کا شان کی آنکھ کھل گئی اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ ہٹائے تو نشاء کا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔

”کاشی، ناراض ہو؟“ اس پر جھکے وہ بڑے دوستانہ انداز میں بول رہی تھی۔ مگر کا شان نے غصے سے منہ پھیر لیا۔  
”اف تمہیں کس بے وقوف نے کہہ دیا کہ تم غصے میں بہت پیارے لگتے ہو۔“ زبردستی اسے پکڑ کر سیدھا کرتے ہوئے وہ مسکرا کر بولی تو کا شان مزید برداشت نہ کر سکا۔  
”نشاء! پلیز چلی جاؤ یہاں سے“ میں تمہاری



شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔“

”کیوں میری شکل کیا چیز یوں جیسی ہو گئی ہے جو تم دیکھنا نہیں چاہتے خیر میں تم سے جھگڑا کرنے نہیں آئی۔ ایکسکسپو زکرنے آئی ہوں پلیر کاشی مجھے معاف کر دو بس اس دن مجھے غصہ آ گیا۔ پلیر تم تو میرے اتنے اچھے دوست ہو۔“ وہ منٹ میں منٹ ساجت پر اتر آئی تھی اور کاشان کا شان یہیں تو بار جاتا تھا۔

”او کے مگر آئندہ خیال رکھنا میں ساری دنیا کی نفرت سہہ سکتا ہوں مگر تمہاری نہیں۔“ اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ خاصے ناراض لہجے میں بولا تھا مگر نشاء ہلکلا کر ہنس پڑی تھی۔

”جانتی ہوں ناں تب ہی تو منانے آ گئی۔ ویسے ایک بات بتاؤں۔“ اپنا منہ اس کے کان کے پاس لاکر وہ سرگوشیا نہ انداز میں بولی تو حیرانی سے کاشان نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”تم غصے میں بھی بہت پیارے لگتے ہو۔“ ایک دم سے کہہ کر وہ ہلکلا کر ہنس پڑی اور اس سے پہلے کہ کاشان اسے پکڑتا وہ جھپاک سے باہر نکل گئی۔

کاشان کے دل میں نشاء کے لیے جو تھوڑی سی بدگمانی پیدا ہوئی تھی وہ فوراً ختم ہو گئی اور اب وہ پھر دیوانوں کی طرح اسے چاہنے لگا۔ اماں نے رشتے کی بات تقریباً طے کر لی تھی اور کاشان اس پر اتنا خوش تھا کہ گویا اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔

آفس کی طرف سے کسی کام کے سلسلے میں وہ تقریباً پندرہ بیس دن کے بعد اپنے شہر واپس آیا تو اماں مفتی کی قفل تیاری کے بیٹھی تھیں۔ مہینے کے ابتدائی دن تھے۔ کاشان کی تنخواہ سے اماں نے نشاء کے لیے مزید چیزیں خرید لیں۔ وہ ایک دو دن آرام کرنا چاہتا تھا مگر اماں نے چھوٹ نہیں دی اور اسے ساتھ ہی گھسیٹ لیا۔

خالہ اماں نے پورے شایان شان طریقے سے ان کا استقبال کیا۔ کاشان کا ماتھا چوم کر دعا مانگی۔ اپنی طرف سے وہ بھی مکمل تیاری کیے ہوئے تھیں۔ کوئی اس وقت کاشان کے دل کا حال پوچھتا جو خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ پچھلے پندرہ دنوں سے اس نے نشاء کو نہیں دیکھا تھا اور اب دل پہلو میں بری طرح پھل رہا تھا۔ اسے صرف ایک نظر دیکھ لینے کو ترس رہا تھا مگر وہ خود پر کنٹرول کیے بڑی مشکل سے دل کو سنبھالے ہوئے تھا۔ خالہ بڑی محبت سے باتیں کر رہی تھیں۔ جب نشاء کمرے سے باہر آئی وہ اس وقت کاشان کے ساتھ سے سوٹ میں ملبوس تھی۔ سیاہ تنگ پانچوں والی شلوار اور سرخ کڑھائی کی ٹیس سی میٹھ دوپٹے پر بے پناہ سلوٹیں پڑی تھیں۔ خود اس کا حلیہ بھی بے حد رف تھا۔ بغیر دھلا چہرہ روئی روئی سی سرخ آنکھیں چٹپٹا کی قید سے نظر ریشمی بالوں کی آوارہ لئیں کاشان تو اسے اتنا الجھا ہوا دیکھ کر ہی پریشان ہو گیا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے سر اٹھانے لگے۔

”امی! جب میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے کاشان سے کسی قیمت پر شادی نہیں کرنی تو آپ کیوں زبردستی کر رہی ہیں۔“ وہ سیدھی اپنی ماں سے ہمکلام ہوئی تھی۔ کاشان اور اس کی امی کو تو اس نے آکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ کاشان کو لگا جیسے کسی نے پہلو سے اس کا دل نکال کر پاؤں تلے مسل ڈالا ہو۔

”چپ کر بدتمیز کسی کا خیال ہے تمہیں کہ نہیں۔“ خالہ بیگم کو بھی جلال آ گیا تھا مگر نشاء کو ان کے غصے کی مطلق پروا نہیں تھی۔

”کیوں کروں چپ جب میں برملا آپ سے کہہ چکی ہوں کہ میں کاشان کو پسند نہیں کرتی نہ آج نہ کل، کسی قیمت پر اس سے شادی نہیں کروں

میں تو آپ لوگ کیوں میرے ساتھ زبردستی کر رہے ہیں۔“

کاشان کی آنکھیں مارے توہین اور صدمے کے چلنے لگی تھیں جب کہ اس کی ماں حیرانی سے آنکھیں پھاڑے مگر فکر اپنی لاڈلی بھانجی کو دیکھتی رہیں۔ کاشان نے ہاتھ اٹھا کر خالہ بیگم کو مزید کچھ بھی کہنے سے روک دیا وہ اس سے خود بات کرنا چاہتا تھا۔

تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں نشاء کیا تم مجھے بتاؤ گی؟“ بے حد سپاٹ انداز تھا اس کا۔ دل کی خوب صورت وادی ایک ہی پل میں جل کر راکھ ہو گئی تھی۔

”میں تم سے اس لیے شادی نہیں کرنا چاہتی کاشی کیوں کہ میں یاور نقوی سے محبت کرتی ہوں اور میں یہ بات بار بار اپنی ماں کو بتا چکی ہوں مگر یہ پھر بھی مجھے تمہارے پلے باندھنے پر بضد ہیں۔“ بے حد کھردرا اور کٹھن انداز تھا اس کا۔ کاشان کو شدید تنگ محسوس ہوئی۔

”محبت تو میں بھی تم سے کرتا ہوں نشاء اور بچپن سے کرتا آ رہا ہوں۔“ آنکھیں تو دھواں دھواں تھیں ہی لہجہ بھی بھگ گیا تھا مگر نشاء نے بے حد تشفیر سے سر جھٹکا۔

”مجھے تمہاری خالی محبت کا اچا نہیں ڈالنا کاشی اور پلیر تم خود کو یاور کے ساتھ کپیڑ نہتی کرو تو بہتر ہے۔ کیونکہ تم چاہو بھی تو اس کے برابر کبھی کھڑے نہیں ہو سکتے۔“

”کیوں ایسا کیا تضاد ہے مجھ میں اور تمہارے اس یاور نقوی میں۔“ اس کے لیٹیلے انداز پر نشاء طنز سے مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

”تضاد مسٹر کاشان وہ آسمان ہے اور تم زمین ہو۔ اس کے پاس بے شمار دولت ہے جو کہ تمہارے پاس نہیں ہے۔ کیا دے سکتے ہو تم مجھے، دو جوب دو کی

فکر مہینے کے اینڈ پر راشن ختم ہو جانے کی پریشانی اپنے بچوں کو بھوک سے بلکتے دیکھنے کا دکھ مسٹر کاشی

میں نے ساری زندگی اپنی ماں کو ایک ایک پیسے کے لیے ترستے دیکھا ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی آسائشوں کی حسرت ان کی آنکھوں میں جمی دیکھی ہے۔ ساری عمر میں اچھے حلقوں، اچھے کپڑوں، کھانوں کو ترستی رہی ہوں۔ زندگی پر میرا بھی حق ہے اور مجھے کسی صورت گوارہ نہیں کہ میرے بچے بھی ساری عمر معمولی معمولی سی چیزوں کی حسرت کرتے، اپنا بچپن گواہ بنیں۔ دو دو پیسے کی ملازمت کے لیے مارے مارے پھرتے رہیں۔ اوب گئی ہوں میں غربت کی زندگی سے۔ پلیر میری منزل کے راستے کی دیوار مت بنو۔“

بھرائے ہوئے لہجے میں ابھی اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ اماں کا ہاتھ اٹھا اور اس کے گال پر نشان بنا گیا۔ نشاء تڑپ کر رہ گئی۔

”بد لحاظ..... کیا ہوا ہے میری زندگی کو جو تجھے میری جیسی زندگی سے نفرت ہو گئی ہے۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر ہونٹ غصے کی شدت سے کپکپا رہے تھے۔ نشاء ایک دم زخمی شیرنی کی مانند بل کھا کر رہ گئی۔

”سننا چاہتی ہیں تو سنیں، گھن لگا ہے آپ کی زندگی کو محرومیوں کا، دکھوں کا اور میں نہیں چاہتی کل کو میرے بچے بھی میری ہر معمولی چیز کو ترستے رہیں۔“ وہ انجیدم جذباتی ہو گئی تھی۔ اماں کو اپنا وجود اس وقت بے حد نہال لگا۔

”ارے پاگل ہو گئی ہو تم خدا کا شکر ادا نہیں کرتیں، کس چیز سے ترسایا ہے میں نے تمہیں؟“ ”تمہیں دولت چاہیے ناں نشاء میں کماؤں گا تمہارے لیے، دنیا بھر کی دولت لا کر تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا مگر پلیر مجھے مایوس تو مت کرو کوئی امید تو تھاؤ مجھے۔“ اسے لگا وہ تھوڑی



ہی دیر میں رو پڑے گا مگر نشاء تو ہر جذبے سے عاری ہو گئی تھی۔ وہ اس کی حالت کیسے سمجھتی۔ تب ہی بڑی سنگدلی سے بولی۔

”جتنی دولت مجھے چاہیے اسے اکٹھے کرتے کرتے تمہیں ساری عمر لگ جائے گی اور سوری کاشی میں اپنی زندگی کے خوب صورت لمحات کسی کے انتظار میں برباد نہیں کر سکتی۔“

نہایت ہی سرد مہری سے کہہ کر وہ پھر کی نہیں تھی۔ کاشان لئے پئے دل کے ساتھ وہیں کھڑا رہ گیا۔ اپنے ہی قدموں پر چل کر وہ کیسے گھر واپس آیا اسے خبر نہ ہو سکی اور اگلے ہی دن وہ یاور نقوی کو اپنا ریزائن پیش کر رہا تھا۔ یاور نقوی بے حد حیرانی سے وجہ دریافت کر رہا تھا مگر وہ کوئی بھی وضاحت دینے بغیر آفس سے نکل آیا۔

عاشی کو جو بی کاشان کے اس اقدام کا پتا چلا وہ اپنا دل تھام کر رہ گئی۔ وہ تو کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی تھی جسے نوکری کی کسی بھی طرح کوئی ضرورت نہیں تھی مگر کاشان کی ذات نے اسے کسی کا ملازم بننے پر مجبور کر دیا۔ صرف کاشان کے پیچھے ہی وہ اپنا شہر چھوڑ کر اپنے باپ سے ضد کر کے عیش و آرام کو ترک کر کے ایک معمولی سی نوکری کر کے دو کمروں کے فلیٹ میں رہنے پر مجبور تھی۔ کاشان سے پہلی ملاقات ایک بک اسٹال پر ہوئی تھی۔

جب وہ مختلف پوسٹری بس اٹھائے دکان سے باہر نکلے تو ہی تھی کہ تیزی سے دکان کے اندر داخل ہوتے کاشان سے ٹکرو گئی۔ کاشان کا سراں کی نازک سی ناک اور ہونٹوں پر لگا تھا جس کی وجہ سے ہونٹ پھٹ گئے اور خون بہنا شروع ہو گیا۔ دوسرا بھاری کتابیں چھوٹ کر سیدھی پاؤں پر گر گئیں تو وہ چیخ اٹھی۔ درد کی شدت برداشت سے باہر تھی۔ اس وقت وہ جتنا برا بھلا اسے کہہ سکتی تھی اس نے کہا مگر جواب میں کاشان نے ایک لفظ تک نہ

کہا۔ بلکہ اپنے رومال سے اس کا خون صاف کیا۔ بار بار معذرت کی اور گھڑ ڈراپ کرنے کی آفر بھی کی۔

دوسری بار وہ اسے اپنی عزیزانہ جان دوست کی منگنی کی تقریب میں نظر آیا اور اس وقت ایک دم سے اس کا دل کاشان احمد پر لگا ہوا گیا پھر اپنی دوست کی معرفت ہی اسے کاشان کے بارے میں مکمل معلومات ملیں اور وہ صرف اس کی قربت کے لیے اپنا آبائی شہر چھوڑ کر کراچی چلی آئی۔ صرف اسی کے دیدار کے لیے بے حد معمولی سی جاب کی مگر دل کے جذبوں کو کبھی اس پر آشکارہ نہ ہونے دیا۔

کاشان سے محبت میں اسے ہمیشہ کے لیے پالنے کی شرط اس نے کبھی نہیں رکھی تھی۔ وہ بس اسے دیکھتی تھی سوچتی تھی اور بے پناہ چاہتی تھی۔ اب جو کاشان نے آفس چھوڑا تو گویا اس کے دل کی دنیا ہی لٹ گئی۔

”تم نے آفس سے ریزائن کیوں دیا کاشی؟“ شام میں ہی وہ اس کے گھر اس کے سر پر سوار کھڑی ہو چھ رہی تھی۔

”میں ملازمت کے بہتر حصول کے لیے اسٹیشن جارہا ہوں عاشی دعا کرو جلدی بات بن جائے۔“ اپنے حلیے کی طرح وہ خود بھی بے حد الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ عاشی کا دل تو جیسے کسی نے ٹھکی میں لے لیا۔

”مگر کیوں کاشی تمہاری تو یہاں بھی بہت اچھی جاب ہے۔ پھر ابھی تو تم پڑھ بھی رہے ہو۔“

”مجھے ہر قیمت پر یاور نقوی کے مقابل آنا ہے عاشی میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ نشاء پھر ہم دونوں میں سے کس کا انتخاب کرتی ہے۔“

”تو تم صرف نشاء کی وجہ سے باہر جا رہے ہو۔“

”ہاں۔“

”مگر کاشی۔“

”مگر کچھ نہیں اور پلے تم جاؤ یہاں سے“ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں پلیز مجھے اور پریشان مت کرو۔“ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر وہ اکٹھا ہٹ سے بولا تو عاشی لب کاٹ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس وقت اسے کچھ بھی سمجھنا نہ تھا بہت مشکل ہے۔

اگلے بہت سے دن سخت بے قراری کے عالم میں گزر گئے۔ بالآخر عاشی کو کاشان کی مدد کرنا پڑی۔ اس کی سالگرہ تھی اور برتھ ڈے گفٹ کے طور پر عاشی نے اسے امریکہ کے ریٹرن ٹکٹ کا تحفہ دیا۔ کاشان اس تحفے کو قبول کرنے سے انکاری تھا۔ وہ سب کچھ اپنے زور بازو پر کرنا چاہتا تھا مگر عاشی نے کچھ اس طریقے سے اسے قائل کیا کہ کاشان کو عاشی کا احسان لینا ہی پڑا۔

اس کی روانگی کے وقت عاشی کا برا حال تھا۔ وہ سارا وقت اس نے اپنے فلیٹ میں بستر پر رو کر گزارا۔ کاشان کو امریکہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ عاشی نے صرف اسے یہاں تک بھیجے گا ہی احسان نہیں کیا تھا بلکہ وہاں اس کی رہائش اور ملازمت وغیرہ کا انتظام بھی پہلے سے موجود تھا۔ عاشی کے اس ندر حسن سلوک پر آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

کاشان کہا گیا عاشی کو لگا وہ اپنے ساتھ اس کا تین دن گزار رہی خوشیاں جیسے کا مقصد زندگی کی خوب صورتی کا احساس سب کچھ ہی باندھ کر لے گیا ہو۔ جیسے اس کے بغیر سینے میں چلتا دھڑکتا دل درد کا گلاب بن کر رہ گیا ہو۔ جس میں صبح و شام میسیں اٹھتی تھیں۔ سب سے ملنا ملنا ہنسنا بولنا سب کچھ اس نے ترک کر دیا۔ حتیٰ کہ اس سنگدل کا شہر ہی چھوڑ دیا مگر دل کو پھر بھی کسی کل قرار نصیب نہ ہوا۔ کچھ صاحب اپنی لاڈلی بیٹی کا یہ حال دیکھ کر بے حد پریشان تھے۔

”پاپا کیا فائدہ آپ کی اتنی دولت کا جو مجھے میری محبت میرا قرار میری خوشی نہ دے سکے۔“ وہ اکثر ان کے گلے لگ کر ہنسی اور تپ تپ کر رو پڑتی۔

☆☆

پورے تین سال یونہی خاموشی سے اداسیوں کی نظر ہو گئے۔ جب ایک دن وہ اچانک لوٹ آیا۔ سرزمین پاکستان پر پہلا قدم رکھتے ہی نشاء کے کمن اور ساتھ کی تمنا کسی دعا کی طرح اس کے دل میں جا گئی تھی۔ اس وقت وہ کوئی معمولی سا انسان نہیں تھا۔ ایک پڑھا لکھا۔ امیر کبیر اور رہا شیرت انسان تھا جس کو آدھی دنیا جھک کر سلام کرتی تھی اور بلاشبہ یہ سب عاشی کے ڈیڈی کی وجہ سے ہوا تھا۔

عاشی کو اپنے آنے کی خبر سے اس نے بے خبری رکھا تھا۔ خیال تھا کہ نشاء سے مل کر پھر دونوں اکٹھے ہی اس کا شکریہ ادا کریں گے اور اسی خیال کے تحت وہ خاصے رف سے حلیے میں نشاء کی طرف آ گیا۔ جواب کسی ٹوٹے پھوٹے سے مکان کی بجائے سنگ مرمر سے تعمیر خوب صورت گھر میں رہتی تھی۔ گزرنے والے تین سالوں نے اس کے حسن و شباب میں مزید چار چاند لگا دیئے تھے۔ آنٹی کو نظر کا چشمہ لگ چکا تھا اور وہ پہلے سے خاصی نڈھال و کمزور دکھائی دے رہی تھیں۔

”بائے کاشان کتنے دنوں بعد ملے ہو کہاں تھے تم؟“ خوب بنی سنوری وہ کہیں باہر جانے کو تیار تھی۔ جب ایک دم سے کاشان کو سامنے دیکھ کر ٹھک گئی۔ کاشان کو اس کا گرم جوش انداز بھی بے حد مصنوعی لگا۔ تو کیا گزرے تین سالوں کی جدائی بھی تمہارے دل میں میری محبت نہیں ڈال سکی نشاء؟ اپنے ہی آپ سے کہتا وہ ایک دم بکھر سا گیا۔ تاہم دل کا دکھ اس پر ظاہر نہ کیا اور دھیسے سے مسکرا



کے بولا۔

”تم دن کہہ رہی ہو اور مجھے لگتا ہے میں نے تمہیں دیکھے بغیر صدیاں بتا دیں۔ صرف تمہاری خوشی کے لیے تین سال غیر ملکوں کے دھکے کھاتا رہا، تمہارے پل پل کی خبر رکھتا رہا اور آج جب میں تمہیں سب کچھ دے سکتا ہوں تو میں تمہیں تم سے مانگنے چلا آیا ہوں نشا، پلیز اس بار مجھے اپنے در سے خالی ہاتھ مت لوٹانا؟“

محبت بھی انسان کو کتنا ذلیل کر دیتی ہے۔ وہ شخص جس کا اب عالمی مارکیٹ میں ڈنگا جیتا تھا اس وقت ایک عام سی لڑکی کے سامنے کھڑا ہے۔ یہی سے گڑ گڑا رہا تھا۔ کیوں کہ اس لڑکی سے اسے حقیقی محبت تھی۔ نشا نے کچھ دیر حیران نظروں سے اسے دیکھا پھر ہلکلا کر ہنس پڑی۔

”او مائی گاڈ کاشی! میں نے کہا اور تم سچ سچ دولت کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے؟“ وہ ہنس رہی تھی اور کاشان بے پلکیں جھپکائے حیرانی سے مگر مکر اسے ہنسنے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں سمجھ کیوں نہیں آتی کاشی کہ میں تم سے کسی قیمت پر بھی شادی نہیں کر سکتی۔ دو تین سال مختلف ملکوں کے دھکے کھا کر تم سمجھتے ہو تم یاد رکھے برابر آگئے۔۔۔۔۔ ہاؤ فنی۔۔۔۔۔“

ایک مرتبہ پھر وہ پیٹ پکڑ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ کاشان کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ تاہم اس نے خود کو سنبھال لیا۔

”میں آج تمہارے گھر سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا نشا، آج تمہیں مجھ سے محبت کا اقرار کرنا ہی ہو گا، ورنہ میں یہیں تمہارے گھر کی دیواروں سے سرنگمرا کر اپنی جان دے دوں گا کیونکہ تمہارے بغیر جینے کا میں نے بھی نہیں سوچا۔“

”نہیں سوچا تو اب سوچو اور مرنے کا تمہیں اتنا

ہی شوق چڑھا ہوا ہے تو اپنی ذمہ داری پر مبرا میرے گھر میں مرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ بے حد تنفر سے خاصے چیز لے کر وہ باہر نکل گئی اور کاشان کو لگا وہ وہیں پتھر بٹو گیا ہے۔ اس کی سماعتیں، بصراتیں سب پتھر ہو گئی ہوں۔ وہ کیسے اس کے گھر سے باہر نکلا۔ کیسے گاڑی میں بیٹھا اور کب اپنا توازن کھو بیٹھا اسے کچھ خبر نہ ہو سکی۔ ہوش میں آیا تو سارے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا جسم پیٹوں میں جکڑا ہوا تھا اور وہ ایک پرسکون سے کمرے کے بید پر بے بسی سے لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ماں اس کا ہاتھ چومتی، گالوں پر ہاتھ پھیرتی بری طرح رو رہی تھیں اور اس کے پائیں طرف کھڑا وہ نازک سا وجود جو بچپن کی زد میں تھا اسے ہوش میں واپس آتے دیکھ کر ممت آنکھوں سے مگر دیا۔

”آئی۔۔۔۔۔ آئی میں نے کہا تھا ناں کاشی کو کچھ نہیں ہو گا۔ میرے مالک نے میری دعا سن لی آئی اس نے میری پر خلوص دعاؤں کو ضائع نہیں کیا۔ میں نے کہا تھا ناں وہ غفور الرحیم ہے، کریم ہے وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ اسی نے میرے آنسوؤں کی لاج رکھ لی آئی دیکھیے کاشی کو ہوش آ گیا۔“

وہ اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش کے ساتھ ساتھ خوشی کی کپکپاہٹ بھی واضح محسوس کر رہا تھا۔ تب ہی ایک نرس دھیمے سے دروازہ کھول کر اندر چلی آئی اور اس کی جانب پیشہ وارانہ توجہ سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”دیکھیے آپ پلیز مریض کو زیادہ ڈسٹرب مت کریں۔ انہیں شدید چوبیس آئی ہیں۔ ذہن پر بھی گہرا اثر پڑا ہے۔ آپ باہر چلیں اور انہیں اب آرام کرنے دیں۔“

کاشان کا کبل ٹھیک کرتے ہوئے اس نے جونہی اپنی بات ختم کی عاشی اس کی ماں کو کندھوں

سے تمام کمرہ سے باہر لے آئی۔

”کیوں بچایا ہے تم نے مجھے؟“

”اگلے روز وہ جو بھی اسے سوپ پلانے کے لیے کمرے میں داخل ہوئی اس نے بے حد غرا کر پوچھا۔ عاشی کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ عود آئی۔

”تمہیں تو میرے پروردگار نے زندگی دی ہے کاشی، پھر میں بچانے والی کون ہوں بھلا اور۔۔۔۔۔ اور زندگی تو اس کی امانت ہے ناں، وہ جب چاہے گا واپس لے لے گا، پھر تم نے اتنی بزدلانہ حرکت کیوں کی۔“ سوپ کا پاول ٹبل پر رکھتے ہوئے وہ دھیمے لہجے میں بولی تو کاشان پھر سے تب گیا۔

”کیوں کہ میں نشا کے بغیر نہیں جی سکتا۔ میرے پاس اس کے بغیر جینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔“

”لیکن ضروری تو نہیں ہے کاشی کہ ہم جیسے چاہیں اسے پا بھی لیں اگر نشا تمہارے نصیب میں ہے تو ایک دن ضرور تم اسے پا لو گے لیکن خدا خواستہ وہ اگر تمہارے نصیب میں نہیں ہے تو تم کسی قیمت پر اسے حاصل نہیں کر سکتے۔“

”شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ عاشی! میں اسے برقیات پر حاصل کر کے رہوں گا۔ وہ صرف میری ہے صرف میری۔“ وہ ایک دم اتنا ایڈوشل کیوں ہو گیا تھا وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

”اوکے، پلیز ری ٹیلیکس کاشی، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ پلیز اتنا غصہ مت کرو۔“ عاشی تو اسے ایک دم اتنے غصے میں دیکھ کر ہی تھر تھر کا پٹنے لگی تھی۔

”تمہیں میری فکر کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ سمجھیں تم؟ اور اب جاؤ یہاں سے، میں کچھ دیر تمہارے بنا چاہتا ہوں۔“ ایک دم ہی رخ پھیر کر وہ

سرد مہری سے بولا۔ تو عاشی آنسو پیتی تو ابھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اوکے میں جا رہی ہوں مگر پلیز تم زیادہ حرکت مت کرنا۔ تمہاری ٹانگوں پر گہرے زخم ہیں تمہیں تکلیف ہوگی۔“ سوپ کا پیالہ کارنوالی ٹبل پر رکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی مگر نصیحت کرنا نہ بھولی۔

کاشان نے سرد مہری سے منہ پھیر لیا۔ وہ نشا کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ اس کے دل کو نرم کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکالنا چاہتا تھا۔ نشا کی یہ بے رخی و بیگانگی اسے بہت تکلیف دے رہی تھی۔ عاشی کو بھلا کیا پتا کہ وہ کتنی تکلیف میں تھا؟

تیسرے روز جب عاشی اسے سب کاٹ کر کھلا رہی تھی اور وہ غصے سے اسے جھڑک رہا تھا تو اسی وقت دروازہ ہلکی سی چرچاہٹ کے ساتھ کھلا اور نشا نے قدم اندر رکھ دیئے۔ اس وقت بھی وہ

میک اپ سے خوب بنی سنوری ہوئی تھی۔ کاشان کی نظر جونہی اس پر پڑی اس کا چہرہ گلاب کے شگفتہ پھول کی مانند کھل اٹھا۔ عاشی کا ہاتھ پیچھے جھٹک کر اس نے انھنے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گیا۔

”لیئے رہو کاشی، پلیز لیئے رہو مجھے تو جونہی تمہارے ایکسیڈنٹ کی خبر ہوئی تڑپ کر رہ گئی۔ ابھی بھی ڈاکٹر سے مل کر آ رہی ہوں۔ اف کاشی تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ جب ڈاکٹر نے بتایا کہ تم اپنی دونوں ٹانگیں کھو چکے ہو تو بچ میرا تو دل بیٹھ گیا۔ اب تم کیا کرو گے؟ کیا ساری عمر ایک ویل چیر پر گزار دو گے؟“

اس کے بے دردی سے کہے لفظوں نے ایک مرتبہ پھر کاشان کی سماعتوں پر بم گرا دیئے۔ پچھنی پچھنی آنکھوں سے اس نے نشا کی طرف دیکھا اور پھر عاشی کی طرف جواڑی اڑی رنگت کے ساتھ پریشانی سے انگلیاں مروڑتے نشا کی طرف دیکھ



رہی تھی۔

”نہیں کاشی ڈاکٹر ز ابھی ٹانگوں کے بارے میں خاصے پر امید ہیں۔ پلیز تم دل مت چھوڑنا۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ یہ نشاء تو یونہی کہہ رہی ہے۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال کو کیسے فہم کرے۔ جس بات کو وہ فی الحال کاشان سے چھپانا چاہتی تھی۔ نشاء نے نہایت بے دردی سے وہی بات اس پر عیاں کر دی تھی۔ اس کی ہمدردی پر نشاء نے خاصا بد مزہ ہو کر اسے دیکھا۔ پھر سردہمی سے بولی۔

”رہنے بھی دو عاشی تم یہ بات بھلا کب تک چھپاتی پھر وگی ایک نہ ایک دن تو کاشی کو پتا چلنا ہی ہے۔ پھر ابھی کیوں نہ چلے؟“ عاشی کا دل چاہا وہ تھپڑوں سے اس کا چہرہ سرخ کر ڈالے مگر وہ ضبط کر کے رہ گئی۔ کاشان کم سم ہو کر رہ گیا تھا۔ یقیناً یہ بات اس کے اعصاب پر بہت گراں گزری تھی۔ اس کے چہرے پر نہایت تکلیف دہ آثار تھے۔ عاشی کا دل جیسے کسی نے گھٹی میں لے لیا۔

”نشاء خدا کے لیے تم یہاں سے جاؤ پلیز۔“ اپنے آنسوؤں پر بمشکل ضبط کر کے وہ تقریباً چلا اٹھی تھی۔ نشاء نے نخوت سے ایک نظر اس پر ڈالی۔ پھر ایک بھٹکے سے اٹھتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”کاشی تم ٹھیک ہو جاؤ گے، تمہیں کچھ نہیں ہوگا“ پلیز تم نشاء کی بات کو دل پر مت لینا۔“ آنسو کب تک آنکھوں کے کنٹرول میں رہتے پالا خرگالوں پر لڑھک ہی آئے۔ وہ اسے کیسے بتانی کہ اس کی یہ حالت اسے کتنی تکلیف دے رہی ہے اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اس کے حصے کی تکلیف اپنے نصیب میں لکھوا لیتی مگر اس پر کوئی آج نہ آنے دیتی۔

”دفع ہو جاؤ تم یہاں سے، نہیں چاہیے مجھے تمہاری ہمدردی، کچھ نہیں چاہیے مجھے جاؤ تم۔“

اس کی تمام تر ہمدردی پر بھی وہ چلا اٹھا تھا۔ عاشی سہم کر رہ گئی۔ پھر اس کی کنڈیشن کو سمجھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔

☆☆

نشاء اس دن کے بعد نہیں آئی تھی۔ تقریباً ایک ہفتے کے بعد ڈاکٹر ز نے کاشان کو ڈسچارج کر دیا۔ اس کے اسپتال کے تمام تر اخراجات عاشی نے افرڈ کیے۔ اس وقت بھی جب وہ کاشان کو سہارا دے کر کمرے سے باہر لارہی تھی ڈاکٹر اسے نصیحت کرنا نہ بھولی۔

”مس عاشی آپ پلیز اپنے کزن کا خصوصی خیال رکھیے گا۔ انہیں زیادہ دیر نہامت چھوڑیے گا اور روزانہ انہیں سہارا دے کر ورزش بھی کروانا مت بھولے گا۔ یقیناً اللہ نے چاہا تو یہ ضرور اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل ہو جائیں گے۔“ عاشی نے ڈاکٹر کی ہدایت خوب توجہ سے سنی۔ پھر ان کا شکریہ ادا کر کے وہ اسی طرح کاشان کو سہارا دے گاڑی تک لائی۔ بیساکھیاں سیٹ کر گاڑی میں پچھلی سیٹ پر رہیں اور کاشی کو اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

”تم یہ سب کیوں کر رہی ہو عاشی؟ جب تم جانتی ہو کہ میں صرف نشاء سے محبت کرتا ہوں۔ میرا دل، جان، جسم، ہر سانس، صرف اس کی امانت ہے، پھر کیوں اپنا قیمتی وقت تم مجھ جیسے بے کار انسان پر ضائع کر رہی ہو۔“

اس کے سر دلچے میں حد درجہ مایوسی تھی یا گہری کاٹ عاشی دھیان نہ دے سکی۔ وہ اسی وقت کاشان کی امی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جو صبح سے بھوک پیاسی کاشان کی گھر واپسی کی شدت سے منتظر تھیں۔ عاشی سوچ رہی تھی کہ وہ انہیں کاشان کی ٹانگوں کے بارے میں کیا بتائے گی؟

کے بتائے گی؟ ان کا ری ایکشن کیا ہوگا جب انہیں پتا چلے گا کہ کاشان اپنی ٹانگیں کھو بیٹھا ہے۔ وہ اب چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ وہ انہیں خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی جب کاشان نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا۔

اور اس کے سوال پر عاشی دھیسے سے مسکرا کر رہ گئی۔

☆☆

کاشان کے لبوں پر اب بھی ہر پل محض نشاء کا نام تھا مگر عاشی کی زندگی کا خور تو اب صرف اور صرف کاشان کی ذات بن کر رہ گئی تھی۔ ڈیڈی کے بعد اب وہی اس کے جیون کا مقصد تھا۔ ہر روز وہ اپنے ہاتھوں سے اسے کھانا کھلاتی، اس کے کپڑے بدلتی، بال سنوارتی، اپنی ہانہوں کا سہارا دے کر اسے ہرے بھرے لان میں واک کراتی، وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتی پھرتی اس خوب صورت سی شخصیت کو جب گرتے گرتے سنبھالتی تو دل کی دھڑکنیں ایک دم ہی اٹھ پھٹ سی ہو جاتیں اور وہ سرخ چہرے کو نیچے جھکا لیتی کہ کہیں کاشان اس کے دل کے چور کو پکڑ ہی نہ لے۔

اور پھر ایک دن جب ماں جی بھی چپ چاپ ان سے روٹھ گئیں اور کاشان ایک مرتبہ پھر بھر کر رو گیا تو اس نے اپنا آپ اس پر وار کر رکھ دیا۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھتی۔ اصرار کر کے اسے کچھ کھلاتی پلاتی، بمشکل آرام کے لیے کمرے تک لاتی اور سونے پر مجبور کرتی، نشاء اس دوران محض ایک مرتبہ افسوس کرنے آئی تھی۔ پھر دوبارہ شکل تک نہیں دکھائی تھی۔ عاشی کو معلوم تھا کہ وہ یاور نقوی کے ہمراہ شاپنگ کے لیے پیرس چارہی ہے مگر اس نے یہ بات کاشان کو نہیں بتائی تھی بلکہ اس سے یہی کہا تھا کہ نشاء بیمار ہے، کاشان پر گزرنے والی قیامت نے اسے بستر پر ڈال دیا

ہے اور کاشان کو اس خبر سے کتنا دکھ ہوا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔

اس دن عاشی کچھ گھریلو چیزوں کی خریداری کے لیے قریبی مارکیٹ تک گئی ہوئی تھی کہ پیچھے سے نشاء کاشان سے ملنے چلی آئی۔

”ہائے کاشان کیسے ہو تم؟“ وہ لان میں بیٹھا دھوب لے رہا تھا۔ جب نشاء ادائے بے نیازی سے چلتی اس کے قریب آ بیٹھی۔ اسے دیکھ کر کاشان ایک دم کھل سا گیا۔

”میں تو ٹھیک ہوں مگر تم کیسی ہو اب؟ عاشی بتا رہی تھی کہ تم بیمار ہو گئی تھیں؟“

”میں..... ارے نہیں بھئی میں تو کل ہی یاور کے ساتھ پیرس سے لوٹی ہوں۔“ ایک دم ہلکھلا کر وہ قدرے حیرانی سے کہتی تو کاشان بھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ایک دم ہی لبوں پر چپ سی لگ گئی۔ نشاء کافی دیر بیٹھی اپنی اور یاور کی باتیں اس سے کرتی رہی اور وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے اسے ہتے ہوتے دیکھتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اٹھ کر چلی گئی تو کاشان جیسے اپنے ہوش میں واپس لوٹ آیا۔

”تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا عاشی۔“ شام میں جب وہ اسے بستر پر لٹا کر مبل درست کر رہی تھی تو کاشان کے سوال نے ایک دم اسے چونک جانے پر مجبور کر دیا۔

”کون سا جھوٹ؟“

”یہی کہ نشاء کو میرے دکھ نے بستر پر ڈال دیا ہے۔“ بہت سپاٹ لہجہ تھا اس کا، عاشی گڑبڑا کر رہ گئی۔ کاشان سے اس سوال کی وہ توقع نہیں کر پاتی تھی۔

”تمہیں، تمہیں کس نے بتایا کہ نشاء بیمار نہیں تھی؟“ ایک دم بوکھلا کر وہ بولی۔

”یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے۔“



سے ایک خوب صورت سا گفٹ نکال کر اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولی۔

”پہلی برتھ ڈے ٹویو کاشی“ آج تمہارا جنم دن ہے اور آج کے دن تمہیں پریشان رکھنے کا تصور بھی نہیں ہے میرے پاس تم جانا چاہتے ہو ناں کہ مجھے تمہاری پروا کیوں ہے؟ میں کیوں تمہیں دھ میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی؟ ہے ناں؟“ گفٹ اسے

تھماتے ہوئے وہ نگاہوں میں ڈھیر ساری محبت لیے، اسے اک نظر دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔

”خوب صورت اور لطیف جذبوں کو نہایت خوب صورتی کے ساتھ قلمبند کرنے والی حساس شاعرہ گلینہ شاہ کہتی ہیں۔“

”ہمیں محسوس ہوتا ہے“

زمانے کی طرح تم بھی

محبت کے حسین خاموش جذبوں پر

بہت کچھ سنا چاہتے ہو

مگر اپنی طبیعت کہ ہمیں اظہار جذبوں کا

کبھی اچھا نہیں لگتا

سنا ہے پیار کا دن ہے

تو ہم اپنی طبیعت کی پسند و ناپسند اب کے

بالائے طاق رکھتے ہیں

تمہاری ہے خوشی اس میں

تو کہتے ہیں حیا کیسی؟ چلو ہم کہہ ہی دیتے ہیں

ہمیں تم سے محبت ہے

مگر انفسوس کہ میں گلینہ شاہ نہیں ہوں۔ لاکھوں

کرڈوں کی جائیداد کی مالک ہو کر بھی میں ایک

عام سی لڑکی ہوں۔ بہت عام سی لڑکی، کیونکہ میرا

دامن محبت جیسی امنٹ اور انمول دولت سے خالی

ہے۔ ہاں کاشی میں تمہیں چاہتی ہوں۔ بے حد

بے تحاشا، اپنی جان سے بھی بڑھ کر مگر میری محبت

کا شان کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ نگاہیں جھکانے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ دل ایک دم ہی دھڑک اٹھا کہ جانے کا شان اب کیا سمجھے؟ تاہم اس کا فطری اعتماد اس کے لہجے کی کپکپاہٹ پر غالب آ گیا اور وہ اس کی طرف ایک نظر دیکھ کر دھیمے سے بولی۔

”میں جانتی ہوں کاشی کہ تم نشاء سے بہت پیار کرتے ہو۔ اس کا محبت سے کہا ایک لفظ تمہارے اندر زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ اس کی ڈرا سی نفرت تمہارے دل کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے اور مجھے یہ مصیبت ہے کہ میں تمہیں دکھ میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی بس اسی لیے اس دن میں نے تم سے جھوٹ بولا۔“

”کیوں..... کیوں دکھ میں مبتلا نہیں دیکھ سکتیں تم مجھے؟“ اس وقت وہ بے حد الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ عاشی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اسے کیا کہے۔ ”پلیز مجھے میرے سوال کا جواب دو عاشی، تم جانتی ہو کہ میں نشاء سے محبت کرتا ہوں، پھر بھی تم نے قدم قدم پر مجھے سہارا دیا۔ میرے جنم دن پر امریکہ کے ٹکٹ دے کر تم نے مجھ پر پہلا احسان کیا، پھر وہاں میرے لیے ہر آسائش مہیا کی، یہاں میری ماں کا بھرپور خیال رکھا، امریکہ میں مجھے پل پل یہاں کے حالات سے باخبر رکھا۔ پھر میرے ایکسیڈنٹ پر اسپتال کے اخراجات اٹھائے، میری ماں کی خدمت کی ان کی وفات کے بعد اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھے، کسی بھی قدم پر مجھے بکھرنے نہیں دیا۔ اب بھی تم نہ لوگوں کی باتوں کی پروا کر رہی ہو نہ اپنے قیمتی وقت کی، مجھ بے بس ادھورے انسان پر تمہاری یہ مسلسل مہربانی، کیوں عاشی؟ پلیز مجھے بتاؤ.....؟“

اپنے حلیے کی طرح وہ اندر سے خود بھی بے حد رُف ہو رہا تھا۔ عاشی چپ چاپ اٹھی۔ پھر الماری



بے لوث ہے۔ تمہیں جاننے کے لیے۔ میں نے اپنے دل سے تمہیں پانے کی شرط بھی نہیں رکھی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کاشی کہ محبت زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ ہم کسی کی پیشانی پر پستول رکھ کر اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہم سے محبت کرے۔“

آنسو آپ ہی آپ آنکھوں سے پھل کر گالوں پر لڑھک آئے تھے مگر اس نے پتھیلی کی پشت سے انہیں رگڑ ڈالا۔ پھر کاشان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”جب میں نے دیکھا کہ نشاء کو دولت کی طلب ہے اور دولت کے لیے اس نے یاور نقوی کو تم پر ترجیح دی ہے اور تم اس بات پر بے حد نڈھال ہو، تو میں نے پایا سے کہہ کر تمہارے لیے امریکہ کے ٹکٹ کا انتظام کیا۔ کیوں کہ میں تمہیں بھرا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی اور تم باہر جا کر کسی مشکل میں پڑو یا نشاء کو اپنی ابتر حالت کا الزام دو، یہ بھی مجھے گوارا نہیں تھا۔ اسی لیے تم وہاں آرام سے رہے اور تمہیں فوراً ہی پایا کی فرم میں کام بھی مل گیا۔ پھر جب نشاء کی باتوں نے تمہیں ہرٹ کیا اور تمہارا اکیڈمیٹ ہوا تو میں نے اس لیے تمہیں کسی قیمتی متاع کی طرح سمیٹ لیا کہ مجھے تم سے محبت تھی، نشاء کی طرح میرے لیے دولت تم سے تمہاری زندگی سے قطعی بڑھ کر نہیں تھی اور آج..... آج بھی مجھے لوگوں کی باتوں کی کوئی پروا اس لیے نہیں ہے کیونکہ مجھے صرف تمہاری خوشی، تمہاری سلامتی چاہیے، تم نشاء سے محبت کرتے ہو اور میں جانتی ہوں تم اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اسی لیے میری خواہش اور کوشش ہے کہ تم اپنے بیروں پر چلنے کے قابل ہو جاؤ کیونکہ میں جانتی ہوں کاشی، نشاء کو ایک نہ ایک دن ضرور اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا، تب وہ پلٹ کر صرف تمہاری طرف ہی آئے گی اور میں نہیں چاہتی کہ اس وقت تمہاری ٹانگوں کی کمزوری

اسے تم پر احسان کرنے کا موقع دے یا وہ تم سے سرد رویہ اپنائے۔ اس لیے میں تمہیں بالکل محبت مند دیکھنا چاہتی ہوں کہ جب وہ پلٹ کر تمہاری طرف آئے تو تم خود کو کسی میلنس کا شکار نہ پاؤ، تم اسے اور وہ تمہیں سچی خوشی دے سکے۔“

عاشی نے منہ پھیر لیا تھا مگر کاشان اس کے لیے میں آنسوؤں کو، خوبی محسوس کر چکا تھا۔ ایک دوسری سی بے ساختہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔ محبت کے چکر بھی کتنے عجیب بات تھے۔ عاشی کو اس سے محبت تھی مگر اسے نشاء سے محبت تھی اور نشاء کو یاور سے اور کتنی عجیب تھی کہ مینوں کی محبت ہی یکطرفہ تھی۔ اسے عاشی کی محبت کی قدر نہیں تھی، نشاء کو اس کی محبت کی اور شاید یاور کو نشاء کی محبت کی قدر بھی نہیں تھی وگرنہ اتنے عرصے میں وہ لب کا نشاء سے شادی کر چکا ہوتا۔ ”اچھا سنو..... پھر تم کیا کرو گی؟“

یونہی یہ سوال وہ پوچھ بیٹھا تھا، مگر اسے خبر تک نہ ہو سکی کہ اس کے اس سوال نے عاشی کے دل میں درد کی کتنی گہری ٹیس کو چھیڑ دیا تھا۔

”میں..... میں اپنا سارا کاروبار چھوڑا، تمہیں سوئٹ کر رہی ہوں، اس لیے لندن چلی جاؤں گی۔“ بھرائے لہجے پر قابو پا کر اس نے آنسوؤں کی بھرپور کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ آنسو پلٹیں بھگو ہی گئے، پھر وہ وہاں ٹھہری نہیں تھی، بنا گئے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ کاشان کے لیے اس کا انکشاف بے حد حیرانی کا باعث تھا۔ چپ چاپ بستر پر لیٹ کر وہ گہری سوچوں میں کھو گیا۔ نشاء اس کی بچپن کی دوست تھی، اس کی خالہ زاد کزن، جسے وہ بچپن سے چاہتا آیا تھا مگر اسے کاشان سے پیار نہیں تھا، اسے دولت سے محبت تھی، دولت کی طلب تھی اور عاشی، جسے اس نے ہمیشہ نظر انداز کیا تھا، اسے اس سے محبت تھی، اس کے ناکارہ وجود سے اس کی غربت سے اور کتنی عجیب بات تھی

اسے اپنی محبت کا کوئی صلہ بھی نہیں چاہئے تھا۔ اس نے کبھی ان دونوں کو جدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ وہ چاہتی تو کاشان کو نشاء سے بدلتا کر لیتی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور یہی اس کی ذات، اس کی محبت کے بڑے پن کا واضح ثبوت تھا۔

☆☆☆

نشاء بھی اب ”محبت محبت“ کے اس کھیل سے استغناء گئی تھی۔ وہ اب یاور سے شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتی تھی مگر ایک لڑکی ہونے کے ناتے خود اپنے منہ سے شادی کے لیے کہتا، خود اپنی عزت کو داؤ پر لگانا تھا اور یاور تو گویا شادی کی ضرورت کو محسوس ہی نہیں کرتا تھا، اس روز جب وہ یاور کے ساتھ شہر کے مہنگے ترین ریسٹوران میں کافی پینے کے لیے آئی تو جب نہ رہ سکی۔

”یاور! معلوم ہے وہ میرا کزن تھا ناں، کاشان جانتے ہوں ناں، اے.....؟“ کافی کا پہلا کھونٹ بھرتے ہوئے وہ قدرے تجسس سے بولی تو یاور نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

”ہاں بھی، وہ تو اب کافی بڑا آدمی بن گیا ہے۔“ یاور کے جواب نے اسے جہاں تھوڑا سا حیران کیا، وہاں دلی خوشی بھی دی۔ اس کے دل کا حال جاننے کا یہ بہترین موقع تھا۔

”ہاں، کل وہی ہمارے گھر آیا تھا، ممی سے پراہاتھ ماٹنے۔ مگر میں نے تو صاف انکار کر دیا اور اگلے لفظوں میں کہہ دیا کہ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔“ نشاء نے دیکھا اس کی بات سے یاور کے مسکراتے چہرے پر ایک دم سے ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تاہم اس نے مسکرا کر اسے چھپانے کی بھرپور کوشش کی۔

”اچھا.....؟“ وہی بے جھٹی وہ خوش نصیب ہے کون جسے تمہاری محبت کا شرف حاصل ہو رہا ہے؟“

اظہار اس نے شوخ، لاابالی سے انداز میں پوچھا تھا مگر نشاء نے اس کے لہجے میں چھپی بے قراری کو واضح محسوس کیا اور مسکرا کر بولی۔

”کیوں، تمہیں کیوں بتاؤں؟ تم نے کبھی مجھے بتایا ہے کہ تم کس سے محبت کرتے ہو؟“

اس کی بات کو یاور نے جی بھر کر انجوائے کیا اور خوب ہلکھلا کر ہنسا۔

”اوکے، بھی پراس۔ بہت جلد یہ راز بھی کھل جائے گا اور ممی کے ساتھ عقرب ہی تمہارے گھر آ رہا ہوں کیونکہ میرا خیال ہے میں جس لڑکی سے محبت کرتا ہوں، اب اس سے شادی بھی کر ہی ڈالوں..... تمہارا کیا خیال ہے؟“

وہ بے حد جوی موڈ میں بول رہا تھا اور نشاء کے اندر تک سرشاری ہی سرشاری پھیل گئی۔ بے حد پُرسکون ہو کر، کن اکھیوں سے اس نے یاور کو دیکھا اور ہلکھلا کر ہنستے ہوئے سر اثبات میں ہلادیا۔

☆☆☆

اسے گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یاور کی آمد کا انتظار رہتا تھا۔ کاشان نے اس دوران بار بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ ہمیشہ موبائل پر اس کا نمبر دیکھتے ہی کال کاٹ دیتی اور کاشان بے حد دکھ میں گھر کر رہ جاتا مگر اسے قطعی کوئی پروا نہیں تھی اور پھر اس روز اس کا انتظار ختم ہو گیا۔

یاور اپنی خوب صورت، ماڈرن سی ماما کو لے کر اس کے گھر چلا آیا۔ نشاء کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے، پچھلے دوروز سے وہ بخار میں مبتلا تھی، اسی لیے گھر کی صفائی ستھرائی بہتر طریقے سے نہ ہو سکی تھی لہذا اس وقت یاور کی ماما کے سامنے بے حد کٹی فل کر رہی تھی، جلدی جلدی ڈرائنگ روم کو صاف کر کے انہیں وہاں بٹھایا، چائے کے ساتھ کچھ لوازمات بازار سے منگوائے، کچھ جلدی جلدی خود تیار کیے، اپنی ماں کو اب مجھے سے کپڑے بدلوا کر ان



کے پاس بھیجا اور خود نہانے چل دی۔

نہادھو کر اپنا سب سے اچھا قیمتی سوٹ نکالا، پھر نفاست سے ہلکا ہلکا میک اپ کیا اور دھڑکتے دل کی دھڑکنوں پر بمشکل قابو پائے وہ ڈرائنگ روم میں چلی آئی جہاں یاور اپنی نفیس سی ماکے پہلو میں بیٹھا خوب چمک رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر تو اس کی خوب صورت نگاہوں کی جوت مزید بڑھ گئی جبکہ اس کی ماسکرا کے نشاء کی امی سے کہنے لگیں۔

”بھئی آمنہ بہن! یاور تو دیوانہ ہو گیا ہے اس لڑکی کا، گھر میں ہر وقت نشاء نشاء کی تسبیح کرتا رہتا ہے۔ نشاء کو یہ پسند ہے نشاء کو وہ پسند نہیں سچ ہمیں تو گھمائے رکھتا ہے یہ لڑکا اور آج نشاء بیٹی کو دیکھ کر مجھے بھی یقین آ گیا کہ یہ واقعی اتنی اہمیت کی لائق ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بول رہی تھیں اور نشاء کا سر بار خیا سے جھٹکتا جا رہا تھا، دل تھا کہ پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو تیار تھا۔

”نشاء! وہ میں نے تمہیں سر پر انز کا کہا تھا ناں آج وہ دن آ گیا ہے اور جناب بہت پہلے ہی آ جاتا مگر مماندن لگی ہوئی تھیں پرسوں ہی آئی ہیں وہاں سے، خیر تم آنکھیں بند کرو مجھ سے اب اور انتظار نہیں ہو رہا.....“ یاور ایک دم ہی اپنی ماں کے پہلو سے اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھا اور اپنے مخصوص مدھر لہجے میں کہا تو نشاء نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرانی سے پلکیں بند کر لیں۔

”چلو اب کھولو.....“

دوسرے ہی پل وہ بولا تھا اور نشاء نے دیکھا کہ اس نے اپنی جینز کی پاکٹ سے ایک خوب صورت، نفیس سا، میرج کارڈ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا، پھر مسکراتے ہوئے مسرور لہجے میں بولا۔

”یہ میری اور نوین کی میرج کا انوٹیشن کارڈ ہے نئی میری کوئی بہن تو ہے نہیں اب میری شادی کا سارا انتظام تم ہی کو سنبھالنا ہے۔ میں نے کہا تھا

ناں تم سے کہ بہت جلد میں اپنے دل کا راز تم کو کھول دوں گا، ویسے نوین سے تو تم ہی بل ہی چکی ہو بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں نے سوچا اس سے میری کہ تم شادی کر کے پھر سے اڑ جاؤ میں اپنی شادی کروالوں۔ اب تم بھی اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کر لینا، مگر چلیز پہلے میری شادی ہو جائے۔“

وہ اپنے مخصوص مدھر لہجے میں بول رہا تھا اور نشاء کو لگا سا تو اس آسمان اس کے سر پر ایک دم آن گئے ہوں۔ سماعتیں اور بصارتیں جیسے ایک دم سن ہو گئی ہوں، وہ دھیرے سے مسکرا کر اپنا جہم رکھنا چاہتی تھی مگر نہ رکھ پائی۔ دل کی وادی میں ایک دم ہی طوفان آ گئے تھے، خوب صورت آنکھیں، جن میں تھوڑی دیر پہلے خوب صورت رو پہلے خواب مقید تھے اب ایک دم سے جلنے لگی تھیں۔

وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی، مگر رونہ پائی۔ یادہ نقوی کب گیا اسے کچھ خبر نہ ہو سکی، وہ تو اپنے آپ ہی سے بے نیاز ہو بیٹھی تھی۔ اسی دکھ نے اس کی محبت کرنے والی پیاری ماں کی جان لے لی اور وہ بھری دنیا میں اکیلی ہو کر رہ گئی۔ اپنی بد قسمتی پر پھوٹ پھوٹ کر روتی، بھرے گھر کی تنہائیوں میں بہکتی، دن رات شعلوں میں جل رہی تھی، اس نے کاشان سے کہا تھا کہ وہ اپنی خوب صورت زندگی کے حسین لمحے اس کے انتظار میں رہا نہیں کر سکتی۔ مگر اسے شاید خبر نہیں تھی کہ یاور نقوی کی ہمسفر بننے کی صورت میں انتظار کی صلیب ہمیشہ کے لیے اس کے سر پر لٹک جاتی، وہ خود کو دو جمع دو کی فکر سے بچانا چاہتی تھی لیکن یاور نقوی سے شادی کر کے یہی دو جمع دو کی ہوس اسے زندگی کی حقیقی خوشیوں سے ترسادی۔ برنس، پارٹیز، فرینڈ شپ گیدرنگ، مصروفیات، ان سب چیزوں کے درمیان یاور



## کسی کے نام

تم نے کہا تھا کہ دوستی اور دوست ایک ایسا واحد رشتہ ہے کہ جس کی تم کو جا کرتے ہو۔ تمہاری دوستی اور دوست ہونے پر مجھے غر ہے۔ مگر ایک بات ہم دونوں کے درمیان مذہب خاندان کی تفریق ہے مگر دوستی مشترک ہے۔ اس لیے چاہتی ہوں کہ تم اب سدھر جاؤ اپنا مستقبل محفوظ کرو۔ تمہارے لگے ہوئے گانے سن کر تم کو یاد کرتی ہوں خاص کر وہ گانا جو میری روح کو چین دے قرار دے تمہارا دیا ہوا گلاب اگرچہ مر جھا گیا ہے مگر خوشبو ابھی تک ہے۔ اپنا خیال رکھو کرو ہر کسی سے پرگامت لیا کرو اپنی تم کو پیار دے رہی ہیں۔ (روٹی گیلانی..... جزو اولہ)

ساعتوں سے ٹکرائی تھی اور نشاء سوچ میں پڑ گئی کہ بات کا آغاز کیسے کرے؟  
”ہیلو کاشی“ میں..... میں نشاء بول رہی ہوں۔“

”زہ نصیب..... آج کیسے یاد آگئی ہماری“  
خیریت تو ہے.....“ اتنے طویل عرصے کے بعد اُس کی خوب صورت آواز سن کر وہ سچ کچھ کھل اٹھا تھا۔ عاشی جو نہایت انہماک سے اس کے سر میں تیل ڈال رہی تھی چونک پڑی۔

”ایسی بات نہیں ہے کاشی“ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کبھی تمہیں بھولی ہی نہیں بس وقتی طور پر دولت کا بھوت میرے سر پر سوار ہو گیا اور میں تم سے منہ پھیر بیٹھی مگر حقیقت تو یہ ہے کاشی کہ میں تمہیں بھی اپنے دلی سے نہیں نکال سکی۔“ آج وہ کیا اعتراف کر رہی تھی کاشان تو حیران کا حیران بیٹھا رہ گیا۔

”ہاں کاشی“ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے یاد اور نقوی سے شادی سے انکار کر دیا ہے کیوں کہ میں صرف تمہیں چاہتی ہوں صرف تمہیں۔ لیکن دل میں ایک خوف سا ہے کہ نجائے تم مجھے اب چاہتے بھی ہو یا نہیں میں نے آج اسی لیے تمہیں فون کیا ہے تاکہ میں جان سکوں کہ تم آج بھی مجھ

فون سے محبت کی ہے اور اس روز بھی جب میں بہت خوش تھا تو اس کی وجہ بھی فون ہی تھی وہ مجھ سے ناراض تھی مگر اس روز اس نے مجھ سے اپنی محبت کا اقرار کیا تھا۔ تمہیں عاشی نے بتایا تو ہوگا کہ میں اسے کتنا جانتا ہوں اور پھر مجبوری بھی تو کوئی چھوٹی ہوتی ہے نشاء جس طرح محل میں بیوند نہیں جتا بالکل اسی طرح اونے گھر دیں میں بھی ایٹی کیٹس نبھانے کے لیے اونچے گھرانوں کی لڑکیاں ہی جیتی ہیں۔ بہر حال پھر بھی معذرت کہ تمہیں میری وجہ سے دکھ ملا حالانکہ میں اس میں قصور دار نہیں ہوں خراب میں چلتا ہوں۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ پھر ملیں گے.....“

ایک دم ہی وہ اپنی خوب صورت مضبوط کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈال کر بات سمیٹ گیا اور نشاء وہیں کھڑی اُسے جاتا دیکھتی رہی۔ اسے لگا آج تک وہ یاد اور نقوی کے کھوجانے کا سوگ مناتی رہی تھی مگر آج کے بعد اسے اپنی عزت اپنی خودداری اپنی انا اور اپنی برسوں سے سنیت سنیت کر رکھی ہوئی بے لوث محبت کا بھی سوگ منانا ہوگا۔

آج اُس نے ہمیشہ ہمیش کے لیے یاد اور نقوی کو کھو دیا تھا۔ ”وہ کہیں کسی موڑ پر ملے گا تو نہ امت سے کیا کہے گا۔“ اس نے خوش فہم احساس کو بھی کھو دیا تھا۔ ایک دم سے ہی تھکن اُس پر غالب آگئی اور وہ ہمیشگی خود کو گھٹ کر گھر تک لاسکی۔

ماں جی کہتی تھی کہ وہ چڑھتی ہڈیا کو ٹھوکر مار رہی ہے لہذا ساری عمر پچھتائے گی اور آج اُن کا کہنا بالکل درست ثابت ہو رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنی حماقت پر غصہ آ رہا تھا اس روز من میں جانے کیا آئی کہ بیٹھے بیٹھے کاشان کا موبائل نمبر پریس کر ڈالا۔

”ہیلو کاشان اسپیکنگ۔“

اگلے ہی پل اُس کی مانوس خوب صورت آواز

کے عاجزانہ لہجے پر وہ پھر کر ایک دم واپس چلی تھی۔

”قصور..... قصور پوچھتے ہو تم مجھ سے اپنا..... سنو..... مسٹر یاور نقوی دھوکا دیا ہے تم نے مجھے میری آنکھوں میں سہانے خواب بھر کر پھر آنکھیں

ہی فوج ڈالی ہیں تم نے میری صرف تمہارے لیے میں نے کاشان کو ٹھکرا دیا جو مجھ سے بے حد محبت کرتا تھا اور تم..... تم نے مجھے ہی ٹھکرا دیا۔ کیوں؟ کیا کی تھی مجھ میں.....؟ صرف یہی

ناں کہ میں ایک غریب لڑکی تھی جسے تم اپنی دوست تو بنا سکتے تھے مگر اپنی بیوی نہیں کیوں کہ یہ تمہارے اونچے محلوں کی ریت کے خلاف ہوتا مجھے بڑی بڑی پارٹیز میں تم فخریہ ایک دوست کی حیثیت سے تو متعارف کروا سکتے تھے مگر ایک بیوی کی حیثیت سے نہیں کیوں کہ اس سے تمہاری عزت پر حرف

آتا ہے۔ تمہارا انٹینس آن بان رکھ رکھاؤ اس کی اجازت نہیں دیتا تمہیں مسٹر یاور نقوی اگر تمہیں کسی اور ہی سے شادی کرنا تھی تو مجھے خوش فہمیوں کا شکار کیوں کیا؟ میرا کیا قصور تھا.....؟“

وہ بھی کہاں تک ضبط کرتی اندر ہی اندر ٹھٹھکیں مارتا لاوا پھٹ پڑا اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ یاد اور نقوی تو اپنی جگہ پتھر ہی بن گیا۔ نشاء کا یہ اظہار محبت اس کے لیے بے حد حیرانی کا باعث تھا اور وہ بھی

بھٹی لگا ہوں سے اسے بولتے ہوئے سنتا رہا۔  
”یو مین..... تم مجھ سے پیار کرتی تھیں.....؟“

بے حد حیران ہو کر اس نے پوچھا مگر نشاء نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اب خاموشی سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

”آئی ایم ساری نشاء میرا یقین کرو مجھے کبھی خبر نہ ہوئی کہ تم مجھے چاہتی ہو۔ مگر..... مگر میں نے تمہارے بارے میں کبھی ایسا نہیں سوچا میں نے

اسے کب تک اور کتنی محبت دے سکتا تھا؟ محلوں جیسے گھر ہی اگر زندگی کی ڈھیروں خوشیوں کے ضامن ہوں تو بڑی بڑی خوشیوں کے اندر بسنے والی نجائے کتنی معصوم زندگیاں آزادی کے خواب ہی کیوں دیکھیں؟

یاد اور نقوی ہر روز اُسے فون کرتا تھا حتیٰ کہ اپنی شادی والے دن بھی اسے نہیں بھولا مگر نشاء گھر پر تالا ڈال کر اپنے پیچھے گھر آگئی۔ ہنسی مسکرائی لڑکی سے وہ ایک دم پتھر کی مورتی بن کر رہ گئی تھی لوگوں سے ملنا جلنا ہنسنا بولنا سب کچھ بھول چکی تھی وہ۔ بہت سے دن یونہی ادا سبوں کی نظر ہو گئے۔

اُس نے یاد اور نقوی کی ملازمت بھی کب کی چھوڑ دی تھی اور اُس روز جب وہ اکیلی یونیورسٹی اسٹور پر گھریلو استعمال کی کچھ ضروری چیزیں خرید رہی تھی یاد اور نقوی سے بالکل اچانک ہی اُس کا ٹکراؤ ہو گیا۔ یاد اور کی نظر اتفاقاً جوبھی اس پر پڑی وہ لپک کر اس کے قریب آ گیا۔

”ہیلو نشی“ کیسی ہو تم.....؟“ قدرے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے اسے بھاگنا پڑا تھا اسی لیے سانس پھول گیا۔ نشاء نے پتھر جی ہوئی آنکھوں سے فقط ایک نظر اس کے شاندار حلیے پر ڈالی پھر سر جھکا کر برس سے پیسے نکالنے لگی۔

”نشی! تم مجھ سے ناراض کیوں ہو پلیز مجھے بتاؤ۔ تم بات کیوں نہیں کر رہی ہو مجھ سے؟“

بے منت کر کے وہ آگے بڑھ گئی تھی مگر یاد اور آج اُس کے سر دروپیے سے ہرٹ ہو کر پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔

”دیکھو نشی“ پلیز مجھ سے بات کرو۔ میں نے اپنی شادی پر تمہارا کتنا انتظار کیا مگر تم نہیں آئیں مجھے گھر والوں سے کتنا شرمندہ ہونا پڑا ناراض تو مجھے تم سے ہونا چاہیے اُلٹا تم مجھ سے ناراض ہو گئی ہو۔ پلیز..... پلیز نشی مجھے میرا قصور تو بتاؤ۔“ اس



سے پیار کرتے ہو یا نہیں.....؟“

وہ بے حد دھیمے لہجے میں بول رہی تھی اور کاشان حیرانی کی دلدل میں دھنسا جا رہا تھا۔ دل میں یکا یک پھول سے گل اٹھے۔

یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ عشاء میں تو آج بھی تمہیں اتنا ہی چاہتا ہوں، جتنا پہلے چاہتا تھا۔“  
”اور نیکی کاشی۔“ دوسری طرف عشاء کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔

”ہاں عشاء میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ بے حد بے تحاشا۔“  
وہ ایک جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا اور اس کے قریب کھڑی عشاء کو لگا جیسے کسی نے تیز نوکدار خنجر اس کے دل میں اتار دیا۔

”اوکاشی تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں کتنی خوش ہوں، تمہیں پا کر مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں نے سب کچھ پایا ہو۔“ اس کے بے پناہ مسرور لہجے پر کاشان نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا اور دوسری طرف وہ خوشی سے بے حال تھی۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ کاشان اس کے اتنے برے سلوک کے باوجود بھی اس سے محبت کا دم بھرے گا۔ یا ورنہ تو یہ نہ سہی کاشان احمد سہی کہ بہر حال امیر تو اب وہ بھی بہت تھا اور سونے پر سہاگہ وہ اسے چاہتا بھی تھا۔ اس کی ساری اداسی بے گلی منٹ میں ہوا ہو گئی۔

اور اگلے ہی روز وہ کاشان کے سامنے جی سنوری بیٹھی اپنی حماقتوں کا اعتراف کر رہی تھی۔ اس کے لیے اپنے دل میں موجود محبت کا اعتراف کر رہی تھی اور اس میں شاید کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ کاشان کی ثابت قدمی اور سچی محبت نے سچ سچ اس کے دل کو چھو لیا تھا۔

عاشی بچن میں چائے بنا رہی تھی اور کاشان کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا کافی مصروف نظر آ رہا تھا۔

تب ہی وہ اٹھ کر کاشان کے کندھے پر جھول گئی اور اسی پل عاشی چائے لیے کمرے میں داخل ہوئی تو عشاء ایک عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے ڈرافٹ ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ پھر بھاپ اڑائی چائے کا کپ اٹھاتی ہوئی چپک کر بولی۔  
”عاشی! ہماری شادی کے بعد تم کیا کرو گی؟“  
عجیب فاتحانہ سا انداز تھا اس کا۔ عاشی کا سر آٹھ میں عمو آنے والے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے خود بخود ہی جھکتا چلا گیا۔

”میں..... میں..... لندن واپس چلی جاؤں گی..... اپنی آخری کے پاس۔“ کپ کاشان کو تھمتے وقت اس کی انگلیاں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ دل کے اندر ہی نہیں درکار طوفان تھا غصے مار رہا تھا۔

”ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ ویسے ہماری شادی کے بعد تمہارا یہاں رہنے کا جواز بنتا بھی نہیں ہے۔ ناں کاشی؟“ ایک ادا سے اٹھلاتے ہوئے وہ کاشان کی طرف پچلی جو خاموش سا بیٹھا ان دونوں کو بغور دیکھ رہا تھا مگر اس سے پہلے کہ کاشان کوئی جواب دیتا عاشی جلدی سے اٹھ کر وہاں سے چلا گئی۔

☆☆

کاشان کا بریل اب صرف اور صرف عشاء کی ملکیت ہو کر رہ گیا تھا۔ کبھی وہ اسے شاپنگ کروا رہا تھا۔ کبھی چائے ڈز یا آس کریم کھلانے لے جا رہا تھا۔ تو کبھی رات گئے تک مختلف پارٹیز، سینما میں لے جا رہا ہوتا تھا۔ عشاء کو تو اب پتا چل رہا تھا کہ کاشان کتنی بڑی آسامی بن چکا ہے اور وہ دل سے اپنی پچھلی حماقتوں پر لعنت بھیجتے ہوئے زیادہ سے زیادہ کاشان کے قریب ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس روز بھی کاشان اسے اس کی ایک فرینڈ کے ہاں ڈراپ کر کے واپس لوٹا، تو عاشی کو اپنا

سامان پیک کرتے پایا۔ اسے سامان پیک کرتے دیکھ کر وہ ہنک کر روک گیا۔

”عاشی! یہ کیا کر رہی ہو تم؟ کہیں جارہی ہو کیا؟“ اس کے اچانک استفسار پر عاشی نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر ایک نظر اس پر ڈال کر سر جھکاتے ہوئے بیک کی زپ بند کرتے ہوئے مصیبت سے بولی۔ ”ہاں کاشی میں لندن واپس جا رہی ہوں پرسوں کی فلائٹ ہے میری سوچا انجی سے تیاری پکڑ لوں۔“ بظاہر وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی مگر کاشان کو اس کا لہجہ بے حد اداس لگا۔ خود اس کے دل پر جیسے کسی نے اچانک ہی ہاتھ ڈالا ہو۔

”مگر..... مگر تم..... تم جا کیوں رہی ہو؟“ لہجہ آپ ہی آپ بوکھلا سا گیا۔ لفظ حلق میں ہی اٹکنے لگے۔

”مجھے جانا تو ہے ناں کاشی آج نہیں تو کل تمہاری اور عشاء کی شادی ہو جائے گی۔ پھر میں یہاں کیا کروں گی؟“ عجیب عجیبے سے انداز میں کہتی وہ اسے دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی مگر کاشان وہیں بیڈ پر بیٹھ گیا۔

دل میں ایک دم سے ہی جیسے کوئی بھونچال سا آ گیا تھا۔ سانس سینے کے اندر ہی گھسنے لگا۔ یہ وہ لڑکی تھی جس نے قدم قدم پر اسے سہارا دیا تھا۔ اس کے ایک ایک آنسو کو اپنی انگلیوں کے پوروں سے چننا تھا۔ اپنی خدمت، محنت اور کوشش سے اسے اس کے پاؤں پر چلنا سکھا دیا تھا۔ اس کے ادھر سے وجود کو عشاء کی پسند کے مطابق بنا دیا تھا۔

اور آج جب وہ پھر سے ایک چلتا پھرتا، صحت مند انسان تھا تو وہ اسے چھوڑ کر جا رہی تھی۔ ہمیشہ کے لیے..... کیوں.....؟ صرف اس لیے کہ عشاء اسے قبول کر لے۔ اسے رحم کھا کر نہ اپنائے؟ صرف اس لیے کہ وہ عشاء کو پا کر خوش رہ سکے؟

## احادیث مبارکہ

لڑکے لڑکی کا بھاگ جانا جسے آج کل مہذب الفاظ میں کورٹ میرج کہتے ہیں یہ اسلامی روایات اور امت کے عملی تواتر کے سراسر منافی ہے۔ ایسی بھی تک صورت حال کے پیش نظر یہ حدیث بہنوں کو جوں کی توں سنانے کو دل چاہتا ہے۔

”جس عورت نے بھی اپنے وارث کی اجازت کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے، باطل ہے، باطل ہے۔“ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی، مشکوٰۃ ۲۷۰)

(مس عرفانہ غنی۔ بوچھال کلان چکوال)

ساری رات وہ کروٹیں بدلتا رہا، آنکھیں شدت کرب سے بو جھل ہو رہی تھیں۔ صبح وہ اٹھا تو طبیعت بے حد بو جھل تھی۔ دل سمیت پورے بدن میں درد ہو رہا تھا۔ بستر سے اٹھنے کی ہمت ہی نہ ہو رہی تھی۔

ہر روز کی طرح عاشی اسے ناشتے کے لئے چگانے آئی تو اس کا مرجھایا مرجھایا سا چہرہ دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

”ارے یہ تمہیں کیا ہوا؟ کیا رات میں ٹھیک سے سوئے نہیں۔“ وہی اپنائیت بھرا، فکر مند انداز حالانکہ اس وقت خود اس کی آنکھیں رات بھر جاگنے کی جھلکی کھا رہی تھیں۔ ”ارے تمہیں تو بخار ہے کاشی، میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔“ اپنا ٹھنڈا ہاتھ جوہنی اس نے کاشان کی جلتی پیشانی پر رکھا فکر اس پر غالب آگئی مگر اس بار کاشان چپ نہ رہا۔

”اب تم میرے لیے فکر مند ہونا چھوڑ دو عاشی پلیز مجھے تکلیف اور درد کا ذائقہ چکنے دو کرنے دو مجھے دکھ کا سامنا۔“ اس کے بے زار سے لہجے پر عاشی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ پھر چپ چاپ کمرے سے باہر چلی گئی اور جب کمرے میں



واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں گرم چائے کا کپ اور ساتھ میں بخاری ٹیبلٹ تھی۔  
 ”چلو اٹھو کاشی یہ ٹیبلٹ لو اور چائے بھی پیو“  
 انشاء اللہ بخارا تر جائے گا ورنہ پھر میں ڈاکٹر کو بلا لیتی ہوں۔“ اس کے انداز میں اب بھی اپنائیت اور فکر مندی کا تاثر نمایاں تھا۔ کاشان پلٹیں موندے چپ چاپ لیٹا رہا، تھوڑی ہی دیر میں نشاء بھی آگئی۔ اسے یقیناً عاشی نے ہی فون کر کے بلایا تھا تا کہ کاشان کی طبیعت میں بو جھل پن اور چڑچڑاہٹ ختم ہو جائے۔

☆☆

دو دن کیسے پر لگا کر اڑ گئے، وہ سمجھ ہی نہ سکی۔ تیسرے دن کے سورج نے جوئی اپنا دیدار کروایا عاشی دل تھام کر رہ گئی۔ کاشان تو کمرے سے باہر ہی نہ نکلا۔ ٹائم پورا ہو رہا تھا۔ چار بجے اس کی فلائٹ تھی اور اب گھڑی تین بج رہی تھی۔ وقت بالکل نہ تھا مگر کاشان نے تو کمرے سے باہر نہ نکلنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ مجبوراً اسے خود ہی دروازہ دھکیل کر اندر جانا پڑا کہ دل بے تاب اسے آخری بار دیکھنے کو بری طرح پھل رہا تھا۔

کاشان اپنے بیڈ پر دایاں بازو آنکھوں پر دھرے لیٹا ہوا تھا۔ عاشی کے دل کو بے حد دکھ نے جکڑ لیا۔ ”تو کیا تمہارے دل میں میری اتنی سی جگہ بھی نہیں کہ تم مجھے جاتے وقت الوداع ہی کہہ سکو کاشی؟“ آنسو گالوں پر بکھرنے کو بے تاب تھے مگر وہ کمال ضبط سے انہیں پیتے ہوئے کاشان کے سر ہانے آکھڑی ہوئی اور پھر اٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں آج ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے دور جا رہی ہوں کاشی پلیز میرا دل رکھنے کی خاطر ہی سہی مجھے مسکرا کر الوداع تو کہہ دو، اس قدر بیگانگی کا مظاہرہ تو نہ کرو کاشی! آخر میں بھی تو انسان

ہوں۔“

”اسے خبر ہی نہیں تھی کہ آنسو صرف اس کی آنکھوں میں ہی نہیں ہیں۔ کاشان کی آنکھیں بھی مسلسل برس رہی ہیں۔ رات بھر آنسو لٹکانا کاشان کی ہو چکی ہیں۔ جو بھی اس نے کاشان کا بازو ہٹایا اس کی سوچتی ہوئی سرخ بھیگی آنکھیں دیکھ کر اس کے رہ گئی۔ کاشان کی آنسوؤں بھری آنکھیں اس کے سامنے تھیں اور اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

”بس یہی دیکھنا جا رہی تھیں ماں تم؟ مل گیا سکون؟ اب جاؤ پلیز جاؤ یہاں سے۔“

وہ اس دھان پانی لڑکی کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتا تھا مگر آنسوؤں نے بغاوت کر ڈالی اور وہ ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہو گیا۔ عاشی بمشکل اپنی سسکیاں روکے منہ پر ہاتھ رکھ کر بکلتے ہوئے وہاں سے بھاگی تھی اور اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی دیوار سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

آج سے سات سال پہلے جب وہ لندن سے پاکستان آئی تھی تو کس قدر خوش تھی۔ بے حد پیار کرنے والے باپا، دوست احباب، کزنز سب ساتھ تھے کتنے خوب صورت رو پہلے خواب تھے اس کی آنکھوں میں مگر آج جب وہ واپس جا رہی تھی تو ساتھ میں سوائے آنسوؤں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ حتیٰ کہ کسی کے خلوص دل سے نکلی چند پر خلوص دعائیں بھی نہیں وہ بالکل خالی ہاتھ تھی داماں تھی۔ ساری جائیداد کاشان کے نام کی، صرف چند حسین یادوں کا تھ ساتھ ساتھ لے جا رہی تھی۔ جسے اس نے تازہ زندگی سنبھال کر رکھنا تھا۔

”ارے یہ تمہیں کیا ہوا عاشی اور تم ابھی تک گئی نہیں اگر فلائٹ چھوٹ گئی تو؟ ویسے تم بھی بڑی بے مروت ہو مجھے اپنے جانے کی خبر نہیں کی وہ تو بھلا ہو کاشان کا کہ اس نے بتا دیا ورنہ تم تو مجھے ملے

بغیر ہی چلی جاتیں اور میں شکریہ ادا کرنے کا بس سوچتی ہی رہ جاتی۔“  
 نشاء اچانک ہی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ کوئی اس وقت اس کے دل سے پوچھتا کہ وہ راتے کا کاغذ اگل جانے پر کس قدر خوش تھی اندر سے۔ تاہم عاشی نے جلدی سے پہلی کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے گلے لگا لیا۔ پھر مسکرا کے خدا حافظ کہتی ہوئی سامان اٹھا کر باہر نکل گئی۔ گھر کی دہلیز سے قدم باہر نکالتے ہی جسم کا بوجھ بڑھ گیا۔ قدم من من کے بھاری ہو گئے۔ وہ اور شدت سے رو پڑی۔

ابھی اس نے اگلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ مانوس پکار پر ٹھٹک کر رک گئی۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو لٹکانا سا کاشان دروازے میں کھڑا تھا۔  
 ”کیا تم سچ مجھے چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ گی عاشی؟ کیا خوش رہ سکو گی تم میرے بغیر؟“

اس کے عجیب سے اداس بچھے بچھے انداز پر جہاں وہ حیرت سے ٹھٹکی تھی وہیں نشاء کی آنکھیں بھی مارے حیرت کے پھٹکی کی پھٹی رہ گئیں۔  
 ”یہ..... یہ..... تم کیا کہہ رہے ہو کاشی۔“  
 اسے تو جیسے اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہ آیا۔ دنیا ایک دم اندھیری ہو گئی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نشاء تم نے دولت کے لیے یاور نقوی کو محبت پر ترجیح دی مگر اس پائل لڑکی کو دیکھو جو دولت کے ساتھ ساتھ اپنی محبت بھی دوسروں کی جھولی میں ڈال کر جا رہی ہے۔ کیا محبت دان کی جاسکتی ہے؟ کبھی نہیں۔“

اس کی محبت بھری نظریں عاشی کے وجود پر تھیں اور نشاء صدے کی شدت سے پاگل ہونے کے قریب تھی۔

”مگر..... تم..... تم تو مجھ سے پیار کرتے ہو

کاشی اور میں..... میں بھی تو تم سے محبت کرتی ہوں۔“

”ہاں میں تم سے محبت کرتا ہوں نشاء اور تا زندگی کرتا رہوں گا۔ مگر تین روز پہلے مجھ پر یہ عجیب سی حقیقت کھلی ہے کہ میں عشق عانی سے کرنے لگا ہوں۔ اس نے اپنے آپ کو میری زندگی کے لیے از حد ضروری بنا دیا ہے نشاء اور تم جانتی ہونا کہ عشق کا درجہ محبت سے کہیں بڑھ کر ہے اور ہاں تمہیں مجھ سے محبت کبھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوئی تو تم یاور نقوی کو بھی مجھ پر ترجیح نہ دیتیں۔ تمہیں صرف دولت سے پیار ہے اور میرا وعدہ ہے تم جتنی دولت چاہو گی میں تمہیں دوں گا مگر پلیز آئندہ میرے اور عاشی کے بیچ مت آنا۔“  
 نشاء کو لگا وہ ایک دم سے جیسے ٹھنڈی چھاؤں سے نکل کر تیز دھوپ میں آگئی ہو اس کی تمنائیں منہ کھولے اس کے سامنے بین کر رہی تھیں اور وہ خود اپنا ہی تماشا دیکھ رہی تھی۔ جب کہ کاشان تیز تیز قدم اٹھاتا عاشی کے قریب آیا۔ اس کے بہتے آنسو اپنے پوروں سے پنے اور پیچھ کر سینے سے لگایا تو عاشی اس کے کندھے سے لگ کر سسک پڑی۔ کاشان کی ہانہوں کے مضبوط حلقے میں اسے لگا کہ وہ بالکل اچانک جیسے کڑی دھوپ سے ٹھنڈی چھاؤں تلے آگئی ہو۔ جہاں کاشان کے پیار کی جتنی ہی بہار شدت سے اس کی منتظر تھیں جب کہ وہ اس کی آنکھوں سے پھسلنے آنسو بے تابی سے روک رہا تھا۔ اب ان قیمتی موتیوں کی حفاظت اسے زندگی بھر کرنا تھی۔





# سبز رتو کی جھل میں

عفت سحر پاشا

نظریں ملیں تو رازِ حقیقت عیاں ہوا  
بہروپ میں کسی کے یہ ہر جائی اور ہے

بے یقینی کی گہری دھند اسے اپنی لپیٹ میں لیے رہی ہیں۔ "شفق نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔  
ہوئے تھی۔

پے در پے کھلنے والی حقیقتوں نے درحقیقت اسے ڈمگادیا تھا۔ وہ چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ رہی تب زارا کو بھی صورت حال کی سنگینی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔

پہلے سطوت رانا پھر نیشین اور شہباز گردیزی والا معاملہ ہی کچھ کم میسر نہ تھا کہ وہ نادانستی میں ایڈی کی خفیہ محبت بھی آشکار کر گئی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہونا صبی.....؟" زارا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ اس سے لپٹ کر رو پڑی۔ یہ اس کی برداشت کی آخری حد تھی۔

"تم ایک مرتبہ پھر سے ایڈی کو غلط مت سمجھ لینا۔ یہ بات ہمیں اس نے براہ راست نہیں بتائی بلکہ ایڈی اور نیشین کی جھڑپ کے دوران پتہ چل ہی ہے۔ وہ یقیناً ایک اچھا دوست اور قابل تعریف انسان ہے صبی۔ ہم لوگ ہی ہمیشہ نیشین کی باتوں میں آکر ایڈی سے متفر

اس وقت وہ انتہائی غیر متوقع صورت حال کا سامنا





کر رہی تھی۔

”یہ شریفوں کا گھر انہ سے ذرا اپنی آواز دھیمی رکھو۔ ہماری بہو بیٹیاں اتنی اونچی آواز میں بات نہیں کرتیں۔“ بے جی غصے میں آگ اچھا دیکھنے کی قطعی عادی نہیں تھیں۔ سامنے جو بھی ہوتا اسے لفظوں سے دھنک کر رکھ دیتیں۔

تابندہ کا خون جیسے تیزاب بن کر رگوں کو خاکستر کرنے لگا۔

”تو آپ کا کیا خیال ہے کہ میرا تعلق کسی شریف گھرانے سے نہیں ہے؟“ اس نے اپنی آواز کنٹرول کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”میں کہتی ہوں تابندہ آہستہ بات کرو۔“ بے جی نے اسے سختی سے ٹوکا۔

”کیوں..... کیوں آہستہ آواز میں بات کرو؟“ آپ لوگ چاہیں تو منٹوں میں مجھے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیں اور مجھ سے توقع کرتے ہیں کہ میں اخلاقیات کی پاسداری کر کے سر جھکائے جوتے کھاتی رہوں۔ تو یہ آپ کی بھول ہے۔“ وہ پھٹ پڑی تھی۔

فوزیہ خاموش تماشاخی بنی لطف اندوز ہو رہی تھی جبکہ بے جی کا غضب تو آسمانوں کو چھونے لگا۔ انہیں تابندہ سے اس قدر دلیری کی توقع نہیں تھی۔

”تو تم کیا جانتی ہو کہ تمہیں مردوں کے ساتھ ہنسی ٹھٹھول کرنے کی کھلی آزادی دے دی جائے؟“ ان کا غصے سے بھرا لہجہ تابندہ کو کھل گیا۔

”مرد؟ کن مردوں کی بات کر رہی ہیں آپ؟ ابھی کچھ دیر پہلے میں اپنے شوہر کے ساتھ تھی۔ اور جس مرد کے ساتھ ”ہنسی ٹھٹھول“ کی آپ بات کر رہی ہیں وہ میرا جیٹھ ہے اور اس کا میں اپنے بڑے بھائی جیسا احترام کرتی ہوں۔“

”بھائی جیسا احترام کرنے اور بھائی ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے تابندہ بی بی۔“ فوزیہ نے معنی بخیزی سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اس پر الٹ پڑی۔

”یہ سب تمہاری لگائی ہوئی آگ ہے اور میں اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ کون سی جگہں تمہیں یہ سب کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔“

”اپنی زبان کو گام دو دو لگھن۔“ بے جی نے کوڑک دار آواز میں کہا۔ اسی اشامیں اعزاز علی اور صدیقہ بھابھی بھی افتاب و خیزاں دالان میں کھل آئے۔

”میں..... میں زبان کو گام دوں.....؟“ وہ شدید غصے کے ساتھ ساتھ صدمے کی زد میں بھی تھی۔ کس قدر گھٹیا انداز فکر تھا ان لوگوں کا۔ ”اور آپ جو جی میں آئے کہتی رہیں۔ کم از کم آپ کو تو اپنے مرتبے اور حیثیت کا خیال کر لینا چاہئے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے تابندہ؟“ صدیقہ بھابھی کے حواس اڑنے لگے۔ بھلا بے جی کے سامنے کوئی اس لہجے اور آواز میں کب بات کر بایا تھا۔

”یہ آپ بے جی سے پوچھیے یا پھر ان کی جیتی بہو سے۔“ وہ جی بھرے انداز میں کہتی رہی نہیں سیدی سید اپنے کمرے میں آ گئی۔

”کہاں ہے وقار علی؟ ذرا بلو او تو اسے وہ بھی تو آ کر دیکھے اس کی جیتی بیوی کی زبان درازی۔“ بے جی کی آواز اسے یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔

”آخر بات کیا ہے بے جی؟ کچھ برا تو پکڑائیں۔“ اعزاز علی پریشانی کے عالم میں پوچھ رہا تھا۔

”بات چاہے کچھ بھی ہو میں کہتی ہوں اس کل کی لڑکی کی میرے سامنے اتنی اونچی آواز میں بات کرنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ زبان کاٹ کے ہاتھ میں تمہادوں کی۔“

تابندہ نے زور سے دروازہ بند کر کے ہنڈ لاک دبا دیا اور کپٹیاں مسکتی بستر پر چلی آئی۔ اس کی دماغی نسلیں جیسے پھٹنے والی تھیں۔ ایک تو پہلے ہی بمشکل وہ ایک صدمے سے نکلنے کی کوشش میں تھی اور پھر بے جی اور فوزیہ کی ایسی سیدھی باتوں نے اس کا دماغ

گھما کر رکھ دیا تھا۔ ورنہ وہ کم از کم بے جی کے سامنے یوں زبان کھولنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ نہ حال ہی تھی۔

اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بے جی اس سے اس طرح جیش آسکتی ہیں۔ کتنے آرام سے وہ اس کی اور اعزاز علی کی بے تکلفی کو ایک غلط رنگ دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”مائی گاڈ۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”کس قدر گھٹیا سوچ ہے ان لوگوں کی۔ اور وہ فوزیہ اس تمام کھیل کے پیچھے یقیناً اسی کا دماغ کام کر رہا ہے۔ ورنہ اتنے دنوں میں بے جی نے بھی میرے ساتھ ایسا رویہ روا نہیں رکھا۔“

زوردار طریقہ سے دروازہ دھڑ دھڑائے جانے پر اس نے چونک کر کھٹکوں پر سے سر اٹھایا۔ جانے وہ کتنی دیر تک سوچوں میں گم بیٹھی رہی تھی کھڑکیوں کے پردے گرے ہونے کے باعث کمرے میں بالکل اندھیرا ہو رہا تھا۔

دروازے کے پار وقار علی کی آواز سن کر اس نے تیزی سے اٹھ کر لائن آئی کی اور دروازہ کھول دیا۔ گزشتہ تمام تازہ بیت جیسے اسے سامنے پا کر پھر سے عود کر آئی تھی مگر وہ دروازہ بند کر کے پلٹا تو اسے کوئی اور ہی وقار علی لگا۔ پتھر لیے چہرے اور درشت لہجے والا۔

”تم نے بے جی سے بدزبانی کی ہے؟“ اس کے سر دلب و لہجے سے تابندہ کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ ابھی بے جی کے پاس ہی سے اٹھ کر رہا ہے اور یقیناً انہی کی زبان منہ میں لے کر آیا تھا۔

”تصویر کا ایک ہی رخ مت دیکھیں وقار۔ مجھ سے یہ بھی تو پوچھیں کہ بات کیا ہوئی ہے۔“ اس کے انداز نے تابندہ کو دھکی گیا تھا۔

”بات چاہے کچھ بھی ہوئی ہو تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم بے جی کے ساتھ اونچی آواز میں بات

کرو۔“

وہ ششدر رہ گئی۔

دانتوں پر دانت جمائے مٹھیاں بھینچتا یہ وقار علی کا بہت اوپر سا روپ تھا۔ دکھ اور بے چینی کا شدید احساس اس کی رگوں کو دو رنگ کا بنا چلا گیا۔

”وقار آپ بھی انہی کی طرح مقابل کو صفائی کا موقع دئے بغیر بس دفعہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ اس کی آواز رندہ گئی تھی۔

”تو کیا غلط کہا ہے بے جی۔ اگر تم حویلی کے مردوں کے سامنے سر پر دوپٹہ اوڑھ لوگی تو تمہارے حسن کی تشہیر میں کون سی کمی آجائے گی۔“

وہ آگ کا گولہ بنا ہوا تھا۔ چھو تو تن بدن جل کر راگھ ہو جائے۔ تابندہ بھی جھلس رہی تھی

”آپ بھی تو صدیقہ بھابھی کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہیں اگر میں نے مسکرا کر اپنے جیٹھ سے بات کر لی تو کیا گناہ ہو گیا؟“

”مانٹو یہ وہ میری ماں کے برابر ہیں۔“ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ اکثشت شہادت اٹھا کر متنبہ کرنے والے انداز میں بولا تو وہ باوجود ضبط کے چلا اٹھی۔

”تو کیا میں اعزاز علی کو اپنا بھائی نہیں سمجھتی ہوں۔ مجھ پر ہی ایسی پابندی کیوں ہے؟“

”دیکھو تابندہ یہ حویلی اس کے قاعدے اور قانون سب بے جی کے ہیں۔ تمہیں بالکل ویسے ہی رہنا ہوگا جیسے وہ چاہتی ہیں۔ تمہاری خاطر میں ایک بار اعزاز علی کی زندگی برباد کر چکا ہوں مگر دوبارہ میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔“

وہ شعلہ بار لہجے میں کہتا اس کی محبت کا سارا مانا سارا غرور جلا کر رکھ کر گیا۔

غضب کی شدید لہر اس کے سر سے پیروں تک دوڑی تھی مگر کچھ کہنے سے پہلے ہی اسے یوں لگا جیسے ہر طرف سفید دھند پھیل گئی ہو۔ آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے



ہوئے اس نے نادیدہ سہارے کو تھانے کی بے سود  
کوشش کی مگر کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ وہ ہوا میں لہجہ بھر کو  
لہرا کر نیچے گرنے کو بھی جب انتہائی غیر ارادی طور پر  
وقار علی نے ہاتھ آگے بڑھائے تو وہ ملائم ریشم کی طرح  
اس کی گرفت میں بھری۔

اس کا تمام غصہ اور قہر منٹوں میں اڑن چھو ہو گیا۔  
انتہائی حواس باختہ سا وہ صدیقہ بھائی کو آوازیں  
دینے لگا۔



”میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب ہو کیا رہا  
ہے؟ شادی والے گھر میں عجیب سی پریشانیوں اٹھ  
کھڑی ہوئی ہیں۔ پہلے تم لوگوں کی دوست اٹھ کر چل  
دی۔ لاکھ میں نے روکا کہ کل مہندی کا فنکشن ہے مگر  
اس نے ایک نہیں سنی۔ چلو مانا کہ اسے ایمر جی میں  
جانا پڑ گیا مگر اب ایڈی کو کسی فضول چکر میں پڑنے کی  
کیا ضرورت تھی؟ شکر ہے خدا کا کہ معمولی زخم آئے  
ہیں اور بچے کی جان بچ گئی ورنہ ہم اس کے گھر والوں کو  
کیا منہ دکھاتے۔“ زارا کی مٹی مسلسل پریشانی کے عالم  
میں بول رہی تھیں اور کچھ غلط بھی نہیں گہر رہی تھیں۔  
آج شام کو مہندی کا فنکشن تھا اور رات کو ایڈی کو وہ  
لوگ بینڈ بچ کر واکر ہاسٹل سے لائے تھے۔

”ممی! ثوبان کہہ تو رہا تھا کہ روڈ ایکسیڈنٹ ہوا  
ہے۔“ زارا نے دبے لفظوں میں کہنا چاہا تو انہوں نے  
اسے جھڑک دیا۔

”بے وقوف مت بناؤ مجھے۔ تمہارے ابو بھی خت  
ناراض ہو رہے ہیں اچھی خاصی جھڑپ ہوئی ہے ایڈی  
کی ان لڑکوں کے ساتھ۔ اس کے ”کراٹوں“ کا  
کرشمہ تو ہاسٹل میں ایڈمٹ ہے جبکہ ان کی فائرنگ  
سے یہ بمشکل بچا ہے۔ جو گولی باز کو چھوٹی ہوئی گزر  
سکتی ہے وہ خدا نخواستہ نہیں اور بھی لگ سکتی تھی مگر یہ  
آج کل کے لڑکے ان کو کون سمجھائے۔ اچھا خاصا پیارا  
اور سمجھ دار بچہ ہے پھر بھی۔“ وہ تفکر آمیز لہجے میں کہتی

سر جھٹکتی چلی گئیں۔  
”شفق اب صبرہ کی طرف متوجہ تھی جو ایک بار پھر  
سے روٹنے کی تیاری پکڑ رہی تھی۔  
”لم آن صبی یار جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب پلیز  
تھوڑی سی خوشی بھی منالو۔ آنٹی بے چاری پہلے ہی ہم  
لوگوں کی وجہ سے اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔  
”یہ سب میری بے وقوفی اور کم ہمتی کا نتیجہ ہے  
شفق۔“ وہ ہنک کر رو دی تھی۔

”میری ممی کو تو پریشان ہونے کی عادت ہے۔ صبح  
سے اب تک پتہ نہیں لگتی بار صدقہ خیرات نکال چکی  
ہیں۔ ایڈی کی نظر تک اتار آئی ہیں پھر بھی چین نہیں  
آ رہا۔ اب تم تو مت رو دیا۔ اتنے اچھے موقع پر سب  
یوں سوگوار پھر رہے ہیں ابھی سب رشتہ دار آنے  
والے ہیں۔ وہ پتہ نہیں کیا باتیں بنائیں گے۔ اپنا موڈ  
ٹھیک کرو اور میری شادی کو اچھے طریقے سے انجوائے  
کرو۔ خبردار جو میں نے کسی کی سڑی بھی شکل دیکھی  
تو۔“ زارا نے دھماکا مچا۔ صبرہ کو ایک جھٹکا سالگا۔

واقعی کس قدر بے پرواہی وہ اس بات سے کہ یہ  
زارا کی شادی کا پرستار موقع ہے۔ وہ بے چاری تو  
انہیں خوشیاں بڑھانے کے لیے لے کر آئی تھی اور  
یہاں سب نے اس کے لیے پرابھو کا پہاڑ کھڑا کر دیا  
تھا۔

”آتم سو سو ری زارا مجھے خیال ہی نہیں رہا۔“ وہ  
خفت زدہ سی آنکھیں ملنے لگی۔ اس خیال سے تو وہ جتنا  
بھی شرمندہ ہوتی وہ اس وقت کم تھا کہ زارا کی شادی  
والے دن بھی تمام مسائل تقریباً اسی کے کھڑے کیے  
ہوئے تھے۔

زارا اپنے رشتہ داروں کو ریسو کرنے کے لیے انہی  
تو شفق نے اس کی اچھی خاصی برین واشنگ کر ڈالی۔  
”جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جاؤ صبرہ۔ مانا کہ  
اتنا آسان کام نہیں ہے لیکن ڈیڑ! انسان کو ہمیشہ موقع  
کی مناسبت سے رویہ اپنانا چاہئے۔ جو ہو چکا اس کا

یاد اسی صورت ہو سکتا ہے کہ اب ہم بہت اچھے  
طریقے سے ان تمام فنکشنز میں شرکت کریں اور آنٹی  
کی ہیپ بکر کے انہیں بہترین طور پر پایہ تکمیل تک  
پہنچائیں۔ ان کی کچھ پریشانیوں کو کم ہوں اور اس کے  
لیے انہیں افسردگی اور پچھتاوے کے اس خول سے  
باہر نکلنا ہوگا جسے تم خواہ مخواہ اپنے چہرے پر سجائے  
پھر رہی ہو۔ دنیا میں یہ پہلا دھوکہ نہیں ہے جو کسی  
دوست نے اپنے دوست کو دیا ہے۔ البتہ زارا اور  
ثوبان کی یہ پہلی اور آخری شادی ہے سو پلیز سب کچھ  
بھول کر کھلے دل اور فریش ذہن کے ساتھ اسے  
انجوائے کرو۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب سب کچھ  
ٹھیک ہو گیا ہے۔“

اور یہ سب تو وہ بھی سوچ رہی تھی۔  
یہ ٹھیک ہے کہ دل کا درد حد سے سوا ہو رہا تھا مگر اس  
قدر خوشی کے موقع پر چہرے پر غم زدہ و افسردہ سے  
تاثرات جتنا طبعی نا اندیشی تھی۔

اور ایڈی وہ اپنے احساسات سے پچھتا پھڑانا چاہ  
رہی تھی جو زارا کے انکشاف کے بعد بہت عجیب سے  
انداز میں اس کے دل و دماغ میں پیدا ہوئے تھے اور  
جن کی ماہیت تاحال وہ خود بھی سمجھ نہیں پاتی تھی او  
راے ان تمام انجمنوں سے جان چھڑانے کا سب  
سے بہترین طریقہ یہی بھائی دیا کہ وہ اپنی تمام تر توجہ  
شام کو ہونے والے مہندی کے فنکشن کی طرف  
لگا دیتی۔ مگر سوچ کی حسیت اور دھیان کے دھاگے  
بار بار ایڈی کے خیال سے جا اٹھتے تھے جو یقیناً اسی کے  
لیے شہباز گردیزی گروپ سے جا بھڑا تھا۔ اور ابھی  
تک صبرہ اپنے اندر ہمت سمجھتے نہیں کر پائی تھی کہ جا کر  
اس کی عیادت ہی کر لیتی۔ ورنہ رات گئے جب اسے  
ہاسٹل سے لایا گیا تو سبھی اس کے گرد جمع تھے اور  
حسب توفیق ہمدردی، مشوروں اور رڈائنٹ سے نواز  
رہے تھے۔ ایک صبرہ علی ہی سب سے چھپ کر اپنے  
کمرے میں بھیجی رونی رہی۔ اپنی بے وقوفیوں بھری

جذباتیت پر۔

کس قدر برا سلوک روا رکھتی آئی تھی اس سے  
حقارت بھری رخ باتیں اور اس قدر ناروا سلوک  
برداشت کرنے کے بعد بھی وہ کبھی اس سے غافل نہیں  
رہا تھا۔ ہر موقع پر اس کی مدد کرنے کو بے جھجک آگے  
بڑھا تھا اس کی سچ نواہی کے باوجود اسے سمجھانے کی  
مقدور بھرپور کوشش کرتا رہا تھا اور وہ یہی جھجکتی رہی کہ ایڈی  
اسے اپنی چلتی چڑی باتوں میں پھانسنے کی کوشش کر رہا  
ہے۔ برہمی کی آج میں سلطنتی دوسیاہ آنکھیں اس کے  
ذہن میں دوڑا میں۔

”بنی تو کبھی میری تمہارے ساتھ بھی نہیں صبرہ  
علی۔ پھر میں کیوں تمہارے پیچھے خوار ہوتا پھر رہا ہوں  
کبھی اس پر بھی غور کیا ہے تم نے؟“ بے بسی کی مٹھال  
سی کیفیت نے اسے اپنی گرفت میں کچھ اس طرح سے  
جکڑا کہ اس کی پشیمانی چھپانے نہیں چھپ رہی تھی۔  
شام ہوتے ہی جیسے زندگی خوشیوں بھرے  
ہنگاموں میں گھر گئی۔ فنکشن میں شرکت کی تیاریوں  
خوشیوں اور شرارتوں نے زندگی کو ایک بہت خوب  
صورت سے موڑ پر لاکھڑا کیا تھا۔

”تم دونوں میرے قریب سے بالکل نہیں ہلنا اور  
سنو خبردار جو کسی نے مجھے گلاب جامن کے علاوہ کوئی  
اور مٹھائی کھلانے کی کوشش بھی کی تو۔“ زارا مسلسل  
ہدایات نشر کر رہی تھی۔

”اور وہ جو ابھی پھپھو تمہیں اپنی ”کترنی“ بند  
رکھنے کی سخت ہدایات کر کے گئی ہیں وہ شاید تمہیں یاد  
نہیں۔“ اس کی کزن شائلہ نے یاد دہانی کرائی تو وہ  
سب ہنسنے لگیں۔

”کیا ہے یار۔ میں پہلے ہی اتنی نروس ہو رہی ہوں  
پہلی دفعہ شادی ہو رہی ہے نا اس لیے۔“ وہ واقعی بے  
حد گھبراہٹ ہوئی تھی۔

اس کی کلائی میں پہلی اور سبز چوڑیاں چڑھاتی  
صبرہ کو اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔



”یہ بات تم نہ بھی بتاؤ تو تمہاری ہوائیاں اڑتی شکل دیکھ کر سب کو معلوم ہو رہی ہے۔“

چیزی کے باریک گوشے سے سچے پیلے اور سرخ امتزاج کے لباس میں ملبوس صبرہ کی دلچسپی کو اس کی سادگی بھی ماند کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس وقت اس کی ہنسی زار کو بہت اچھی لگی۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو صبرہ! کہیں کسی کی نظر ہی نہ لگ جائے۔“ زارا نے بے ساختہ شرارت سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”مجھے کسی کی نظر نہیں لگتی۔“

”تو پھر یقیناً کسی اچھی نظر والے بندے نے آپ کو اپنی نظر میں رکھا ہوگا۔ ورنہ اب تک کسی کی نظر لگ چکی ہوتی۔“ زارا کی کزن اس قدر بے ساختگی سے بولی کہ زارا سے اپنی ہنسی دبانا مشکل ہو گیا۔ نادانستگی ہی میں وہ ایک دہی ہوئی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کر گئی تھی۔

صبرہ خفت و خجالت کا شکار ہونے لگی تو فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھ سے یہ گجرے وغیرہ نہیں پہنے جاتے۔ ان کے دھاگے اٹھتے ہوئے ہیں۔“ اس کی بات پلٹنے کی کوشش نے زارا اور شفق دونوں ہی کو محظوظ کیا تھا۔

”تو سیکھو نا۔ یہ نازک معاملات بڑی احتیاط سے سلجھانے والے ہوتے ہیں جلد بازی یا بے زاری نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔“ مسکراہٹ دباتے ہوئے شفق گجرے کا دھاگا سلجھا رہی تھی۔ صبرہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔ اپنی بے وقوفیوں کا جو بھٹکان وہ بھگت چکی تھی اس سے زیادہ اب اور کیا ہو سکتا تھا۔

رات جانے کتنی دیر تک وہ شکرانے کے نوافل ادا کرتی رہی تھی۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ تادیر خدا کے حضور سر بسجود رہی جس نے اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کی تھی۔

”میں ذرا باہر دیکھ کے آتی ہوں سب ریڈی ہے یا

نہیں۔ آنٹی کتنی ہی دفعہ ہمیں نکلنے کا کہہ چکی ہیں۔“ اپنے اندر کی ٹھن سے گھبرا کر وہ کمرے سے پہانہ بنا کر باہر نکلی۔ سب لوگ اپنی اپنی تیاری کو فاضل ٹھج دینے میں مصروف تھے۔ باہر لان میں مردوں کو خوش گپیوں میں مصروف دیکھ کر وہ پلٹ آئی۔ ابھی ”میرج ہال“ پہنچنے میں کافی فاصلہ تھا اسی لیے تو سر اسٹے اطمینان سے بیٹھے تھے۔ وہ چلی ہوئی سانس لینے میسر پر آ گئی۔ تنہائی پا کر دل کچھ اس قدر بے اختیار ہوا کہ اندر کی ٹھن آنسوؤں سنگ باہر نکلنے لگی۔

جو کچھ اس کے ساتھ ہونے جا رہا تھا وہ اس قدر لرزا دینے والا تھا کہ وہ اب تک خود کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ دل کو مسلسل کوئی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھا اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہو۔ اسی شدید احساس کے زیر اثر اس نے صبح فون پرانی سے کتنی ہی دیر بات کی تو آنسو روک روک کر اس کا حلق دکنے لگا تھا۔ مگر اکیلے پن کے ان لمحوں میں اس نے ان جلتے سلکتے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا جو اندر ہی اندر بہتے اس کے دل و دماغ میں ٹھن اور خوف کا سیلاب پیدا کر رہے تھے۔

نادیدہ خوف نے اسے بے حد کم زور بنا دیا تھا ورنہ صبرہ علی ہمیشہ سے دل کی مانتی آئی تھی۔ دماغ کی اس نے بھی زیادہ زحمت دینے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اور ہر بار دل کی مانتے والے اکثر نقصان اٹھاتے ہیں۔ دل کی اس قدر مانتے کا مطلب ہے اسے سب سے بڑا چڑھانا اسی لیے تو دل کو ضدی بچے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بچے بھی جب سر چڑھ جائیں تو اپنی ضد پر آز جانے کی عادت اپنا لیتے ہیں۔ بنا بجر بے کے کچھ بھٹکان ہی نہیں چاہتے۔ کچھ یہی حال دل کی ہر بات مانتے والوں کا بھی ہوتا ہے۔

اور انہی میں سے ایک صبرہ علی تھی۔

انتہادر ہے کی جذباتی ایک لائن پر سوچنا تو پھر اسی پر سوچتے رہنا۔ اپنی اسی عادت کی بنا پر آج وہ ان

حالوں کو پہنچ گئی تھی۔

اس نے دوپٹے سے رگڑ کر چہرہ خشک کیا مگر آنسوؤں کا کیا علاج کرتی جو عزت نفس کے مجروح ہونے کے شدید احساس کے زیر اثر بہتے چلے جا رہے تھے۔

وہ اس وقت حساسیت کے انتہائی درجے پر تھی۔ خدا بہت مہربان ہے، جبار و تہا رہی ہے مگر اس کے جبر و قہر پر اس کی رحمانیت حاوی ہے۔

بے شک عزت اور ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ اکبر۔

”اور ایڈی میری ہیلپ نہ کرتا اور میری فضول باتوں کو انا کا مسئلہ بنا کر پیچھے ہٹ جاتا تو؟“

اس کے وجود پر لرزہ طاری ہونے لگا۔

”میں تم جیسے لڑکوں کے بھٹکانڈوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مگر میں اس لڑکیوں میں سے قطعی نہیں ہوں جن سے ابھی تک تمہارا کوئی واسطہ نہ تار ہا ہے۔ تمہاری نظر کے اشاروں پر چلنے والی تمہاری ہر بات کو حرف آخر مان کر تمہارے قدموں پر قدم رکھتی ہوئی۔“

اس نے تھک کر گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

”تو کیا غلط کہتا تھا وہ؟ کیا رکھا ہے اس مردوں کے معاشرے میں تنہا عورت کے لیے۔ کوئی حصہ تو کیا عزت و احترام کی ایک نگاہ تک نہیں ہے۔ اور میں بے وقوف عورتوں کو حقوق دلانے کی بے وقوفانہ سوچ میں مبتلا ہوئی رہی کہ میں بھی تو ایک عورت ہی ہوں۔ خود میں چاہے کتنی ہی مضبوط اور نڈر کیوں نہ ہوں۔ مگر معاشرے کے لوگوں کی نظر میں تو گھر سے نکلی ہوئی تنہا آزاد عورت ہی ہوں نا۔ کم زور ترین مخلوق۔ جسے شکست دینا مردوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے چاہے وہ کیسی ہی جنگ کیوں نہ ہو۔“

وہ مکمل طور پر شکست خوردہ تھی۔ گزشتہ دن اس کی شخصیت کی تمام مضبوطی سیوا توڑ کر گیا تھا۔ اسے اچھی طرح تجر بہ ہو گیا تھا کہ عورت چاہے

خود کو گھر سے جتنا بھی مضبوط کر کے اپنی بہترین صلاحیتوں کو پالش کر کے کیوں نہ نکلے مقام اسے وہی ملتا ہے جو اسے معاشرہ دیتا ہے۔ مردوں کی اجارہ داری کے اس معاشرے میں جو مرد اپنی ”خواتین“ کے حقوق بحال نہیں کر سکتے، وہ بھلا ایک ”عورت“ کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں جو خواتین کے حقوق کی بحالی کے نعرے لگاتی پھرتی ہے۔

”میری کچھ میں نہیں آتا صبرہ علی کہ تمہارا ہر کام دوسرے سے الگ کیوں ہوتا ہے؟“

اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ وہ سامنے میز کے کنارے کے ساتھ ٹیک لگائے بے حد پُر سکون انداز میں کھڑا تھا۔

چہرے کو تیزی سے ہتھیلیوں سے رگڑ کر اس نے اپنی شکست کے تمام نشانات غائب کرنا چاہے مگر اس لمحے وہ اس قدر شدید آ زردگی اور ندامت کے سمندر میں غرق تھی کہ خود کو سنبھالنا ایک دقت طلب مرحلہ ثابت ہونے لگا۔

”سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ چکے ہیں۔ زارا اور شفق تمہارے لیے پریشان ہو رہی ہیں اب اٹھ جاؤ۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہا تھا۔ لاپرواہی اور ذمہ داری کا مخصوص امتزاج۔

وہ سنہلے سنہلے ایک دم سے رو دی۔

وہ چند ثانیوں تک تنہا کی سی سیٹ سے اے دیکھتا رہا، پھر بہت معتدل سے لہجے میں بولا۔

”میرا نہیں خیال کہ اب تمہارے رونے کی کوئی وجہ بنتی ہے۔ جو بے وقوفی تم کرنے والی تھیں، وہ تم نے نہیں کی۔ اب تم محفوظ ہو ناؤ اسٹیشن اپ سب لوگ ویٹ کر رہے ہیں نیچے۔“ وہ کہنے کے ساتھ ہی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا، وہ بوجھلت اس کے پیچھے بڑھی۔

”ایڈی.....“ عجلت آمیز پکار پر وہ بے ساختہ ہی ایڈیوں کے بل اس کی طرف گھوما تھا۔ آنسوؤں سے



دھلا چہرہ اور بھیگی سرخ آنکھیں لیے وہ سراپا شکست دکھائی دے رہی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیوں کو مروٹی وہ یقیناً اس وقت اپنی زندگی کے مشکل ترین مرحلے سے گزر رہی تھی۔

اپنی شکست تسلیم کرنا اپنی بارمانا۔ اس سے کڑا لکھا کبھی کسی انسان کی زندگی میں اور ہو سکتا ہے۔ وہ بھی اس انسان کے لیے جس نے ہمیشہ خود کو بہت مضبوط اور پختہ بنا رکھا ہو۔

وہ بھی اس وقت اپنی لمحات کے شکنجے میں کسی ایک ایسے شخص کے سامنے کھڑی تھی جس کے سامنے کوئی بھی کم زوری دکھانا وہ اپنی توہین سمجھتی تھی۔ ایک وہ وقت تھا جب اس شخص کے سامنے رونا اسے ذلت لگتا تھا اور آج وہ اس کے سامنے سراپا آنسو بنی کھڑی تھی۔

”تمہارے بازو کا زخم اب کیسا ہے؟“ اس کی حالت نے ایڈی کو کافی متاثر کیا تھا۔ ”اگر تم اس بات کے لیے رورہی تھیں تو یقین کرو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بالکل فٹ، بلکہ آج فٹنشن میں ایک شان دار سارباہنگٹا پیش کرنے کا بھی ارادہ ہے۔“ وہ رساں بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”آتم سوری ایڈی میری وجہ سے یہ سب.....“ ”اب سب ٹھیک ہو چکا ہے صبر۔ پچھلی غلطیوں کو دہرا کر بار بار خود کو اذیت دینے سے بہتر دانش مندی یہ ہے کہ اپنے آنے والے وقت کو بہترین اور اچھا بنانے کی پلاننگ کی جائے۔ میں جانتا ہوں کہ اس تجربے نے تمہیں بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ تمہیں اپنی کوتاہیوں کا احساس بھی ہو گیا ہے مگر میں بھی نہیں چاہوں گا کہ تم خود کو کسی کے سامنے ڈی گریڈ کرو۔“

چاہے وہ میں ہی کیوں نہ ہوں۔ پوئل سوری، او کے فائن۔ لیکن اسے اشتہار مت بناؤ، بس اس تجربے کی روشنی میں اپنی آئندہ زندگی اور تعلقات کو ٹینس کرو، تب ہر کوئی جان جائے گا کہ تم بدل چکی ہو۔ تب تمہیں کسی سے ایسکیزو زکرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے

گی کیوں کہ میرے نزدیک معذرت کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ اپنی غلطی کا مداوا اپنے رویے سے کر دیا جائے، بجائے کسی کے آگے ہاتھ جوڑنے کے۔“ وہ بے حد عجیبی سے کہہ رہا تھا۔

صبرہ کو لگا جیسے اس کے تمام زخموں پر کسی کی میحائی نے جادو اثر کر دیا ہو۔ اس کی عزت نفس کا شش پھر سے بحال ہونے لگا تھا۔ اس کے کھوئے ہوئے اعتماد نے پھر سے اسے سہارا دینے کو ہاتھ بڑھا دیا تھا۔

”اور ہاں، نیچے آنے سے پہلے منہ ضرور دھو لینا۔ کہیں سب سمجھیں کہ میں تمہاری پٹائی کر کے لایا ہوں۔“ وہ جاتے جاتے ہلکی میسراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

وہ جہاں کی تہاں کھڑی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ معذرت سیکڑوں الفاظ دل کی پٹاری میں بند سر پٹختے رہ گئے مگر وہ اس فراخ دلی سے معذرت کا باب بند کر گیا تھا کہ وہ بولنے کا سوچتی ہی رہ گئی تھی۔

♥♥♥ لاکھ بار چاہے وقار علی نے اس سے معذرت کی ہو، پیار اور ملائمت سے سمجھایا ہو مگر تابندہ کے دل میں اس کی طرف سے گراہ گئی تھی۔

”بے جی بڑی ہیں تابی۔ قابل عزت، قابل تکریم۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری ماں ہیں۔ تم پر تو ان کی عزت کرنا بہر حال میں واجب ہے۔ اگر وہ کچھ سخت کہہ بھی دیتی ہیں تو ہاں سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرو۔ پتہ ہے انہیں پلٹ کر جواب سننے کی عادت نہیں ہے اور تمہیں تو ان کی نظروں میں اپنا مقام بنانا ہے ابھی۔“

شوریدی کی لہر اس کے تن کو جھگوٹی تھی۔

”کیوں؟ میں تابندہ وقار علی، آپ کی منکوحہ اس حویلی کی سب سے چھوٹی بہو کیا ابھی بھی میرا کوئی مقام نہیں ہے ان کی نظروں میں؟“

”وہ تو سچ ہے مگر تم ان کی مرضی کے خلاف ان کی

بہو بن کر آئی ہو ظاہری بات ہے ان کے دل میں اس بات کا غصہ تو ہوگا۔“

وہ مصالجانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ کچھ ڈاکٹر کی ہدایت کا بھی اثر تھا، اس نے تابندہ کو ٹینشن فری ماحول میں رکھنے کو کہا تھا۔

”ان کی نہ سہی ان کے بیٹے کی مرضی اور پسند تو ہوں نا۔ کیا وہ اس ناتے سے بھی مجھے کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ میں اپنی خودداری اور عزت نفس کی قربانی دوں۔ بلا وجہ کی ٹوٹکار اور الزام تراشیاں برداشت کروں؟“

”تابندہ پلیز۔“ اس کا دل اچاٹ ہونے لگا تھا۔ بے زار کن انداز میں اسے ٹوک گیا۔

”یہ سب تو پہلے سے طے تھا۔ ساس بہو کی چپقلش تو ہمارے گھرانوں میں ایک روایتی سی بات ہے۔ اور خاص طور پر جس طرح سے ہماری شادی ہوئی ہے اس کے مطابق تو تمہیں خود کو ان حالات کے لیے تیار ہونا چاہئے تھا۔“

”آپ ہی سب کو بتا دیتے کہ یہ لڑکی میری خاطر سب کچھ ٹھکرا کر آ رہی ہے۔ عزت دلوانا شوہر کا کام ہوتا ہے وقار۔“ وہ جی سے گویا ہوئی تو وہ آرام سے بولا۔

”مائنڈ میٹ کرنا، میں عام بات کر رہا ہوں کہ اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کرنے والی لڑکیوں کو سسرال میں اپنا مقام بنانے کے لیے زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ جن کی خیر خبر لینے کے لیے پیچھے کوئی بھی نہ ہو، پاپ نہ بھائی۔“

تابندہ بے حد بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کس قدر دل دکھانے والی بات کی تھی اس نے۔ عام مگر ذلت آمیز۔ یہ اس کے دل میں لگنے والی دوسری گراہ تھی۔

”خوش رہا کرو تابندہ ہنس بولا کرو۔ پتہ ہے ماں کے موڈ کا ہونے والے بچے پر بہت اثر پڑتا ہے۔“

صدیقہ بھابھی صحیح معنوں میں اس کی دوست ثابت ہوئی تھیں، دائے درے، خٹے انہوں نے بھی بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ بے جی کی سرد مہری بڑیوں میں اترنے لگتی تو وہ صدیقہ بھابھی کی پناہ میں چلی آئی، بھی جو فوریہ کا تپا ہوا مزاج سلگنے لگتا تو ان کی ٹھنڈی میٹھی باتیں اسے بہت راحت اور اپنے پن کا احساس دلاتیں۔

”ایسے موقعوں پر لڑکی کی ماں یا بہن ہی صحیح معنوں میں تقویت کا باعث ہوتی ہے بھابھی۔ اور مجھ سا بد قسمت تو کوئی بھی نہیں ہوگا جس نے اپنی بے وقوفی بھری جذباتیت کے ہاتھوں خود ان آفاقی رشتوں کو کھو دیا۔“

اندر کی ٹھٹھن کبھی کبھار بڑھ جاتی تو وہ رو پڑتی تھی۔ ”میں ہوں ناں تابندہ۔ تمہاری بھابھی تمہاری ماں، بہن اور سب کچھ۔“ وہ اس کے لیے سراپا محبت بن جاتی تھیں۔

ان دنوں وہ وقار علی سے بے حد لاپرواہ رہی تھی۔ اور اس بات کو خود وقار علی نے بھی شدت سے محسوس کیا تھا۔

”کیا بات ہے تابی، اتنی بے زار کیوں رہنے لگی ہو؟ کبھی کبھی س، خفا خفا؟“ رات سونے سے پہلے اسے اپنی ہانہوں کی دھیمی آنچ دیتے حصار میں لیے وہ ریشم بچے میں پوچھ رہا تھا۔

”کچھ بھی نہیں، کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ معتدل سے لہجے میں بولی تو وقار علی بے قرار ہوئے لگا۔

”کیوں نہیں ہے؟ ابھی تو ہماری شادی کو چند ماہ ہوئے ہیں اور ہمارے درمیان ہونے کو کوئی بات نہیں رہ گئی۔“

”میں آپ سے محبت کرتی تھی اسی لیے ایک دنیا کو ٹھکرا کر اس گھر میں چلی آئی۔ آپ کو مجھ سے محبت تھی تبھی اپنے گھر والوں سے ٹکرا کر مجھے اپنا لیا۔ اب اور کیا بات ہونے سے رہ گئی ہے؟“



اس کے تھکن زدہ لہجے نے وقار علی کو دھچکا پہنچایا تھا۔

”یہ تو شروعات ہے تائی ہماری زندگی کی بنیاد۔ ابھی تو بہت سے سہرے پل سہانی چاندنی راتیں بہت سی ان کہی باتیں حکایت دل سب کچھ تو باقی ہے۔“

”مجھے صرف سراٹھا کر جینے کا اعتماد چاہئے وقار۔“ اس کی آواز میں بیگیا پن اتر آیا تو وقار علی نے اسے ریشم کے ڈھیر کی مانند سمیٹ لیا۔

”سب کچھ میری جان سب کچھ تمہارے لیے ہے۔“ اس کی محبت کی شوریدہ سری نے تابندہ کو پُر سکون کر دیا تھا۔

وقار علی کی توجہ اور محبت اسے نئی طاقت دے گئی تھی۔ اس کا مرجھایا ہوا روپ پھر سے پھول کی مانند کھل اٹھا تھا۔

محبت تو یوں بھی مردہ دلوں میں زندگی پھونکنے والا ٹانک ہے۔ وقتی طور پر تابندہ بھی سبھل گئی تھی مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وقار علی کی باتیں اس کے دل کو دھچکا گئی تھیں۔

”اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کرنے والی لڑکیوں کو سسرال میں اپنا مقام بنانے کے لیے زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ جن کی خیر خیر لینے کے لیے پیچھے کوئی نہ ہو۔ نہ باپ نہ بھائی۔“

ہر وقت اب ایک عجیب سا چھتاوا اسے اپنی گرفت میں لیے رہنے لگا تھا۔ وقار علی یہاں نہیں ہوتا تو وہ سارا سارا دن چن چن میں یا پھر صدیقہ بھابی کے پاس گزار دیتی۔

اور پھر ان دنوں جب وہ اپنی ذہنی اور جسمانی دونوں حالتوں سے سخت بے زار ہو چکی تھی انتہائی غیر متوقع طور پر احسن ملک اس سے ملنے چلا آیا۔ پہلے تو وہ اسے دیکھ کر ششدر رہی رہی۔

وہ تو اپنے میکے کا سارا سامان بھول چکی تھی۔ مگر تپتی دھوپ میں مہربان ہواؤں نے یہ کون سا در کھولا تھا کہ

لیکھت ہی وہ مشکو ہوا ٹھہری تھی۔ اس وقت بے جی والا ان میں بیٹھی کام والیوں سے گندم صاف کروا رہی تھیں۔ پاس ہی فوریہ اور صدیقہ بھابی بیٹھیں۔ میں شائع ہونے والے سوٹ کے ایک ڈیزائن پر بحث و محض میں مصروف تھیں۔ تابندہ یونہی ان سب سے اتر چھلائے کرسی پر ریشم دراز کیفیت میں بیٹھی تھی۔ احسن کو دروازے میں دیکھ کر لحظہ بھر کو سکت ہوئی اور پھر بے اختیار اٹھ کر بھاگتی ہوئی اس کے شانے سے جا گئی۔

آنسوؤں نے حلق میں چند سال کا گدیا تھا۔ احسن کو سب کی موجودگی میں اس کی یہ بے اختیاری بہت محسوس ہوئی تو ہاتھوں میں تھامے شاپنگ بیگز نیچے رکھ کر اسے شانوں سے تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”کیسی ہو.....؟“ بھی تم دونوں میاں بیوی تو جیسے ادھر کا راستہ ہی بھول گئے ہو۔ میں نے سوچا کہ میں ہی چکر لگا لوں دیکھوں تو سہی کن محبتوں نے تمہیں باندھ رکھا ہے۔“

صدیقہ بھابی سر پر سلیقے سے دوپٹہ اوڑھتی مہمان کی خاطر داری کو اٹھی تھیں جب کہ فوریہ ہونٹ پڑ سوچ انداز میں بیٹھ رہی تھی۔ احسن کو جھک کر بے جی سے سر پر پیار لیتے دیکھ رہی تھی۔

وہ اسے ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ ”امی کیسی ہیں احسن؟ خوشی کا کیا حال ہے؟ تم ان لوگوں کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟“

وہ بھرائے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی اور اسے یوں مہینوں بعد سامنے پا کر خود احسن عجیب سی سوگوار کیفیت کی زد میں تھا۔ سامنے بیٹھی اپنی مگر حد سے زیادہ پرانی۔

”وہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں بلکہ رخی نے تو

تمہارے لیے گفٹس بھی بھجوائے ہیں۔“ وہ اس کے زخموں کو جانتا تھا اسی لیے بڑی کامیابی سے ان پر پھائے رکھنے کی سعی میں مصروف تھا۔

”اور امی نے؟“ اس کی آنکھوں میں امید ویاس کے ہزاروں دیے جگمگا اٹھے تھے۔ احسن نظریں چرا گیا۔

”تم یہ بتاؤ کہ وقار علی کیسا ہے؟ مجھے تو اس کا آفس معلوم نہیں مگر اسے تو ہمارا ایڈریس پتہ ہے پھر بھی کبھی اس نے چکر نہیں لگایا۔“

”وہ بالکل ٹھیک ہے بس مصروفیت کی وجہ سے کہیں نہیں جاتے اور ایک اینڈر پراڈر آ جاتے ہیں۔“ وہ دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے پھیکے سے انداز میں مسکرائی تو احسن نے بغور اسے دیکھا۔

”تم خوش تو ہونا تابندہ؟“

’جانے اس کے ذہن میں کیسا خدشہ کھلایا تھا۔“ میں کیسے خوش رہوں احسن؟ امی کی ناراضگی میری اس خوشی کو مکمل نہیں ہونے دیتی۔ ابوجھ سے تھا مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ انہوں نے تو مجھے معافی مانگنے کا موقع بھی نہیں دیا ساری زندگی کی کسک اور ملامت میرے لیے چھوڑ گئے۔“

سیاہ آنکھوں کے گلینے پانیوں میں گھرنے لگے۔ احسن نے اس کی بے بسی و بیچارگی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اپنے لہجے کو مضبوط بنا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

”غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے تابندہ۔ اور ان غلطیوں سے تجربہ حاصل کر کے زندگی کو بہتر تو بنایا جاسکتا ہے مگر ساری عمر ان غلطیوں پر سر پکڑ کر رونا دناؤں مندی نہیں ہے۔“

”مگر بعض نقصانات ایسے بھی ہوتے ہیں احسن جن پر تمام عمر بھی سر پر ہاتھ رکھ کر رویا جائے تو بھی ان کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔“

آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر ہاتھوں پر گر رہے

تھے۔

صدیقہ بھابی جانے اور دیگر لوازمات لے کر آئیں تو ماحول بہت سوگوار ہو رہا تھا۔

”بھئی یہ تو بہت غلط بات ہے تابندہ۔ اتنے دنوں کے بعد ملنے پر تو خوشی حد سے سوا ہوئی ہے اور تم رورو کر دریا بہا رہی ہو۔“

وہ تابندہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ چکی تھیں۔ احسن بہت سنجیدہ سا بیٹھا تھا۔

”میں تو اس لڑکی کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں۔ گزری باتوں کو اتنی شدت سے سوچیں تو آئندہ زندگی دشوار ہو جاتی ہے مگر یہ اس بات کو سمجھنے کو تیار نہیں۔“

انہوں نے شکایتی انداز میں کہا تو احسن ان کے لب و لہجے سے بھلکتی محبت کو محسوس کرتے ہوئے متاثر کن انداز میں بولا۔

”آپ اس کو سمجھاتی رہیں گا یقیناً یہ آپ کی بات سمجھ جائے گی۔“

تھوڑی دیر کی بات چیت کے بعد صدیقہ بھابی اٹھ گئیں۔

”میں ذرا کھانے کا انتظام دیکھ لوں۔“

”ارے آپ یہ انتظام میری خاطر دیکھنے لگی ہیں تو پلیز زحمت مت کریں۔ میں اتنی دیر نہیں رکوں گا۔“ احسن نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو وہ اپنا بیٹ بھرے رعب سے بولیں۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ اتنے دنوں کے بعد آئے ہیں اور یونہی آپ کی خاطر مہارت کیے بغیر جانے دیں یہ اس حوالی کی روایت نہیں اور یوں بھی تابندہ کے میکے سے کوئی پہلی بار یہاں آیا ہے۔“

”اس کی تو عادت ہے بھابی تکلف برتنے کی۔“ تابندہ نے یاسیت سے مسکرا کر کہا تو وہ بے اختیار بولا۔

”اور تمہاری غیریت برتنے کی۔“ خاموشی کا وقفہ بہت بے ساختہ تھا صدیقہ بھابی نے ہی مسکراتے ہوئے اس بجرمانہ سکوت کی چادر کو



توڑا۔

”تو بس پھر ٹھیک ہے آپ لوگ اطمینان سے باتیں کریں اور آپ بھی فکر مت کریں میں زیادہ دیر بالکل نہیں لگاؤں گی۔“ انہوں نے جاتے جاتے احسن کو تسلی دی تھی۔

”بہت اچھی طبیعت ہے ان کی۔“

ان کے جانے کے بعد احسن نے توصیفی انداز میں کہا تو تابندہ نے بھی اس کی تائید کی۔

”واقعی سادہ اور بے ریا طبیعت رکھتی ہیں بھابھی۔ میری سب سے زیادہ دوستی انہی سے ہے۔ امی نے میرے بارے میں کیا کہا ہے احسن کیا وہ اب بھی مجھے ان لوگوں سے ملنے کی اجازت نہیں دیں گی؟“

جو کنا دل میں گڑا تھا اس کی تکلیف برداشت سے باہر تھی۔ بہت پر امید لہجے میں اس نے پوچھا تو وہ اس سے نظریں چرا گیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اور رخی کو شش کر رہے ہیں انہیں سمجھانے کی اس وقت وہ صدمے کی گرفت میں ہیں ورنہ ماؤں کے دل تو بہت نرم ہوتے ہیں بچوں کی کوتاہیاں بہت جلد بھول جاتی ہیں۔“ اس کا لہجہ جتنا بھی آس بندھانے والا کیوں نہیں تھا مگر اس کا یوں نگاہیں چرا کر بولنا تابندہ کے دل کو ٹھنسی میں لے گیا۔

”تم کب شادی کر رہے ہو؟“

بہت وقتوں کے بعد خود کو سنبھال کر اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلانی تھی۔

”بس کروں گا۔“ قدرے توقف کے بعد وہ بولا تو اس کے چہرے پر پھینکنے والی تاریکی تابندہ سے مخفی نہیں رہی تھی۔

ندامت کا احساس اندر ٹھٹھا مارنے لگا تو وہ بے بسی سے چور لہجے میں بولی۔

”دیر مت کرو احسن رخی سے شادی کرلو۔ ہو سکتا

ہے تبھی امی کا دل میری طرف پلٹ آئے۔“

”ہوں۔“ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مہم سے لہجے میں بولا تو اس نے پوچھا۔

”خالہ کیسی ہیں؟“

”بالکل ٹھیک۔“ وہ چونکا تھا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”تم چنک تو کرو رخی کے علاوہ امی نے بھی تمہارے لیے کچھ چیزیں بھجوائی ہیں۔“

اس کی بات رکھنے کی خاطر وہ اٹھ کر شاہنگ بیگز ٹولنے لگی۔ رخی نے اس کے اور وقار علی کے لیے تین تین سوٹ پیس بھجوائے تھے اور رخی پر فیوض خالہ جان نے بھی ان دونوں کے کپڑے بھجوائے تھے۔ وہ تیس سا تخمینے کیس کھول کر بے ساختہ احسن کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ واحد چیز تھی جس پر کسی کے بھی نام کی پرچی نہیں لگی تھی۔ گو لڈ کا خوب صورت سا بریسلٹ۔ چین کے ساتھ لٹکتے تھے ننھے ننھے سے دل بہت نفیس لگ رہے تھے۔

”یہ میری طرف سے تمہارے لیے۔“ وہ ہلکا سا مسکرا کر بولا۔ اس کی آنکھوں کی بھٹی کیفیت تابندہ کو بہت شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

”اتنا مہنگا گفٹ۔“ وہ متذبذب ہوئی مگر وہ اس کی پس و پیش کو درخور اعتنا جانے بغیر سرسری انداز میں بولا۔

”چلو اب یہ سب کچھ سمیٹ لو۔“

میری تمام کوتاہیوں کو تم کتنی فراخ دلی سے سمیٹ لیتے ہو احسن ملک۔

اس کا دل بے بسی سے پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔ سب چیزیں سمیٹ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی اور جلدی جلدی اپنے سوٹ کیس کھول کر امی خالہ جان اور رخی کے لیے سوٹ نکال کر شاہنگ بیگز میں ڈالے اور ڈرائنگ روم میں آگئی۔ مون کو احسن کی گود میں براجمان بے تکلفی سے گفٹ و شنید کرتے پا کر وہ

مسکرا دی تھی۔

”بھئی بہت ڈہین بچہ ہے۔“ احسن نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ پھر محفوظ ہونے والے انداز میں اس کی کئی باتیں دہرانے لگا۔

”نام عدیم نواز ہے عمر اڑھائی سال ہے اگلے سال اسکولنگ بھی شروع ہو جائے گی۔ ان کو کارٹونز بہت پسند ہیں اپنی امی زیادہ اچھی لگتی ہیں ابو کی نسبت۔ اور تابی بچی اسے بہت پیار کرتی ہیں۔“

”یہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار اور ذہین بچہ ہے احسن۔“ تابندہ نے اسے خوش گوار انداز میں بتایا تھا۔

”عموماً اس عمر میں بچے کی زبان اتنی صاف اور رواں نہیں ہوتی مگر یہ صاحب فر فر ہر سال کا بے تکلفی سے جواب دیے چلے جاتے ہیں۔ ابھی تو انہوں نے آپ کو یہ راز کی بات نہیں بتائی کہ ان کی شکل چونکہ چاند سے ملتی ہے اس لیے سب ان کو مون کہتے ہیں۔“

”ارے واہ۔“ احسن بھی محفوظ ہوا تھا۔ تابندہ اسے یونیو عدیم کی چھوٹی چھوٹی دلچسپ باتیں بتاتے لگی۔ اسے بھی بھی چھوٹے بچوں سے اتنی دلچسپی نہیں رہی تھی مگر ایک تو عدیم تھا ہی اتنا پیارا اوپر سے باتیں بھی اتنی دلچسپ کرتا تھا کہ وہ اس کی گردیدہ ہو گئی تھی۔

دوسری سب سے بڑی وجہ شاید اب خود تابندہ کا تخلیق کے عمل سے گزرنا تھا جس کی وجہ سے وہ عدیم کی ہر ادراہ حرکت کو انجوائے کرتی تھی اور اس کی محبت ہی کی وجہ سے عدیم بھی اس کا دیوانہ تھا۔ اسے بھی اپنی ”تابی“ جیٹا سے بہت محبت تھی۔ سب اس کے تابندہ کو ”تابی“ جیٹا کہنے پر بہت محفوظ ہوتے تھے مگر تابندہ کو اس کا انداز تحاطب دل لوٹ لینے والا لگتا تھا۔

کھانے کی میز پر بے جی موجود نہیں تھیں۔ اعزاز اور بھایا کا کھانا یوں بھی زمینوں پر بھجوا یا جاتا تھا جہاں عمو مہمان خانے میں کوئی نہ کوئی مہمان آ یا رہتا تھا۔

”بھابھی! بے جی اور فوزیہ کھانے پر نہیں آئیں۔“ اسے تعجب ہوا تھا۔

”بے جی تو بھڑک کر کھانا کھائیں گی اور فوزیہ کا تو تمہیں علم ہی ہے کہ اپنی مرضی کی مالک ہے جب جی چاہے گا کھالے گی۔“

انہوں نے عدیم کو اس کی گود سے لیتے ہوئے کہا جو پیٹیز اور پیٹری سے پیٹ بھرنے کے بعد اب سونے کی تیاریوں میں تھا۔

”آپ تو آئیں ناں یوں اچھا نہیں لگتا میز بالکل خالی ہو۔“ تابندہ نے کہا تو وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

”میں بس عدیم کو سلا کر ابھی آتی ہوں۔ بھوک تو مجھے بھی زوروں کی لگی ہے مگر جانتی ہوں نامون صاحب کا سونے کا نام نکل گیا تو یہ رورو کر میرا رات کا کھانا اجیرن کر دیں گے۔“

”یہ تو ہے۔“ وہ سر ہلا کر کہتی پلٹ گئی۔

”بڑے آزاد طبع لوگ ہیں بھئی۔ ہر چیز بہوؤں کے حوالے کر رکھی ہے۔“ کھانے سے جی میز پر اپنے علاوہ صرف تابندہ کو دیکھ کر احسن نے تبصرہ کیا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ بے جی ابھی بھڑک کر کھانا کھائیں گی اور بھابھی ابھی مون کو سلا کر آ رہی ہیں۔“ تابندہ نے مسکراتے ہوئے اس کے آگے ڈونگا کھسکا یا تھا۔

”جاؤ ثریا۔ تم بھی جا کے کھانا کھا لو۔“ مودب کھڑی ملازماؤں سے اسے ہمیشہ چڑھتی تھی۔ حاکم و محکوم کا تاثر گہرا ہونے لگتا تھا عموماً وہ کھانا کھانے کے دوران کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو خود ہی اٹھ کر لے آتی تھی۔

وہ دونوں کھانا کھا چکے تھے جب صدیقہ بھابھی فراغت پا کر پہنچیں۔

”اب میں اسکی کیا کھاؤں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو احسن فی الفور توصیفی انداز میں بولا۔

”کھانا اس قدر اچھا اور مزیدار بنا ہے کہ اگر پیٹ



نہیں۔ اور پھر صرف خالد زاد ہوتا تو چلو معاف بھی تھا کہ بھائی چکی بار سینکے سے آیا ہے۔ یہ تو اس کا منگتہ بھی تھا۔ ”وہ گال پیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔  
بے جی کا چہرہ ایک دم سے رنگ بدل گیا۔



”میرج ہال“ پہنچتے ہی وہ زارا کے ساتھ دلہن کے لیے مختص روم میں گھس گئی۔ شفق کے احتجاج پر زارا نے اسے گھر کا۔

”ارے جا کر تم بھی انجوائے کرو۔“  
”تم بھی تو یہیں ہو۔ ویسے بھی مجھ سے کچھ بھی انجوائے نہیں کیا جا رہا۔ ہمیں عین کو یوں بے زنی سے جانے نہیں دینا چاہئے تھا۔ اس نے کتنے شوق سے شادی میں شرکت کی تیاریاں کی تھیں اور ہم نے اسے ایک بار بھی نہیں روکا۔“ اس کی آنکھوں میں ٹی اتر آئی۔

اور یہ نہیں تھا کہ زارا اور شفق کو عین کے یوں عین شادی والے روز جانے کا دکھ نہیں تھا مگر حالات کا تقاضا ہی یہی تھا کہ اسے جانے دیا جاتا ورنہ شاید کچھ مزید غلط ہو جاتا۔

”وہ کون سا دوستی کے تقاضے نبھا رہی تھی جو ہم اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر رکھنے کی استدعا کرتے۔“ شفق نے اسے دکھ کے اس حصار سے نکالنے کے لیے تنک کر کہا تو زارا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”جو کچھ اس نے کیا وہ کسی طور بھی معافی کے قابل نہیں تھا۔ اب تم اس سارے قصے کو بری یاد سمجھ کر بھول جاؤ۔ اور اگر تم نے میری شادی فلاپ کرنے کی کوشش کی تو پھر دیکھنا۔“ اس نے کہتے ہوئے آخر میں اسے دھمکایا تو اسے ہنسی نہیں آئی۔ اس کی جگہ گاتی آنکھیں اس پل یا سبت کی دھند سے بھری ہوئی تھیں۔

”یادیں مہمان تو نہیں ہوتیں زارا کہ اپنی من مرضی سے جب جی چاہا انہیں مدعو کر لیا اور جب جی چاہا واپس لوٹا دیا۔ یہ تو کمین ہوتی ہیں اور کمینوں کو ان کے

میں گنجائش ہوتی تو میں پھر سے کھا سکتا تھا“ آپ کا ساتھ دینے کے لیے۔“  
”واقعی بھائی کھانا بہت اچھا بنا ہے۔“

تابندہ تو یوں بھی معترف تھی۔ یوں براہ راست تعریف و ستائش پر صدیقہ بھائی جیھنپ کی گئیں۔  
ادھر فوزیہ نے بے جی کے دل و دماغ کو پوری طرح اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ تابندہ احسن کو لے کر ڈرائنگ روم میں گئی تو تھوڑی دیر کے بعد جب بے جی کام والیوں سے فارغ ہوئیں بھی اس نے آگ لگانے کا کام شروع کیا تھا۔

”دیکھ رہی ہیں بے جی اپنی چھوٹی بہو کی آزاد روش کے مظاہرے۔“  
”کیا ہوا؟“ وہ چونکی تھیں۔

کچھ دن پہلے جو تابندہ نے ان کے ساتھ منہ ماری کی تھی اس کے بعد تو ان کے دل میں بھی اس کی طرف سے بال آ گیا تھا۔

”ارے بے جی آپ بھی نا بہت سادہ ہیں۔ ابھی دیکھا نہیں سب کے سامنے غیر مرد کے ساتھ کس قدر بے تکلفی دکھا رہی تھی۔ آپ سے کہہ دیا کہ کزن ہے مگر اصل بات تو بتائی ہی نہیں۔“ وہ آنکھیں گھماتے ہوئے شاطرانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

”تو کیا وہ اس کا کزن نہیں ہے۔ کہہ تو رہی تھی کہ خالہ کا بیٹا ہے۔“ بے جی کی سوچ اتنی گہری اور دماغ اتنا شاطر نہیں تھا یہ الگ بات تھی کہ جہاں انہیں اپنے اختیارات میں کمی کا احساس ہوتا تب وہ صحیح یا غلط کچھ نہیں دیکھتی تھیں۔ اور فوزیہ ان کی اسی کم زوری کا فائدہ اٹھاتی تھی۔

”ارے میری بھولی بے جی خالہ کا بیٹا ہے تو کس کتاب میں لکھا ہے کہ یوں بے حیائی سے اس کے سینے سے لگ کر کھڑی ہو جائے۔ تو بہ تو یہ غضب خدا کا ساری ملازما میں موجود تھیں۔ کیا کیا باتیں نہیں بن رہی ہوں گی اسے تو دیور جی کی عزت کی بھی پروا



اپنے گھر سے نکالنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ بہت مشکل۔ وہ سوچ کر رہ گئی۔

زارا کی کزنز بیٹھ کر اس کے ہاتھوں پر مہندی لگانے لگیں تو شفق نے صبرہ کو بھی ساتھ ہی باہر کھینٹ لیا۔

”اسے ڈسٹرب مت کرو مہندی لگوانے دو۔ ہم ذرا بال میں رونق میلہ دیکھتے ہیں۔“

”تم بھی ناشفق اور اسے عقل نہیں ہے کہ پارلر سے ہی مہندی لگوا لیتی۔ ابھی کیسے سوکھے گی۔“

وہ اس ”دلیس نکالی“ پر جھنجھلائی تھی۔

”اس کا خیال ہے کہ مہندی لگے ہاتھوں کی مووی زیادہ پیاری بنتی ہے۔ جبکہ پارلر سے لگوانے کے بعد خشک ہو کر جھڑ جاتی ہے اس لیے عین ٹائم پر لگوار ہی ہے۔ رسم تک خشک تو ہو جائے گی مگر جھڑے گی نہیں۔“

”آف۔“ شفق کے مزے سے بتانے پر وہ حیران ہوئی تھی۔ کتنی گہری سوچ ہے وہ خود بھی ان تمام لوازمات کے قریب بھی نہیں پہنچتی تھی سو ان باتوں کی گہرائی میں بھی نہیں گئی تھی۔

”یہ دولہا کہاں غائب ہے آنٹی؟“ شفق اسے ساتھ لیے زارا کی ممی کے پاس چلی آئی۔ وہ ہنستے ہوئے اسے بتانے لگیں۔

”وہ لوگ بڑی دھوم دھام سے آنے والے ہیں۔ باقاعدہ دولہے کو کبھی میں سوار کر کے لانے کا پروگرام ہے۔“

”دیکھا ہے ہوتی ہیں شادی بیاہ کی رونقیں مگر تمہیں تو کچھ پتہ ہی نہیں ہوگا۔ اپنی نشست کی طرف بڑھتے ہوئے شفق اسے چھیڑ رہی تھی۔

”واقعی میں نے کبھی کسی شادی میں اتنی خصوصیت سے شرکت نہیں کی۔“ اس نے ایمان داری سے اعتراف کیا تھا۔

آنٹی نے اپنی نگرانی میں ان دونوں کے لیے کولڈ ڈرنکس بھجوائی تھیں۔

”ویسے صبی یا آج میں ایک حقیقت تو مان ہی گئی

ہوں۔“ شفق کے انداز کی شرارت کو محسوس کیے بغیر وہ اس کی ڈیکوریشن کو دل ہی دل میں سراہتی بے توجہی سے بولی۔

”کون سی حقیقت؟“

”یہی کہ“ نہیں محتاج زبوز کا جسے خوبی خدا نے دی۔“

اب کی بار وہ چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”ایسا کون دکھائی پڑ گیا تمہیں۔ اس فیشن شو میں؟“

”صرف مجھے ہی نہیں بلکہ بہت سی بیٹوں کی ماؤں کی نظر بھی یقیناً اسی پر ہوگی۔“ وہ محظوظ ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی اب کی بار صبرہ کو بھی جس نے گھیر لیا۔

”مجھے بھی تو دکھاؤ وہ پری چہرہ۔ جو سادگی میں بھی لوگوں کو لٹ رہا ہے۔“

”آئینہ لاؤں؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔ صبرہ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی پھر اس کی بات سمجھی تو یکاخت ہی جل سی ہوگی۔ سنہری رنگت کے نیچے دوڑتے خون نے اس کی رنگت میں گلابیاں سی گھول دی تھیں۔

”اسٹوڈنٹ۔“

”قسم لے لو۔ ابھی زارا کی ممی سے بات کرنے کے دوران سب آئینوں کی نظر تم پر تھی۔“ وہ مزے سے کہہ رہی تھی صبرہ کے چہرے پر شرم و خجالت کا ملا جلا سا روپ دیکھنا بھی ایک بہت دلچسپ منظر تھا۔

خوب صورت تو وہ بھی ہی مگر اس کی سادگی اس کی دکھائی کو مزید دوام بخش دیتی تھی۔ اوپر سے اس کی خود سے پیے نیازی اور لا پرواہی سو نے پر سہاگے کا کام دیتی تھی۔

”بہت فضول باتیں کرتی ہو تم۔“ اس نے تادیبی انداز میں کہا تو شفق نے ہاتھ ہلا کر جیسے مامی اڑائی۔

”بھی بکھارا یہی فضول باتیں ہونی چاہئیں۔“

”ہاں ویسے کبھی کبھار کوئی حرج بھی نہیں۔“ اس

نے بھی ماحول کی مناسبت سے دل میں پھیلتی خوشگوار محسوس کرتے ہوئے اعتراف کرنے میں عار محسوس نہیں کی تھی۔

کافی دیر تک یونہی گپیں مارتے ہوئے ہال میں موجود لوگوں پر دلچسپ فقرے چست کرتے ہوئے انہوں نے کافی ٹائم بہت مزے سے گزارا مگر کچھ لڑکیوں اور بقول شفق ”آئینوں“ کی نظروں اور مسکراہٹ سے کیفوز ہو کر وہ اٹھ گئی۔

”کچھ دیر کے لیے زارا کے پاس بیٹھتے ہیں۔ اب تک تو وہ مہندی کے پنجھٹ سے بھی فراغت پا چکی ہوگی۔“

”تم بھی نا“ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ان سب کے سامنے اور بھی بن کر بیٹھتی۔“ شفق نے اُسے چھیڑا تو وہ ہنس دی۔

”مجھے ایسی فضول حرکتیں کرنا نہیں آتیں۔“

زارا مہندی لگانے انہی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

”کتنی اچھی لگ رہی ہو زارا۔“ صبرہ نے بے ساختہ ہی اس کی تعریف کی تھی۔ ہاتھوں پیردوں پر باریک ڈیزائن کی مہندی سجائے زرد لباس میں گونے سے سجادہ پٹے شانوں پر ڈالے وہ واقعی پیاری لگ رہی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے“ ثوبان صاحب یونہی دیوانے ہوئے پھر رہے تھے اس کے پیچھے۔“ شفق نے دلچسپ انکشاف کیا تھا۔ ان کی ہنسی پر زارا کی رنگت دھک اٹھی تھی۔ اسی وقت ڈھول تاشوں اور بارودی پٹاخوں کی آوازوں نے پچھل چادی۔

”لگتا ہے وہ لوگ آ گئے۔“ شفق تیزی سے آگے بڑھ کر کھڑکی کے شیشے سے نیچے جھانکنے لگی۔

”زبردست۔“ اس کی آنکھوں میں ستائی تاثرات بھر گئے۔ پھر اس نے ان دونوں کو بھی بلا دیا۔

”دیکھو تو کبھی کیا زبردست مہندی لائے ہیں سب لڑکے۔“

”یہ تو سمجھو بارات کی ریہرسل کر ڈالی ہے انہوں نے۔“ صبرہ محظوظ ہوئی تھی۔

”ثوبان اچھا لگ رہا ہے نابار۔“ زارا نے بے ساختہ کہا تو ان دونوں نے بھی اس کی تائید کی تھی۔

واقعی وہ ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے باوجود خوشی اور مسرت کی تمامت سے جگمگا تا چہرہ لیے سفید کاشن کے براق لباس میں ملبوس گلے میں پیلا صاف ڈالے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ابھی میں شاہانہ انداز میں بیٹھا وہ مسلسل ساتھ بیٹھے ایڈی سے جو گفتگو تھا۔

ابھی کے آگے ثوبان کے تمام دوست اور کزنز بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ ڈھول کی تیز دھمک اور ان کے وقتاً فوقتاً گونجنے والے نعرے ماحول کو گرما دے رہے تھے۔ بے تحاشا آتش بازی کے فضا کو رنگین بنا دیا تھا آسمان پر جا کر پھوٹنے والی پھٹری میں سے رنگ برنگی مالاسی نیچے آتی تو سب کی نظریں اس خوب صورت منظر میں ایک جاتیں۔

”آج تو ایڈی کی بھی شان نزلی ہے۔ میں تو اسے پہلی بار ایسی ڈریننگ میں دیکھ رہی ہوں۔“ شفق نے برملا کہا تو صبرہ کی نگاہ بے ساختہ ہی اس پر جا پڑی۔

آج وہ بھی جینز شرٹ کی بجائے کاشن کے سفید شلوار کرتے میں ملبوس تھا۔ ثوبان کی کسی بات پر ہنستے ہوئے اس نے اپنے مخصوص انداز میں سر جھٹکا اور اس کے شانے پر ایک مکارسید کر دیا۔ اب وہ جھک کر ثوبان کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ صبرہ لاکھ کوشش کر کے بھی اپنی نگاہ نہیں ہٹا پا رہی تھی۔

اک عجیب سا احساس نامانوس کی کیفیت۔ وہ لوگ نیچے ریسپشن میں پہنچ چکے تھے۔ ثوبان اور ایڈی دوستوں کی معیت میں اندر بڑھے تو ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اسے ایک دم جھٹکا سا لگا جیسے کوئی حلوٹا ہوا۔ وہ متوحش سی پلٹ کر کرسی میں دھنسن گئی تھی مگر مگر فی الوقت اس کے پاس اپنی اس بے اختیاری اور اس



عجیب سی کیفیت پر غور کرنے کا نام نہیں تھا۔

”تم لوگ یہیں رہو میرے ساتھ ہی باہر جانا۔“  
زارا نے انہیں تنبیہ کی تھی۔ صمیرہ نے شکر ادا کیا وہ یوں بھی ابھی باہر جانا نہیں چاہ رہی تھی۔

اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب مہندی تیل کی رسم ادا ہونا تھی۔ زارا کے پھوپھو زاد عدیل بھائی مووی میکرز کے ساتھ آ گئے۔

”تم میرے ساتھ کھڑی ہو۔“ زارا نے اس کا ہاتھ مضبوط سے جکڑ لیا تو اس کے ساتھ ہی وہ نہ صرف منقش دوپٹے کے سائے میں بلکہ مووی کیمرے کے فوکس میں بھی آ گئی۔ وہ احتجاج کرنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔ ساتھ ہی دوپٹے کا کونا پکڑے کھڑی شوق کا ساتھ دل کو تھوڑا سا آسرا دے رہا تھا مگر یوں سیکڑوں لگا ہوں کا مرکز بن کر باہر جانا اس کے لیے ایک امتحان ہی ثابت ہوا تھا۔ کمرے سے لے کر اینج تک کا فاصلہ جیسے میلوں پر پھیل گیا۔ زارا کے دل کی حالت تو وہ نہیں جانتی تھی مگر خود اس کا دل جیسے تھیلیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ یوں براہ راست کیمرے کی آنکھ کا سامنا کرنا اس کے لیے عذاب سے کم نہیں تھا مگر اب یوں سب کے بیچ میں سے بھاگ کر بھی نہیں جاسکتی تھی۔ اسے اینج پر بٹھاتے ہی سب سے پہلے وہ بھاگ گئی اور اسی اندھا دھند دوڑ کی وجہ سے وہ بری طرح کسی سے جا ٹکرائی۔ حواس تو پہلے ہی جواب دے رہے تھے اب تو نظر بھی گھوم گئی۔

”آٹم سو ری۔“ بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں سے پھسلا پھر مقابل کو دیکھ کر وہ جیسے اپنی جگہ گڑ کر رہ گئی۔

”پہلی بار دیکھ رہا ہوں کہ سیکڑوں لوگوں میں بے حد اعتماد سے بولنے والی صمیرہ علی آج یوں نروس ہو رہی ہے۔“ ایڈی کے ہونٹوں پر مخطوط ہونے والی جیسی سی مسکراہٹ تھی۔ صمیرہ دھک سے رہ گئی۔ تو یہ سب نوٹ کرتا رہا ہے۔

”نہیں تو“ اکیچو کلی میں نے کبھی ایسے فنکشن میں آئی میں کبھی ایسا رول پلے ہی نہیں کیا۔“ وہ گڑبڑائی گئی۔

”ادھوں“ کرنا چاہئے۔ ریہرسل ہوتی رہتی ہے جو اپنی باری میں کام آتی ہے۔“ ایڈی کے ہونٹوں پر آنے والی بے ساختہ مسکراہٹ اسے سنجیدہ کر گئی۔ وہ اب بھی وہی صمیرہ تھی اور سامنے وہی ایڈی تھا مگر جو انکشاف صمیرہ پر ہوا تھا اس کی وجہ سے وہ عجیب سی گھبراہٹ بلکہ خجالت آمیز احساسات کا شکار ہو رہی تھی۔

”ابھی تم ریسپنشن پر نہیں تھیں۔“ اینج پر نظر دوڑاتا وہ سرسری انداز میں کہتا صمیرہ کی تمام تر توجہ سیٹ کیا۔ ”یا خدا! ان پچاس ساتھ لڑکیوں اور خواتین کی بھیڑ میں اس نے یہ بھی دیکھ لیا۔“ اب خدا جانے وہ کونسی لاپرواہی سے پوچھ رہا تھا یا خود کو لاپرواہ کر رہا تھا مگر صمیرہ کی حالت ضرور غیر ہو رہی تھی۔

”ہاں وہ میں کمرے میں زارا کے ساتھ تھی۔“ اسی وقت وہ کسی کے بلانے پر ایک سکیورز کرتا چلا گیا تو اس کی سانسیں آسان ہوئی تھیں مگر ساتھ ہی وہ اپنی حالت پر حیرت سے غور کرنے لگی۔ ایڈی سے اسے اس طرح کھبرانا، کتنا انا اور اس کی سادہ سی بات پر بھی نروس ہونا اسے خود عجیب سے احساسات کا شکار کر رہا تھا مگر کوئی بھی سر ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔

”یہ سب زارا کی فضول گوئی کا قصور ہے۔ مگر مجھے اس کے سامنے اس قدر کانٹس نہیں ہونا چاہئے۔ کس قدر گھٹیا اور سبکی والی بات ہے۔“ اس نے جتنی سے خود کو سرزنش کی تھی۔

لڑکوں نے بہت شور مچا گامے کے بعد ہنگوڑا ڈالنے ہوئے ٹوبان کو اینج پر زارا کے ساتھ والی منقش کرسی پر جا بٹھایا۔ سی ڈی پلیئر کا فلنڈلیم ماحول میں جوش پیدا کر رہا تھا۔

مہندی کی یہ رات

مہندی کی یہ رات

آئی مہندی کی یہ رات لائے پٹنوں کی بارات  
چننا سا جن کے ہے ساتھ اُس کے ہاتھوں میں ہے ہاتھ

ادھوں کرت سنگھار گوری کرت سنگھار  
تیل مہندی کی دلچسپ رسم میں بھی نے جوش و خروش سے حصہ لیا تھا۔ منقش اسے کتنی ہی بار اشاروں سے بلا چکی تھی۔ اسے زارا نے اپنے پاس روک رکھا تھا مگر وہ نظر انداز کیے اپنی نشست پر براجمان رہی۔

بڑوں کے فارغ ہونے پر اب دولہا دلہن کے دوستوں کے رسم ادا کرنے کی باری تھی۔ آئی اُسے زبردستی اٹھا کر ساتھ لے گئیں۔

”نہیں تو سب سے آگے ہونا چاہئے صمیرہ۔ بیٹ فریڈ ہوزارا کی۔“ انہوں نے اسے کرسی پر جا بٹھایا تو وہ نروس سی ہو کر رہ گئی۔ اس کی جھجک میں نہیں آ رہا تھا کہ رسم شروع کرے تو کیسے کرے۔

”مہندی رکھو پہلے میرے ہاتھ پر پھر تیل لگاؤ اور اس کے بعد مٹھائی کھلاؤ۔“ زارا بی بی نے اطمینان سے مشورہ دیا تو شوق نے پیچھے سے اس کا سر دبا کر جھکا دیا۔

بمشکل ہی سہی مگر وہ یہ مرحلہ طے کر کے اٹھنے لگی تو ان سب نے شور مچا دیا۔

”ابھی تو دولہا بنائی ہے۔“  
”اوہ گاڈ۔“ وہ چپس کر رہ گئی۔ بہر طور اس نے ٹوبان کی رسم بھی ادا کر ہی دی۔

”ذرا اس شہ بائے کو بھی تیل لگاؤ صمیرہ۔ تاکہ اس کی بھی جلدی سے شادی ہو۔“ آئی نے اونچی آواز میں کہا تو وہ بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔ سبھی نے ٹوبان کے ساتھ ساتھ ایڈی پر بھی خوب تیل انڈیلا تھا مگر صمیرہ نے قطعاً نہیں سوچا تھا کہ اس کی باری بھی آجائے گی۔ دل ٹڑا کر کے اس نے ایک انگلی تیل میں ڈبو کر ایڈی کے تیل میں تھمرے بالوں پر گر ڈی۔ بھی

اُس نے ایک دم سے اپنی پھیلی صمیرہ کے آگے پھیلا دی۔  
”مہندی نہیں لگاؤ گی۔ کسی خوب صورت سے نام کی۔“

اس کا دل سکڑ کر پھیلا۔ چاہے کسی نے اس شور میں ایڈی کی بات نہ سنی ہو مگر صمیرہ اس کی فرمائش پر ساکت رہ گئی۔ ایڈی کے لب و لہجے جیسی سنجیدگی اس کی آنکھوں سے چھلکتی ماناؤں سی کیفیت سے بھی ظاہر تھی۔ وہ تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

اس کے بعد وہ سارے فنکشن میں زارا کے ساتھ چپکی رہی۔ حتیٰ کہ مہمانوں کی رخصتی عمل میں آنے لگی اسی اثنا میں صبح کے ساڑھے تین بج چکے تھے۔

”مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے۔ اور تھکن سے برا حال ہے۔“ صمیرہ بد مزہ ہو رہی تھی۔ دراصل اپنے احساسات کی تبدیلی کو اس کے دل و دماغ قبول کرنے سے انکاری تھی۔ ہاں ناں کی یہی جنگ اس کے اعصاب کو تھکا رہی تھی۔

وہ سب نیچے داخلی دروازے پر آئیں تو زارا کے پاپائے کہا۔  
”تم لوگ بھی گاڑی میں بیٹھو چلو جلدی کرو۔“

”چلو بھئی۔“ ایڈی نے بلیک کرو لا کا دروازہ کھولا تو زارا اور شوق کی تقلید میں اسے بھی بیٹھا پڑا۔

”ایڈی! تمہاری گاڑی میں جگہ تو ہے نا ایک بندے کی؟“ انکل نے فرنٹ سیٹ خالی دیکھ کر آواز لگائی تو وہ گاڑی اشارٹ کرتے ہوئے مصروف انداز میں بولا۔

”خالی تو ہے مگر بیٹھے کے قابل نہیں گیلی ہے۔“ ان تینوں کو بھی کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی تھی مگر زارا تو تب بدکی جب مین روڈ پر جا کر ایڈی نے گاڑی روکی اور جو انتظار دولہا کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا شرف بخشا۔

”کس قدر بد تمیز ہو ایڈی۔ تم تو کہہ رہے تھے کہ



سٹ گیلی ہے۔“ زارا نے حسب استطاعت دوٹے کا گھونگھٹ نکالتے ہوئے چلا کر کہا تو وہ ہنسنے لگا۔ مگر ٹوبان بہت جذباتی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔  
”تمہاری خاطر تو میں کہیں بھی بیٹھ سکتا ہوں۔“  
”جلتے تو ہے پر بھی۔“ ایڈی نے گرہ لگائی تو وہ اسے گھورنے لگا۔

”یہ ویسے بہت غلط بات ہے۔ ابھی گھر جا کے سب کو پتہ چلا تو ڈانٹ پڑ جائے گی سب کو۔“ شفق نے ان کی شرارت سے محفوظ ہوتے ہوئے بظاہر انہیں ڈرایا تھا۔

”میں ڈانٹ بھی کھالوں گا۔“ فرما رہی تھی تو آج ٹوبان پر ختم تھی۔ انہیں اس کی حرکت پر ہنسی آ رہی تھی۔  
”ایڈی نے تو آج اچھی طرح اپنی مایوں کی ریہرسل کر لی ہے۔ لگتا ہے کہ بہت جلدی ہے شادی کرنے کی۔“ شفق عموماً اتنی بے لطفی سے کام نہیں لیتی تھی۔ صبرہ کو لگا اس کی پیشانی تپ اٹھی ہو۔ اگر زارا نے محض قیاس آرائی نہیں کی تھی تب تو اس وقت ایڈی سے اس سچ پر گفتگو کرنا گویا صبرہ کی برداشت کا امتحان تھا۔ وہ کچھ بھی کہہ سکتا تھا، اس نے بے اختیار شفق کا ہاتھ دبا کر اسے بازو سے لٹکایا تھا۔

”بھئی ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کی نظر میں ہو۔“ ٹوبان کی مسکراہٹ بے وجہ نہیں تھی۔ صبرہ کی اٹھتی نگاہ ویومر میں ایڈی کی مسکرائی نظروں سے جا لگرائی تو پہلو میں پائل کا سا احساس پا کر صبرہ نے فی الفور نظر کا زاویہ تبدیل کر لیا۔  
”اور جو میری نظر میں ہو وہ تو کوئی نایاب ہستی ہی ہو سکتی ہے۔ تو میں کیسے اسے کھونے کا رسک لے لوں؟“

اس کا چہرہ ہر سکون مسکراہٹ کی زد میں تھا۔ صبرہ کا رہا سہا سکون بھی غارت ہو گیا۔ وہ خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ نہ تو ایڈی نے اس سے اصرار محبت کیا تھا اور نہ ہی ایسا کچھ ظاہر کیا تھا۔ پھر بھی اس کی

باتیں اور نظروں کا تصادم ہر لمحہ اسے خود میں سنسنے پر مجبور کر رہا تھا۔  
”یہ نئے دور کا مجنوں ہے۔ پتہ ہے کچھلے وہ سالوں سے لیلیٰ کے پیچھے پتھر کھا رہا ہے اور مزے کی بات یہ کہ لیلیٰ کو خبر بھی نہیں۔“ ٹوبان اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

”تم ذرا اپنی خبر رکھو! ابھی جب گھر جا کر اس گاڑی میں سے برآمد ہو گے تو تم پر کسی سنگ باری ہوگی۔“ اس موضوع کی طوالت صبرہ کو خلیان کا شکار کرنے لگی تو اس نے فوراً ہی ٹوبان کی توجہ زیر غور مسئلے کی طرف مبذول کر کر موضوع بدلنے کی سعی کر ڈالی۔  
ایڈی کی ویومر میں اس پر اٹھنے والی مسکرائی نگاہ بہت بے ساختہ تھی۔

”ذیر سسر! ابھی ہم اپنے گیٹ پر اتر جائیں گے اور ویسے بھی ہم باطل سے ڈرنے والے بالکل بھی نہیں ہیں۔“ وہ مزے سے بولا تو زارا نے جھلکا کر کہا۔  
”تم صرف آغا جان کی چھڑی کی مار سے ڈرنے والے ہو اور ابھی دیکھنا میں گاڑی رکھتی ہی ہنگامہ کھرا کر دوں گی۔“

”بس یہی آواز سننے کی خاطر تو میں اس گاڑی میں بیٹھا ہوں۔“ وہ بدو کہتے ہوئے وہ ڈیش بورڈ بجا کر گنگنانے لگا۔

”آواز وہ جادو سا جگاتی ہوئی آواز مدھوش دل و جاں کو بناتی ہوئی آواز کلیوں کے چنچنے کی صدا ہم نے سنی ہے شیشے کے ٹکھنے کی صدا ہم نے سنی ہے بلبل کے چہلنے کی صدا ہم نے سنی ہے لیکن وہ کہاں ہوش اڑاتی ہوئی آواز مدھوش دل و جاں کو بناتی ہوئی آواز آسمان پر چھائی سیاہی سے جھلکتی صبح کے ہلکے ہلکے نور کی چادر تلے رات کے سنائے میں اس کی آواز کا دلکش زیر و بم لطف دے گیا تھا۔ خود زارا شیشا کر چپ

ہو رہی تھی۔  
”ویری گد بہت اچھے۔“

ٹوبان کے خاموش ہوتے ہی شفق نے اسے سراہا تھا۔

”زارا! کسی غلط فہمی میں مت رہنا! کل کے بعد یہ نظم بالکل بدل جانے والی ہے۔ پھر یہ کہے گا، جھگی بلی نے شوہر کو ڈرائی ہوئی آواز۔“ ایڈی نے ہنسنے ہوئے کہا تو ٹوبان اس پر خفا ہونے لگا۔  
”کم از کم آج تو آزادی کا جشن منا سکتا ہوں نا۔ کل کے بعد سب سے پہلے گھر میں تیرا آنا جانا ہی بند ہونے والا ہے۔“

”بہت فضول ہیں یہ لوگ۔“ زارا تنگ آ گئی تھی۔ اور پھر اس نے ایسے ہی کیا۔ خود اپنے گیٹ سے کچھ پہلے ہی اتر گیا۔

”تمہارے دینا احتجاجا مارچ پاسٹ کرتا میرج ہال سے گھر تک آیا ہوں۔ میری آزادی سلب کی جا رہی ہے۔“

ایڈی نے اسے مشورہ دیا جس پر اس نے فوری طور پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”بہت فضول شخص ہو تم۔ میری موجودگی میں تم اسے ایسے شرانگیز مشورے دینے جا رہے ہو۔“ گاڑی آگے بڑھتے ہی زارا نے ایڈی کی گردن تاپی تھی۔

”مشکل میں دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔“ وہ ہنسا تھا۔

تمام گاڑیاں گھر پہنچ چکی تھیں۔ سب سے آخر میں ان کی گاڑی پہنچی تھی وہ سیدھا گاڑی کو پورچ میں لے آیا۔ وہ تینوں پیچھے اتریں، ایڈی بھی آج آف کرتا انیشن میں سے چابی کھینچتا نیچے اترنے لگا تھا، جانے کیسے بے احتیاطی سے اس کا بازو گاڑی کے مٹھے دروازے سے رگڑ کھا گیا تھا۔ درد کی شدید لہر نے اسے ہونٹ بھینچنے پر مجبور کر دیا۔

”کیا ہو ایڈی؟“ زارا پریشان ہوئی تھی۔

”اوہ گاڑ۔“ اس کے بازو پر پھیلنے والی خون کی سرخی صبرہ کو دہلا گئی۔

”یہ کیا ہوا ہے؟“ انکل تیزی سے اس کی طرف بڑھے تھے۔

”یونہی انکل، دروازے سے رگڑ لگ گئی۔“ وہ انہیں ٹالنے لگا مگر آغا جان نے اسے ڈانٹ دیا۔  
”تمہیں ضرورت ہی کیا تھی ڈرائیونگ کرنے کی۔ بالکل تازہ زخم ہے بازو کا۔ پتہ ہے بے احتیاطی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔“

”درد تو بالکل نہیں ہو رہا آغا جان! بس رگڑ لگنے سے بلیڈنگ شروع ہو گئی ہے۔ میں ابھی بینڈیج تبدیل کر لیتا ہوں۔“ وہ اب بھاگنے کو پر تول رہا تھا۔  
”چلو! میں خود ٹوبان سے کہتا ہوں جا کر۔“ انکل اسے ساتھ لے گئے تھے۔

”میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔“ زارا نے جھرجھری لے کر کہتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھائے تو وہ بھی مردہ دلی سے اس کے ساتھ بڑھ گئی۔

”مجھے بھی خیال نہیں رہا کہ زخمی بازو کے ساتھ وہ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔“ شفق کو اپنی کند فہمی پر افسوس ہوا تھا۔

”اس لڑکے کو یوں بھی ایسی بہادریاں دکھانے کا بہت شوق ہے۔ اسے تو کسی بہت مضبوط دل والی لڑکی سے شادی کرنی چاہئے۔“ زارا نے مسکرا کر کہا تھا۔

شدید تکان کے باوجود نیند کی کہ انہیں رہی تھی۔ وہ تنگ آ کر اٹھ بیٹھی۔ زارا اور شفق بے سدھ پڑی تھیں۔

ایک وہی احساس ندامت کا شکار بنی وحشت کے گھبراؤ میں تھی۔ اسے اب شدت سے اپنی سابقہ غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا جو وہ ایڈی کے کردار کے حوالے سے کرتی چلی آئی تھی اور اس کے باوجود وہ ہر مشکل مرحلے میں بلا تھجک اس کی مدد کو آگے بڑھا تھا۔



یہاں تک کہ کل شہباز گردیزی سے بھی بھر گیا۔ وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ ایڈی کی بونی وری سے باہر شہباز گردیزی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی، ماسوائے خود صبرہ والے قصے کے۔

”کس قدر ذلالت کی بات ہے کہ ایک شخص میری خاطر موت کی حدوں کو چھو آ یا اور مجھے اس بات کا کوئی احساس ہی نہیں۔ یا خدا! میں کیا کروں کہ میرے دل پہ دھرا یہ ندامت کا بوجھ ہٹ جائے؟“ وہ بے چینی و اضطراب کے کھنور میں غوطہ زن تھی۔

ایڈی سے کہے تمام فضول الفاظ بے دریغ اس کی کردار نشی کرنا اسے جھوٹا اور دھوکے باز کہنا۔ تمام کچھ اسے تمانچے کی طرح اپنے منہ پر پڑتے محسوس ہو رہا تھا۔

پتہ نہیں کس خیال میں وہ سنٹنگ روم میں چل آئی۔ لائٹ آن کرتے ہوئے اس نے لحظہ بھر کو نہیں سوچا تھا کہ اگر اس وقت آئی وغیرہ میں سے کوئی اسے یوں دیکھ لے تو کیا سوچے گا۔

ایڈی کا موبائل نمبر اس کے پاس کبھی بھی نہیں رہا تھا مگر اس نے ٹوبان کے موبائل پر کال کر لی۔ وہ بلا جھجک اس سے ایڈی سے بات کرانے کا کہنا چاہتی تھی مگر شومی قسمت کہ کال ایڈی ہی نے ریسپونڈ کی تھی۔

”کون ایڈی؟“ دوسری طرف سے ایڈی کی آواز سن کر اس نے واضح طور پر اپنے ریسپونڈ کو تھانسنے والے ہاتھ میں پکیپا ہٹ محسوس کی تھی۔

”جی، مگر آپ کون ہیں؟“ سی ایل آئی پر واضح طور پر زارا کا فید کیا ہوا نام آیا تھا مگر آواز زارا کی نہیں تھی سو اس کی حیرانی واجب تھی کہ اس قدر وثوق سے اس کا نام لینے والا کون ہے۔

”میں صبرہ ہوں۔“ اسے متعارف ہونے کے لیے اپنی تمام تر ہمت جمع کرنا پڑی تھی۔ اور اس کے جواب میں جھاننے والی چند ثانویوں کی خاموشی بھی بہت اچھی طرح محسوس ہوئی۔

”خیریت؟“ حیرت کے پہلے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد وہ اب تشویش بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”میں تمہاری طبیعت کا حال معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز نرم ہوئے گی۔ بھلا اس شخص کے احسان کا بدلہ کی طور چاکیا جاسکتا تھا؟

”مجھے کیا ہوا ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بلکہ ابھی میں ٹیرس پر پہل قدمی کرتے ہوئے خود کو زیادہ بہتر محسوس کر رہا ہوں مگر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ٹوبان کا موبائل میرے پاس ہے؟“ لاپرواہی سے کہتے ہوئے اس کے لہجے میں تجسس درآ گیا تھا۔

”اگر ٹوبان کے پاس بھی ہوتا تو میں اس سے تم سے بات کرانے کا کہہ دیتی۔“ اس نے رخساروں پر آجانے والے آنسوؤں کو انگلیوں کی پوروں سے جھٹکا تھا۔

”تم رورہی ہو صبرہ؟“ وہ سنجیدہ تھا۔

”نہیں۔“ اس سے بولنا نہیں گیا تھا۔

”تم رورہی رہی ہو اور جھوٹ بھی بول رہی ہو صبرہ۔ کیا بات ہے؟ کھل کر کہو۔“ اس نے مضبوط لہجے میں اپنی بات دہرائی تو وہ جیسے تھک سی گئی۔

”میں بہت شرمندگی محسوس کر رہی ہوں ایڈی۔ آج تک آنکھوں پر خود ساختہ نفرت کی جی بائمرھے میں نے حقیقت کو محسوس کرنے کی بھی کوشش ہی نہیں کی۔ ہر موقع پر تم سے بدگمانی برتی مگر تم نے پھر بھی اچھے دوست ہونے کا حق نبھایا حالانکہ ہمارے درمیان کبھی یہ رشتہ نہیں رہا پھر بھی تم نے اس رشتے کے تقاضے نبھائے۔ میں خود کو بہت چھوٹا محسوس کر رہی ہوں ایڈی، تم چاہتے ہو کہ میں کوئی معذرت نہ کروں لیکن میں جانتی ہوں کہ اگر میں نے تم سے معذرت نہیں کی اپنی تمام غلطیوں اور بدگمانی کی تو میں کبھی بھی اپنے آپ سے نظریں نہیں ملا سکتی گی۔ میں جانتی ہوں کہ کس وجہ سے تم نے شہباز گردیزی سے جھگڑا کیا

ہے۔ میں نے تو کبھی بھی تمہیں صحیح نہیں سمجھا تھا ایڈی“ پھر بھی تم نے میری خاطر یہ گولی تمہاری جان بھی تولے لی تھی۔ پتہ نہیں کیسی بے چینی اور ندامت میرے دل کو کھینچ لے لیے ہوئے ہے ایڈی۔ مجھے لگ رہا تھا اگر میں نے تمہارے سامنے اپنی غلطیوں کی اپنی بدتمیزیوں کا اعتراف نہیں کیا تو شاید میں عمر بھر اسی اضطراب میں گھری رہوں گی۔“ وہ رورہی تھی۔

اس شخص کے سامنے جس کے سامنے شکست کا اعتراف کرنا اسے ذلت لگتی تھی۔

مگر اب اسی شخص کے سامنے رو کر اسے اپنے دل و دماغ پر سے ندامت کا بہت سا بوجھ ہٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”صبرہ صبرہ۔ پلیز خود کو سنبھالو۔“

”میں تم سے معافی مانگتا چاہتی ہوں ایڈی۔ خدا کے بعد تمہیں نے مجھے ذلت کے اس عمیق کڑھے میں گرنے سے بچایا ہے۔ اگر تم میری بدتمیزی اور بدزبانی کے باوجود میری مدد نہیں کرتے تو مجھے ٹریپ ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔“

وہ نڈھال ہو رہی تھی۔ وہ لب بھینچے اس کی دل گرفتہ باتیں سن رہا تھا مگر ایک مرتبہ بھی اس نے صبرہ کو نہیں ٹوکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو جانا ہی اس کا سب سے بہترین علاج تھا۔

جس صورت حال سے وہ ٹریپ ہوتے ہوئے پچی تھی وہ واقعی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اگر کسی طور وہ ایک بار بھی سطوت آرا کے ہتھے چڑھ جاتی تو تمام عمر کے لیے عزت کی زندگی گزارنا ایک خواب سا بن کر رہ جاتا۔

”اٹس اوکے“ اگر اس طرح تمہارے دل کو سکون ملتا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں نے تمہاری معذرت سن بھی لی اور قبول بھی کر لی ہے۔ حالانکہ میں نے کبھی بھی تمہاری طرف سے اپنے دل میں کوئی ایسی بات کوئی

بغض نہیں رکھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم بہت بہترین لڑکی ہو، اگر میرا الٹیج تمہاری نظروں میں خراب نہیں ہوتا تو تم کبھی بھی مجھ سے اتنے بُرے تعلقات نہیں رکھتیں۔ کیوں کہ تم ایسی لڑکی نہیں ہو جو خواہ مخواہ کسی سے ذاتی عناد رکھتی پھرے۔“ وہ نرمی سے کہتے ہوئے رکا تھا پھر قدرے توقف کے بعد سنجیدگی سے بولا۔ ”اور جہاں تک میری اچھائی کی بات ہے تو صبرہ! انسانیت کا درد رکھنے والے تو کسی کو بھی مشکل میں دیکھ کر اس کی مدد کرنے کو آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر رشتہ داری یا دوستی و دشمنی نہیں دیکھی جاتی۔ اور ایک بات جو میں نے آج تک تم سے صرف اسی وجہ سے نہیں کہی تھی کیوں کہ تم کبھی بھی میرے کردار کی طرف سے مطمئن نہیں رہیں وہ یہ کہ میرا تمہاری اتنا بدگمان رہنے کے باوجود تمہارے پیچھے خوار ہونا صرف اس وجہ سے ہے کہ مجھے تمہارے کردار کی چٹنگی اور صاف ستھری سوچ نے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ جانے کب اور کیسے حمایت اور مخالفت کے چکر میں تقریریں کرتے اتنے گولڈ میڈلز جیتنے کے بعد بھی میں ہارتا چلا گیا۔ وہ بھی ایک ایسی لڑکی سے جو ہمیشہ ہی مجھے اپنا دشمن اول قرار دیتی رہی ہے۔ اور جسے نہ تو کسی پر اعتبار کرنا آتا ہے اور نہ ہی آنکھیں پڑھنا۔“

اس کا دل جیسے پلساں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہونے لگا۔ اپنے سے بھائی بھیلی میں تمہارا ریسپونڈ جھٹکے لگا تو اس نے جلدی سے لائن ڈراپ کر کے ریسپونڈ کریدل پر بھادیا۔

وہ اس وقت خود بھی اچھی طرح اپنی ہوائیاں اڑتی محسوس کر سکتی تھی۔ اس کے ہاتھوں بیروں میں عجیب سی سنسانہٹ دوڑ رہی تھی۔

دشمنی سے ہٹ کر دوستی پر آنے اور اب یکجہت ہی اپنائیت اور لگاؤ کے اس غیر متوقع اظہار نے اس کی دھڑکنیں اٹھل پھٹھل کر دی تھیں۔ اس نے سرد ہوتے



باتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر کچھ بخنے کی کوشش کی۔  
 ”تو زارا کا کہنا غلط نہیں تھا۔“  
 اس کا دل اتھا گہرا یوں میں ڈوب کر ابھرا تھا۔



وقار علی کو ویک اینڈ سے دو روز پہلے گھر میں دیکھ کر وہ خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت کا بھی شکار ہوئی تھی۔ وہ سوری تھی جب وہ آیا۔ کھٹکے کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تو وقار علی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔  
 ”آپ کب آئے؟“ وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ کرسی میں دھنسا پیروں کو جوتوں سے آزاد کر رہا تھا۔  
 ”فون بھی نہیں کیا اور ابھی آپ کی چھٹی بھی نہیں تھی۔“

”تو کیا کروں واپس چلا جاؤں؟“ وہ اس قدر تپتی سے بولا تھا کہ ایک پل کو تابندہ بھی بولنا بھول گئی۔  
 ”کیا بات ہے وقار خیریت تو ہے نا؟“ اس کے دل کو کوئی اوہام نے گھیرا تھا۔  
 ”خیریت! طینان! سکون! یہ سب رہائی کہاں ہے میری زندگی میں۔“  
 وہ بہت غصے میں لگ رہا تھا۔ تابندہ تھیر میں مبتلا ہونے لگی۔

”کچھ بتائیں تو سہی۔ ہوا کیا ہے؟“  
 وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پتھر لیے تاثرات اس لمحے تابندہ کو بے حد اجنبیت کا احساس دلارہے تھے۔

”میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ اس حویلی کے کچھ اصول، کچھ ضوابط ہیں تابندہ جن کی پاسداری کرنا تمہارے لیے فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔“  
 وہ بحر تھیر میں غرق ہونے لگی۔

”میں نے ایسا کیا کیا ہے جس سے اس گھر کی عزت پر کوئی حرف آیا ہو یا پھر کوئی اصول ٹوٹا ہو؟“  
 اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔  
 ”احسن ملک یہاں کیا کرنے آیا تھا۔ وہ بھی میری

غیر موجودگی میں؟“ وہ جھنجھٹے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔  
 تابندہ خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس پوچھ بگچھ کا پس منظر بخنے کی کوشش میں اس کا ذہن ناکام رہا تھا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“  
 ”تم بچی نہیں ہو کہ میرے سوال کو سمجھ نہیں پا رہیں۔ میں پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں احسن ملک کو یہاں بلانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟“  
 ”اول تو یہ کہ میں نے اسے نہیں بلایا تھا بلکہ وہ خود مجھ سے ملنے آیا تھا۔ دوسرے یہ کہ آپ کو اس بات پر کیا اعتراض ہے؟“

اسے وقار علی کی بات پر شاک پہنچا تھا۔  
 وہ تنگنا ہوا چلیوں پر ہاتھ جمائے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اسے گھورتے ہوئے غصے سے بولا۔  
 ”جیسے یہ اعتراض ہے کہ وہ شخص میری غیر موجودگی میں اس گھر میں کیوں آیا تھا اور تمہیں اس کے ساتھ اتنی آزاد روی سے ملنے کی اجازت کس نے دی ہے؟“

تابندہ کو لگا بہت سے شے اس کے گرد و پیش میں ٹوٹے ہوں۔ اعتماد کے یقین کے مان اور بھروسے کے۔ اور ان ٹوٹے شیشوں کی کچھ کرچیاں شاید اس کی آنکھوں میں بھی جا پڑی تھیں تو نکلخت اس کی نگاہ دھندلائی گئی تھی۔

”اس میں پابندی والی کوئی بات تو نہیں وقار۔ وہ میرا کزن ہے۔“

وہ اس سے تیز لہجے میں بولا۔  
 ”پابندی ہے تابندہ نیگم میری طرف سے پابندی ہے۔ وہ صرف تمہارا کزن نہیں بلکہ تمہارا منگیتر بھی رہ چکا ہے۔“

اس کی دماغی نہیں جیسے تن ہی گئیں۔  
 اس قدر گھٹیا سوچ  
 یا خدا یہ کیسی پُر ازیت ساعتیں ہیں۔ بد اعتادی کا

کیا روپ ہے جو اس قدر محبت کرنے والے شخص کی صورت میرے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔  
 ”میں اس سے منگیتر والے رشتے سے نہیں ملتی تھی وقار۔ وہ میرے میکے سے پہلی بار آیا تھا اور تم ایسی گھٹیا باتیں۔“  
 وہ جھنجھٹا۔

اس قدر ذلت و اہانت سے پُر الفاظ برداشت کرنے کی مزید سکت اس میں باقی نہیں رہی تھی۔ مگر وہ اس اونچے لہجے میں اس کی بات کاٹ کر درشتی سے بولا۔

”وہ چاہے پہلی بار آیا ہو یا آخری بار مگر مجھے اپنی بیوی کا غیر کے شانے پر سر رکھ کر اپنا دکھ بانٹنا گوارہ نہیں۔ میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں کہ اپنی بیوی کو اتنی بے باکی کے ساتھ اس کے سابقہ منگیتر سے ملتے ہوئے۔۔۔۔۔“

”تمیز سے بات کریں وقار میں بیوی ہوں آپ کی کوئی زرخیر غلام نہیں جس کے ساتھ آپ جس لب و لہجے میں چاہے بات کرتے پھریں۔“  
 اس کی پیشانی پر جیسے کسی نے جتنی سلاخ رکھ دی تھی۔

اس کے انداز نے لحظہ بھر کو وقار علی کو ٹھنکادیا۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی۔

”جانتی ہوں میں کہ کس نے آپ کے کان بھرے ہیں مگر آپ تو مجھ سے نہیں ہیں۔ آپ تو مجھے انجھی طرح جانتے ہیں پھر آپ کی یہ سب باتیں کرنے کی بہت بھی کیسے ہوئی۔ اگر احسن کی میری نظر میں کوئی ایسی حیثیت ہوتی تو میں کبھی بھی آپ کے لیے اسٹینڈ نہ لیتی۔ اور آج آپ دوسروں کی باتوں میں آ کر مجھ پر الزام تراشی کر رہے ہیں۔ یہ بات بھول کر کہہ آپ کی خاطر میں نے احسن کو ٹھکرا دیا تھا۔“

”تم نے اسے ٹھکرایا تھا تابندہ وہ کن جذبات کے ساتھ تم سے ملنے یہاں آیا تھا کیا تم اس کے دل کی

بات جان سکتی ہو؟“  
 وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ تابندہ کا سر چکرانے لگا۔  
 یہ وقار علی ہے اس قدر تنگ ذہن گندی سوچ کا مالک۔

”بس! بس کریں وقار اور کتنے زیادہ گریں گے میری نظر سے۔“ وہ ٹڈھال ہو گئی۔ یقین کے جھنڈا اختیار کی تمام خوش رنگ تلبیاں اس کی مٹھیوں سے پھسل گئی تھیں۔ پھولوں کی روش پر چلتے چلتے وہ جیسے تپتے صحرا میں نکل آئی تھی جہاں ہر طرف دل و جان کو راکھ کر دینے والی تیز دھوپ بھی کوئی مہربان سایہ دور دور تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔

”شٹ اپ تابندہ میں تمہیں ایک سیدھی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور تم بکواس کر رہی ہو۔“ وقار علی کا جیسے دماغ الٹ چکا ہو۔

ابھی تو یہ اور بے جی کی زبانی جو کچھ سن کر وہ آ رہا تھا اس نے وقار علی کی آنکھوں میں خون اتار دیا تھا۔  
 احسن ملک کا اس کی غیر موجودگی میں آنا اور تابندہ کا اتنی بے تکلفی سے اس سے ملنا اور تنہائی میں محو گفتگو رہنا اس کی غیرت پر تازیانہ بن کر لگا تھا۔

”کیا سیدھی بات سمجھا رہے ہیں آپ؟ آپ تو صرف مجھ پر دفعہ عائد کرنے آئے ہیں۔ میں اتنی ہی بُری تھی آپ کی نظر میں تو مجھ سے شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اب آپ کو مجھ میں خامیاں دکھائی دینا شروع ہو گئی ہیں آپ بھی تو میرے لیے غیر تھے تب میں آپ سے بھی ملتی تھی۔ اس وقت آپ میں یہ غیرت کیوں نہیں جاگی تب آپ کو کسی کی عزت کا خیال نہیں آیا تھا؟“

وہ جھنجھٹ کر رہ گئی۔ آنسوؤں نے اس کا چہرہ بھگو دیا تھا۔

”وہ تمہارا مسئلہ تھا تابندہ۔ اگر ایک لڑکی اپنے والدین سے چھپ کر مجھ سے ملتی ہے تو اس میں میرا کیا جاتا ہے۔ بنیادی بات ہوتی ہے لڑکی میں اپنی عزت



بنا کر رکھنے کا احساس ہوتا۔ اگر تمہیں ہی اپنے گھر والوں اور اپنی عزت کا احساس نہیں تھا تو مجھے کیا پروا تھی۔  
بس اسے لگا جیسے یہی قیامت کا لمحہ ہو۔

اندر کا شوراں قدر بڑھ گیا کہ سائیں سائیں کرتی سماعتوں کے ساتھ وہ بے حد بے یقینی سے وقار علی کے بولنے ہونٹوں کو دیکھ رہی تھی مگر آواز نہیں سن رہی تھی۔ ابھی سورج دھڑی پر اتر آئے گا پہاڑ دھکی ہوئی روئی کی طرح اڑنے لگیں گے۔

اسے لگا وہ اپنے بد اعمالی کی پاداش کے نتیجے میں دوزخ کے سیاہ بھڑکتے آلاء میں ڈال دی گئی ہو اور اب اس کی سزا شروع ہو گئی ہو۔ اس کے بالوں کو رسی سے باندھ کر پھینچو اس کے وجود کو شکنے میں اتنی سختی سے کس دو کہ اس کی تمام ہڈیاں آپس میں غلط ملط ہو جائیں۔ اس کی سماعتوں میں پکھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے اس کے حلق میں کانٹے اتار دیئے جائیں اس کے وجود کو تیز دھار خنجر سے کاٹ ڈالو۔ وہ ان تمام عذابوں کو بہت اچھی طرح محسوس کرتے ہوئے حواس سے بے گانہ ہو گئی تھی۔

اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

”کیا بات ہے وقار۔ اتنی جلدی تمہارا جنون ختم ہو گیا؟ جذباتی محبت کا نشہ اتر گیا؟“ بھایا اس پر سخت خفا ہو رہے تھے۔ وہ سر جھکا بے بیگانگی کی سخت سن رہا تھا۔

”دن کتنے ہوئے ہیں تمہاری شادی کو کہ تم نے لڑنا جھگڑنا بھی شروع کر دیا ہے آپس میں۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ عملی زندگی میں جذباتیت کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔“

”بھایا میں اسے صرف سمجھا رہا تھا۔“ وہ مدہم آواز میں بولا۔ کچھ بھی ہوتا بندہ کی گڑنی حالت نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اشتعال کا طوفان تھا تو وہ خود کو

کوس کر رہ گیا۔

”جانتا ہوں میں۔ مگر تم اپنے ذہن سے بھی سوچنا شروع کرو۔ عورتوں کی سیاست کا شکار بن کر اپنی ازدواجی زندگی کو داؤ پر مت لگاؤ۔ نہ تو تابندہ تمہارے لیے غیر ہے اور نہ اچھی۔ میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا وقار عورت کے لیے عزت نفس اس کی اہمیت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ بھی بھی اپنی بیوی کی عزت نفس کو نہیں پہنچانے کی غلطی مت کرنا۔“

صدیقہ بھائی کی وساطت سے وہ بہت کچھ جان اور سمجھ چکے تھے۔ ماں کے سامنے تو وہ کچھ کہہ نہیں پاتے تھے مگر اعزاز علی سے انہوں نے فوزیہ کو سمجھانے کا ضرور کہا تھا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا بھایا۔ اور اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں کسی کے لیے میں آ کر تابندہ ہوں جھگڑا کر رہا تھا تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ اس کا اپنے سابقہ منکبہ سے ملنا مجھے بالکل بھی گوارا نہیں ہے۔“ وہ لب بلیغ گیا تھا۔ بھایا متا سفاہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے پھر تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

”اپنا لہجہ درست کرو وقار۔ تم اپنی بیوی کے متعلق بات کر رہے ہو کسی غیر کے بارے میں نہیں۔ کوئی بھی دوسرا شخص نہیں بلکہ بعض اوقات ہماری سوچ غلط ہوتی ہے۔ اور تم تابندہ کے متعلق بہت غلط سوچ رہے ہو۔ میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ تم اسے آزمائش کی بنیاد میں اتار رہے ہو مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ پہلی آزمائش تمہاری ہی طرف سے ہوگی۔“

”میں اسے غلط نہیں کہتا بھایا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ اپنے شہری طرز زندگی کو بھول کر اس حوالہ کی روایت اپنالے۔ یوں اپنے کزن کے ساتھ تہائی میں جو گفتگو ہونا چاہیے پسند نہیں اور نہ ہی اس کا منہ اٹھا کر یہاں چلے آنا۔“

جانے اسے کن لفظوں میں بہکایا گیا تھا پھر بھی بھایا نے اپنی طرف سے اسے سمجھانے میں کوئی کسر اٹھا

نہیں رکھی تھی۔ اور وہ بھی سر جھکائے یوں سنتا رہا جیسے اب ہر قدم ان کی نصیحت کے مطابق اٹھانے کا ارادہ ہو۔

فوزیہ بہت اطمینان سے بستر پر نیم دراز غصے کے عالم میں پیڑوں کی طرح کمرے میں ادھر ادھر ٹپکتے اعزاز علی کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔

مجھے جلتے تو ہے پر بٹھا کر سب بہت سکون میں تھے۔ اب خود پر ذرا سی آج آئی تو سب ہی سلگنا شروع ہو گئے ہیں۔ وہ اس کے سامنے تھم گیا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس طبیعت کی عورت ہو۔ تمہیں ذرا سی بھی شرم نہیں آئی وقار کے سامنے اس طرح کی بکواس کرتے ہوئے کچھ اپنے رتبے ہی کا لحاظ کر لیتیں۔“

اس کی آنکھوں میں اتنی سرخی، بھینچا ہوا لہجہ پیشانی کے بل کچھ بھی فوزیہ کے لیے پریشانی کا باعث نہیں تھے بلکہ کچھ میں اتنی ٹھنڈک پڑ چکی تھی کہ اب اعزاز علی کے غصے کی پیش بھی اسے باؤسیم کے جھوٹے کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔

”ہم نے تو جو دیکھا وہ دیوری کو بتا دیا۔ اب آپ ہی بتائیں کون سا شوہر برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی بیوی غیر مرد سے اتنی بے تکلفی برتے؟ ایک ہم ہیں کہ جس نے اپنے شوہر کے سامنے اتنے بے اختیار نہیں ہوئے جیسا کہ دیواری جی اپنے سابقہ منکبہ کو دیکھ کر ہو رہی تھیں۔“ وہ اپنے مخصوص تسمن و طنز سے بھرپور انداز میں کہتی اعزاز علی کو اپنا ضبط آزمانے پر مجبور کر گئی۔

”گھر اس طرح نہیں بنائے جاتے فوزیہ۔ اس طرح کی غیبت اور چغلیاں گھروں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔“

وہ جیسے تپ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا۔ میں نے خود سے گھر کر

یہ سب وقار علی کو بتایا ہے؟“  
”میں یہ نہیں کہہ رہا۔ مگر تمہارا طریقہ بالکل غلط تھا۔“ وہ اب بھی نرمی سے کہہ رہا تھا۔

”مسٹر اعزاز علی! وقار علی کو بے جی نے فوری نوٹس پر بلوایا تھا۔ انہی کو تابندہ بیگم کے چھن ٹھیک نہیں لگے تھے اور وقار علی کو ہر بات سچ سچ بتانے کا سہرا بھی انہی کے سر جاتا ہے۔“ وہ بھڑک اٹھی تھی۔ پھر قدرے توقف کے بعد غصے سے بولی۔ ”جب بات گھر کی عزت اور مردوں کی غیرت پر آجائے تو پھر لا پرواہی نہیں برتی جاسکتی۔ غضب خدا کا تمام ملازما میں وہاں موجود تھیں ہر کسی نے وہ بے حیائی دیکھی۔ اب کسی کو کیا پتہ کہ دونوں میں کیا رشتہ ہے۔ اس کے بعد دو گھنٹوں تک اکیلے بیٹھ کر پیس مارتے رہے پھر سچ گیا کیا۔ ہم میں سے تو کسی کو جھوٹے منہ نہیں پوچھا تابندہ بیگم نے۔ شاید ڈسٹر بنس کے خیال سے۔“

وہ معنی خیز انداز میں آنکھیں گھماتے ہوئے بولی تو اعزاز علی کی کپنیاں سلگ اٹھیں۔

”بکواس مت کرو فوزیہ اب اگر تم نے بھائی کے متعلق ایک بھی فضول بات کہی تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔“

مارے اشتعال کے اس کی رنگت سرخ ہو گئی۔ آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا ہو۔ اگر وہ تمام صورت حال سے انجان ہوتا تب شاید اس کا رد عمل اتنا شدید نہ ہوتا مگر صدیقہ بھائی نے اس سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔

”ارے واہ آپ کے دل میں بہت درد جاگ رہا ہے بھائی کے لیے۔ اور جو اسے بھگا کر لائے ہیں وہ خواہ خواہ تپے پھر رہے ہیں۔ اتنا اعتماد تو انہیں ہونا چاہئے اعزاز صاحب۔ ہم کہیں خیریت تو ہے نا خدا خواست۔“

وہ بڑی شرارت سے مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اعزاز علی نے دانتوں پر دانت بجا کر بمشکل غصہ



ضبط کیا تھا۔ پھر قدرے سنبھلنے کے بعد متاسفانہ انداز میں بولا۔

”بے حد گھٹیا ذہنیت ہے تمہاری فوزیہ۔ تمہیں نہ تو کسی رشتے کی عزت کا پاس ہے اور نہ ہی اپنی عزت کا۔ تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ شوہر سے کیسے بات کی جاتی ہے۔“

”اب آپ سے ہم کو اتنی بھی محبت نہیں ہوئی کہ خوش اخلاقی اور تمیز کی کلاسز جو ان کرنے کا جنون سوار کر لیں۔ ہم بھی تو کمپر و ماثر کر رہے ہیں آپ بھی گزارہ کیجئے۔“

وہ تفر سے کہہ رہی تھی۔ اعزاز علی کو اپنے اعصاب تنے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تمام نسیم کسی بھی بل ٹوٹ جائیں گی۔

وہ سر جھٹکتا کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ فوزیہ جیسی عورت کے ساتھ بحث کر کے انسان صرف اپنا دماغ ہی خراب کر سکتا تھا۔ جس کا انداز اب تک اعزاز علی کو بہت اچھی طرح ہو چکا تھا۔ اس عورت نے اس کی ازدواجی زندگی کو ایک امتحان بنا کر رکھ دیا تھا۔ نہ تو وہ خود خوش رہتی تھی اور نہ ہی اعزاز علی جیسے سادہ مزاج بندے کو مطمئن رہنے دیتی تھی۔

وہ آکر وقار علی پر آٹ بڑا۔

”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی بھانجی سے یہ سب فضول باتیں کہنے کی؟“

اے ہے اعزاز میاں! کیوں ہوا کہ گھوڑے پر سوار ہو۔ ذرا دم تو لو۔“ بے جی نے اسے ٹوک دیا تھا مگر وہ وقار علی کی طرف متوجہ تھا جو خاموشی سے بے جی کے قریب موڑھے پر بیٹھا تھا۔

”دیکھو اعزاز! تم لوگ خواہ خواہ بات کو غلط رخ دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ بہو کو اس حویلی کی عزت اور اقدار کا پاس رکھنا چاہئے۔ اس کے کزن کا یوں وقار علی کی غیر موجودگی میں بہو کے پاس آنا کسی طور بھی درست نہیں ہے۔“

بے جی کے منہ میں فوزیہ کی زبان بول رہی تھی اور کچھ اب سر پر بھی آن پڑی تھی تو اپنے کہے سے ہنمان کی شان کے خلاف تھا۔

”کیوں بے جی! کیوں درست نہیں؟“ وہ خلاف عادت اونچی آواز میں بول گیا تھا۔ ”کھر میں صرف وقار علی ہی نہیں تھا بانی سب تو موجود تھے۔ پھر اس شخص کا آنا کیسے غلط ہو سکتا ہے؟“

”وہ بہو کا صرف کزن ہی نہیں منگیتر بھی رہ چکا ہے۔“ بے جی نے اسے باور کرایا تو وہ مسکتی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

”آپ لوگوں کو یہ حقیقت تو دکھائی دے رہی ہے کہ وہ بھانجی کا سابق منگیتر ہے مگر یہ حقیقت کسی کو دکھائی نہیں دے رہی کہ اسی شخص سے رشتہ توڑ کر وہ وقار علی کے ساتھ چلی آئی تھیں۔ اگر ان کے دل میں اس شخص کے لیے کوئی جگہ ہوئی تو وہ وقار علی کی خاطر اپنے والدین کو نہیں چھوڑ دیتیں مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ وقار بھی ان کی اس قربانی کو بھول گیا ہے جو بھانجی نے اس کے لیے دی تھی۔ ہمیشہ کے لیے اپنے پیاروں کو کھو دیا ہے انہوں نے مگر اس نے ان کی قدر نہیں جانی۔ اور شخص چند بے بنیاد باتوں کے بل بوتے پر ان کے سر پر سے آسمان اور قدموں تلے سے زمین چھین لی۔ شاباش ہے تم پر وقار علی! اور آج مجھے اس قربانی پر افسوس ہو رہا ہے جو میں نے تمہاری اور بھانجی کی شادی کی خاطر دی تھی۔ اگر اس وقت میں فوزیہ کو اپنانے سے انکار کر دیتا تو آج شاید حالات کچھ اور ہی ہوتے۔“

اس کے ہر لفظ سے دکھ اور ناامیدی جھلک رہی تھی۔

جس کی خوشی کی خاطر اعزاز علی نے اپنی زندگی بھر کی خوشیاں داؤ پر لگا دی تھیں وہ آج خود اپنی مرضی سے آگ کے جلنے والا وہیں کودنے کو تیار بیٹھا تھا۔ اعزاز علی اکتا کر باہر نکل گیا۔

”پتہ نہیں سب مجھے ہی کیوں غلط سمجھتے ہیں۔ میں نے تو اپنے بچے کی بھلائی سوچ کر یہ سب اسے بتایا تھا۔ مجھے کیا جرح تھی کہ ہر کوئی مجھی کو الزام دینا شروع کر دے گا۔“ بے جی نے دوپٹے کا پلو منہ پر ڈال کر رونا شروع کر دیا تو وقار علی اپنی پریشانی بھول کر انہیں سنبھالنے لگا۔

وہ کمرے میں آیا تو صدیقہ بھانجی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

وقار علی نے ان کی ناراضگی کو شدت سے محسوس کیا تھا مگر فی الوقت تو وہ تاباندہ کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس نے دیکھا وہ آنکھوں پر بازو رکھے شاید سو رہی تھی یا پھر اسے دیکھ کر خود کو سوا ہوا ظاہر کر رہی تھی۔

اسے پشیمانی کا تند و تیز احساس اپنی لپٹ میں لینے لگا۔

اعزاز علی کی باتوں نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے فوزیہ اور بے جی کی باتوں پر یقین کیسے کر لیا تھا۔

کسی تھک کر بستر کے قریب کرتے ہوئے وہ آگے جھک کر بیٹھا اور نرمی سے اس کی کلائی تھام کر اس کا بازو ہٹانے کی سعی کی تو وہ ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”آتم سوری تابی! پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔“ وہ بے حد شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔

تائاندہ کی آنکھوں میں دکھ کر نہیں لینے لگا۔ نسیم میں جیسے پھر سے وہی اذیت دوڑ اٹھی جس نے اسے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا تھا۔ وہ سراپا اظہارِ ندامت بنا بیٹھا تھا۔ مگر اس نے اپنے دل میں وقار علی کے لیے ذرہ برابر بھی نرمی محسوس نہیں کی تھی۔

”مگر میں اچھی طرح جانتی ہوں وقار علی آپ کو کیا ہو گیا تھا۔“ غیر متوقع طور پر وہ بے حد صاف آواز میں بولی تھی۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ جس کے انداز و الفاظ اسے کسی عجیب سے احساس کا شکار بنا گئے تھے۔

”وہ سب آپ کے اندر کی باتیں تھیں۔ وہ تمام خیالات جو آپ میرے بارے میں رکھتے ہیں۔ اور میرا جو کردار آپ نے اپنی نظروں میں تراش رکھا ہے آپ کے نزدیک میں اب ایک ایسی ناقابل اعتبار عورت ہوں جس نے اگر آپ کی خاطر اپنے محبت کرنے والے والدین کو چھوڑ دیا تھا تو پھر کسی اور کی خاطر آپ کو بھی چھوڑ سکتی ہوں۔“ وہ عجیب سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ وقار علی نے اس پل اپنے آپ کو بہت چھوٹا ہوتے محسوس کیا تھا۔

”تم غلط سمجھ رہی ہوتی.....“

اس نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی مگر وہ اس کی بات پر توجہ دے بغیر بولی تو اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمکینی چھلکی ہوئی تھی۔

”میں بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہوں وقار۔ یہ دنیا مکافات عمل ہے میں نے اپنے جان سے زیادہ محبت کرنے والے والدین کو شدید تکلیف پہنچائی تھی۔

بالکل وہی تکلیف وہی ذلت کل میں نے بھی برداشت کی ہے۔ میں محسوس کر سکتی ہوں کہ ان لوگوں پر کیا بتی ہوگی جب لوگوں نے انہیں ایسے طعنے دیئے ہوں گے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ انہوں نے اس صدمے کو کیسے برداشت کیا ہوگا، مگر خدا نے بہت جلدی یہ سب کر دیا نا! بہت جلدی۔ میں نے تو ابھی ٹھیک طرح سے تمہاری محبتوں کو برتا بھی نہیں تھا وقار کہ تم نے اپنا چولا اتار کر ایک اجنبی اور خوف زدہ کر دینے والا روپ میرے سامنے لا رکھا۔ مگر شاید یہ میری کرنی کی سزا ہے۔ یہ دنیا مکافات عمل ہے وقار۔“

اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبتی چلی گئی تھی۔ شدید ترین احساسِ ندامت اور ذلت کا شکار وقار علی پسینوں میں ڈوب گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)





## احساس

عائشہ ناز علی

خوشی ملی تو کئی درد مجھ سے روٹھ گئے  
دعا کرو کہ میں پھر سے اُداس ہو جاؤں

وہ تھکا ماندہ آفس کی سیڑھیاں اتر کے اپنے اسکوٹر کی طرف جا رہا تھا۔ چلتے چلتے اس کی نگاہیں ریڈ کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی خاتون پر گئیں۔ یہ ”وہی“ تھی یا کوئی اور.....؟ ”نہیں نہیں..... میری نگاہیں دھوکہ کیسے کھا سکتی ہیں؟ یہ وہی ہے..... اسے تو میں لاکھوں کروڑوں کی بھیڑ میں پہچان سکتا ہوں۔ مگر یہاں.....؟“ اس کے قدم از خود کار کی طرف بڑھنے لگے۔ ”مگر..... میں کیوں جاؤں اس کے پاس؟ میں کیسے جاؤں؟ کیا وہ میری صورت بھی دیکھنا گوارا کرے گی؟ وہ مجھے دھتکار دے گی، تذلیل کرے گی سب کے سامنے۔“ اس کی نظریں اطراف میں چلتے پھرتے لوگوں پر پڑیں۔ دل میں چور تھا لہذا نگاہیں چرا کے جلدی سے اپنے اسکوٹر کی طرف بڑھ گیا۔ جلدی اتنی تھی وہاں سے نکلنے کی کہ اسکوٹر اشارت کرتے ہی کافی تیزی سے پارکنگ سے اسکوٹر نکال کر انتہائی مصروف روڈ پر ڈال دی۔ یوں لگ رہا تھا کہ پیچھے کوئی بھوت پڑ گیا ہو۔ بار بار شیشے میں دیکھتا کہ کہیں سرخ

گاڑی پیچھے تو نہیں آرہی۔ خدا خدا کر کے گھر پہنچا تو گھر میدان جنگ کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ حسب معمول اماں اور رقیہ کی ٹوٹو، میں میں اسٹارٹ تھی۔ بچوں کی فوج آپس میں دھینگا مشتی اور چھیڑنا جھپٹی میں لگے تھے۔ اچھا خاصا سجا سجا یا گھر اس وقت لنڈا بازار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس نے عالم بے زاری میں ڈوبی نظر سب پر ڈالی۔

”ارے۔ آپ اتنی جلدی آگئے؟“ رقیہ اسے دیکھتے ہی اماں سے منہ ماری بھول کر پوچھنے لگی۔ ”غلطی ہوگئی۔ کیا چلا جاؤں؟“ وہ کاٹ کھانے والے انداز میں بولا۔

”بھڑکتے کیوں ہیں؟ پوچھنا خطا ہوگئی۔“ وہ جواب چلائی۔

”تم سے شادی کرنا ہی زندگی کی سب سے بڑی خطا ٹھہری رقیہ بیگم!“ اس نے صرف سوچنے پر اکٹفا کیا۔ بولنے پر رقیہ کی دودھاری تلوار جیسی زبان چلنے لگتی تو رات گئے تک کاٹ بھاڑ کرتی رہتی اور اس



وقت وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں تو کیا کسی کی شکل دیکھنے سے بھی بے زار تھا۔

”کھانا لاؤں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ میں نے آفس کیٹین میں کھالیا تھا“ میں صرف سوؤں گا..... سر میں درد ہے۔ تم ذرا ان کم بختوں کو چپ کر دو بڑی مہربانی ہوگی۔ میں آرام کرنے گھر آیا ہوں۔“ اس نے بڑی التجائی نگاہ بیوی پر ڈالی اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”اوکینوں! ذرا آرام سے مر جاؤ ادھر۔ باپ تھکا ہوا آیا ہے آرام کرنے دو۔ ارے اونا مراد کا کٹی ادھر مرنا ک صاف کروالے کم بخت۔“ وہ کمرے میں پہنچا اور رقی کی پاٹ دار آواز اس کا پیچھا کرتی رہی۔ اندر آ کے اس نے دروازہ بند کیا اور شرٹ کے بٹن کھولے پھر ٹائی کی نائٹ ڈھکی کی کپڑے بدل کر وہ بید پر نیم دراز ہو گیا۔

بارہ سالوں بعد اس کو دیکھا تھا، وہ بری طرح ڈسٹرب ہو رہا تھا، بے قرار ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر ایک بار پھر آ گیا۔ رائی بلیو کمر کی گرے بارڈر والی سازھی باندھے ہوئے تھی۔ میک اپ سے بے نیاز گلابی چہرہ یا تو قی لبوں پر ہلکے رنگ کی چمک دار لپ اسٹک لگائے ہوئے تھی۔ بالوں کا اسٹائل البتہ بدلا ہوا تھا پہلے اس کے بال شولڈر کٹ تھے اب باب کٹ تھے جو کہ اس کے حسین چہرے کے گرد بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ ڈائمنڈ کے ننھے ننھے آویزے اور گلے میں نازک سا لاکٹ کلائی میں نازک سا بریلٹ تھا۔ بڑے اعتماد سے فرنٹ ڈور کھولتی ہوئی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتی، کار اشارت کرتی نظر آتی تھی اور کار میں بیٹھ کر بڑے انداز سے ہلکے سن گلاسز بھی لگا لیے تھے۔ وہ ذرا نہیں بدلی تھی بلکہ ان بارہ سالوں میں تو اس کے حسن و دلکشی اور باوقار شخصیت میں کئی گنا اضافہ ہوا تھا۔ بلا کی جاذب نظر غضب کی جامد زیب۔

ارمان، کشف الرضی سوچتا ہوا بارہ سال پہلے کے دور میں جا نکلا جب وہ کشف ارمان تھی۔

کشف اور وہ دونوں اکٹھے پڑھتے تھے پہلے پہل بائی ہوئی پھر بات دوستی تک آئی۔ دوستی کے محبت کی شکل اختیار کی اور ارمان نے کشف کے کہنے پر اپنی ماں کو کشف کے گھر اس کا ہاتھ مانگنے بھیج دیا۔ کشف کا گھر انا ارمان کے مقابلے میں بڑا تھا۔ دو بھائی تھے کشف اس کے مقابلے میں جبکہ ارمان کی صرف ایک بہن تھی بڑی، وہ بھی شادی شدہ۔ باپ کا انتقال کافی سالوں پہلے ہو چکا تھا۔ پہلے تو ابا کی پیشکش پر ہی گھر چلتا تھا بعد ازاں ارمان نے پارٹ ٹائم نوکری کر لی تھی۔ ارادہ تھا کہ ایم اے کے بعد کوئی اچھی سی نوکری کر لے گا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ہمارے ملک میں جہاں ایم ایس سی کرنے والے بھی بے روزگاری کی چھاپ لگائے مارے مارے پھرتے ہیں وہاں ایک معمولی پبل ایئر اے کرنے والے کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ یہ تو کشف کی مہربانی تھی جس کی بدولت اس کو ایک سرکاری دفتر میں اچھی سی نوکری مل گئی تھی۔ کشف نے اپنے باپ سے سفارش کی تھی اور ہیک صاحب کے لیے اپنی چھٹی بیٹی کی بات سے انکار ممکن نہ تھا۔ انہوں نے اسے رسون کی بدولت ارمان کو نوکری دلوا دی تھی۔ تنخواہ بھی اچھی تھی اور ترقی کے چانسز بھی تھے وہ بہت خوش تھا۔ اماں حالانکہ اس رشتے پر خوش نہ تھیں وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی اپنی بہن کی لڑکی سے کرنا چاہتی تھیں۔ پھر انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ لڑکی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، امیر ہے سب سے بڑھ کر بیٹے کی پسند ہے شادی کے بعد بیٹے وہ ان کے بیٹے کو لے کر پھر نہ ہو جائے لیکن بیٹے کی ضد کے سامنے مجبور ہو گئیں۔

کشف دہن بن کے ارمان کے گھر آ گئی۔ ارمان کا چھوٹا سا معمولی گھر قیمتی جینز سے بھر گیا۔ کشف اس گھر میں کیا آئی، گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ارمان کی

بے کیف، بے رنگ زندگی میں رنگ ہی رنگ بھر گئے تھے اس کی اداس ٹائیں تھیں اور ویران کمرے میں گویا زندگی نص کر لی گئی تھی۔ کشف نے اسے اتنا پیار دیا، اتنا اس کا خیال رکھا کہ وہ نشے کی حد تک اس کا عادی ہونے لگا۔ وہ ایک ماں کی طرح سے اس کا خیال رکھتی تھی۔ وقت پر اس کا کھانا پینا، اس کی پسند و ناپسند کا خاص خیال رکھنا، اس کا ہر چھوٹا بڑا کام بھاگ بھاگ کر کرنا۔ کشف بہت ذہین، سلیقہ مند، سچی ہوئی اور موقع شناس لڑکی تھی۔ سب سے بڑھ کر وہ بے غرض، حساس اور ذمہ دار تھی۔ اس نے شادی کے بعد اپنی ہستی بھلا دی تھی۔ اپنا آپ اریان کے قدموں میں نچھاور کر دیا تھا۔ وہ یہ بھول بیٹھتی تھی کہ اس کی اپنی بھی کوئی ہستی ہے۔ اگر یاد تھا تو صرف اریان۔ اس کے دل کی ہر دھڑکن اس کے نام کی مالاچھتی تھی۔ اس کی ہر سانس اسی کی خوشبو سے بھکتی تھی۔ اس نے ارمان کو اپنا اس قدر عادی بنا دیا تھا کہ وہ اس کے بناسانس لینے کا تصور تک نہ کر سکتا تھا۔ ہر روز صبح سویرے ہی وہ اٹھ جاتی تھی، صوم و صلوٰۃ کی سخت پابندی لہذا فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک قرآن پاک سے مستفید ہوتی رہتی۔ پھر ارمان کے آفس کے کپڑے نکالتی، استری تو وہ حسب عادت پہلے ہی سے کر کے رکھتی تھی۔ طبیعت میں از حد نفاست اور صفائی پسندی تھی لہذا ہر شے کو قرینے سلیقے سے اپنی جگہ پر رکھتی تھی۔ پھر اماں کے کمرے میں جھانکتی، وہ سوری ہوئیں تو پلٹ جاتی، اگر جاگتی مل جاتیں تو ان کا ناشتہ ان کو دے آتی۔ پھر گھڑی پر وقت دیکھتی، آفس ٹائم سے تقریباً پون گھنٹہ قبل ارمان کو اٹھا دیتی۔ نیند کے خمار میں ڈوبی آنکھوں سے وہ اس کے سر پر ہاتھ کو دیکھتا، صبح کے وقت غسل کے بعد وہ ہلکے رنگ کے لباس زیب تن کرتی تھی۔ کبھی سفید، کبھی ہلکا گلابی، کبھی آسمانی، کبھی ہرا، کبھی زرد، کبھی فیروزہ، تازہ غسل اور عبادت الہی سے چمکتا صحت مند گلابی چہرہ ارمان کی نظروں کو

تراوت، بخشتا تھا۔ نفاست سے سلجھے بال، ان میں مہکتا گچھا، کسی پرفیوم کی ہلکی سی مہک، اس کے جسم کی خوشبو میں گھلتی ملتی اس کی سانسوں کو مہر کا جانی۔ کشف اپنے مخصوص انداز سے اسے جگاتی تھی اس کے سیاہ بالوں میں اپنی گداز انگلیاں پھیر کے۔ ارمان عالم مدہوشی میں اس کا نرم و نازک ہاتھ تمام لیتا تھا۔

”یہ پینا ہے تو پسٹانی رہے دے۔ مجھے ہوش میں مت آنے دے۔ اے حسن کی دیوی!..... آ..... ادھر آ..... میں تیرا چچاری تیرے قدموں میں اپنے سارے جذبے بچھا کر دینا چاہتا ہوں۔“

”بس۔ اب اٹھ جائیے جناب۔ خواب و مدہوشی کا سفر تمام ہوا، آفس کو دیر ہو جائے گی۔ تیار ہو جائیے۔“ وہ چھوٹی موٹی سی ہوجاتی اور اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہتی۔

”اوں ہوں۔ ظالم! ساری رومانیت کا ستیاناس کر دیا۔“ وہ بے مزہ ہوجاتا تو وہ ہنستی ہوئی کچن میں چلی جاتی۔ پہلے اماں تھیں تو کبھی ڈھنگ سے ناشتہ کھانا نصیب نہ ہوتا تھا اماں کو کھانے پکانے اور گھر کے دوسرے کاموں سے کوئی خاص شغف نہ تھا، بس کام چلانے والے کام کرتی تھیں۔ ناشتے میں بھی جانے ڈبل روٹی اور کبھی جیم، کبھی پاپے آگے رکھ دیتی تھیں۔ ارمان کھانے پینے کا شوقین تھا، اس سے سوھی ڈبل روٹی اور پاپے، ہضم نہ ہوتے تھے لہذا صرف دودھ کا گلاس پی کر چپ چلا جاتا تھا۔ لیکن جب سے کشف آئی تھی اس کے تو ”پیٹ کی مراد بر آئی تھی۔ وہ ناشتے میں خاصا اہتمام کرتی تھی۔ فریش موٹی پھل کا جوس، چائے، دودھ کا گلاس جس میں کبھی اوٹین اور کبھی روح افزا ملا دیتی تھی۔ گرم گرم پراٹھا اور آلیٹ یا فرانی انڈا۔ جھٹی والے روز وہ زیادہ اہتمام کرتی تھی۔ پوریاں، حلوے، پجوریاں، بھجیا اور جانے کیا کیا بنا ڈالتی تھی۔ وہ بھی خوب سیر ہو کے کھاتا تھا۔ ہاتھ میں لذت بھی بے انتہا تھی کہ کھانے والا انگلیاں



اپنے ان نازک ہاتھوں سے کام کر دے گی۔“ ارمان نے اس کے نازک ہاتھ تھام لیے۔

”تو کیا ہوا؟ وہ میرے باپ کا گھر تھا؟ میرا چچا گھر ہے ارمان۔ اس گھر کا ایک ایک کام کر کے مجھے روحانی ودی مسرت ہوتی ہے۔ پھر اپنے ہاتھوں سے کام کرنا تو اچھی بات ہے۔ ہماری اہمات اہل منہ بھی تو اپنے دست مبارک سے سارے کام انجام دیتی تھیں۔“ اس نے نرمی اور حلاوت سے مثال دے کر اسے قائل کر ہی لیا تھا۔ دوپہر تک وہ سارے امور سے فارغ ہو جاتی تھی۔ کھانا وہ دونوں وقت کا کھتا ہی بنالیتی تھی۔ دوپہر کے لیے کوئی ملکی سی غذا کہ صرف وہ اور اماں ہی تو ہوتی تھیں جبکہ رات کے لیے خاص اہتمام کرتی تھی۔ ارمان کو سبزی وغیرہ سے زیادہ گوشت پسند تھا۔ سودہ گوشت یا مرغی کے مختلف آٹم بناتی رہتی تھی۔ کبھی روسٹ، کبھی بریانی، کبھی کڑھائی، کبھی گوشت میں کوئی سبزی ملا کر بنالیتی تھی۔ ٹیٹھے میں بھی مختلف آٹم بناتی تھی۔ کبھی کھیر، کبھی سوپاں، کبھی کسڑڈ تو کبھی ٹرائفل۔ اپنی طرف سے وہ کوئی کسر نہ چھوڑتی تھی۔ ارمان کو گھر کی چپاتیاں پسند تھیں۔ پہلے تو اماں کی وجہ سے اسے تنوری نان ہی کھانے پڑتے تھے کہ اماں کے نہ کرنے کے عذر ہزار تھے لیکن جب سے کشف آئی تھی، وہ اس کے لیے اور اماں کے لیے گھر میں چپاتیاں بناتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی نرم و نازک سی چپاتیاں کہ اماں من ہی من معترف ہو جاتیں۔ بازاری نان سے ان کے بوڑھے معدے پر بھی برا اثر پڑ رہا تھا۔ پھر چبانے میں بھی مسئلہ رہتا تھا۔ گھر کی نرم اور تازہ چپاتیوں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔ شام کو ارمان کے آنے سے ذرا دیر قبل وہ غسل کر کے خوب صورت کھلے رگوں کا کوئی جدید اسٹائلش سا سوٹ یا ساڑھی پہن لیتی۔ لائٹ فیس میک اپ اور نازک سی جیولری پہن کر مسکراتے ہوئے اس کا سواگت کرتی تھی۔ شام کی چائے کے ساتھ بھی وہ اسٹیکس بنالیتی تھی۔

چاشما رہ جاتا۔ امی بھی خوب پیٹ بھر کے کھاتی تھیں لیکن کبھی جھوٹے منہ بھی تعریف نہ کی تھی۔ وہ خالصتا ساس تھیں۔ انہوں نے بھی ماں بن کر اس کے ساتھ پیش آنے کی زحمت نہ کی تھی لیکن کشف نے بھی ان سے بار اماں سے شکوہ نہ کیا تھا۔ وہ کسی سے امید رکھنے کی قائل نہ تھی اگر وہ ان کی خدمت کرتی تھی تو بے غرض ہو کے۔ صلی کے نہ اسے توقع تھی نہ امید اور نہ وہ اپنی خدمت جتاتی تھی۔ ارمان اپنی چھیتی بیوی کے ہر گن ہر خوبی پر سو سو بار ثناء ہوتا تھا۔ اس کے دل میں کشف کی محبت روز بروز جڑ پکڑتی جا رہی تھی۔ ارمان کو وہ صدر دروازے تک رخصت کرنے جاتی تھی پھر اس کے جانے کے بعد وہ گھر کے کاموں میں جست جاتی تھی۔ کشف کے آنے سے قبل ایک مجبوری ملازمہ آ کر گھر کے کام کاج کر جاتی تھی۔ کشف کے آنے کے بعد اماں نے یہ کہہ کر اس کی چھٹی کرادی کہ وہ کام ٹھیک سے اور صفائی سے نہیں کرتی۔ چوری چکاری کی بھی عادت ہے لہذا اس کی چھٹی کر دی جائے۔ کشف کے دل میں ایک سوال تو اٹھا تھا کہ اگر ایسا ہی تھا تو پہلے کیوں نہ اس کی چھٹی کر دی گئی؟ لیکن اس نے فوراً ہی اس سوال کو دل سے نکال باہر کیا اور بہت اپنائیت سے یوں۔

”تو کیا ہوا اماں؟ میں ہوں ناں۔ میں خود سارا کام کر لیا کروں گی۔ یوں بھی ماسیوں کے ہاتھ کے کام سے دل مطمئن نہیں ہوتا۔ آپ فکر نہ کریں۔“ ارمان نے بہت کہا کہ وہ دوسری ماسی کا بندوبست کر لے گا مگر کشف نے منع کر دیا۔ ”اماں کو ماسیوں کے ہاتھ کا کام پسند نہیں ہے۔ وہ نہیں چاہتیں تو کیوں ہم ان کی مرضی کے خلاف کریں۔ پھر تین بندوں کا کام ہی کتنا ہوتا ہے؟ میں خود کر لوں گی۔ آپ فضول پریشان نہ ہوں۔“ اس کے سمجھانے پر وہ چپ ہو گیا۔ ”مگر تم کو اتنے کام کی عادت نہیں ہوگی۔ تمہارے والد کے گھر تو چار چار ملازم موجود ہیں اور یہاں تم



”مجھے تو خبر ہی نہ تھی کہ تم اتنے گنوں والی ہو۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ بڑے گھرانوں کی لڑکیوں کی جانکاری بس فیشن تک ہی ہوتی ہے۔ لیکن تمہیں دیکھ کر تو میں نے اپنا خیال بدل ڈالا ہے۔ ہر فن میں طاق ہو۔ کنگن سلانی، پینٹنگ، دوسرے کام کاج اور پھر اس قدر سلیقہ طریقہ اور نفاست۔ تم نے مجھے واقعی حیران کر دیا ہے۔ مجھے اپنی پسند پر فخر ہے کہ میں نے تم جیسی لڑکی کو چاہا اور اپنا جیون سا بھی بنالیا۔ تم نے تو میرے گھر کو جنت بنا دیا ہے۔“ ارمان کے منہ سے اپنی تعریف سن کر وہ جھینپ گئی۔

”ہماری امی دوسری ماؤں سے ذرا مختلف ہیں۔ انہوں نے ہم لوگوں کی پرورش اور تربیت ذرا مختلف ڈھنگ سے کی ہے۔ شروع ہی سے انہوں نے ہر کام ہمیں خود کرنے کی عادت ڈالوائی ہے۔ نوکروں کے ہونے کے باوجود ہم سب بہن بھائی اپنا سب کام خود کرتے آئے ہیں۔ اپنے کمرے کی سیننگ اپنے کپڑوں اور چیزوں کی ترتیب اپنے بوٹ تک خود بالٹ کرنا۔ پھر جب میں بڑی ہوئی تو انہوں نے اسکول وغیرہ کی چھٹیوں کو ضائع نہیں کرنے دیا بلکہ میٹرک کے بعد رزلٹ آنے تک مجھے مختلف کورسز سکھانے کے لیے سینٹر بھیج دیا جہاں سے میں نے سلانی، کنگن اور دوسرے کورسز کیے تھے۔ کچھ میرا اپنا شوق بھی تھا۔“ وہ بتاتی گئی۔ ”دراصل ارمان! ہماری جو بھی شخصیت ہوتی ہے اس میں زیادہ اثر ہماری تربیت اور ہمارے گھر کے ماحول کا ہوتا ہے جس انداز سے میری ماں نے میری تربیت کی ہے اور جس طرح کا ہمارے گھر کا ماحول تھا بس تم مجھے اسی سانچے میں ڈھلا دیکھتے ہو۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو کشف۔ ان چیزوں کا بچے کی شخصیت پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ خاص طور سے ماں کی شخصیت کی چھاپ اور عکس تو اولاد پر گہرا ہوتا ہے۔ کشف! میں چاہتا ہوں کہ ہماری اولاد بھی بس تمہارا

ہی پرتو ہو۔ تمہارا ہی عکس۔ مجھے اپنے بچوں کو تم جیسا دیکھنا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولتا رہا تھا۔ اولاد کے تذکرے پر کشف کے صبح چہرے پر بہار کے رنگ بکھر نے لگے تھے۔ بچے اسے بے حد پسند تھے اور اس کی یہی آرزو تھی کہ اس کے کم از کم پانچ بچے ہوں جن سے اس کا یہ چھوٹا سا دودھنڈا گھر بھر جائے۔ ارمان کو الہستہ بچوں کا اتنا شوق نہ تھا اس کا کہنا تھا کہ یہ تو خدا کی دین ہے جتنے ہوں اس کی مرضی مگر فی الحال مجھے بچوں کی ایسی کوئی ضرورت ہے نہ خواہش۔ بہت بندھ جاتا ہے انسان بچوں کے بعد زندگی کا صحیح لطف اٹھا نہیں پاتا۔ تو وہ فوراً اسے ٹوک دیتی۔ ”ایسا مت کہا کریں ناشکری ہوتی ہے۔ خدا ہمارے آنگن کو معصوم قلقلاریوں سے آباد کرے (آمین) مجھے تو بہت پسند ہیں بچے۔ پیارے پیارے گول منول ان کی معصوم ہنسی اور شرارتوں سے ہی تو زندگی کا احساس ہوتا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ ہم کم از کم پانچ بچے درجن بچے ضرور لائیں گے۔ کہو منظور ہے؟“ وہ شوچی سے کہتا اس پر جھک جاتا اور کشف کی روح تیک لگنا نہکتی۔ اُس روز آجامیدہ آئی ہوئی تھیں۔ ان کے چار عدد بچوں نے گھر بھر میں اودھم مچا رکھا تھا۔ کشف کی مصروفیات میں اس روز اضافہ ہو جاتا تھا جس روز اس کی نند بھیم پلان آدھی گئی تھی۔ سو آج بھی یہی ہوا تھا حمیدہ آپانے تو آتی ہی کہہ دیا تھا کہ رات میں ڈاکر بھی آئیں گے۔ کھانے پر کچھ اچھا بنالے۔ سو وہ نند کے کہنے پر رین میں جت گئی تھی کباب تو وہ ہنا کے فریز کر لیتی تھی سو وہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ ساس سے رات کا مینو پوچھنے ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”برائی میں گوشت ڈال دوں گی ساتھ چکن کڑھائی ہو جائے گی۔ کباب فرانی کرلوں گی، میٹھے میں ٹرائفل بنالوں گی۔“ وہ من ہی من مینو ترتیب دے رہی تھی۔ ”بس اماں سے پوچھ لوں تاکہ اگر کچھ تبدیلی یا

اضافہ کرنا ہو تو پتہ چل جائے۔ پھر بعد میں شکایت نہ کریں کچھ۔“ وہ سوچ رہی تھی مگر اماں کے کمرے کے پار اپنا تذکرہ سن کر جیسے ٹھٹھک گئی۔ اس کی عادت نہ تھی چھپ چھپ کے باتیں سننے کی مگر اپنا نام سن کر متحس ہو گئی تھی۔

”شادی کو تین سال ہو چکے ہیں چوتھا شروع ہونے والا ہے۔ اماں! ابھی تک کشف نے خوش خبری نہیں سنائی۔ اس کی عمر میں تو میں دو بچوں کی ماں بن گئی تھی۔“ آپا کہہ رہی تھیں۔

”ابھی تک تو ایسا کوئی قصہ چھڑا ہوا نظر نہیں آتا۔ ارے ماں کی حکم عدولی کر کے بانجھ کو باہا یا! خالی خولی صورت کو کیا چاہتا ہے۔ ارے نسب تو اولاد سے چلتا ہے۔ میرا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ مجھے اپنے پوتے کا منہ دیکھنے کا بڑا ارمان ہے مگر لگتا ہے کہ اب تو یہ حسرت لے کر ہی دنیا سے جاؤں گی۔“ اماں بڑے سوز سے کہہ رہی تھیں۔ کشف کے دل پر گھونسا سا پڑا۔

”اماں! یہی باتیں کیوں کرتی ہو؟ تم ایک کام کرو! ارمان کو دھمکی دو اور صاف کہہ دو کہ اگر اس سال بھی بچہ نہ ہوا تو اسے دوسری شادی کرنی ہی پڑے گی۔ آخر کو مر دو دو شادیاں کرتے ہی ہیں خود ڈاکر کے باپ نے تین شادیاں کیں۔ اب ڈاکر ہی کو دیکھو پہلی بیوی بانجھ تھی تو مجھ کو بیاہ کر لے گیا۔ اب دیکھو لو کیسی ہریالی ہے آنگن میں۔“ ان کے انداز اور لہجے میں غرور تھا سفاکی تھی۔ کشف کا دل پتے کی طرح لرزنے لگا۔

”ہاں! تو ٹھیک کہتی ہے۔ کل ہی بات کروں گی اس سے۔ آخر اس طرح کب تک چلے گا؟ میں کب تک جیوں گی؟ دو چار سالوں میں مگر کچھ جاؤں گی کم از کم مرنے سے پہلے دادی بننے کی حسرت تو پوری کر لوں۔“

”اور اماں! تمہاری بہو کیسی جاری ہے؟“ آپانے باتوں کا موضوع تبدیل کر دیا۔

”کیسی ہوگی؟“ میرے بھولے بھالے بیٹے کو اپنی

اداؤں سے لہجائی رہتی ہے۔ ارے یہ جو لڑکوں کے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں ہوتی ہیں ناں! بس ایسی ویسی ہی ہوتی ہیں۔ ورنہ میرے ارمان کو لڑکیوں کی کمی تھی؟ سب سے بڑھ کر میری اپنی بہن کی بیٹی تھی۔ میں تو اس سے کہہ کر بیٹھی تھی کہ رقیہ میرے ارمان کی دہن بنے گی مگر اس کشف نے اپنی جادوگری سے میرے معصوم بچے کو ایسا اسیر کیا کہ وہ تو رٹ لے کر بیٹھ گیا کہ شادی کرے گا تو صرف کشف سے ورنہ گھر چھوڑ کے چلا جائے گا۔ ارے میں تو مامتا کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی۔“ اماں بیٹی کے سامنے دل کے پھسپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

”تو اب لے آؤ نا! تم ارمان سے صاف صاف کہہ کر تو دیکھو۔“ آپا بولیں۔ کشف کی ہمت جواب دے رہی تھی مزید اس سے نہ سنا جا رہا تھا نہ کھڑا ہوا جا رہا تھا۔ وہ پلٹ آئی، چکن میں آکر وہ منڈھال سی اسٹول پر بیٹھ گئی۔ آج اس کا دل بہت دکھا تھا۔ ساس اور نند کی نوکیلی باتوں نے اس کے دل اور روح کو لہو لہا کر دیا تھا۔ وہ بہت کسیدہ خاطر ہو رہی تھی کیا کچھ نہیں کیا تھا اس نے اپنی ساس اور نند کے دل میں جگہ بنانے کے لیے ہاتھوں سے مہندی بھی نہ اترنے پائی تھی کہ اس نے اپنی نند اور اس کے سسرالیوں کی دعوت کر دی تھی۔ جب بھی اس کی نند آتی اس کے بچوں کو وہ کچھ نہ کچھ دے دلاتی تھی۔ کبھی کھلونے، کبھی کپڑے، کبھی چائیس وغیرہ۔ نند اور نندوں کی کوہر تہوار اور ہر موقع پر دینا دلانا نہیں بھولی تھی۔ گھر آتے تو رات کا کھانا کھلائے بغیر جانے نہیں دیتی۔ بہت عزت سے پیش آتی۔ بچوں سے تو ویسے بھی پیار کرتی تھی لہذا وہ بھی اس کے لیے اپنے دل میں بہت جگہ رکھتے تھے۔ ساس کے لیے ان کی من پسند غذا میں تیار کرتا، جوس دینا، رات کو سونے سے پہلے دودھ کا گلاس تھما، وقت وقت پر دوائیاں کھلانا، ڈھک بیماری میں ڈاکٹروں کے پاس دوڑیں لگانا ان کے خاندان میں



کوئی موقع ہوتا تو ساتھ ساتھ رہنا وغیرہ وغیرہ۔ اتنی خدمت اور پیار کے جواب میں از خود اس کے دل میں یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ شاید اب وہ اس سے راضی ہیں مگر جو آج اس کے کانوں نے سنا تھا اس کے بعد تو اس کا دل ان سے کھٹائی ہو گیا تھا۔ زیادہ خوف اسے اس چیز کا تھا کہ کہیں واقعی اس کی ساس نند ارمان کی دوسری شادی نہ کرادیں۔ کتنا بھی اس کا دیوانہ ہی تھا تو مردی۔ عورت کے بہکاوے میں آسکتا تھا حالانکہ خود اس نے چپکے ہی چپکے کئی بار مختلف بہترین ڈاکٹروں سے چیک اپ کروایا تھا۔ اس کا ہر ٹیسٹ پازیٹو آیا تھا سب کا یہی کہنا تھا کہ وہ مانجھ نہیں ہے۔ اس کے باغ میں بھی پھول کھلیں گے مگر جب خدا کو منظور ہوگا تب۔ وہ خدا سے پرامیدی۔

جیسے تیسے اس نے کھانا بنایا سب کو کھلایا۔ خود تو جیسے بھوک ہی مر گئی تھی۔ سو اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی شام تک سوچوں میں گم رہی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ طبیعت بوجھل ہونے لگی تھی۔ کپڑے بدلنے کو بھی دل نہ چاہ رہا تھا لیکن ارمان کے آنے کا وقت ہو چلا تھا وہ اچھی اور تیاری کرنے لگی۔ وہ اپنے وقت پر آگیا تھا لیکن اس کا اترا ہوا چہرہ اور ابھی ہوئی آنکھیں دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ وہ اس کا سبب معلوم کرنے کو بے چین تھا لیکن اماں اور آپا نے اسے نیچے ہی روک لیا تھا۔ وہ اٹھنے کے لیے ارادہ کرتا تو آپا بہت اپنائیت سے کہتیں۔

”بیوی کے پاس تو روز ہی جاتا ہے بہن اتنے دنوں بعد آتی ہے کچھ وقت اسے بھی دے۔ چلی جاؤں گی رات تک پھر لگے رہنا بیوی کے گھٹنے سے۔“

مجبوراً وہ وہیں بیٹھا رہا۔ ادھر کشف بے چین سی کمرے میں ٹپکتی رہی۔ دو گھنٹوں بعد اسے بمشکل اس بات پر جانے کی اجازت ملی کہ وہ تھکا ہوا ہے ذرا فریش ہونا چاہتا ہے۔

”ٹھیک ہے پھر جلدی فریش ہو کے آ جانا۔ میں

تمہارا انتظار کر رہی ہوں کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ آپا کے بجائے اماں نے کہا۔

”سوری یاؤں آپا کے پاس بیٹھا تھا۔ تم تو جانتی ہو ان کا مزاج۔ اگر نہ بیٹھتا تو برا مان جاتیں۔ وہ کمرے میں آتے ہی وضائیں کرتے لگا۔

”میں نے تو کچھ نہیں کہا ناں۔ آپ جائے اور فریش ہو جائیں۔“ اس نے نرمی سے ارمان کی بات کاٹی۔ وہ تازہ دم ہو کر آیا تو کشف چائے سمیت موجود تھی۔

”بانی سب پی چکے ہیں؟“ ارمان نے پوچھا۔

”جی۔ بہت پہلے میں آپ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ لیکن آپا کے ساتھ بھی چائے پینی پڑی۔ آخر مہمان کا ساتھ بھی تو دینا پڑتا ہے۔“ اس نے بمشکل مسکرا کے جواب دیا۔ رات کو ڈاکٹر بھی آ جائیں گے کھانا بن چکا ہے۔“ وہ بولی۔

”کشف جان..... کچھ پریشان سی لگ رہی ہو۔ کیا بات ہے؟“ اس نے بغور ساتھ بیٹھی کشف کو دیکھا۔

”نہیں تو۔ آپ کا وہم ہے۔“ وہ ٹالنا چاہ رہی تھی۔

”نہیں کچھ تو ہے۔“ اس نے کپڑے میں رکھا اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تب وہ جو بھرے دل کے ساتھ بیٹھی تھی ضبط کھو بیٹھی اور اس کے شانے سے لگ کر رونے لگی۔ ارمان بہت پریشان ہو کر وجہ پوچھنے لگا۔ ان ساڑھے تین سالوں میں اس نے کبھی کشف کی آنکھ میں نمی نہ دیکھی تھی پھر آج یہ آنسوؤں پر کچھ بڑی وجہ ہو گئی۔ اس نے اپنی قسم دے کر پوچھنی ڈالا تو وہ مجبور ہو گئی اور اماں اور آپا کی باتوں کو خلاصے میں اس کے گوش گزار کر ڈالا۔ اس کی باتیں سن کر وہ تھپتھپ لگا کر ہنس پڑا تو وہ تعجب سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”میں کوئی لطیفہ سنار رہی ہوں؟ ہنس کیوں رہے

ہیں؟“ وہ ہلکا کر بولی۔

”جان ارمان! بالکل ہی بدھو ہو۔ ارے میں کوئی کچھ بتاتی ہوں جو اماں اور آپا مجھے اپنی مرضی سے سمجھائیں؟ ارے میری جان! میں مرد ہوں اور مرد کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ مرد مجبور ہو جائے تو وہ کاہے کا مرد؟ پھر تم تو جانتی ہو کہ مجھے ابھی تک بچوں کی تمنا ہے نہ چاہ۔ اور پھر قید جیسی لڑکی کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ ایک نمبر کی اجڑا گنوار لڑکی ہے۔ جسے نہ بات کرنے کا ڈھنگ ہے نہ ہنسنے اور ہنسنے کا سلیقہ۔ کہاں وہ کہاں تم۔ اور پھر مجھے خدا نے تمہاری صورت میں ایسی نعمت عطا کی ہے کہ قیامت تک شکرانے کے نوافل ادا کروں تو کم ہے۔ پھر میں بھلا نا شکری کیوں کروں؟ چاہے کوئی تم سے ہزار درجہ بہتر ہو مگر وہ تم تو نہیں ہو سکتی ناں۔ تم کشف ہو کشف وہ کشف جسے ارمان نے روح کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ تم سوچ بھی کیسے ہو کہ میں اتنا کم زور ہوں کہ محض کسی کے دباؤ میں آ کے تمہیں کھونٹوں گا۔ میں تو تم سے ہوں اور مجھے اس بات کا شکر ہے۔ تم اولاد کی بات کرتی ہو؟ یہ تو قسمت کی بات ہے۔ تقدیر میں ہوئی تو تم سے مل جائے گی ورنہ تو نہیں۔ اب تم اپنا موڈ ٹھیک کر دو مجھے میری ہنسی مسکرائی کشف چاہئے۔“

ارمان بہت بیٹھے لہجے میں اس کو اپنائیت کا یقین دلارہا تھا۔

”سچ کہہ رہے ہیں؟“ اس نے اپنی چھیل آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”جھوٹ بولوں تو مر جاؤں۔“ ارمان نے اس کی چھوٹی سی ہاتھوں ناک چٹکی میں پکڑ کر ہلاتی۔

”خدا نہ کرے۔ مریں آپ کے دشمن۔“ اس کا دل کانپ اٹھا۔ اس نے بے ساختہ ہی ارمانوں کے ہونٹوں پر اپنا مر میری باتھ رکھ دیا۔

”تمہاری بیٹی ادا میں تو لے ڈوبی ہیں ہمیں۔ اب مجھے جانے دو نہیں بہک گیا تو پھر نہ کہنا۔“ ارمان

جذبے لگاتی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تو وہ جھینپ گئی۔

پھر اگلے دو روز تک خاموشی چھائی رہی نہ ہی اماں نے ارمان سے کوئی بات کی اور نہ ہی یہ موضوع دوبارہ چھڑکا۔ انہی دنوں کشف کے چھوٹے بھائی کی شادی کا چرچہ ہونے لگا اگلے ہفتے سے رمضان شروع ہو رہا تھا اور اس بابرکت مہینے کے پہلے ہی روزے کو کشف کے بھائی رضا کی بارات تھی۔ وہ بہت خوش تھی رضا کی شادی ان کی کزن انجم سے ہونے جاری تھی جو کہ کشف کی خالہ زاد بھی تھی اور بہت اچھی سہیلی بھی۔ بارات لے کر اسلام آباد جانا تھا۔ لاہور سے اسلام آباد کا سفر اچھا خاصا تھا کشف کو اس کی ماں نے ہفتہ قبل ہی بلاوا بھیج دیا تھا ارمان نے بہت بے دلی سے اسے جانے کی اجازت دی تھی اس لیے کہ مومن ہی ایسا تھا۔ خود تو اس کو مہندی والے روز ہی آنا تھا خود کشف کا دل بھی اس کے بغیر اداس ہو رہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ سگے بھائی کی شادی اور پھر وہ شادی کے بعد پہلی مرتبہ رہنے کے لیے جاری تھی۔ البتہ اماں بہت خوش لگ رہی تھیں۔

”تم جاری ہو۔ کس طرح گزاروں گا یہ دن یہ راتیں؟ کیسے کیسے گئے یہ پل..... یہ لمحے؟ تمہارے بنا تو سانس نہیں لی جاتی۔“ وہ جانے والی تھی کارینچے اس کی منتظر تھی اور ارمان اسے پہلو سے لگے کبہ رہا تھا۔

”میرا بھی کہاں دل چاہ رہا ہے آپ سے جدا ہونے کو۔ وہ بھی اتنے دنوں کے لیے پر کیا کریں۔ دنیا داری بھی بھائی پڑتی ہے ناں بھیا کی شادی ہے جانا بھی ضروری ہے اور پھر دس دنوں کی تو بات ہے۔ پھر تو آپ بھی وہیں آ کے رہیں گے ناں۔ ویسے کے بعد ہم دونوں اپنے گھر واپس آ جائیں گے۔“ وہ بولی۔

”پھر وہ چلی گئی۔

شادی والا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اتنے کام تھے کہ وہ جاتے ہی جت گئی۔ ساری بری اس نے بڑی



بھابھی اور ماں کے ساتھ مل کر سیٹ کی تھی۔ دوسرے ہزار کام اس کے منتظر تھے مگر ان سب مصروفیات کے باوجود ارمان اس کے ذہن اور دل سے نہ نکل پایا تھا۔ ہر لمحہ یوں اس کا خیال ہمراہ ہوتا کہ گویا وہ جسم خود موجود ہو پھر مہندی والا دن بھی آ گیا۔ وہ خود کو پور پور سجانے اس کی منتظر ہی رہی مگر ساری تقریب گزر جانے کے باوجود وہ نہ آیا۔ امی بار بار پوچھ چکی تھیں۔ ”کشف! تمہاری ساس اور نند نہیں آئیں، ارمان بھی نہیں پہنچا۔ کیا وجہ ہے؟“ ابو بھی دو بار کہہ گئے تھے۔ ”بیٹا! تم گھر فون کر کے معلوم تو کرو۔“ اس نے تو دپے ہی دو چار بار گھر کا نمبر لڑائی کر لیا تھا مگر کوئی اٹینڈ ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ بہت فکر مند بھی اس نے ایک بار اور نمبر زپش کیے۔ اس بار خیال تھا کہ اگر فون کسی نے اٹینڈ نہ کیا تو وہ کار لے کر سیدھی گھر چلی جائے گی مگر صد شکر کہ دوسری پیل پر ہی کسی نے فون اٹھا لیا تھا۔ ”ہیلو۔“ ارمان کی آواز سن کر اس نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

”ارمان! شکر ہے آپ کی آواز تو سننے کو نصیب ہوئی۔ کہاں ہیں بھئی؟ میں کب سے فون کر رہی ہوں کوئی اٹھاتا کیوں نہیں؟ اور آپ اور اماں ابھی تک پہنچے کیوں نہیں؟ ساری رہیں ہو گئیں سب لوگ پوچھ رہے ہیں آپ کا۔“ وہ ایک ہی ساس میں بولتی گئی۔ ”ہاں..... آں..... وہ میں دراصل..... میں تم کو ابھی فون کرنے ہی والا تھا۔ مجھے آفس کے ضروری کام سے ارجنٹ دوسرے شہر جانا پڑا ہے اور اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ آپا جمیدہ کے یہاں ہیں۔ میں بس اب نکلنے ہی والا ہوں میری فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔ تم گھر پر فون مت کرنا، کوئی نہیں ملے گا اور مجھے آنے میں دس پندرہ دن لگ سکتے ہیں تم شادی آرام سے اٹینڈ کر کے آنا۔ اوکے خدا حافظ۔“ دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔ کشف خالی خالی نظروں سے ریسیور کو گھور رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے

ریسیور نیچے رکھ دیا۔ وہ پریشان سی ہو گئی تھی اور متفکر بھی۔ ارمان کا انداز اسے بہت عجیب لگا تھا اسے یوں لگا جیسے وہ اس سے کچھ چھپا رہا ہو۔ جیسے وہ اس سے بھاگ رہا ہو۔ آفس والوں نے پہلے تو بھی اسے شہر سے باہر نہیں بھیجا تھا اور اب اچانک..... وہ بھی اتنے دنوں کے لیے..... وہ سوچ میں گم گئی۔ باقی تقریب اس نے یونہی بے دلی سے اٹینڈ کی تھی دل میں کوئی اتنی سی کبھی بھی جو نکل نہیں پارہی تھی۔ وہ سوچتی لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا۔

سمجھ میں تو اس روز آیا تھا جب وہ اپنے بھائی کی چوتھی کی دعوت میں اچانک بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی بڑی بھابھی ڈاکٹر تھیں انہوں نے اس کا چیک اپ کیا تو وہ خوش خبری اسے سنائی جس کو سننے کو اس کے کان پھسلے چار سالوں سے منتظر تھے۔ معجزہ ہو گیا تھا۔ اس کی گود ہری ہو گئی تھی۔ وہ بے تحاشا مسرور بھی اور اپنے رب کا شکر بجالانے کے بعد اس نے سب سے پہلے ارمان کو گھر فون کیا تھا مگر فون کوئی اٹینڈ نہ کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ شاید ارمان ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔ ابھی وہ ریسیور نیچے رکھنے ہی والی تھی کہ دوسری طرف سے کسی نے فون ریسیور کر لیا۔

”ہیلو۔“ ایک تیز نوازی غیر مانوس آواز نے اسے چونکا دیا۔

”ہیلو۔ کون؟“ اس نے پوچھا۔ ”بھئی آپ کون ہیں؟ کس سے بات کرنی ہے؟ میں کون ہوں اس سے آپ کو کیا مطلب؟“ دوسری طرف سے بڑی ہی بد لحاظی سے کہا گیا۔ ”یہ ارمان کا گھر ہے؟“ اس نے نمبرز دہراتے ہوئے کنفرم کرنا چاہا۔

”جی ہاں مگر آپ کون ہیں؟“ اس طرف سے پوچھا گیا۔

”میں کشف ہوں۔ ارمان کی بیوی اور اس گھر کی مالکہ جہاں تم کھڑی ہو کے فون ریسیور کر رہی ہو اب

”ارمان! شکر ہے آپ کی آواز تو سننے کو نصیب ہوئی۔ کہاں ہیں بھئی؟ میں کب سے فون کر رہی ہوں کوئی اٹھاتا کیوں نہیں؟ اور آپ اور اماں ابھی تک پہنچے کیوں نہیں؟ ساری رہیں ہو گئیں سب لوگ پوچھ رہے ہیں آپ کا۔“ وہ ایک ہی ساس میں بولتی گئی۔

”ہاں..... آں..... وہ میں دراصل..... میں تم کو ابھی فون کرنے ہی والا تھا۔ مجھے آفس کے ضروری کام سے ارجنٹ دوسرے شہر جانا پڑا ہے اور اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ آپا جمیدہ کے یہاں ہیں۔ میں بس اب نکلنے ہی والا ہوں میری فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔ تم گھر پر فون مت کرنا، کوئی نہیں ملے گا اور مجھے آنے میں دس پندرہ دن لگ سکتے ہیں تم شادی آرام سے اٹینڈ کر کے آنا۔ اوکے خدا حافظ۔“ دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔ کشف خالی خالی نظروں سے ریسیور کو گھور رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے



بتاؤ تم کون ہو اور ارمان کہاں ہے؟“ اب کی بار کشف نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

”او..... کشف..... بابا بابا“ دوسری طرف سے زبردست تہمت بھرا۔

”تم کون ہو؟ کیوں ہنس رہی ہو؟“ کشف کو اب غصہ آنے لگا تھا۔

”میں رقیہ ہوں رقیہ۔ بیچاقتی ہونا مجھے۔ ارمان کی خالہ زاد۔ اور رہا سوال میرا اس گھر میں ہونے کا تو سنو کشف بی بی اب میں اس گھر کی مالک ہوں تم نہیں۔ میں اب صرف رقیہ نہیں رہی رقیہ ارمان شاہ بن چکی ہوں سمجھیں۔“

کشف کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔ یہ انکشاف تھا کسی نے کچھ سانس اس کے کانوں میں اٹھیل دیا تھا۔ اس کو ساری دنیا ڈولتی ہوئی نظر آئی۔

”کس کا فون ہے جانم؟“ دوسری طرف سے ارمان کی گھبراہٹ سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ بے یقینی سے ریسور کو گھورنے لگی۔ یہ انداز..... یہ آواز..... یہ گھبراہٹ اس کے لیے مخصوص تھی۔ آج یہ انداز کی اور کا نصیب بن گئی تھی۔

”اوہ ارمان! چھوڑیں بھی۔ ابھی تو نہا کے آئی ہوں تھک گئی ہوں۔ ذرا میرا خیال تو کریں سخت نیند آرہی ہے۔“ رقیہ نے ریسور کو پکڑ کر رکھنے کی بجائے تپائی پر رکھ دیا تھا وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی تھی تاکہ کشف واضح طور پر ان کی گفتگو سن سکے اور وہ اپنی اس چال میں کامیاب رہی تھی۔ کشف بہت واضح طور پر ان کی گفتگو سن سکتی تھی۔

”تو نیند کو بھگاؤ ناں۔ رات سونے کے لیے نہیں ہوتی ہے پیار کرنے کے لیے ہوتی ہے۔“ ارمان جیسے مدھوشی میں بول رہا تھا۔

”ہوں..... رجنے دیں۔ یہی ڈانٹاگ تو آپ اس کشف کے سامنے مارتے ہوں گے۔“ رقیہ نے منہ بنا کے کہا۔

”اوہ ڈارلنگ! یہ ہمارے درمیان کشف کہاں سے آگئی؟ دیکھو! وہ بیٹا ہوا کل تھی میں اسے بھول جانا چاہتا ہوں۔ تم میرا آج ہو میں آج جینا چاہتا ہوں۔

پہلے تو میں یہی سمجھتا تھا کہ میں کشف کے بنائیں رہ سکتا تھا لیکن وہ محض میری جذباتیت تھی۔ اس نے محض مجھے اپنا عادی بنایا تھا۔ دیکھو رقیہ جان! میں اسے طلاق دے چکا ہوں تمہاری خوشی کی خاطر۔ کل تک تو اسے پیپر ز بھی مل جائیں گے مگر میں چاہتا ہوں کہ ہماری اس نئی زندگی میں کشف کا ذکر نہ آئے۔ میں اس کے نام سے بھی دور بھاگنا چاہتا ہوں اور پھر مجھے اس نے اس طرح باندھ کے رکھ دیا تھا کہ میں کسی دوسری طرف نگاہ

تک نہ کر سکا تھا۔ دوست یار عزیز و اقارب ساری دنیا بھول بیٹھا تھا۔ اب تم کو میری زندگی میں آئے صرف ایک ہفتہ ہی گزرا ہے پچھلے جمعے کو ہمارا نکاح کتنی سادگی سے ہو گیا تھا۔ اس وقت میں نے صرف اماں اور آپا کے مجبور کرنے پر تم سے نکاح کیا تھا۔ لیکن یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ تم کیا چیز ہو۔ تم تو وہ بوجس کے لیے میں کشف کو طلاق دینے پر راضی ہو گیا۔ اب بس میں چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان کوئی کشف نہ ہو بس

میں ہوں اور تم۔“ وہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا مگر کشف تو جیسے پتھر بن گئی تھی۔ اسی وقت رقیہ کی آواز اسپیکر میں ابھری۔

”سن لیا اپنے کانوں سے۔ اب تمہارا اور ارمان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ تم کو طلاق دے چکے ہیں۔ تمہاری جگہ نہ ان کی زندگی میں ہے نہ گھر میں اور نہ ہی دل میں سمجھیں۔ اب فون مت کرنا یہاں۔“ فون ڈسکنیکٹ ہو چکا تھا اور وہ ہوش و حواس سے بے گانہ گویا پتھر کا مجسمہ بن کے رہ گئی تھی۔ بڑی بھانجی کا وہاں سے گزر ہوا تو وہ ریسور ہاتھ میں پکڑے بت بنی کھڑی تھی۔ ساکت نگاہیں سامنے دیوار پر لگی خانہ کعبہ کی تصویر مبارک پر جمی تھیں اس پر کسی جیتے جاگتے جسمے کا گمان ہوتا تھا۔ بھانجی پریشانی سے آگے

پہنچیں۔

”کشف..... کشف..... کیا ہوا؟“ انہوں نے اس کا شانہ بلایا تو وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ان کی ہانپوں میں جھول گئی۔

ایک قیامت تھی جو آگے گزری تھی۔ شدید قسم کے زلزلے پر ایک ڈاؤن نے اس کی آدھی سے زیادہ طاقت بھری تھی لیکن صد شکر کہ اس کے وجود میں پلنے والی جسمی جان کو خدا نے اماں میں رکھا تھا۔ وہ ہفتہ بھر ہسپتال میں رہنے کے بعد گھر آئی تھی۔ گویا زندگی ہی بدل گئی تھی چپ چاپ پتھر بنی بس خلاؤں میں کچھ ڈھونڈتی رہتی۔ گھر کے بھی افراد نے اس کا اس شخص

مرحلے پر بے حد ساتھ دیا اور سب سے زیادہ اس کا خیال بھی رکھا۔ اسے زندگی کی طرف لانے کے لیے بہت جتن کیے۔

کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے جو روح پر لگے گھماؤ بھی بھر دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے گھماؤ بھرنے لگے تھے۔ زخموں پر کھرند آنے لگا تھا اس نے اس زخم کی تکلیف کو اپنے طیبت سے اندر ہی دبا دیا تھا کہ اسے جینا تھا۔ جینا مجبوری تھی اسے اپنے بچوں کے لیے جینا تھا۔ لڑکا ساؤنڈر پورٹ کے مطابق اس کے جڑواں بچے ہونے تھے۔ ایک لڑکا اور دوسری لڑکی۔ نو مہینے کا عذاب اس نے کس جتن سے سہا تھا یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا مگر ڈیلیوری کے وقت اسے ارمان کی بے حد یاد آئی تھی اس تکلیف کے بہانے اس نے اپنی روح کی تکلیف پر آسو بہاے تھے جس وقت اس کے پہلو میں اس کا بیٹا اور بیٹی لائے گئے۔

وہ وقت اس کی زندگی جھیل آنکھوں سے برسات اور تھی۔ سب اس کی خوشی میں خوش تھے اور اس کے دل پر کٹنے والی چوٹ کے درد سے ممکن بھی۔ کشف نے جی سے سب کو منع کر دیا تھا کہ کوئی ارمان کو ان بچوں کی ولادت کی خبر نہ دے۔ اب اس کا اس بے وفا سہ قدر شخص سے کوئی رشتہ نہیں۔

پھر آہستہ آہستہ وقت کا پرندہ چو پرواز رہا اور کشف نے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ اپنی نقدیر سے سمجھوتہ کرتے ہوئے خود کو بچوں اور دوسرے کاموں میں غرق کر دیا۔ اس نے اپنی مضبوط قوت ارادی سے خود کو مزید کرنے سے بچالیا تھا۔ ارمان کی یاد کو اپنے دل کے قبرستان کے پاتال میں دفن کر چکی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ اسے بھول نہ پائی تھی۔ کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ آ جاتا جو اسے اس ہرجائی کو یاد کرنے پر مجبور کرنے لگتا تھا لیکن وہ سختی سے دل کو جھڑک دیتی تھی۔

اس نے ایک بوتیک اشارت کیا تھا جو گزرتے وقت کے ساتھ کامیاب ترین ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا بزنس پھیلتا جا رہا تھا بزنس کی دنیا میں وہ ایک کامیاب بزنس دو مین تھی۔ ایک آئیڈیل ماں بھی دنیا والے اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ طلاق یافتہ ہونے کا لیبل چسپاں ہونے کے باوجود اس کے وقار عزت اور مرتبے میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی اپنی اولاد کے نام کر دی تھی۔ ارمان اس کی زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد تھا۔ اس کے بعد اس نے کسی کی طرف نہ دیکھا۔ کئی آئے اور اس کے آگے دامن پھیلا یا مگر وہ سب کو جھٹکتی ہوئی ناک کی سیدھ میں چلی گئی۔ اس کے بچے جتنی اس کی عزت کرتے تھے جتنی اس سے محبت کرتے تھے اتنا ہی باب سے نفرت۔ حالانکہ اس نے بھی ان سے کچھ نہ کہا تھا مگر وہ خود ہی اتنے سمجھ دار تھے کہ سارے حالات و واقعات جان گئے تھے۔ ماں کی خوب صورت آنکھوں میں چھپا درد ان کو صاف نظر آتا تھا اس کی مسکراہٹ کے غلاف میں لپٹا کر وہ صاف دیکھ سکتے تھے لہذا کوشش یہ کرتے کہ ان کی وجہ سے کم از کم ان کی ماں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

اس روز کشف کو اپنے بیٹے کے کالج جانا تھا آج ان کے کالج میں ڈیپٹ کا مقابلہ تھا بہت بڑا مقابلہ



تھا۔ شہر کے کئی کالج اس میں حصہ لے رہے تھے کشف چاکلیٹ کرکی پلین ہاف سلیوز بلاؤز والی ساڑھی میں اپنی مخصوص چھب کے ساتھ اگلی ہی نشست پر بہت وقار کے ساتھ براجمان تھی مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس کے بیٹے نے بھی تقریر میں حصہ لیا تھا بے حد مضبوط دلائل بہت خوب صورت اور اٹل انداز بیان تھا اس کا۔ اس قدر بولڈ..... اس قدر رواں کہ حاضرین بس سنتے ہی رہے۔ کشف بہت توجہ سے سن رہی تھی اس کو اپنے لائق فائق بیٹے پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ بارون اسٹیج سے جا چکا تھا پورا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ اسی گونج میں کشف کو ایک مانوس آواز سنائی دی۔

”کشف.....“ اس نے ایک جھٹکے سے دائیں سمت دیکھا تو زندگی سترہ سال پیچھے چلی گئی ہو۔ اس کے برابر والی سیٹ پر ارمان بیٹھا تھا ان سترہ سالوں نے اسے بہت بدل کے رکھ دیا تھا۔ کھیرے بال اب صرف جھاروں کی صورت میں رہ گئے تھے۔ سیاہ بالوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی جبکہ سفید بالوں کی جھلک جگہ جگہ سے نمایاں تھی۔ توند بڑھی ہوئی تھی رنگت کچھ اور سنو لاگئی تھی۔ ہونٹ جو بھی گلابی مانگ ہوتے تھے آج سیاہی لیے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ ایک نظر میں تو پہچانا ہی نہ جا رہا تھا۔

”ار..... مان.....“ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”کیسی ہو؟ اتنے سالوں بعد دیکھا ہے تم کو۔ بالکل نہیں بدلیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”بالکل ٹھیک ہوں الحمد للہ۔“ وہ اپنے اندر اٹھنے والے مدوجز کو قافلو کرتے ہوئے اطمینان سے بولی۔

”تم یہاں کیسے؟“ ارمان پوچھ رہا تھا۔

”میرا بیٹا اس کالج میں پڑھتا ہے۔ آج اس نے بھی اس مقابلے میں حصہ لیا ہے۔“ وہ مدہم لہجے میں بولی۔

”بیٹا؟“ وہ اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

”ہاں۔ میرا بیٹا، جو ابھی ابھی یہاں اسٹیج سے گیا ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے اور بیٹی بھی ہے ایک۔ وہ بھی نہیں پڑھتی ہے۔“ کشف نے لفظ ”نہ“ پر زور دیتے ہوئے گویا کچھ بتایا۔

”تم نے شادی کب کی؟“ بے اختیار ارمان کے منہ سے نکلا۔

”یہاں میں مقابلہ دیکھنے آئی ہوں مسٹر ارمان۔ پلیز مجھے سننے دیں۔“ کشف نے سی ان سی کرتے ہوئے اس سے کہا اور پھر بہت منہمک ہو کر تقریر سننے لگی جبکہ ارمان بہت بے چین ہو گیا تھا۔ ”منہ.....“

دوسری شادی بھی کر لی، کیسی کمین عورت ہے۔ کتنی تھی ارمان! میں تمہارے علاوہ کسی اور مرد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ تم میری زندگی میں آنے والے پہلے اور آخری مرد ہو جسے مرتے دم تک تمہارے نام کو دل کے صفحہ قمراس پر لکھتی رہوں گی تم میری روح میں شامل ہو۔ دوغلی..... جھوٹی..... مکار.....

فریبی..... دوسرے سے شادی بھی کر لی۔ دو بچے بھی پیدا کر لیے سارے دعوے بھر بھری ریت کی دیوار نکلے۔ جی تو کرتا ہے گلا دبا دوں۔“ وہ کھولتے ذہن سے سوچ رہا تھا۔ ”میری زندگی تو اس منحوس رقیہ نے دشوار بنا دی ہے سارے بچے بھی ناکارہ اور غلے نکلے ہیں۔ ماں کی طرح جھگڑاؤ پھینکنا اور نالائق۔ میرا ساجھنا گھر جیسے کوڑا کھاڑ بن کر رہ گیا ہے۔ یہ تھا تو ایسا کب تھا۔“ وہ کن اکھیوں سے سامنے بے نیاز بیٹنی کشف کو دیکھنے لگا۔ ”اس نے تو جنت بنا رکھی تھی اس چہار دیواری کے اندر۔ اس کا حلیہ دیکھو لگتا ہی نہیں کہ اتنے جوان بچوں کی ماں ہے۔ یقیناً بہت خوش ہوں اپنے ”نئے شوہر“ کے ساتھ۔ اس نے بہت خوش رکھا ہوگا اور ایک میں ہوں.....“ وہ پھر خود کو اور رقیہ کو کوٹنے لگا۔ ”اماں خود تو مر مر گئی اور مجھے عذاب بھگتنے کو چھوڑ گئیں۔ بد بخت نے میری زندگی کو بھی گھن لگا دیا۔ نہ

شکل و صورت میں کشف کے مقابل تھی وہ..... نہ بیٹنے اور نہ سلیقے طریقے، تہذیب و زبان میں اس کی پائی۔ پھر میں نے کیوں اس جنت کو چھوڑ کے دوزخ خرید لی؟ شاید اس لیے کہ ایک عورت پر اتنا کفارنا مرد کی فطرت نہیں یا شاید میں اتنا کم زور تھا کہ دوسری عورت کے ”سراغ“ کو مانے کے چکر میں اتنا سستا سودا کر بیٹھا۔ میں اپنے نفس کے آگے ہار گیا تھا۔ ہاں..... مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے نفس کے آگے ہار گیا تھا مگر یہ عورت..... یہ کشف اس نے کیوں اپنے عہد کی خلاف ورزی کی؟ یہ عورت ہے اسے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا ایسا کرنے کا۔ کیوں اس کا نفس ہار گیا؟ یہ تو بہت مضبوط بتی تھی ناں۔ پھر کیوں اس نے ایسا کیا؟ کسی دوسرے کی بیج سجاتے ہوئے اس کا دل اس کا ضمیر کیسے راضی ہو گیا؟ ”ایک آگ کی ارمان کے اندر بھرنے لگی تھی اسی وقت بیج صاحب نے رزلٹ اناؤنس کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔

”پہلا انعام جاتا ہے بارون ارمان کو۔“ اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی اور ارمان کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کے کانوں میں بس ایک ہی نام گونج رہا تھا۔ ”بارون ارمان.....“ بارون ارمان..... بارون ارمان..... اس نے بے اختیار کشف کو دیکھا وہ گنار چہرے سے تالیاں بجا رہی تھی۔ پھر یکدم ہی اس نے گردن موڑ کر ارمان کو دیکھا۔

”بارون اور جراتمہاری بی اولاد ہیں۔ میں اپنے اندر سے میں جچی تھی اور ہوں۔ ساری زندگی میں نے ایک ہی نام کے سہارے کائی میری زندگی میں ایک ہی مرد آیا تھا اور اس کا نام ہے ارمان شاہ۔ جس نے مجھے اسے سارے رشتے توڑ لیے مگر اب تک تم اسے اپنے دل سے بھلا نہیں پائی۔ اس کے سنگ جیسے پل اب بھی میری یادوں میں تازہ ہیں میں سرخرو ہوں اپنی نظروں میں اپنی اولاد کے سامنے میرا سر جھکا نہیں میری آنکھیں شرمسار نہیں۔ زندگی نے مجھے





## رشتے پیلے

فرح عتیق

گڑے ہیں سینے میں دکھ کی کماں کے تیز مگر  
میری نظر میں ہیں منظر دھنک کی پریوں کے  
غموں کی دھند میں عشرت کو لے ہی ڈوبیں گے  
جو حل نہ ہوئے مسائل اُداس نسلوں کے

گڑے ہیں سینے میں دکھ کی کماں کے تیز مگر  
میری نظر میں ہیں منظر دھنک کی پریوں کے  
غموں کی دھند میں عشرت کو لے ہی ڈوبیں گے  
جو حل نہ ہوئے مسائل اُداس نسلوں کے  
ہم سب میں بڑا سلوک اور اتفاق تھا جس کی وجہ  
سے کسی کو اس کا اندازہ کرنے میں بڑی دشواری ہوئی  
تھی کہ کون سے بچے حاجی صاحب کے ہیں اور کون  
سے شیخ صاحب کے۔

میرے ابا جان حاجی صاحب کے نام سے مشہور  
تھے اور چچا شیخ صاحب کے نام سے۔ ہم پانچ بہن  
اور دو بھائی تھے اور چچا کی پانچ بیٹیاں اور چار بیٹے تھے  
جبکہ ہمارے ایک بڑے تایا کی انگوٹھی بیٹی بھی ہمارے  
ساتھ ہی رہتی تھی۔ بڑے تایا جی اور تائی جی کا ایک  
حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ زاہدہ کی عمر اس وقت  
4 سال تھی۔ اس وقت سے ہی زاہدہ ہمارے ساتھ رہ  
رہی تھی۔

ہم سب بہنوں میں بڑا سلوک تھا۔ میرے والد  
صاحب کو بہت شوق تھا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل

کروں۔ میں اور زاہدہ ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہم  
جماعت بھی تھیں۔

محلے کے لوگ اور ملنے جلنے والے لوگ اکثر کہا  
کرتے تھے اتنے زیادہ بچے ہونے کے باوجود یہاں

سے ہمیشہ ہنسنے کی آواز آتی ہے۔ کبھی کوئی لڑائی جھگڑا  
نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے جب ہم لوگوں نے جوانی میں

قدم رکھا ہی تھا کہ بہت سے رشتے آنے شروع  
ہو گئے۔ لیکن چونکہ میرے والد صاحب مجھے پڑھانا

چاہتے تھے اس لیے مجھ سے چھوٹی بہن کی شادی  
کا فیصلہ کر دیا گیا۔ میں اس وقت ایف اے میں تھی اور

سب بہنوں میں سب سے زیادہ خوب صورت اور  
اسمارٹ بھی تھی۔ سب سے زیادہ میں ہی لاڈلی بھی تھی

۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں والد صاحب کی  
شادی کے 18 برس کے بعد بہت دعاؤں اور

مرا دوں کے بعد پیدا ہوئی۔ پھر دادی دادا امی ابو اور  
چچا چچی سب کی بہت ہی لاڈلی تھی اور سب ہی میرے

ناز و نخرے اٹھاتے تھے۔ اسی اثنا میں میری والدہ بیمار  
رہنے لگیں اور والد صاحب کافی پریشان ہو گئے



سرکاری نوکری کی وجہ سے اکثر ابا جان کو شہر سے باہر جانا پڑتا تھا۔

والدہ صاحبہ کی صحت دن بدن خراب ہونے لگی آخر یہ ہوا کہ اسی جان اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور ہم بھی زاہدہ کی طرح ماں جیسی نعمت سے محروم ہو گئے لیکن ہماری بچپی نے ہمیں ماں جیسا پیار دیا اور ہمیں کبھی یہ کمی محسوس نہ ہونے دی۔

پھر ابا جان کو ہماری شادیوں کی فکر رہنے لگی۔ دونوں بھائی ابھی چھوٹے تھے۔ پھر مجھ سے چھوٹی شاہدہ کی شادی طے پا گئی۔ کافی لوگوں نے والد صاحب سے اس بات پر اعتراض کیا کہ آپ نے بڑی بیٹی کو چھوڑ کر چھوٹی کی شادی کیوں طے کر دی۔ چونکہ والد صاحب خود بھی اپنے زمانے میں بی اے پاس تھے اس لئے مجھے بھی پڑھانا ان کا خواب تھا۔

میری پھوپھی میرا رشتہ مانتی تھی اور اباجی اپنی بہن اور ان کے اکلوتے بیٹے کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے جبکہ احمد تھا بھی خوب صورت اور پڑھا لکھا۔ پھوپھو مجھے بچپن سے ہی بہو بنانا چاہتی تھی۔ بالآخر میں اور زاہدہ نے بی اے کر لیا۔ اسی دوران چچی نے بھی اپنی دو بیٹیوں ٹیٹس اور عابدہ کی شادی کر دی تھی۔ بی اے کے بعد زاہدہ نے لاہور گورنمنٹ کالج میں MSc میں داخلہ لے لیا اور ہوش میں چلی گئی۔ یہ بات اباجی اور باقی گھر والوں کے لیے بڑے فخر کی تھی کہ اس گھر کی بیٹی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

مجھے داخلے کی اجازت نہ ملی بلکہ یوں کہیں کہ اباجی نے مجھ سے ریگسٹریٹ کی کہ بیٹا تم اب داخلہ نہ لو میں اب مجبور ہو گیا ہوں تمہاری ماں اس دنیا میں نہیں رہی اور میری بھی زندگی کا کوئی پھر و سہ نہیں اس لئے میں اپنے فرائض جلد سے جلد ادا کرنا چاہتا ہوں۔

رشتے تو کافی آتے ہی رہتے تھے پھر اباجی نے مجھ سے کہا کہ بیٹا میں تمہیں پڑھانا تو بہت چاہتا تھا لیکن حالات کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

اسی اثنا میں ایک رشتہ آیا اور میرا رشتہ طے ہو گیا کیونکہ ہم لوگ سفید پوش تھے۔ والد صاحب (جیسا کہ میں بتا چکی ہوں) سرکاری ملازم تھے۔ اسی لئے ساری وجوہات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس رشتے سے انکار نہ کیا۔ جبکہ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ شادی شدہ سے اور اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کا ایک بچہ بھی ہے جس کی عمر 4 سال ہے۔ ان کا پنا کاروبار تھا۔ حیثیت میں وہ لوگ ہم لوگوں سے کچھ زیادہ تھے۔ عبداللہ کے اور بھائی بھی تھے جو شادی کر کے اپنی بیگمات کے ساتھ دوسرے ملک میں مقیم تھے ایک بہن شادی شدہ تھی اور دوسری غیر شادی شدہ۔ ان کے والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ البتہ عبداللہ پڑھا لکھا تھا اور اپنے والد صاحب کا سارا کاروبار بھی اس نے سنبھالا ہوا تھا۔

جب مجھے زاہدہ کی زبانی یہ سب پتہ چلا تو پہلے دل چاہا کہ والد صاحب سے کہوں کہ اتنا پڑھا لکھا کر آپ میرے ساتھ یہ کیا برتاؤ کر رہے ہیں لیکن پھر ہماری مشرقت آڑے آ گئی اور خاموشی سے ہاں کر دی۔ پھر عبداللہ کے گھر والے ہمارے گھر آئے اور مجھے پسند کر لیا اور جلد ہی دعائے خیر ہو گئی۔ عبداللہ کی والدہ کی خواہش تھی کہ شادی جلدی کی جائے اور میرے والد صاحب بھی یہی چاہتے تھے کہ جتنی جلدی ہو یہ فرض ادا ہو جائے۔

آخر شادی طے ہو گئی۔ پھر کیا تھا ہر دوسرے دن عبداللہ کی بہن یا ماں بغیر اطلاع کے آدھمکتیں اور پھر عجیب عجیب سی باتیں کرتیں اسی دوران عبداللہ کے گھر والوں کے روئے کچھ کچھ بگڑنے لگے۔ لیکن کیونکہ میری ماں بھی نہیں تھیں اور ویسے بھی ہمارے معاشرے میں لڑکی کو جس کے ساتھ ایک دفعہ منسوب کر دیا جاتا ہے تو پھر وہ اسی کی ہو کر رہتی ہے۔ بس منتفی کر دیا جاتا ہے تو پھر وہ اسی کی ہو کر رہتی ہے۔ بس منتفی کے دوران ہی کچھ ملنے والوں اور ادھر ادھر کے لوگوں سے پتہ چلا کہ عبداللہ کی پہلی بیوی بھی ان لوگوں کے

ظلم و ستم سے تنگ تھی۔

دوسری طرف پھوپھو بھی ناراض تھیں کہ میرے بچے کو تنہا کر شادی شدہ اور ایک بچے کے باپ کو اتنی خوب صورت بیٹی دے دی۔ شادی کے دن قریب آگئے زاہدہ بھی پچھلی لے کر آ گئی اور شادی کی تیاری میں بھرپور شرکت کی۔ شام میں سب بینیں اور سہیلیاں ڈھولک بجا کر گیت گائیں اور خوب ہلہ گلہ کرتیں اور مجھے چھیڑتی تھیں میری کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ پیادیں جانے کی خوشی اور میکہ چھوٹنے کا غم، سب ملا جلا تھا۔ آج بھندری تھی۔ ان لوگوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم ان فضول رسموں میں نہیں پڑتے۔ صرف بارات کے دن ہی آئیں گے۔ اور پھر شادی کا دن آن پہنچا جس سے سب لوگ مصروف نظر آ رہے تھے بارات کے استقبال کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ کھانا وغیرہ بھی تیار ہو چکا تھا باقی انتظامات بھی مکمل ہو چکے تھے۔ بارات آنے کا ٹائم بھی ہونے کو تھا۔ آہستہ آہستہ سب مہمان بھی آگئے اپنے مقررہ وقت سے کچھ دیر بعد بارات آئی بہت زبردست استقبال کیا گیا۔ سب کچھ بہت اچھا ہوا۔ پھر نکاح کا ٹائم ہو گیا۔ میرے چچا بھائی اور ماموں قاضی صاحب کے ہمراہ مجھ سے نکاح نامے پر دستخط کروانے کے لئے آئے۔ جب میں نے پین پکڑا تو دل دوسو کی سیڈ سے دھڑک رہا تھا اور ایک ہی لمحہ میں میں پرانی ہوئی۔ مجھے زاہدہ وغیرہ نے دہن بنایا اور جس نے بھی دیکھا یہی کہا کہ نظر نہ لگ جائے ماشاء اللہ چاند کا ٹکڑا ہے اتنا روپ کسی کسی پر آتا ہے۔ غرضیکہ سب نے اپنے اپنے کونٹیں دے دیے۔ آخر سب کی دعاؤں میں میں رخصت ہو کر پیادیں سدھاری۔ شام سے کچھ دیر پہلے تھوڑے سے سفر کے بعد ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔ گھر پہنچ کر سب سے پہلے ایک درمیانے سے دروازے سے گزر کر ایک راہ داری میں پہنچ گئے وہاں سے گزر کر ایک بڑا سا سخن آ گیا۔ اس میں ایک لکڑی کا تخت پوش

پڑا تھا جس پر مجھے بٹھا دیا گیا۔ چونکہ میں نے عبداللہ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لئے پتہ نہ تھا کہ وہ کون سے ہیں۔ میں کچھ دیر بعد بڑی ریلیکس ہو کر بیٹھ گئی تو میری چھوٹی نند آئی اور کہنے لگی کہ بھابھی کچھ کھوٹھٹ نیچے کر لیں بھائی جان سامنے بیٹھے ہیں۔ میں بہت ہی شرمندہ ہوئی اور شرم سے خود بخود ہی سر جھک گیا۔ گھر پہنچ کر سب سے پہلے تو ساس صاحبہ نے منہ دکھائی میں سلامی دینے کی بجائے کہا کہ یہ زیورات دے دو کسی کے ہیں آج ہی واپس کرنے ہیں۔ میں تو ہکا بکا رہ گئی کیونکہ ہمارے خاندان میں بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ پھر مندوں نے بھی اپنے رنگ دکھانے شروع کر دیے۔ بڑی بہن چھوٹی سے کہنے لگیں کہ چلو شہناز اچھا ہوا کہ بھابھی گھر آ گئی کچھ آرام تو ملے گا تمہیں۔ سارا دن کام کر کر کے تھک ہی جاتی تھی۔ میری معصوم بہن۔ بھابھی اب تم اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور گھر کے کام کاج خود کرنا اس بے چاری کو نہ ہر وقت کاموں میں لگا دینا میکے والے لاڈا بھول جاؤ۔ شادی کے بعد کوئی اتنے لاڈ نہیں اٹھا تا جو لڑکوں کے حساب سے جینز لاتی ہیں وہ بھی سسرال میں ذرا دب کر ہی رہتی ہیں اور تم تو بس مناسب ہی لاتی ہو۔ کوئی پر پرزے نکالنے کی کوشش نہ کرنا۔ سمجھیں!

اتنے میں کچھ لڑکیاں اور عورتیں آ گئیں کہ دہن دیکھنی ہے تو میں حیران ہی ہو گئی۔ کہ میری نند جو ابھی کچھ دیر پہلے زہرا گل رہی تھی اس کی زبان سے یہ امرت کس طرح ٹپک پڑا کہ میری بھابھی تو لاکھوں میں ایک ہے۔ ہمارا گھر تو کسی جنت سے کم نہیں۔ پتہ نہیں ہماری کون سی نیکی ہمارے آگے آئی جو ہمیں اتنی اچھی بھابھی ملی یہ تو ہمارے گھر کی زینت ہے۔ راج کرے گی اس گھر پر۔

اور وہ عورتیں رشک بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں اور میں ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔



رات ہوگئی نہ کوئی کھانا نہ کوئی ولیمہ کی تیاری ایسے لگتا ہی نہیں تھا کہ کچھ گھنٹے پہلے یہاں دلہن آئی ہے یا اس گھر میں شادی ہوئی ہے کوئی ہلہ گلہ نہیں تھا۔ پھر میری چھوٹی نند نے آواز لگائی کہ زہرہ وہ پیچھے والا کمرہ تمہارا ہے ادھر چلی جاؤ اور سو جاؤ میں بڑی حیران ہوئی۔ کچھ ویسے دہن بنے ہوئی شرم آ رہی تھی کچھ جگہ بھی نئی تھی ابھی میں سوچ رہی تھی کہ بڑی نند بڑے ہی کرخت لہجے میں بولیں۔ اٹھ جاؤ! کیا رات بھر یہاں ہی بیٹھی رہو گی سب کے رنگ دیکھ کر بہت تکلف ہوئی لیکن ایک آس اب بھی دل میں تھی کہ کوئی بات نہیں عبد اللہ تو میرے جذبات کو سمجھ گا اور میرا ساتھ دے گا۔ کیونکہ ہم لوگوں نے تو ہمیشہ چچا تایا اور والد صاحب کو اپنی بیویوں کی عزت و احترام کرتے ہی دیکھا تھا اور عورتوں کی عزت کا سبق ہی دیتے ہوئے سنا تھا اور میں تو ان کی شریک حیات ہوں میری ایک دیورانی کو نجانے کیا خیال آیا کہ وہ آئی اور مجھے پکڑ کر کمرے کی طرف لے گئی۔ کمرے میں پہنچی تو کمرہ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ یہ دلہن کا کمرہ ہے۔ نہ بیچ نہ کوئی خوشبو بس میرے جھیز والے دونوں بیڈوں مختلف دیواروں کے ساتھ مخالف سمت میں پڑے ہوئے تھے اور سنگھار میز ایک کونے میں لگا ہوا تھا اور عبد اللہ کا پہلا بیٹا ایک بیڈ پر سویا ہوا تھا۔ کمرے کا ایک دروازہ ساس صاحبہ اور چھوٹی نند کے کمرے میں کھلتا تھا اور دوسرا سنگھار روم میں۔ کمرے میں کھانا پیسے والی کوئی چیز نہیں نظر آئی۔ ابھی کمرے میں آئے پندرہ بیس منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازہ کی کھٹک سنائی دی اور مجھے قدموں کی آواز آئی اور عبد اللہ کمرے میں داخل ہوئے میرا دل بڑے بڑے طریقے سے دھڑکنے لگا۔ دھڑکنیں تتر بتر ہونے لگیں۔

سارے سہانے سینے چھوٹے نظر آنے لگے۔ کمرے میں آنے کے بعد بڑے آرام سے عبد اللہ نے دروازہ بند کیا اور میرے قریب بیٹھے

ہوئے مجھ سے کہا کہ دیکھو زہرہ یہ تو تم جان ہی چکی ہو گی کہ میرے گھر میں کون کون ہے اور ان کے مزاج سے بھی تم جلدی ہی واقف ہو جاؤ گی اور مجھے امید ہے کہ ان کے ساتھ جلدی کھل جاؤ گی۔ کیونکہ میری امی اور چھوٹی بہن کی عادت ذرا کرخت ہے اور تم بہت ناز اور لاڈلوں میں پلی بڑھی ہو۔ کچھ وقت لگے گا لیکن تم انہیں اور وہ تمہیں سمجھنے لگیں گی۔ میری پہلی شادی بھی اسی لئے ناکام ہوئی کہ میری بیوی اور میری بہن کا آپس میں ہر وقت لڑائی جھگڑا رہتا تھا اور قصور کسی کا بھی ہوتا۔ پستان میں ہی تھا اگر بہن کی طرف لڑائی کرتا تو بیوی ناراض اور اگر اس کا ساتھ دیتا تو ماں بہن کی ناراضگی آڑے آ جاتی۔ غرض یہ کہ ہر وقت میدان جنگ گرم ہی رہتا۔ اگر کسی کو سمجھانے کی کوشش کرتا تو میری سختی آ جاتی۔ اسی دوران زہیب پیدا ہوا لیکن حالات ٹھیک ہونے کی بجائے مزید بڑھ گئے اور پھر آخر ہماری علیحدگی ہو گئی۔

یہ بات مجھے اس وقت پتہ چلی کیونکہ ہمیں یہ کہا گیا تھا کہ عبد اللہ کی پہلی بیوی انتقال کر چکی ہے۔ یہ تو عبد اللہ نے مجھے اس لیے کہا کیونکہ انہیں بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ ان کی ماں اور بہنوں نے ہم لوگوں سے جھوٹ بولا ہے۔ میرے خوابوں کا کل تو چکنا چور ہو گیا۔ پھر عبد اللہ نجانے کیا کچھ کہتے رہے اور میں بت نہی سچھی رہی۔

پھر زہیب نیند میں رونے لگا تو اس کی آواز سے میں ایک دم اس دنیا میں لوٹ آئی۔ عبد اللہ نے زہیب کو تھپتھپا کر دوبارہ سلا دیا۔ پھر کہنے لگے کہ مجھے یقین ہے کہ تم پڑھی لکھی بھی ہو اور اپنے خاندان کی بھی۔ تم ان کے ساتھ ایڈجسٹ ہو جاؤ گی! کچھ وقت تو لگے گا لیکن انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور تم زہیب کو ماں کا بچا رو دو گی۔“

صبح کے پانچ بج رہے تھے میں جلدی سے اٹھی اور نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے لیے بہت سی دعا میں

کہیں کہ اے اللہ میں نے جو وعدے عبد اللہ سے کئے ہیں مجھے ان پر پورا اترنے کی ہمت عطا فرمائے۔ یہی وہ لالہ لالی سی طبیعت جو کہ لاڈلوں کی وجہ سے زیادہ بنی بکری ہوئی تھی ایک ہی رات میں جانے کدھر ہوا ہو گئی اور میں بڑی خدمت گزار بہو کی طرح چکن کی سمت آ گئی کہ ساس کو بیڈنی وغیرہ بنا کر پیش کروں حالانکہ گھر میں میں نے بھی چائے بنانا تو درکنار کبھی کچن میں جانا بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کیا تھا۔ اگر امی کبھی نہیں کہ کوئی کپ یا برتن ڈھونڈ لگے گھر جا کر دھونا پڑیں گے تو میں کہتی کہ امی کوئی بات نہیں ہم کھانا کھانے کے بعد توڑ دیا کریں گے لیکن دھونے کا جھنجھٹ نہیں کرنے گی۔ لیکن یہاں تو سب کچھ ہی کرنا پڑتا تھا۔ خیر میں چکن میں پیچنی تو چینی کافی بڑا تھا لیکن کمرہ نہ تھا کوئی ایک کونے میں ڈولی برتنوں والی پڑی تھی اس کے ساتھ ہی نوکری میں دھوئے ہوئے برتن رکھے ہوئے تھے جس میں مجھے کپ جلدی ہی نظر آ گئے سانسے کی طرف چولہا تھا اور پورے کچن کی طرف لگا ہوا تھا جس پر مایوس اور دیگر ضروری چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ جن میں چھری چمنا وغیرہ شامل تھا۔ چکن کے ایک کونے میں پانی کا نلکا بھی لگا ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ برتن وغیرہ وہاں ہی رکھ کر دھوئے جاتے ہیں۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو ایک طرف دروازے کے پیچھے دیکھے اور تیلے نظر آئے میں نے ادھر سے ہی چائے کے لیے ایک ساس پین لیا اور من کپ چائے بنانا شروع کر دی۔ سانسے والی ڈولی من کپ کافی سارے ڈبے بھی نظر آ رہے جیسے کہ میرا عوارہ تھا کہ پانی میں پیچنی اور پتی ڈالنے کے بعد کافی اڑیک جاتے تو پھر دودھ ڈالتے ہیں۔ خیر میں نے لالہ لالی کیا اور جو ڈبے سانسے نظر آ رہے تھے ان میں سے پیچنی اور پتی ڈھونڈ نکالی لیکن جب ٹپوہ پک گیا تو ٹپوہ مرحلہ یہ تھا کہ دودھ کہاں ہوگا تو میں نے دیکھا تو ایک طرف چھوٹا سا فریج رکھا تھا۔ کھلنے پر ایک جگہ

دودھ والا نظر آیا۔ حیرت تو بہت ہوئی کیونکہ ہمارے گھر میں دودھ وغیرہ کافی مقدار میں ہوتا تھا اور یہاں ایک جگہ نظر آیا شاید یہ کل والا ہی ہو۔ بہر حال میں نے چائے بنائی چونکہ ابھی مہمان بھی گھر میں موجود تھے اور آج ولیمہ کا دن تھا اور ابھی تک سب لوگ سوئے تھے۔ میں چائے لے کر امی کے کمرے میں پہنچی تو بجائے امی خوش ہونے کے کہنے لگی۔ ”ارے ارے یہ تم نے کیا کیا تم میں ذرا بھی تمیز نہیں کہ کوئی کام کرنے سے پہلے بڑوں کی اجازت لینی ہوتی ہے۔“ نند بھی اماں کی آواز سن کر نیند سے بیدار ہو گئیں۔ میں نے کہا کہ باجی آپ کے لئے بھی بیڈنی لائی ہوں تو پہلے وہ تیوریاں چڑھا کر غصے سے مجھے دیکھنے لگیں پھر بولیں یہ جو تم دودھ وغیرہ ضائع کر آئی ہو اس کا کیا ہوگا۔

میں تو ہکا بکا رہ گئی یہ کیا ہو گیا۔ میرے سارے خواب بے دردی سے نوچے گئے تھے۔ کچھ تو رات کو عبد اللہ کی باتیں اور کچھ اس وقت ان کے رویے۔ میں تو چائے رکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور بہت ہی رونی۔ زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ عبد اللہ نے بھی بجائے امی اور آپا کو کچھ کہنے کے مجھے ہی کہا کہ چائے اگر بنائی ہی تھی تو امی یا آپا سے پوچھ لیا ہوتا۔ ان سب نے اتنی چھوٹی سی بات کا اتنا ایشو بنالیا اور عبد اللہ نے بھی ان ہی کا ساتھ دیا۔

”دو پہر تک تیار ہو جاؤ ابھی خیر سے تمہارے میکے والے آتے ہوں گے۔“ یہ ولیمہ تھا۔ مہمان آنے شروع ہو گئے۔ پھر چچی پھوپھو اور سب بہنیں اور کزنز بھی آئے لیکن میرے سرال والوں نے کوئی اچھا ریپاس نہ دیا۔ سب لوگوں نے ان سب کے رویے محسوس تو کر لئے لیکن اظہار نہ کیا لیکن واپس جا کر میری پھوپھیاں اور چچی اماں جی سے کہنے لگیں کہ اس سے اچھا تھا کہ آپ بیٹی کو کسی کھائی میں دھکا دے دیتے۔ ان لوگوں کے بیچ میں رہ کر تو زہرہ ہر روز جیسے



گی اور ہر روز مرے گی۔  
پھر ہر روز کا معمول بن گیا کہ ہر وقت گھر میں لڑائی

جھگڑا رہنے لگا کھانے کے وقت چائے کے وقت  
سونے کے وقت غرض یہ کہ ہر وقت لڑائی رہنے لگی اگر

میں میکے جانے کا ہتھی تو بھی لڑائی ہونا شروع ہو جاتی  
کہ شادی کے بعد میکے کو بھول جانا چاہئے۔ اگر ان

میں سے کوئی آ جاتا تو بھی ان کے ساتھ بہت برا  
سلوک کیا جاتا۔ چونکہ زائدہ سے میری دوستی تھی وہ اب

بھی پڑھ رہی تھی اور جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ وہ  
ہوشل میں رہتی تھی اگر وہ بھی گھر آتی تو مجھ سے ملنے

ضرور آتی تو بھی سب کو اعتراض ہوتا اور ہم دونوں کو  
بھی ایک منٹ کے لیے بھی اکیلا نہ چھوڑا جاتا کوئی نہ

کوئی ہمارے ساتھ ضرور رہتا اور تو اور زوہیب کو بھی  
میرے خلاف کیا جاتا۔ اس کو سب یہ کہتے کہ یہ تمہاری

سوتیلی ماں ہے۔ اس کو سوتیلی ہی کہ جگہ رکھو۔ اس  
معصوم بچے کا ذہن بھی خراب کر رہے تھے بھی اس کو

کہتے کہ ابو کے ساتھ رہا کرو۔ ورنہ وہ تم سے تمہارے  
ابو کو پھین لے گی اور جب ابو گھر آئیں تو بتایا کرو کہ یہ

تم کو مارنی بھی ہے اور ڈانٹ ڈپٹ بھی بہت کرنی  
ہے۔

عبداللہ کو بھی ہر وقت میری طرف سے بہت ہی  
بدظن کیا جاتا۔ اسے تو کوئی کام نہیں آتا۔ سارا دن ہم

لوگوں کو ہی کام کرنا پڑتا ہے عبداللہ کے ایک دوست  
ڈاکٹر تھے ان کی بیوی چچی ڈاکٹر تھیں وہ اکثر ہمارے گھر

آتی تھیں میں ان کے لئے چائے بنانے چن میں گئی  
۔ میری ساس ان سے باتیں کرنے لگیں جب چائے

وغیرہ سے فارغ ہوئے تو وہ بھی پیٹھی ہوئی تھیں تو میری

ساس نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئی تو مجھ سے پوچھنے

لگیں کہ میری طبیعت وغیرہ کیسی ہے تو میں نے بتایا

کہ ٹھیک ہوں بلکہ عبداللہ تو ہر روز مجھے طاقت کی دوائی

بھی دیتے ہیں تاکہ کام وغیرہ کی وجہ سے کمزوری نہ

ہو جائے۔ وہ کہنے لگی۔

”ارے یہ قوف لڑکی آئندہ دوائی مت کھانا۔“

لیکن بھابھی عبداللہ تو ہر روز مجھے خود پاس کھڑے

ہو کر کھلاتے ہیں۔“

”آئندہ ادھر ادھر پھینک دینا۔“

”لیکن کیوں بھابھی؟“

ارے یہ سب گھر والے چاہتے ہیں کہ

عبداللہ کا بس ایک بیٹا زوہیب ہی کافی ہے۔ اگر اور

اولاد ہوگی تو اس کی توجہ بٹ جائے گی اور وہ بچوں میں

مصروف ہو جائے گا اور گھر میں اور زوہیب پر توجہ نہیں

دے گا۔“

میں ڈاکٹر بھابھی کی باتیں سن کر بہت پریشان

ہوئی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ مجھے یہ سب

سن کر دکھ بھی بہت ہوا لیکن کر کیا کرتی تھی۔

میں نے بھابھی کا شکریہ ادا کیا اور نماز پڑھ کر بھی

یہی دعا کرنے لگی۔ کہ اے اللہ تو میری مدد فرما۔

کچھ دن ہی گزرے تھے کہ میری طبیعت خراب

رہنے لگی۔ پھر ڈاکٹر بھابھی کو ہی گھر بلا دیا گیا سب کو یہ

شک تھا کہ میرا بلڈ پریشر لو ہو گیا ہے۔ خیر بھابھی نے

سب کو کمرے سے باہر بھیج دیا اور میرا مکمل چیک اپ

کیا۔ پھر پتہ چلا کہ میرا پاؤں بھاری ہے میں تو بہت

خوش تھی۔ ظاہری طور پر تو سب خوشی کا اظہار کر رہے

تھے لیکن میں یہ بات جانتی تھی کہ سب لوگ اندر اندر

سے بہت ناراض تھے عبداللہ سے بھی اور مجھ سے

بھی۔ دے دے الفاظ میں ساس صاحبہ نے احتجاج

بھی کیا۔“

”زوہیب ہی کی پرورش اچھی طرح کر لو۔ تو بڑی

بات ہے۔ اور بچے کیا کرنے ہیں۔“ عبداللہ نے بھی

ان کی باتوں پر کان دھنا شروع کر دیئے۔ لیکن پھر

بھابھی نے عبداللہ سے خود بات کی اور کہا کہ اب اگر

آپ لوگوں نے کوئی ایسا قدم اٹھایا تو زہرہ کی زندگی

بھی جاسکتی ہے۔ اس لئے ایسا ہرگز نہیں کرنا۔ عبداللہ تو

یہ بات سمجھ گئے لیکن گھر والوں کو سمجھنا بہت مشکل تھا۔

ایک ہر روز دوائی لڑائی کے لئے گھر والوں کو ایک ٹاپک  
مل گیا۔ پھر ایک دن میری ساس کا موڈ میرے ساتھ

بڑا اچھا تھا کہنے لگیں۔

”آج کھانا میں خود بناتی ہوں۔ تم آرام کر لو۔“

میں بڑی خوش ہوئی کہ میری محنت رنگ لے آئی اور

میری خدمت گزار سے میری ساس کا رویہ میرے

ساتھ اچھا ہو گیا لیکن میں غلطی کھانا کھاتے ہی میری

حالت گڑنے لگی۔ مجھے ڈاکٹر بھابی کے کلینک لے جایا

گیا اور وہاں مجھے داخل کر لیا گیا اور داخل ہونے کے

بعد کچھ ٹیسٹ وغیرہ ہوئے تو پتہ چلا کہ میں نے کوئی

غلط چیز کھائی ہے جس کی وجہ سے ایسا ہوا ہے اور میں

نے تو صرف کھانا ہی کھایا تھا جو کہ میری ساس نے مجھے

دیا تھا۔ اگر کبھی میں بہت کم کوئی فروٹ یا کوئی اور چیز

کھانے کو دل چاہ رہا ہے تو میری ساس کہتی کہ ہم پر بھی

ایسا ناظم گزارا ہے ہم نے تو بھی خیر نہیں کیا۔ پھر

میں چپ ہی کر جاتی اگر کبھی مینے دو مینے کے بعد میکے

جالی تو ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا تھا اور اگر کبھی عبداللہ

سے کہتی تو کہتے کوئی بات نہیں اسی وغیرہ تو ویسے ہی

آؤٹنگ کے لئے تمہارے ساتھ چلی جاتی ہیں۔

زوہیب بھی ساتھ ہی ہوتا تھا۔

میری صحت دن بدن گرتی ہی جا رہی تھی۔ ایک تو

سارا دن گھر کا کام کرنا کھانا پکانا کپڑے دھونا دوسرا

ہر وقت ساس مندوں کے طعنے سننا۔ جبکہ شادی سے

پہلے تو بھی کسی کام کے کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا اور

اب چپ چاپ سارے کام کرنا ہی پڑتے اور پھر بھی

گھر والے خوش نہیں تھے۔ ہر کام میں نقص ہی نکالتے

تھے۔ دوسری طرف سارا دن کام کاج کی وجہ سے تھک

جاتی تو رات کو دل چاہتا کہ فوراً سو جاؤں۔ عبداللہ بھی

ہمارے دن کے چٹکے ہارے آتے تو میں ان کو بھی

ٹھیک طرح سے ناظم نہ دے پاتی تو وہ بھی مجھ سے خفا

رہنے لگے۔

میری شادی کو دس مہینے ہو چکے تھے لیکن گھر والوں

کا رویہ ابھی تک غیروں والا تھا۔ کسی بات کو میرے

سامنے ڈسکس نہ کرنا ہر بات چھپانا میں بہت کمزور

ہو گئی تھی اور اکثر میرا بلڈ پریشر کم ہو جاتا تھا۔

ایک دن میری طبیعت خراب ہو گئی۔ عبداللہ نے

جا کر امی سے کہا کہ زہرہ کو ہسپتال لے جانا ہے۔ اس

کی طبیعت خراب ہے آپ تیار ہو جائیں تو امی کہنے

لگیں۔ ”اس نے تمہیں بتایا ہے تو تم ہی لے جاؤ

۔ ہمیں نہ تو اس نے بتایا اور نہ ہی جانے کو کہا ہے۔“

اس بات کو لے کر ایک نیا معرکہ شروع ہو گیا۔ صبح 6 بج

رہے تھے میری جان پر بنی ہوئی تھی اور ان ماں بیٹی کی

لڑائی جاری تھی۔ پھر فیصلہ یہ ہوا کہ زہرہ امی سے معافی

مانگے کہ غلطی ہو گئی کہ عبداللہ سے پہلے مجھے آپ کو بتانا

چاہئے تھے۔ مجھ سے معافی منگوانا تو ان کا روز کا

معمول تھا۔ بھی کبھی توجی چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ

کر واپس میکے چلی جاؤں لیکن پھر ابا جی اور چھوٹی

بہنوں کا خیال آ جاتا کہ بوڑھے والد صاحب ہیں اور

چھوٹی بہنوں کی ابھی شادی ہونا ہے میری وجہ سے ان

کی زندگیاں خراب نہ ہو جائیں۔ پھر سوچتی کہ خود کسی

کر لوں تاکہ جان چھوٹ جائے لیکن پھر خیال آتا کہ

حرام کی موت سے یہ زندگی ہی ٹھیک ہے شاید حالات

کبھی ٹھیک ہو جائیں۔ اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ

عبداللہ کی پہلی شادی ناکام کیوں ہوئی ہے نہیں تو کوئی

ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے سے الگ کرنے کی

روادار نہیں ہوتی۔ میں نے امی سے معافی مانگی تو اس

کے بعد پھر ہم ہسپتال گئے۔ وہاں پہنچ کر کچھ دیر بعد

میں نے ایک خوب صورت بیٹی کو جنم دیا۔ اس وجہ سے

بھی میری ساس کا موڈ آف ہو گیا کہ بیٹی کیوں ہوئی۔

شاید وہ اس آس میں تھے کہ پوتا ہوگا۔ بیٹی بالکل میری

ڈیوٹن کی تھی بہت ہی خوب صورت۔

میری ساس نے تو اتنا غصہ کیا کہ میرا مارے بھوک

کے برا حال تھا اور ظالم عورت مجھے کھانے کو کچھ نہیں

دے رہی تھی۔ بس یہ ہی کہتی جا رہی تھی کہ



میں کیا کروں عبداللہ آئے گا تو کچھ لے آئے گا۔ شام کے چار بج گئے لیکن عبداللہ نہ آیا۔ آخر شام کو میں ڈسچارج ہو گئی اور گھر آ کر مجھے روٹی کھانا نصیب ہوئی۔ اب کوئی میری بیٹی برشا کو دیکھنے آتا تو میری ساس کو بہت ناگوار گزرتا۔ میری بہنیں بھی برشا کو دیکھنے آئیں تو میری منہ ان سے خوب لڑائی کی اور کہا کہ ہمارے بھائی کو چھوٹی سی عمر میں بیٹی جیسی مصیبت پہلے پڑ گئی۔ پھر میری سختی کے دن شروع ہو گئے کیونکہ میں ایک بیٹی کی ماں بن گئی تھی۔ ویسے عبداللہ بہت خوش تھے ان کا کہنا تھا کہ بیٹا تو پہلے سے ہے ہمارا اور اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں بیٹی بھی عطا کر دی ہے بیٹی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے۔

زوہیب بھی بہن سے بہت پیار کرتا تھا لیکن اس کی پھوپھی اور دادی پوری کوشش کرتیں کہ زوہیب برشا کو پیار نہ کرے۔ وقت اتنی تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ زوہیب صبح اسکول چلا جاتا عبداللہ اپنے کام پر چلے جاتے۔

برشا تین ماہ کی ہوئی تو بہار بنے گی۔ سردی کا موسم تھا میں سارا دن کام کاج میں لگی رہتی۔ بے احتیاطی کی وجہ سے برشا کو شدید قسم کا انفلیشن ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد میری طبیعت بھی خراب رہنا شروع ہو گئی گھر میں ایک نیا محاذ کھل گیا۔ میری ساس نے کہا کہ اپنے بچے کو اور الگ گھر میں رہو۔ میں بہت روٹی گزرائی کہ ایسا نہ کریں میں علیحدہ نہیں ہونا چاہتی۔ آپ کے ساتھ رہ کر آپ کی خدمت کرتا چاہتی ہوں۔ شام کو جب عبداللہ گھر آئے تو پھر کھانے کی میز پر میری ساس کہنے لگیں کہ کل سے آپ لوگ اپنا بندوبست کر لو ہمارے ساتھ گزارا مشکل ہے۔

خیر ہم لوگ قریب ہی ساتھ والی گلی میں کرائے کا ایک چھوٹا سا مکان لے کر الگ ہو گئے۔ پھر یہ روٹین تھی کہ عبداللہ کام پر جاتے ہوئے بھی امی کی طرف چکر لگا کر جاتے اور واپسی پر بھی ادھر سے ہو کر واپس

آتے۔ اب میری ساس نندیہ برداشت نہیں کر پاری تھیں کہ ہم خوش و خرم زندگی کیوں گزار رہے ہیں۔ اب انہوں نے پھر عبداللہ کو میرے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ میری عادت تھی کہ جب کچھ نئی چیز پکائی تو پہلے امی کو دے کر آتی پھر بچوں کو دیتی۔ ویسے عبداللہ کو اب اپنے گھر والوں کی کافی حد تک سمجھ آنا شروع ہو گئی تھی۔ اکثر عبداللہ سے جب گھر والے عجیب عجیب باتیں کرتے تو وہ گھر آ کر مجھ سے دبے دبے الفاظ میں کہتے کہ تم امی کی طرف ذرا کم جایا کرو۔ تم ٹھیک بھی نہیں رہتی اور زوہیب کو اسکول کا کام بھی کروانا ہوتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد میں نے ایک خوب صورت بیٹے کو جنم دیا۔ عبداللہ کے تو قدم ہی زمین پر نہ ٹک رہے تھے وہ بہت خوش تھے۔ امی وغیرہ کو اطلاع دی تو خوش ہونے کی بجائے انہوں نے بڑی الجھن باہل شروع کر دیں۔

میری چھوٹی بہن باجرہ آج کل میٹرک کے امتحان دے کر فارغ ہو چکی وہ کچھ دن میرے پاس آ گئی لیکن امی وغیرہ کو یہ بھی پسند نہ آیا۔

پھر نام گزرنے کے ساتھ بچے بڑے ہونے لگے۔ زوہیب برشا اور احمد تینوں اسکول جانے لگے۔ عبداللہ نے بھی اپنا کاروبار شتر کہ سے الگ کر لیا تھا۔ اب ہم لوگوں نے اپنا گھر بھی بنالیا تھا اور اب جبکہ ہم الگ بھی رہتے تھے تو جس دن اپنے گھر میں شفٹ ہونا تھا تو میں نے پہلے امی کو کہا کہ آپ ہمارے گھر آئیں پھر ہم لوگ آئیں گے۔ (لیکن آج بھی امی کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے کہ جس دن اپنا ذاتی ایک کمرہ بھی بناؤ گی اسے دیکھ لوں گی۔) لیکن آج اللہ تعالیٰ کے حکم اور کرم نوازی سے میرا بڑا بھائی تیار ہو گیا اور آج بھی امی نہیں آئیں۔ شاید ان کو اپنا رویہ یاد آ گیا پھر بھی میری اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مکی کہ میں اپنی ساس کی خدمت کروں۔

میری ساس ان لوگوں سے کہتی ہیں کہ میری

بہو بری نہیں تھی میں نے اس پر ظلم کیے اور اپنی بیٹیوں کے کہنے میں آ کر زہرہ کو برا بھلا کہا۔ زہرہ نے اولاد کے ساتھ بڑی محنت کی ہے۔ زوہیب کو بھی محسوس نہیں ہوا کہ زہرہ اس کی ماں نہیں ہے۔ اس نے بچوں کی تربیت ایسی اچھی کی کہ احمد اور برشا کو تو یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ ان کا سوتیلہ بھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زہرہ کو صبر کا پھل دیا ہے کہ اس کی اولاد بعد زوہیب کے بہت نیک اور فرمانبردار لائق اور محنتی ہے۔

وقت ایسا تیزی سے گزر گیا کہ پتہ ہی نہیں چلا لیکن میری چھوٹی منہ سے جتنا بھی ہوسکا اس نے اپنے وار جاری رکھے۔ اب زوہیب کی ماں کو کسی کے ہاتھ پیغام بھیجنا شروع کر دیئے کہ تم زوہیب کو واپس کیوں نہیں لے لیتیں تمہارا بیٹا ہے۔

سچ کہتے ہیں کہ پیدا کرنے والے سے پالنے والے کا حق زیادہ ہوتا ہے۔ زوہیب کو سب کچھ معلوم تھا اور اس نے سبھی اپنی ماں کے بارے میں نہیں پوچھا بلکہ اگر کوئی اس موضوع پر بات بھی کرے تو وہ کہتا ہے کہ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے امی کو ہی دیکھا ہے اور انتہا سے زیادہ پیار کرنے والی ماں ہیں میری ماں.....

اب وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا میں اکثر زوہیب کو اس کی امی سے ملنے کے لئے بھیجتی۔ جس کا علم کسی کو نہیں تھا عبداللہ کو بھی نہیں۔ کیونکہ لوگوں سے پتہ چلتا کہ اس کی ماں کا گھر اجاڑنے میں زیادہ ہاتھ اس کی دادی اور پھوپھیوں کا تھا۔ پھر میں یہ سوچتی کہ وہ ماں ہے۔ آخر اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہوگا۔ اسے بھی اپنے بیٹے کی یاد تو آتی ہوگی اور اللہ تعالیٰ زندگی دے زوہیب کہتا کہ امی میں صرف آپ کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے جاتا ہوں ورنہ میرے دل میں ان کے لئے نہ تو کوئی پیار ہے اور نہ ہی کوئی جگہ۔ جب وہ گئی تھیں تو ابو وغیرہ کے کہنے کے باوجود مجھے ساتھ نہ لے کر گئیں اس وقت بھی تو میں ان

کا بیٹا ہی تھا۔

زوہیب نے سی اے کیا اور بینک میں اعلیٰ عہدے پر ہے۔ اس کی شادی میں نے اس کی مرضی کے مطابق اپنے رشتے داروں میں کی ہے۔ میں نے اس سے بہت کہا کہ اگر تم اپنی امی کی مرضی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو بے شک کر لو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن زوہیب نے کہا کہ اس ٹاپک کو یہاں ہی ختم کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

برشا بھی اپنے گھر کی ہو گئی ہے میرا داماد ارسلان ایک پراپوٹ فرم میں ہے۔ بڑا ہی اچھا اور فرمانبردار بچہ ہے۔ اس کے بھی دو بیٹے ہیں اور اس کی ساس سر بھی اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میری بیٹی اپنے ساس سر کی خدمت کرتی ہے اور ان کی دعا میں جیتی ہے۔ اس کے ساس سر بھی اس کی ہر وقت تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ایسے ہی خوش رہیں (آمین)۔

احمد کی شادی پچھلے سال زائدہ کی بیٹی سے کی ہے۔ اس کا بھی اللہ کے فضل سے ایک بیٹا ہے۔

اب میرے پوتے اور نواسے ہیں۔ میری بہو میں بہت ہی اچھی ہیں میں نے پہلے بیٹوں کے فلیٹ لئے پھر ان کی شادیاں کیں۔ ہمارے بیٹے اور بہو ہر روز ہمارے گھر ضرور چکر لگاتے ہیں۔ پوتے بھی بہت پیار کرتے ہیں۔ میں اور عبداللہ اکیلے رہتے ہیں بہت خوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ برائی سب باتوں کو بھول گئے ہیں اگر بہو بیٹوں نے نہیں جانا ہو تو بچے ہمارے ہاں آ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارا آئینہ بونے بونے بستا رہے۔ میری زندگی کسی اچھے خواب کی طرح گزر رہی ہے اور اللہ تعالیٰ کرے میں اسی طرح خوشیاں سمیٹتی رہوں (انشاء اللہ) آمین۔





# اس کی شخصیت

اے ایس صدیق

اب دیکھتے ہیں خوف پیدا کیسے ہوتا ہے۔

(۱) بچپن کی تربیت:

بچے اپنے والدین سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ وہ ماؤں سے زیادہ سیکھتے ہیں اگر ماں بچے کو راتی راتی مثلاً ”دیکھو تم دوڑھ نہیں چو گے تو بھوت آ جائے گا۔“ اسی قسم کے جملے بچے کے ذہن میں نامعلوم خوف پیدا کرتے ہیں۔ وہ بڑا ہونے کے بعد بھی اسی قسم کے خوف سے باہر نہیں نکل پاتا۔

کہتے ہیں افراد سے خاندان گھروں سے محلے اور معاشرے تربیت پاتے ہیں۔ اگر خاندان کے لوگ خوف زدہ ہوں تو پھر معاشرے میں بھی خوف کے سائے ضرور ملیں گے۔ یعنی خوف میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

اب دیکھیے جس طرح ہم نے لکھا کہ اعتماد کی دو قسمیں ہوتی ہیں اسی طرح خوف کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱) منفی خوف

(۲) مثبت خوف

منفی خوف:

منفی خوف تخریبی ہوتا ہے۔ یہ خوف شخصیت کو مخرب کرتا ہے۔ آدمی کو جسمانی اور ذہنی غواڑ میں پھنساتا ہے۔ دلوں میں فکروں اور اندیشوں کو ختم دیتا ہے۔

تعمیری خوف مثبت ہوتا ہے۔ یہ ہمارے لیے فائدہ مند ہوتا ہے۔ مثلاً خوف خدا..... مثلاً پولیس کا خوف، عزت و وقار کا خوف۔ یہ خوف ایسے ہوتے ہیں کہ ہم لاقانونیت اور برائیوں سے دور بھاگتے ہیں۔

خوف حقیقتاً ایک ہیجانی کیفیت ہوتا ہے۔ اس سے آپ کے اندر لرزہ بھی طاری ہو سکتا ہے، گھبراہٹ بھی ہو سکتی ہے سکتے بھی ہو سکتا ہے۔

اب تک ہم نے خوف کے بارے میں وہ باتیں بتائیں جو اس کا منبع اور سرچشمہ ہوتی ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ اس سے آپ کو کیا کیا نقصان ہو سکتے ہیں۔ لیکن صرف یہ جان لینے سے آپ کیسے تھوڑا سا فائدہ ہو سکتا ہے یعنی آپ کے علم میں کچھ اضافہ ہو جائے گا۔

سوال اہم یہ ہے کہ ہم کس طرح اس کی زہر بانی سے بچ سکتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا..... اس سے بچنے کے لیے ہمیں ب

پہلے خاندانی تربیت اور بچپن کی تربیت کی سمت دیکھنا ہوگا۔ کہنے سے جسٹن میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اگر خاندان کے افراد چاہتے ہیں کہ ان کے بچے بڑے ہو کر خوف زدہ شخصیت نہ بنیں تو انہیں اپنے وقت پر دل پر گہری نگاہ رکھنی ہوگی۔

ماں کو خصوصاً خیال رکھنا چاہئے کہ وہ بچوں میں خوف نہ سرايت کرنے دیں۔

۱۔ کبھی اپنے بچوں کو نامعلوم چیزوں سے نہ ڈرائیں۔

۲۔ کبھی وہ اپنے بچوں میں اعتماد کم کرنے کی کوشش نہ کریں۔

۳۔ بچوں پر ذمہ داری عائد کریں۔ ذمہ داری نبھانے کا طریقہ سکھائیں اور پھر انہیں آواز دلا کر کام کرنے دیں۔ ناکامی پر انہیں بتائیں کہ ناکامی کیوں ہوئی۔ انہیں بتائیں کہ وہ کس کس چیز پر توجہ نہیں دے سکے جس کی وجہ سے ناکامی ہوئی۔ انہیں دوبارہ میل کا نئے سے لیس کر کے پھر اسی کام پر لگا دیں۔

۴۔ بچوں کو ایسی کہانیاں سنائیں جو عزم اور ہمت کے واقعات کی ہوں۔

نپولین بونا پورٹ جب میدان جنگ کی طرف رواں تھا راستے میں اسے کوہ آپس کی بلندیاں آئیں۔ اس موقع پر اس نے کہا۔

”یہ پہاڑ تم کو راستہ دے گا..... اگر اس نے راستہ نہ دیا تو اسے کھود کر راہ سے ہٹا دوں گا۔“

یہ الفاظ وہی شخص کہہ سکتا تھا جو خود پر اعتماد رکھتا ہو۔ طارق بن زیاد نے اجیت فتح کرنے کے لیے اپنی کشتیاں جلادی تھیں اور اپنے سپاہیوں سے کہا تھا۔

”ہم یہاں فتح حاصل کرنے آئے ہیں واپس جانے کے لیے نہیں۔“ یہ الفاظ اس کے منہ سے اس بھروسے نے نکلوائے تھے جو اسے خدا پر تھا۔ جو اسے اپنے عزم اور اپنی صلاحیت پر تھا۔

۵۔ بچے جلتے جلتے گر جاتا ہے تو ماں باپ لپک کر بچے کی دل بونی شروع کر دیتے ہیں۔ ناز برداری کا یہ طریقہ بر وقت جاری رہتا ہے جبکہ ہونا چاہئے کہ بچے سے کہا جائے کہ وہ روئے چپے نہیں۔ چلنے میں آدمی بھی گہری گہری جاتا ہے۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں دوبارہ چلو..... اور سوچ کر چلو کہ گر جانے کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں۔

۶۔ یاد رکھیں۔ بچے عموماً تصوراتی دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ فرض کر لیتے ہیں اسی کو حقیقی سمجھتے ہیں لہذا ضروری ہے کہ ہمارا

برتاؤ ان کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ان کی تصوراتی دنیا زمین بوس ہو جائے اور ایسی چیزیں فرض کرنے لگیں جو نامعلوم ہوں اور وہ بے یقینی کی گرفت میں چلے جائیں۔

۷۔ والدین کو چاہئے کہ بچوں کو ایک دوسرے سے ڈرائیں نہیں۔ مثلاً یہ کہنا..... کہ تمہارا باپ بہت بری مار لگائے گا۔ وہ ایسا ہے وہ ویسا ہے۔

یہ جملے بچے کے لیے زہر قاتل ہوتے ہیں۔ وہ باپ کی سمت سے عدم تحفظ کا شکار ہو سکتا ہے۔

اسی طرح کسی بھی چیز سے بچے کو نہ ڈرائیں بلکہ فوائد اور نقصانات کی بات کریں اور یوں کہیں کہ تم نے یوں کیا تو تمہارا باپ تمہیں انعام دے گا۔

بچے میں خوف سے زیادہ انعام کی ترغیب کا عنصر ڈالیں تاکہ وہ اعتماد کے ساتھ قدم اٹھا سکے۔

۸۔ ماحول بھی افراد کو خوف میں مبتلا کرتا ہے۔ اگر آپ نے ایسے لوگوں سے میل جول رکھا جو بزدل ہیں تو پھر آپ بھی بزدل ہو جائیں گے۔ ایسے افراد کی صحبت جو مثبت انداز میں اپنے اندر دلیری اور بے باکی رکھتے ہوں خوش امید اور روشن ذہن کے ہوں..... آپ کو خوف سے بچاؤ میں کام آ سکتی ہے۔

بچے اپنے ماحول اور والدین میں رنگ جاتے ہیں اور والدین کو ایسے ہی رنگ میں رہنا چاہئے جو ان کے بچوں کے لیے غمہ خیز مثال ثابت ہو۔ یاد رکھیں حقیقتاً خوف کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا ہمارے واہموں اور سوچوں کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے اپنے اندر اعتماد پیدا کریں۔ جب تک آپ اعتماد کے حصار میں رہیں کہ خوف نزدیک نہیں آ سکتا۔ آپ کو زندگی میں کبھی بھار خطرات مول لینے ہی پڑیں گے لہذا خطرہ مول لیں۔ اسی سے آپ کے اندر جرأت پیدا ہوگی۔ مثلاً اندھیرے میں رہنے کا خوف طاری ہو..... تو پھر کسی روز اندھیرے میں گھمیں۔ بھلا کوئی قدم اٹھائے بغیر کوئی شخص منزل تک پہنچ سکتا ہے؟

اعصاب کی مضبوطی آپ کو خوف سے نجات دلا سکتی ہے۔ اس کا اہتمام کریں اپنی شخصیت کو خوف کے ذریعے مخ نہ ہونے دیں۔



شخصیت کو مخرب کرنے والی باتیں ایک دو نہیں بہت سی ہیں مگر اس وقت ہم صرف ایک کا ذکر کریں گے جسے خوف کہتے ہیں۔

خوف کیا ہے؟

خوف دراصل کسی چیز کے چھسن جانے کا احساس ہے۔ خوف عدم تحفظ کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایک ذہنی کیفیت ہوتی ہے۔ خوف آدمی میں کس طرح سرايت کرتا ہے؟

یہ دراصل بچپن کی تربیت وراثت اور ماحول سے جنم لیتا ہے۔ خوف میں آدمی اکثر متعدد محسوسات سے گزرتا ہے۔ مثلاً اُسے خطرہ لاحق رہتا ہے، کوئی مجھے قتل کر دے گا، کوئی میرے بچے کو اغوا کر لے گا، کوئی مر جائے گا۔ میں فلاں کام میں ناکام ہو جاؤں گا یہ کام نہیں ہوا تو یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا وغیرہ۔ ہر شخص کے اپنے اپنے خوف ہوتے ہیں۔ طالب علم کو امتحانوں کا خوف ہوتا ہے بادشاہوں کو غداروں کا چوروں کو سر ا کا ملازموں کو مالک کا باپ کو اولاد کے بگڑنے کا اور اسی طرح کے خوف۔

خوف پیدا کہاں سے ہوتا ہے؟

یہ عدم تحفظ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اعتماد کی کمی سے پھوٹا ہے۔ اعتماد کی کمی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

مثبت منفی

یوں سمجھیں خدایا پر اعتماد مثبت اعتماد ہے۔ آپ برائیوں سے دور رہتے ہیں اور قناعت اور مستقل مزاجی سے کام کرتے رہتے ہیں۔ منفی اعتماد شیطان کی مثال سے واضح ہوتا ہے جو اڑ گیا تھا کہ انسان کو مجھ نہیں کرے گا کہ وہ اس سے کم تر ہے۔







قطرے ایک کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پلائیں۔ مقصد حاصل ہونے تک دوا کا استعمال جاری رکھیں۔

ایچ ایس رجم یارخان سے لکھتی ہیں کہ واقعی اللہ نے آپ کے ہاتھ میں شفا دی ہے جس سے ہزاروں لوگ شفا یاب ہو رہے ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر کیل دانے نکلتے ہیں۔ دبا کر نکالنے سے نشان پڑ جاتے ہیں اور قبض کی شکایت بھی ہے۔ دوسرا مسئلہ میری امی کا ہے۔ ان کے پچھلے سر میں درد رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اعصابی کھنچاؤ اور درد بھی ہوتا ہے۔ بلڈ پریشر اور ہوتا ہے۔ محترمہ آپ GRAPHITIS-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں اور اپنی امی کو KALIPHOS-6X کی چار چار گولی تین وقت روزانہ کھلائیں۔

سو برا معلیٰ کراچی سے لکھتی ہیں کہ میرے بال اتنی تیزی سے گر رہے ہیں کہ بالوں کا چوتھا حصہ رہ گیا ہے اور دوسرا اہم مسئلہ بھی ہے۔

محترمہ آپ ACID FLUOR-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر صبح شام پی لیں اور SABALSERULATTA-Q کے دس قطرے دو پہر رات کو پی لیں۔

مسکان عارف والا سے لکھتی ہیں کہ میرے چہرے پر بال ہیں۔ آپ کا جو HAIR REMOVER ہے کیا اس کے لگانے سے ہمیشہ کے لیے یہ بال ختم ہو جاتے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ تیل کا نام منگوانے کا پتا اور مکمل خرچ منگوائیں۔

محترمہ آپ مبلغ 500 روپے کا مٹی آرڈر اوپر لکھے ہوئے اعجاز احمد پاک پین شریف کو دیئے گئے نام پتے پر ارسال کر دیں۔ آپ کو مکمل کورس دو بوتل پارسل کر دیا جائے گا۔ لکھی ہوئی ترکیب استعمال کے مطابق استعمال کریں۔ انشاء اللہ آپ کے چہرے سے بال مستقل

طور پر ختم ہو جائیں گے۔ اپنا مکمل پتا بمعہ قریبی فون نمبر کے ضرور ذکر کریں۔

ایس ایس ایچ رضوی کراچی آپ میرے کلینک پر تشریف لائیں۔ انشاء اللہ آپ کا مکمل علاج ہو جائے گا۔ سعیدہ لاہور سے لکھتی ہیں کہ چہرے کے بالوں کا آپ کا تیل استعمال کرتے ہوئے ابھی ایک ماہ ہوا ہے۔ فرق محسوس نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ میری کالی رنگت کے لیے JODUM-IM استعمال کیا۔ اس سے بھی فرق نہیں پڑا۔

محترمہ HAIR REMOVER کا استعمال جاری رکھیں۔ ملاکارواں ہوتا ہے تو بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ بال موٹے گھنے ہوتے ہیں تو کچھ وقت لگتا ہے۔ ترکیب کے مطابق استعمال جاری رکھیں۔ انشاء اللہ مایوسی نہیں ہو گی۔ اس کے علاوہ SARSAPARILLA-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔

ریحانہ کوثر بریڈ فورڈ سے لکھتی ہیں کہ HAIR REMOVER منگوانا چاہتی ہوں کیا آپ ڈاک کے ذریعے بھیج سکتے ہیں۔

محترمہ ڈاک کے ذریعے لیکوڈ بھیجنا اندرون ملک ہی کافی پریشانی کا باعث ہے آپ کو انگلینڈ کی طرح بھیج سکتا ہوں۔ کسی آنے جانے والے کے ذریعے ہی آپ اسے حاصل کر سکتی ہیں۔ جیسا کہ بہت سے لوگوں نے امریکہ فرانس انگلینڈ میں رہتے ہوئے اسے حاصل کیا ہے۔

عابد راؤ کراچی سے لکھتے ہیں کہ اتفاق سے آپ کا ہاتھ آ گیا۔ آپ کی صحت کا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ امید کرتا ہوں کہ میرے لیے بھی دوا تجویز فرمائیں گے۔

محترمہ آپ SELENIUM-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔ بیگم کو پیٹ کم کرنے کے لیے CALCIUM FLUOR-6X کی چار چار گولی تین وقت روزانہ

کھلائیں۔

راحیلہ کنول کراچی سے لکھتی ہیں کہ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ آپ نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ ایسے ہی خلق خدا کی مدد کرتے رہیں۔ چند سوالات کر رہی ہوں شائع کیے بغیر جواب دیں۔

محترمہ آپ کی دعاؤں کا شکریہ۔ آپ بالکل مطمئن رہیں قریبی دنوں میں دوبارہ مزید یہ دوا استعمال کر لیں اور اسماٹھ ہونے کے لیے CALCIUM FLUOR-6X کی چار چار گولی تین وقت روزانہ کھلائیں۔

عزیز تریت کچھ سے لکھتی ہیں کہ اپنی ماں، کزن اور اپنا مسئلہ لکھ رہی ہوں۔ آپ شائع کیے بغیر علاج بتائیں۔

محترمہ اپنی ماں کو COLCHICUM-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پلائیں اور اسی طرح کزن کو CAUSTICUM-30 استعمال کرائیں اور آپ خود

PHYTOLACCA-Q کے دس قطرے ایک کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔

رضیہ بانو فیصل آباد سے لکھتی ہیں کہ جس طرح آپ لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں اس کی توفیق اللہ کسی کسی کو دیتا ہے۔ میرا مسئلہ شائع کیے بغیر علاج بتائیں۔

محترمہ آپ SENECIO-3X کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔

ممنز اس محمود انگلینڈ سے لکھتی ہیں کہ مجھے بچپن سے سخت قبض کی شکایت ہے۔ آج تک اس کا علاج نہیں ہو سکا۔

محترمہ آپ HYDRASTIS-3X کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔

عروج خان راولپنڈی سے لکھتی ہیں کہ میرے چہرے پر تیل پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئی علاج بتائیں۔

محترمہ آپ THUJA-200 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر روزانہ صرف ایک مرتبہ پی لیں۔ ایک ہفتہ دوا کا استعمال کافی ہے۔

شبانہ سعید سکھر سے لکھتی ہیں کہ آپ کو پہلے خط لکھا تھا مگر جواب نہیں ملا۔

محترمہ فردری کے شمارے میں آپ کا جواب موجود ہے۔

ظہل ہما کراچی سے لکھتی ہیں کہ میں آپ کو کیا کیا تکلیف بیان کروں، کون سی ایسی تکلیف ہے جو مجھے نہیں ہے۔ علاج کرا کے تھک گئی ہوں۔ اب تو شوہر بھی طلاق کی دھمکی دیتا ہے مگر میں کیا کروں میں خود اپنی زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ خود کشی حرام ہے مگر اس حالت میں جینا بھی حرام ہے آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟

محترمہ آپ میرے کلینک پر تشریف لائیں۔ انشاء اللہ آپ کا مکمل علاج ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے شفا کی امید رکھیں۔

رخسار جمیل مٹلی سے لکھتی ہیں کہ میں نے پہلے بھی آپ سے مشورہ طلب کیا تھا۔ آپ نے جواب بھی دیا تھا جس کا میں بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں۔ مزید کچھ مسائل لے کر حاضر ہوں۔ شائع کیے بغیر دوا تجویز فرمائیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہو مو پتھک دوا سے ٹھیک ہونے کے بعد بیماری پھر سے شروع ہو جاتی ہے۔

محترمہ آپ MERC SOL6 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں اور GRAPHITIS-200 کے پانچ قطرے ہر آٹھویں دن ایک بار پی لیں۔ وقتی طور پر مرز کا دب جانا ایلو پتھک ادویات سے ہوا کرتا ہے۔ ہو مو پتھک مستقل علاج ہے۔ آنکھوں کے لیے کسی ایچھے ماہر چشم کو دکھائیں۔

فیروز علی کراچی سے لکھتے ہیں کہ مکمل حالات تحریر کر رہا



ہوں۔ مسئلہ شائع کیے بغیر علاج شائع فرمائیں۔

محترم آپ STAPHISAGARIA-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔

سیدہ کوثر روالبندی۔ محترمہ آپ پلسٹا کے بجائے BORAX-30 کے پانچ قطرے صبح شام اور OLIUMJAC30 کے پانچ قطرے دوپہر رات کو پی لیا کریں۔ کراچی میں آپ کا کوئی عزیز ہو تو اس سے کہیں وہ میرے کلنگ سے HAIR-REMOVER لے کر آپ کو بھیج دے۔

شبنم بی بی کو ہاٹ سے لکھتی ہیں کہ مسئلہ شائع کیے بغیر علاج بتائیں۔

محترمہ آپ BERBARIS AOUI-Q کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔

عارف عظیم چکوال سے لکھتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ ادویات سے قد بڑھنا ممکن نہیں ہے اگر ممکن ہے تو کوئی دوا بتائیں۔

محترمہ آپ CALCAREA PHOS-6X کی چار چار گولیاں تین وقت روزانہ کھائیں اور BARYTACAR B-200 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر ہر آٹھویں دن ایک بار پی لیا کریں اگر اچھی آپ کی عمر قد بڑھنے والی ہے تو ضرور بڑھے گا۔

محترم عبدالکی رحم یار خان! آپ بھی یہی دوائیں استعمال کریں۔

منیچہ منصور بھلم سے لکھتی ہیں کہ میں نے فاسٹولا کا پیری کا استعمال شروع کیا تھا۔ پیٹ کم ہوا مگر بال سفید ہونے لگے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا بعد میں معلوم ہوا کہ بال کسی اور وجہ سے سفید ہو رہے ہیں۔ کیا میں وہی دوا دوبارہ شروع کر دوں۔

محترمہ آپ اس دوا کا استعمال پھر شروع کر دیں۔ محترمہ شگفتہ ناز لاہور سے لکھتی ہیں کہ قد بڑھانے کی کوئی دوا بتائیں۔

محترمہ آپ عارف عظیم کو دیئے گئے جواب پر عمل کریں۔

نائد طارق ضلع لیہ سے لکھتی ہیں کہ میرے تین بچے بڑے آپریشن کے ذریعے پیدا ہوئے ہیں۔ میرا پیٹ اور کولہجہ بہت بڑھ گئے ہیں۔

محترمہ آپ CALCREA FLUOR-6X کی چار چار گولیاں تین وقت روزانہ کھائیں اور CALCAREA CARB-200 کے پانچ قطرے ہر آٹھویں دن آدھا کپ پانی میں ڈال کر پی لیا کریں۔

حافظ ام ایمن کبوترہ سے لکھتی ہیں کہ مجھے معزمت قض کی شکایت ہے اور پیٹ بھی بہت بڑھ گیا ہے۔ دوسرا مسئلہ آدھے سر میں درد کا ہے۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ ہومیوپیتھی کی دوا کھانے سے نقصان ہوتا ہے۔ کنواری لڑکیوں کو نہیں کھانی چاہیے۔

محترمہ آپ CALCAREA FLUOR-6X کی چار چار گولیاں تین وقت روزانہ کھائیں اور OPIUM-200 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر ہر آٹھویں دن پی لیا کریں۔ سر درد آپ نے بتایا نہیں کہ دایمیں یا بائیں جانب ہوتا ہے۔ ہومیوپیتھی سے متعلق یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوئی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

معائنہ اور باقاعدہ علاج کے لیے تشریف لائیں۔ صبح 10 تا 1 بجے۔ شام 6 تا 9 بجے فون: 6997059

ڈاکٹر محمد ہاشم مرزا کلینک دکان C-5 کے قریب اے ٹینس فیز 4 شادمان 2

سیکٹر B-14 نارتھ کراچی۔ کراچی 75850 (نئی حسن و ناگن چورنگی کے درمیان مین روڈ پر)

خط لکھنے کا پتا: آپ کی صحت ماہنامہ آنچل

پوسٹ بکس 75 کراچی



## گالکاتیں

فریذ جمیل

کان کا درد: ایک چمچ سرسوں کے تیل میں ایک بادام کچل کر پکائیں پھر تیل کو چھان کر ٹھنڈا ہونے دیں پھر ایک دو پوند کان میں ڈالیں درمیان فوری آرام آئے گا۔

گھٹیا اور جوڑ: گھٹیا اور جوڑوں کے درد میں روزانہ صبح شام تازہ پانی سے بیس گرام مٹھی کے دانے نگل لیں۔ گھٹیا اور جوڑوں کے درد کے لیے اکثر دوا ہے۔

دانت کا درد: اجوائن کے تیل میں روٹی کا پھابا بھگو کر دانت کے نیچے رکھنے سے درد میں آرام آتا ہے۔ ناریل کا چورا: پسا ہوا ناریل کچھ عرصے تک پزارہ جائے تو خشک ہو جاتا ہے۔ اس سوکھے ہوئے براہے کو تازہ کرنے کے لیے اس میں تھوڑا سا دودھ ڈال کر اچھی طرح ملا لیں اور تھوڑی دیر کے لیے رکھا رہے دیں۔ چاہے تو ایک چنگلی چینی بھی ڈال دیں اس سے اس کا ذائقہ اچھا ہو جائے گا۔

چیونٹیاں: چیونٹیاں کو بھگانے کے لیے اس جگہ تھوڑی سی پینگ بالندی رکھیں تو چیونٹیاں خود ہی چلی جائیں گی۔

دیمک: کمرے کو بند کر کے گندھک جلانے سے دیمک کے کیڑے مر جائیں گے اور فرنیچر وغیرہ محفوظ رہے گا۔

زہر بلا کھانا: کھانا پکاتے وقت یا دودھ اُبلاتے وقت اگر یہ خشک ہو جائے کہ اس میں کوئی زہریلی چیز گر گئی ہے تو چمچ میں اکاوا کھانا یا دودھ لے کر اسے آگ میں ڈال دیں اگر نیچے رنگ کے پتے لگیں تو سمجھ لیں کہ کھانا زہر بلا ہو گیا ہے۔

سبز یوں کے داغ: سبزیاں کاٹنے وقت اگر ہاتھوں پر دھبے لگ جائیں تو سرسوں کا تیل اور نمک ہاتھوں پر مل لیں۔ دھبے صاف ہو جائیں گے۔

کپڑوں کی چمک: زلیں کپڑوں کی چمک برقرار رکھنے

کے لیے پہلے پانی میں لیموں کا رس یا تھوڑا سا سرکہ ملا لیں پھر اس پانی سے کپڑے دھوئیں کپڑوں میں چمک آجائے گی۔

بھنوں کو گھنا کرنا: بھنوں کو گھنا کرنے کے لیے روزانہ رات کو زیتون کا تیل تنکے کے ساتھ لگی ہوئی روٹی سے بھنوں پر لگائیں اس عمل سے بھنوں کھنی ہو جائیں گی۔

چھلا ہوا سب: سب کو کاٹ کر رکھ دیا جائے تو وہ تھوڑی ہی دیر میں بھورا ہو جاتا ہے اس سے بچاؤ کے لیے سب کو چھیل کر اس کی قاشوں کو نکالیں پانی میں ڈبو کر رکھ دیا جائے اور جب کھانے کی ضرورت ہو تو تازہ پانی سے دھو کر استعمال کیا جائے۔

فرتج کی صفائی: فرتج کا اندرونی حصہ گندا اور میلا ہو جائے تو صابن کو نیم گرم پانی میں ملا کر لیو کا رس اور تھوڑا سا نمک ڈال دیں پھر اس پانی سے فرتج کو اندر سے دھوئیں بعد میں کئی خشک سوئی پکڑے سے پونچھ دیں۔ فرتج کے اندر سے ہر قسم کے داغ دھبے اور پیلاہٹ دور ہو جائے گی۔

پیٹ کا پھارہ: بچے کے پیٹ پر پھارہ آجائے تو چار ماشہ سونف ایک گلاس پانی میں اُبالیں اور پانی کو ٹھنڈا کر لیں۔ پھر یہ پانی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بچے کو پلائیں آرام آجائے گا۔

بچوں کا باضمہ: بچوں کا باضمہ اکثر خراب رہتا ہے اس کو درست رکھنے کے لیے کیلے کو خشک کر کے آٹے کی شکل میں سفوف بنالیں پھر یہ آٹا بچوں کو دیا جائے اس سے کم زور باضمہ والے بچوں کا باضمہ درست رہے گا۔

الگ الگ بال: اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے بال الگ الگ نظر آئیں تو بالوں کو دھونے سے پہلے ان کی جڑوں میں دودھ کا باکا سا مساج کر لیں اس کے بعد نیم گرم پانی میں ایک لیو کا رس ملا کر لیو کا رس کو دھو دیا جائے اس عمل سے بال جھڑنے بھی بند ہو جائیں گے اور الگ الگ نظر آئیں گے۔

زیورات کی حفاظت: سونے چاندی کے زیورات ڈبوں میں کچھ عرصہ کے لیے بند پڑے رہ جائیں تو وہ کچھ سیاہ سے پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے زیورات کے ڈبوں میں زیورات کے ساتھ تھوڑی سی چاک رکھ دی جائے تو



# بیوٹی گائیڈ

عائشہ غفار

- جلد کی رنگت نکھانے کے کچھ طریقے:
- 1- دودھ میں جو یا گیہوں کا آنا ملا کر اُٹھن کرنے سے چہرے کی جلد کا رنگ نکھرتا ہے۔
  - 2- ٹارنگی کے خشک چھلکوں کو پیس کر تیل میں ملا کر چہرے پر مالش کریں۔
  - 3- دو بڑے پیچھے دودھ میں آدھا بڑا پیچھے کاغذی لیموں کا رس ملا کر آج کے ذریعے چہرے کی جلد پر لگائیں۔ جب وہ خشک ہو جائے تو پہلے نیم گرم اور پھر ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں۔
  - 4- 'یو ڈی کلون' ملے نیم گرم اور ٹھنڈے پانی کے ذریعے باری باری سے منہ دھونے سے چہرے کی جلد کا رنگ نکھرتا ہے اور خون کا دور ان بھی تیز ہوتا ہے۔
  - 5- پیس ہوئی ہلدی اور جو کے آٹے کو سرسوں کے تیل میں ملا کر جلد پر اُٹھن کریں۔
  - 6- خشک چوڑھی ہلدی اور سکترے کے خشک چھلکے ان سب کو برابر برابر لے کر اور دودھ میں پیس کر چہرے پر ملیں۔
  - 7- شہد میں لیموں کا رس ملا کر پوری جلد پر لپ۔
  - 8- گلیسرین میں تھوڑا سا لیموں کا رس ملا کر رکھ لیں صبح چہرہ دھونے کے بعد اس محلول کو چہرے پر ملنے سے جلد ملائم ہوتی ہے اور رنگ بھی نکھرتا ہے۔
  - 9- رس نکالے ہوئے کاغذی لیموں کے ٹکڑوں کو چہرے پر ملنے سے جلد کا رنگ نکھرتا ہے اور وہ ملائم ہوتی ہے۔
  - 10- غسل کرنے کے بعد مکھن میں کافور ملا کر چہرے پر لگانے سے خشک اور کھردری جلد ملائم ہوتی ہے۔
  - 11- چوڑھی اور باداموں کو دودھ میں پیس کر چہرے پر ملنے سے رنگ نکھرتا ہے۔
  - مزید احتیاطیں:
  - 1- خوب پانی پئیں۔
  - 2- ہفتے میں تین بار اُٹھن لگائیں۔
  - 3- سونے سے پہلے چہرے کو کچے دودھ سے ضرور صاف کریں۔
  - 4- چہرے کو دھونے کے بعد اس پر برف کا ٹکڑا ملیں۔
  - 5- صابن کا کم سے کم استعمال کریں۔
  - 6- جلد کو صاف اور ٹھنڈا بنائے رکھیں۔
  - 7- رات کو ہونٹوں پر بالائی یا ویزلین ضرور لگائیں۔

زیورات سیاہ نہیں ہوں گے۔

چاندی: چاندی کے زیورات کی حفاظت کے لیے ڈبے میں پھٹکری کے دو تین ٹکڑے رکھ دیں چاندی سیاہ نہیں پڑے گی۔

ہیرے برش: پرانے استعمال شدہ ہیرے برش کو پھٹکری اور پانی کے محلول میں ڈال دیں چند منٹ میں برش کے دانتوں میں پھنسا ہوا میل نکل جائے گا اور برش دوبارہ استعمال کے قابل ہو جائے گا۔

بائس کی چڑیاں: اگر بائس کی بنی ہوئی کوئی چیز میلی ہو جائے تو نمک ملے نیم گرم پانی سے دھو لیں صاف ہو جائے گا۔

اکتابت: طبیعت میں بھاری پن اور آکتابت محسوس ہو رہی ہو تو رات کو املی اور خشک آلو بخارا ایک گلاس پانی میں بھگو کر رکھ دیں۔ صبح نہار منہ پانی چھان کر پی لیں طبیعت دن بھر ہشاش بشاش رہے گی۔

ٹٹھے چاول: ٹٹھے چاول پکانے ہوں تو چاول ڈالنے سے پہلے چانی میں آدھے لیٹو کا رس ملا لیں۔

لیموں کے چھلکے کھا کر پیس لیں اس سے دانت صاف کریں دانت چمک دار ہو جائیں گے۔

ہونٹ نرم کرنے کے لیے روغن بادام اور شہد ملا کر روز لگائیں۔

نینگن کو اگر نمک ملے پانی میں کاٹا جائے تو وہ سیاہ نہیں ہوتا۔

بلبوں کو اگر گاہے گاہے صاف کرتے رہیں تو نہ صرف ان کی زندگی بڑھ جاتی ہے بلکہ وہ روشنی بھی زیادہ دیتے ہیں۔

خالی پیٹ کیلے کھانے سے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے۔

شیشے کو اخبار کے ٹکڑوں سے صاف کریں داغ دھبے ختم ہو جائیں گے۔

بہترین جلد کے لیے آپ کو چاہئے کہ کچا دودھ چہرے پر ملیں بلکہ ہاتھوں سے مساج کریں جب تک بتیاں بن کر نہ گرنے لگیں مساج کرتی رہیں۔

بالوں کی خوب صورتی کے لیے ہیرے کیلے ماسک استعمال کریں۔ آملہ ریٹھا، ساکائی، باجپھر اور میٹھی دانے رات میں





# دشمن مقابلہ

طلعت آغاز

ثابت مصالحہ دار گوشت

دیں۔ کوئی دس منٹ کے بعد کھولیں اور دیکھیں کہ گوشت مسالہ اور بھی نظر آئے پانی باقی نہ رہے تو اتار لیں اور استعمال کریں۔

(جبانواز بھٹی۔ سانگھڑ (سندھ) چانیز چکن برگر

اشیاء:  
گوشت

ایک سیر (مچھلی یا دتی کا اس میں ہڈی نہیں ہونا چاہیے۔

آدھی چھٹانک

سوکھا دھنیا  
مرچ، لونگ، الائچی

اشیاء:

دو مٹی

ایک پاؤ

ایک پاؤ

ایک پاؤ

ایک ٹھنی

ایک ماشہ

دو مٹی

ایک پاؤ

ایک پاؤ

ایک پاؤ

ایک پاؤ

ایک پاؤ

ایک پاؤ

ایک پاؤ

ایک پاؤ

ایک پاؤ

ترکیب: دھنیا ادھ پیسا کر لیں۔ اور ک کے ٹکڑے کر لیں۔ پیاز نیچے دار کاٹ کر گھی میں تل لیں۔ جب پیاز یا دمی رنگ کی ہو جائے تو گوشت اور سب مصالحے اس میں ڈال دیں۔ پھر اتنا پانی ڈال دیں کہ گوشت گل جائے جب گوشت نیم گلا ہو جائے تو اس میں دہی ڈال کر بھونیں پھر لہسن کا پانی ڈال کر بھونیں۔ جب سب مصالحے گل کر گوشت کے ساتھ مل جائیں تو زعفران کو ذرا سے کیوڑے میں حل کر کے اوپر ڈال دیں اور دم پر لگا

انڈے ڈالنے سے پہلے ان سب چیزوں کو مشین میں سے نکالیں۔ پھر ہاتھ سے اچھی طرح مکس کریں۔ اس کے بعد اس میں

انڈے

میدہ

کالی مرچ

کچپ

ترکیب:- اب ان سب کو اچھی طرح مکس کریں۔

جب ایک جان ہو جائے تو انہیں پور ایک دن فریج میں

رہیں۔ پھر اس کو میری مشین کرنے کے بعد اس کی گول

ٹکیاں بنالیں۔ سب سے پہلے صاف سطح پر پلاسٹک پیپر

بچھا کر اس کے اندر گول پیڑہ رکھ دیں۔ اوپر ایک اور

پلاسٹک پیپر بچھا کر ہاتھ سے پریس کریں اس کے بعد

پیسٹ کی مدد سے بالکل گول ٹکی بنالیں پلٹ کی مدد سے

پریس کریں اور ٹکی بنانے کے بعد گرم توتے پر تھوڑا سا تیل

یا گھی ڈال کر گولڈن براؤن کر لیں۔ ٹکی دونوں سائیڈ

سے پکا لیں اس کے بعد برگر والے بند کو درمیان میں

سے کاٹ کر اس کی اوپر والی سائیڈ پر ہلکا سا تیل لگا کر

دونوں سائیڈ سے گرم کر لیں۔ اب سب سے پہلے برگر

کے اوپر سلاڈ کا پیسہ صاف تھرا رہیں۔ اس کے بعد ایک

ٹماٹر کا سلاڈ ایک شملہ مرچ کا سلاڈ ایک چیز کا سلاڈ

اور پھر اس کے اوپر ٹکی رکھ دیں۔ اس کے اوپر اب آپ

مائنیز یا کچپ یا باری کیو ساس (کچپ میں کالی مرچ اور

نمک شامل کر کے باری کیو ساس بنتی ہے) استعمال

کریں اس پر اس کی تہ لگا دیں اور اوپر برگر رکھ دیں آپ

کا چانیز چکن برگر تیار ہے۔

(ہما کلشوم۔ فیصل آباد)

گاجر کی برنی

اشیاء:

گاجر

آدھا کلو (چھیل کر کش

کر لیں)

آدھا کلو

دودھ

دودھ

دودھ

آدھا کلو یا حسب ذائقہ

150 گرام

آدھا چائے کا چمچ

زعفران

ترکیب:- فرانگ پین میں ایک کھانے کا چمچ گھی

ڈال کر اس میں گاجر فرائی کریں۔ ایک پٹلی میں دودھ اور

چینی ڈال کر گاڑھا ہونے تک پکا میں۔ گاڑھا ہونے پر

اس میں فرائی شدہ گاجر اس میں ڈال دیں اور اتنا پکا میں کہ

جسنے گلے۔ اب اس میں بقیہ گھی اور زعفران ڈال دیں اور

چولہا بند کر دیں۔ جس ٹرے میں جمانا مقصود ہو اس میں

پہلے برش کی مدد سے گھی لگائیں اور برنی کا آمیزہ اس میں

ڈال دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر حسب خواہش ٹکڑے کاٹ

لیں۔

(نادیہ ثوبیہ۔ مومبر آزاد کشمیر)

بیف چلی گارلک سوس

اشیاء:

گائے کا گوشت

400 گرام بغیر ہڈی کے

ایک کھانے کا چمچ

ایک کھانے کا چمچ

دو کھانے کے چمچ

تھوڑا سا

ایک عدد

دو ٹھنی

ایک کھانے کا چمچ

ایک کھانے کا چمچ

دو کھانے کے چمچ

دو کھانے کے چمچ

ایک عدد

ترکیب: گوشت دھو کر اس کے تقریباً ڈیڑھ انچ لمبے

تیلے تیلے ٹکڑے کاٹ لیں۔ گوشت میں نمک اور کارن

فلاور لگا کر کچھ دیر کے لیے رکھ دیں۔ کسی فرائی پین میں

گھی گرم کریں اور اس میں گوشت کے ان ٹکڑوں کو تیل

لیں۔ لہسن چھیل کر موٹا موٹا کاٹ لیں۔ فرائی پین میں

لیں۔ لہسن چھیل کر موٹا موٹا کاٹ لیں۔ فرائی پین میں

لیں۔ لہسن چھیل کر موٹا موٹا کاٹ لیں۔ فرائی پین میں

لیں۔ لہسن چھیل کر موٹا موٹا کاٹ لیں۔ فرائی پین میں



تھوڑا سا گھی یا تیل ڈال کر گرم کریں اور اس میں لہسن کو ہلکا براؤن کریں۔ پیاز اور شملہ مرچ بھی موٹی موٹی کاٹ کر ہلکا سا فرانی کر لیں اور پھر اس میں فرانی کیا ہوا گوشت شامل کر کے تھوڑی دیر تک اسے بھونیں۔ ایک یا دو منٹ بعد اس میں سویا ساس، شکر اور سرساز چلی ساس اور چکن پاؤڈر شامل کر دیں۔ ان تمام چیزوں کو کچھ دیر پکینے دیں۔ اس کے بعد گاڑھا کرنے کے لیے اس میں کارن فلاور ملا دیں۔ مزیدار بیف چلی گاڑھا کر لک ساس تیار ہے۔ گرم گرم نوش کریں اور مجھے یاد کریں کھاتے ہوئے۔

(لالہ رخ۔ لاہور)

لوکی کا حلوہ

اشیاء:

لوکی

دودھ

گھی

چینی

الاجچی بڑا دام

چاندی کے ورق اور کیوڑہ

ترکیب: لوکی چھیل کر کاٹ لیں اور بیج نکال دیں۔

اب اسے کدوئش کر لیں۔ ایک کڑا ہی میں الاجچی ڈال کر

گھی میں کڑکڑائیں اور اس میں لوکی ڈال کر خوب بھونیں

یہاں تک کہ خوشبو آنے لگے تو اس میں دودھ ڈال دیں اور

پکینے دیں۔ جب دودھ خشک ہو جائے تو اسے پھر سے

بھونیں اور اس میں چینی ڈال دیں اور بھوننے جائیں۔

یہاں تک کہ چینی کا پانی خشک ہو جائے اور لوکی بھی چھوڑ

دے۔ ان میں بادام اور کیوڑہ ڈال کر اتار لیں اور پیش

کرتے وقت چاندی کے ورق لگا دیں۔

(مہناز گل روشی۔ رحیم یار خان)

نہاری

اشیاء:

گائے کا گوشت

3 کلو (بونگ مع ہڈی) نلی

گودے والی

آدھی پیالی

دو تولہ

ایک تولہ

ایک تولہ

دو عدد بڑے

چار چائے کے چمچ

ایک عدد

تین چار پیتاں

دو کپ

آدھا کلو

دہی

نمک مرچ ہلدی اور گرم سالہ

حسب ضرورت

آدھا کپ

گھی

ترکیب: تیل خوب گرم کریں۔ اس میں گوشت ڈال

کر ڈرا دیں کہ بھون کر نمک سرخ مرچ، لہسن اور کدو وغیرہ

ڈال کر پانچ منٹ تک بھونیں اور دو گلاس پانی ڈال کر گلا

لیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو سوئف پیاز اور سوئف

پس کر ملا لیں۔ اب کچھ دیر کے بعد گرم مصالحہ چمچ لیں اور

جاوڑی پس کر دہی میں ملا کر گوشت میں شامل کر دیں۔

مزید پانچ منٹ بھون کر اس میں مناسب مقدار میں پانی

ڈال کر شور با پکا لیں۔ اب اس پکیتے ہوئے شور بے میں

آدھے گلاس پانی میں آٹا گھول کر پکیتے ہوئے گوشت میں

ڈال کر شور با مناسب گاڑھا کر لیں۔ جب حسب مشق

سائن تیار ہو جائے تو گھی میں پیاز ثابت سرخ مرچ کا

گچھا دیں اور آدھا کپ باریک کٹا ہوا سبز دھنیا ڈال کر

چولہا بند کر کے ڈھنکا دے دیں اور دس منٹ بعد گرم گرم

توری روٹیوں کے ساتھ نوش فرمائیں۔

(مستر فصیحہ آصف خان۔ ملتان)

آپکل کی سالگرہ پر

کتنی مبارک! کتنی پدمست ساعت تھی

جب تم نے ہماری دنیا میں آ کر

خوشیاں ہی خوشیاں بکھیر دیں

ہمارے سروں پہ

اپنے آچل کی چھاؤں ڈال دی

اے میرے آچل!

وہ تمہارا مبارک جنم دن تھا

آج تمہارا جنم دن ہے

اور آج یہ دعا ہے میری

سدا رہے یونہی تیرا سایہ ہم پر

کر دراج یونہی ہمارے دلوں پر

ہو سب کو دوستو! آچل کی سالگرہ مبارک

(غزالہ عزیز۔ کورنگی کراچی)

اتنی تباہی اتنی اکیلی اتنی بیکل

اس کی آنکھیں بول رہی تھیں

کانچ کی چاہت ٹوٹ چکی تھی

سو گئی ریت کے جیسی چاہت

بندھنی سے چھوٹ چکی ہے!

(شاعرہ..... سعدیہ اہل کاشف)



## غزل

پچھڑتے وقت جب مجھ سے چھڑا رہے تھے ہاتھ  
وہ ایک رات مجھ پہ زندگی سے بھاری تھی  
وہ ایک لڑکی جو جیتی زمانے بھر سے مگر  
تمہارے پیار میں اک فقط تم سے باری تھی  
کچھ ایسی بات تھی کہ تم پہ وار دی ورنہ  
ہمیں بھی زندگی اپنی یہ بہت پیاری تھی  
ہوئے سوار تم ایسے کہ ڈگ مگا بھی گئی  
یہ گاڑی زندگی کی جو سکوں سے جاری تھی  
جئے ہوئے تھے میری آنکھ میں تیرے آنسو  
محبوبوں پہ جدائی کی برف باری تھی!  
تم ہم کو کھوکھو کے کبھی خوش نہ رہ سکے ورنہ  
تمہارے ساتھ جو لڑکی تھی بہت پیاری تھی  
تمہارے دیس سے آتی ہواؤں نے یہ کہا  
ہمارے بھر کی ہر رات تم پہ بھاری تھی  
تمہیں الزام چٹا بھی جو دیں تو کیوں دیں ہم  
محبوبوں میں بھی جو بھی خطا ہماری تھی  
تم ہم کو کھوکھو کے بھی ہر پل ہمیشہ شاد رہو  
پچھڑتے وقت یہی اک دعا ہماری تھی  
(نازیہ کنول نازی..... ہارون آباد)

ادھوری تحریر  
میں جب بھی کچھ لکھنا چاہتا ہوں  
تو تری تصویر اچانک میری  
آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے  
اور میں یوں ہی گم جم  
ہو کر  
ترے عکس کو تکتا  
رہتا ہوں اور پھر  
کافی دیر  
تک سوچوں کے دھاروں

پچھڑتا ہوا کہیں دور  
چل جاتا ہوں

اور ہمیشہ  
کی طرح میری تحریر  
ادھوری رہ جاتی ہے

(نعیم انصاری..... جھنگ صدر)

سرمہ کا ساون  
اے سرمہ کے ٹھنڈے ساون  
سرمہ میں نہ آیا کر

تیرا آنایوں تو میرے دل میں پھول کھلاتا ہے  
میرے دل کے بجز دشت میں ہر ابھر ہو جاتا ہے  
لیکن میری آنکھوں میں بھی اک ساون آ جاتا ہے  
اے سرمہ کے ٹھنڈے ساون

سرمہ میں نہ آیا کر

جب سرمہ کے ردوئوں میں ساون چھڑی لگ جاتی ہے  
تو ننھی ننھی بھڑکی پیاسی چڑیاں سردی سے ٹھنڈی ہیں  
جنہیں دیکھ کر میرا دل جانے کیوں بھر جاتا ہے

اے سرمہ کے ٹھنڈے ساون

سرمہ میں نہ آیا کر

معصوم بگھر ننھے بچے فٹ پاتھ پر جو سوتے ہیں  
موسم کی اس ستم گری پر رات بھر وہ روتے ہیں

نیندیں اپنی کھوتے ہیں

تجھ کو کیا معصوموں پر ڈراتر نہیں آتا ہے

اے سرمہ کے ٹھنڈے ساون

سرمہ میں نہ آیا کر

چھوٹے چھوٹے گھروں میں بستے.....!

مغفلوں و ناداروں پر کیوں تو ستم ڈھاتا ہے

اے ساون یہ بتا تو سرمہ میں کیوں آتا ہے

اے سرمہ کے ٹھنڈے ساون

سرمہ میں نہ آیا کر

(حیا غوری..... کراچی)

اچھے نہیں رہے ہو

کچھ نہیں ہوا

کہہ دیا تاکہ

کچھ بھی تو نہیں ہوا

بات صرف اتنی سی

ہے کہ رات بھر میں

سو نہیں سکا

اسی لیے آنکھوں میں لالی ہے

ورنہ اس نے تو صرف

اتنا ہی کہا ہے

”ساجی“ تم اب اچھے نہیں رہے ہو

(ساجد عباس اعوان..... حافظ آبادی)

نمکین غزل

وہ پیغام دیتی ہے نگاہوں کی ای میل سے

وہ انجوائے کرتی ہے محبت کے اس کھیل سے

مجھے اس کے ڈیڈی کا ہرگز اتنا خوف نہیں

جتنا خوف آتا ہے پولیس اور جیل سے

وہ مجھے ملنا پسند اس دن سے کرتی نہیں

جب سے چڑے ہیں بال مسروں کے تیل سے

پیو کی اماں کی ہرگز تم بات نہ کرو

محلہ سارا تنگ ہے اس کی بارہ بویوں کی ریل سے

میک اپ کا بل دیکھ کر چلا کر میاں نے کہا

بس بہت تم نے اٹھا لیا فائدہ میری ناجائز ڈھیل سے

ساس نے کہا کہ اس کے لیے بنواؤ تم سوئی سی زنجیر

یہ قابو آنے والی ہرگز نہیں اس نکیل سے

قامت اس کی بتائیں کیا؟ قامت صرف ہے چار فٹ

مگر وہ ضرور قامت نظر آئے مجھے پنسل ہیل سے

ہم اس کے نیلے لینز کی تعریف کیا کریں یارو

لن کتنی ہیں اجڑ گئیں جاکے کنبہ رگڑ گئیں جاہل جھیل سے

(الی جبہ شانزے..... ہارون آباد)

سفر

اک سفر زندگی کا

اور ان گنت راستے ہیں

ہر راستے پر تنہائی کا درد ہے

وحشت زدہ سے لمحے ہیں

چاہتی ہوں نجات پالوں مگر

نہیں ختم ہی نہیں ہوتا

یہ درد اور تنہائی کا سفر

میں رکتی بھی ہوں تو

زمین چلے لگتی ہے

(نویدہ قدیر ندا..... اسلام آباد)

تم کیا جانو.....!

تم کیا جانو.....!

خاموشی کی آوٹ میں

کتنی باتیں کرنی ہیں

کتنے سننے بننے ہیں

کتنی راتیں بسر کرنی ہیں

دل ہی دل میں گوننا ہے

منہ سے ہاں نہیں کرنا ہے

آنسو چھپا کر مسکراتا ہے

خود ہی اداں ہوتا ہے

اور خود ہی بھلتا ہے

سمندر سا گہرا اول بنا کر

تمہیں اس میں چھپانا ہے

مگر سن لو.....

اس خاموشی کی دستک پر

تمہیں اک دن واپس آنا ہے!

(قراۃ العین بھٹی..... ساگھر سندھ)



بہار

اب کے بہاروں میں آ جانا  
وہی پرانا گیت سنا جانا  
دل پہ غموں کی برکھا چھائی ہے  
آ کر اداسیوں کے موسم مٹا جانا  
نہ جانا پھر تم لوٹ کر کہیں  
ہر لمحہ ساتھ ساتھ بٹنا جانا  
یہ نہ ہو کہ ہم منتظر ہی رہیں  
آ کے سندر مکھڑا دکھا جانا  
نہ ہونا پھر جدا ہم سے  
گلے سے ایسے لگا جانا  
دل کی تو بس یہی آرزو ہے  
میرے ساتھ اپنا نام سجا جانا  
(مرن فیضی آصف خان..... ملتان)

میں لوٹ آیا ہوں

میں جی رہی ہوں  
اس یقین کے ساتھ  
کہ تم لوٹ آؤ گے  
جب اندھیری رات کو میں جلتے دیپوں کی روشنی میں  
ایکلی گھنٹوں میں سردیے بیٹھی  
تمہیں سوچ رہی ہوں گی  
کہ اچانک تمہاری آہٹ پا کر  
چونک کر سر اٹھاؤں گی  
اور تم بڑے محبت سے مسکراتے ہوئے  
میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو گے  
دیکھو میں لوٹ آیا ہوں  
تمہیں منانے کے لیے  
اپنے سنگ زندگی کی ہر راہ میں  
ہر موڑ پر اپنا جانے کے لیے  
میں لوٹ آیا ہوں میں لوٹ آیا ہوں  
(قمر بخاری..... علی پور)

غزل

دشمنی نے بھی کیا اثر چھوڑا  
شہر سارا لہو سے بھر چھوڑا!  
ٹھوکر بن گئیں مقدر پھر  
بے بسی میں جب ہم نے گھر چھوڑا  
خار دل میں چھو لیے اپنے  
اس کا دامن گلوں سے بھر چھوڑا!  
اس کی یادیں سنبھال کر رہیں!  
ساتھ ہم نے نہ عمر بھر چھوڑا  
پھل وہ لائے گا ایک دن آخر  
جس نے بیڑوں کو بے ثمر چھوڑا  
ٹھوکر بن گئیں اس نے ہر قدم کھائیں  
جس نے اپنے خدا کا در چھوڑا  
تنگ غریبی سے اس قدر آیا  
اپنے بیڑوں کا خون کر چھوڑا  
مشقیں اور بڑھ گئیں اس کی  
جس نے بھی دامن صبر چھوڑا  
مطمئن ہوں میں زندگی سے اب  
خواہشوں کو تمام کر چھوڑا!

حکیم خان حکیم

منہی لڑکی

ساحل کے اتنے نزدیک  
ریت سے اپنے گھر نہ بنا  
کوئی سرکش موج ادھر آئی تو  
تیرے گھر کی بنیادیں بہا لے جائے گی  
اور پھر ان کی یاد میں تو  
ساری عمر اس رہے گی

(لیلیٰ خان اور کرنی۔ ہنگو)

غزل

وہ کہاں آسمان جیسا تھا  
جس کا لہجہ چٹان جیسا تھا  
تجھے پچھڑے گزر گیا اک ماہ  
چاند اب پھر کمان جیسا تھا  
اس نے پھینکا اٹھا کے یوں باہر  
دل پرانے سامان جیسا تھا  
آنکھیں اس کی غزل کہتی تھیں  
وہ میر کے دیوان جیسا تھا  
وقت جو زندگی کا گزرا ہے  
وہ کڑے امتحان جیسا تھا  
چارہ گر تیرا یہ تلخ تر لہجہ  
میرے اس بدگمان جیسا تھا  
بھلا کے مجھ کو وہ سوچتا ہو گا  
شخص سونے کی کان جیسا تھا  
یہ جو گزرا ہے اجنبی صورت  
یہ کبھی میری جان جیسا تھا  
مجھ کو رکھتا تھا دھوپ سے محفوظ  
سایہ اس کا مکان جیسا تھا  
(آزاد حسین آزاد۔ کراچی)

فریاد

جب سے بیگم نے مجھے مرغا بنا رکھا ہے  
میں نے نظروں کی طرح سر بھی جھکا رکھا ہے  
برتنوں آج میرے سر پر برستے کیوں ہو  
میں نے تم کو ہر دم دھلا رکھا ہے  
پہلے یلن نے بنایا ہے میرے سر پر گومڑ  
اور چنے نے میرا گل سجا رکھا ہے

سارے کپڑے تو جلاؤ اے بیگم نے میرے  
ذیب تن رکھنے کو بنیان پھٹا رکھا ہے  
اے کنوارو شاد رہو آباد رہو  
ہم کو بیگم نے سولی پہ چڑھا رکھا ہے  
وہی دنیا میں مقدر کا سکندر ٹھہرا  
جس نے خود کو یہاں شادی سے بچا رکھا ہے  
پی جا اس مار کی گئی کو بھی ہنس کر ذیشان  
مار کھانے میں بھی قدرت نے مزا رکھا ہے  
(شانی ذیشان..... منظور کالونی، کراچی)

شک

شک کی دلدل میں کھو گئے ہیں  
کوئی تو سوچے  
کہ اپنے جیون کی کتنی خوشیاں  
کتنی عیدیں  
کتنے ایسٹر  
ان پر قربان کیے ہیں پھر بھی  
شکستہ پاہوں  
بے آسراہوں  
کوئی تو دیکھے  
کہ لوگ نیندوں کے لطف لوٹیں  
میں اپنی راتوں کی میٹھی نیندیں  
تیاگ کر بھی  
بے آبرو ہوں  
نجانے کیوں ہوں  
کسے بتاؤں  
میں کس سے پوچھوں؟

(گلین شاہ..... کراچی)



# بیاض دل

میمونہ تاج

ڈیفرنٹ شاہینہ..... جھنگ

رنگ ہے پھول ہے خوشبو ہے صبا ہے کوئی  
موسم گل کی طرح ہم سے ملا ہے کوئی  
ایک رشتہ جو لفظوں میں بیاں ہو نہ سکے  
ہم کون ہیں اس کے آخر ہمارا کیا ہے کوئی  
عاصم نورین..... فیصل آباد

ہم خوشبو کے سوداگر ہیں سودا سچا کرتے ہیں  
جو گاہک پھولوں جیسا ہوں ہم بن اماں تک جاتے ہیں  
ہم شہر وفا کے لوگوں کا کم حال بھلا کیا جانو گے  
ہم دل کی چوٹ چھپاتے ہیں اور آنسو تک پی جاتے ہیں  
نازیہ کنول نازی..... جھنگ

یارب تیرے جہان میں دل ٹوٹنے ہیں کیوں  
ساحی وفا کی منزلوں سے چھوٹنے ہیں کیوں  
گو یہ ترے حضور مجسم سوال ہے  
سادا دلوں کو پیار سے سب لوتے ہیں کیوں  
سُباس گل..... رحیم یارخان

نئے برس کا آغاز ہو چلا جاناں  
تمہیں مبارک ہو سالگرہ کا دن اپنا  
سدا رہو محبتوں اور مسرتوں کے بیچ  
یہی دعا ہے یہی آرزو یہی سہنا  
فاکھہ فردوس..... بہاولپور

خود وقت میرے ساتھ چلا وہ بھی تھک گیا  
میں تیری جستجو میں بہت دور تک گیا  
میں سوچتا ہوں شہر کے پتھر سمیٹ کر

وہ کون تھا جو راہ کو پھولوں سے ڈھک گیا  
سمیرا روشنی..... کراچی

بچھڑ کے مجھ سے سنا ہے موسم ہے اب وہ  
جو میرے ساتھ بھی تھا تو صرف پتھر تھا  
اُسی نے دل میں اندھیروں کی فصل بوئی ہے  
وہی جو ذہن میں اک روشنی کا پیکر تھا  
نانیہ سعید..... عارف والا

غم کے غبار میں ہیں ستارے اُٹے ہوئے  
خواہش کی کرچوں میں ہیں چہرے بٹے ہوئے  
اب کیا تلاش امن میں نکلیں کہ ہر طرف  
مدت سے فاختاؤں کے ہیں پر کٹے ہوئے  
نسرین رح..... گوجرانوالہ

تیری خوشبو میری سانسوں میں بسانے آئے  
دل کی دنیا میں بہاروں کے زمانے آئے  
وہ ہے مجبور مگر پیار سے مجبور بھی ہے  
خود ہی ناراض کرتے خود ہی منانے آئے  
شکیلہ انجم..... پنڈی بھٹیاں

یہ بھی آداب ہمارے ہیں تمہیں کیا معلوم  
ہم تمہیں جیت کے ہارے ہیں تمہیں کیا معلوم  
اک تم ہو کہ ہمیں سمجھتے نہیں ہو اپنا  
اک ہم ہیں کہ تمہارے ہیں تمہیں کیا معلوم  
طاہرہ رفیق..... منڈی بہاؤ الدین

ہزاروں خواہشیں دل کے نہاں خانوں میں ہوتی ہیں  
یہ بے آباد قصبے کہاں ویران رہتے ہیں  
بلا کی افراتفری ہے ہماری ذات میں لیکن  
اس بے دھیانی میں بھی تیرے دھیان میں رہتے ہیں  
نادیہ جہانگیر..... موہڑ آزاد پور

سدا ہے جکڑے قسمت کی جو زنجیروں میں  
ہمارا نام بھی شامل ہے ان اسیروں میں  
وہ جس کے ساتھ کی خواہش اڑاؤں بھرتی ہے  
اسی کا نام نہیں ہاتھ کی لکیروں میں  
ثوبہ جہانگیر..... موہڑ آزاد پور

محبت آدمی بھی ہے خدا بھی  
محبت ہی مکاں و لامکاں ہے  
اسی رشتے کو کہتے ہیں محبت  
جو تیرے اور میرے درمیاں ہے  
الی چہ شانزے..... یارون آباد

سب مل کر تم ہمارے سنگ یہ دعا کرو  
کہ ہم خوش رہیں ہر حال میں  
سر تاپا اُس کی محبت میں ہو جائیں غرق  
آئیں کبھی نہ پھر شیطان کے جال میں  
نوزیہ چیمہ..... بدین

آنکھوں سے میری اس لیے لالی نہیں جاتی  
یادوں سے کوئی رات خالی نہیں جاتی  
تو جان بھی مانگے تو ہنس کر تجھے دے دوں  
تیری تو کوئی بات بھی ٹالی نہیں جاتی  
خواجہ عرفانہ محبوب..... جتوئی

تمہیں جو یاد رکھا ہے یہی اپنی عبادت ہے  
عبادت جس طرح کی ہو عبادت کب بدلتی ہے  
جو دل پہ نقش کر جائے نگاہوں میں سٹ آئے  
علامت ہے یہ چاہت کی تو چاہت کب بدلتی ہے  
لالہ رخ..... لاہور

کسی کو کیا جو قدموں میں جبین بندگی رکھ دی  
ہماری چیز تھی ہم نے جہاں چاہی وہاں رکھ دی  
جو دل مانگا تو وہ بولے کہ تھہرنا یاد کرنے دو  
ذرا سی چیز تھی ہم نے خدا جانے کہاں رکھ دی  
فرحین عمران..... کراچی

شام چلے جب سارے پرندے لوتے ہیں نو پڑتے ہیں  
اس کی تپسیاں کے وعدے سوچتے ہیں نو پڑتے ہیں  
اُجڑا کرہ لکھری چیزیں بوجھل دل اور بھیسی پلکیں  
اپنی حالت دیکھ کر اکثر ہنستے ہیں رو پڑتے ہیں  
شیخا صابر بٹ..... اوکاڑہ ٹی

دل میرا اک کتاب کی صورت  
جس میں وہ ہے گلاب کی صورت

حسن کچے گھرے کا شیدائی  
عشق موج چناب کی صورت  
مہنا زگل روشنی..... رحیم یارخان

میری غزلیں یہ میری نظیں  
تمام تیری حکایتیں ہیں  
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں  
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں  
قراۃ العین بھٹی..... ساکھڑ سندھ

کبھی اچھا بُرا سوچا نہیں ہے  
محبت عقل کا سودا نہیں ہے  
صراط عشق پر مڑ کر نہ دیکھو  
پلٹنے کا کوئی رستہ نہیں ہے  
پردین افضل شاہین..... بہاولنگر

پچھڑے ہوئے یاروں کی صدا کیوں نہیں آتی  
اب روزن زنداں سے ہوا کیوں نہیں آتی  
اے موسم خوشبو کی طرح روٹھنے والی  
پیغام تیرا لے کے صبا کیوں نہیں آتی  
دیویا سونی..... ننڈوالہ یار

یہ سچ تو ٹوٹ کے کب کا ٹکڑا گیا ہوتا  
اگر میں جھوٹ کی طاقت سے ڈر گیا ہوتا  
جہیں جھکاؤ بھی تو کس کے سامنے ٹوٹنے  
خدا کے در پہ جو جھکتا سنور گیا ہوتا  
سعدیہ عروج عباسی..... خانپور کٹورہ

دل سمندر بھی ہو اگر احمد  
پیاں غم کی بجھا نہیں سکتا  
زرتاشا..... فیصل آباد

میری ہر سانس کی دہلیز پر  
کھلے ہیں پھول تیرے انتظار کے  
ناراض چوہدری..... سوہا وہ

تم سے نہیں کہا تھا کہ شعلہ یدن ہیں لوگ  
اب کیوں دکھا رہے ہو تھیلی جلی جلی  
ساجد عباس اعوان..... حافظ آباد



## یادگار

جویریہ طاہر

+ سوزندگی کے ان چند لمحوں میں اگر کوئی پیار سے بلائے تو چلے جانا کہ شاید پھر کوئی بلانے والا بھی نہ ہوگا۔

(صائمہ یاسمین..... نکودر)

خزانہ معلومات

+ ”رہوڑ کا مجسمہ“ وہ عجوبہ تھا جو اپنی تعمیر کے صرف 56 سال بعد ایک زلزلے کے باعث زمین بوس ہو گیا تھا۔

+ برصغیر کے تیسری صدی ق م کے بادشاہ اشوک کے کتے پاکستان میں صوبہ سرحد کے علاقوں مانسہرہ اور شہباز گڑھی (پشاور) میں پائے گئے ہیں۔

+ ٹھٹھہ کے قبرستان میں تقریباً 5 لاکھ سے زائد قبریں ہیں۔ یہ قبرستان طول 12 میل اور عرض ایک میل بڑا ہے۔ یہاں سب سے زیادہ جاذب نظر مقبرہ ”جام نظام دین“ کا ہے۔

+ تپلس کے قریب کاریج شہر کے کھنڈرات قدیم ”فونیقی تہذیب“ کی غمازی کرتے ہیں۔

+ وادی نیل کی تہذیب کا آخری بڑا مرکز ”بابل“ تھا۔

+ ”بابل“ کلدانی حکومت کا صدر مقام تھا۔

+ سات عجائبات میں شامل ”رہوڑس کا مجسمہ“ تھا جو آٹھ دھاتوں سے بنایا گیا تھا اور اس کی ٹانگوں کے درمیان سے جہاز گزر جاتے تھے اور وہ پوری

مسلمان بچے کی پہچان  
+ میری پہلی پہچان یہ ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

+ میری دوسری پہچان یہ ہے کہ میں دن رات میں پانچ وقت کی نماز ادا کرتا ہوں۔

+ میری تیسری پہچان یہ ہے کہ میں ہر سال رمضان کے روزے رکھتا ہوں۔

+ میری چوتھی پہچان یہ ہے کہ میں بڑا ہو کر غریبوں، ضرورت مندوں کے لیے اپنے مال سے صدقہ اور زکوٰۃ ادا کروں۔

+ میری پانچویں پہچان یہ ہے کہ جب بڑا ہو جاؤں تو اللہ کے کھرچ کرنے جاؤں۔

(مسز شیر احمد دلبر..... سرگودھا) چند لمحے

+ زندگی میں چند لمحے ایسے بھی ہوں گے جب تم کسی کو چاہو گے لیکن تمہیں کوئی چاہنے والا نہ ہوگا۔

+ زندگی کے چند لمحے ایسے بھی ہوں گے جب تم کسی کا انتظار کرو گے لیکن تمہارا انتظار کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔

+ زندگی کے چند لمحے ایسے بھی ہوں گے

آنکھوں میں آنسو تو ہوں گے لیکن کوئی پونچھنے والا نہ ہوگا۔

میں لوٹ آؤں گا پھر عیدیں منائیں گے  
سعیدہ منظور ڈاہر..... کولتار ڈ (حافظ آباد)

ہر دکھ ہر غم کو بھول جائیں ہم  
تم جو آؤ تو عید منائیں ہم  
سنجبال رکھے ہیں لفظوں کے موتی  
دامن پھیلاؤ تو برسائیں ہم  
شیر احمد دلبر..... سرگودھا

حسن جتنا ہے میری آنکھ کی تحویل میں ہے  
ورنہ چہرے کے خدو خال میں رکھا کیا ہے  
پروین افضل شاہین..... بہاول پور

رو پڑا ہوں تو کوئی بات ہی اس میں ہوگی  
میں کہ واقف تھا تیرے ہجر کے آداب سے بھی  
کچھ تو اس آنکھ کا شبیہ ہے خفا ہو جانا  
صائمہ یاسمین..... نکودر

کبھی چھپنا چڑی کی آڑ میں وہ کسی کے ڈھونڈنے کی طلب  
نہ پلٹ کے آئیں گی ابھی وہ عیدیں جو گزر گئیں  
مہنا زگل روشنی..... رحیم یار خان

تو غزل اوڑھ کے نکلے کہ دھنک اوٹ چھپے  
لوگ جس روپ میں دیکھیں تجھے پہچانتے ہیں  
کتنے لبھوں کے غلافوں میں چھپاؤں تجھ کو  
شہر والے میرا موضوعِ سخن جانتے ہیں

قمر وحش اشوک..... کراچی

تپش سے بچ کر گھٹاؤں میں بیٹھ جاتے ہیں  
گئے ہوؤں کی صداؤں میں بیٹھ جاتے ہیں  
ہم ارد گرد کے موسم سے جب بھی گھبرا جائیں  
تیرے خیال کی چھاؤں میں بیٹھ جاتے ہیں

میر اصغر علی..... دینہ

وفا کا سندس لے کر اترے تمہارے آنگن میں  
گواہ محبتوں کا رفاقتوں کا بن کر ہلال عید



شعر کہنے کی ضرورت بھی گئی  
اس مشقت میں محبت بھی گئی  
دل سے جاتا رہا احساس وفا  
اور وہ پہلی سی محبت بھی گئی  
رانا طارق شمیم..... پاکستان نیوی

اب کرب کے طوفاں سے گزرتا ہی پڑے گا  
سورج کو سمندر میں اترتا ہی پڑے گا  
پڑتی ہے تو پڑ جائے شکن اس کی تجھیں پر  
سچائی کا اظہار تو کرتا ہی پڑے گا  
گڑیا ظفر..... کراچی

یادیں تیرے خلوص کی ڈستی ہیں آج بھی  
ملنے کی آرزوئیں ترقی ہیں آج بھی  
آنکھیں ہزار بار صبر کی کوشش کے باوجود  
رُک رُک کے باز بار برتی ہیں آج بھی  
ایم۔ آر۔ کے..... مظفر گڑھ

جار ہے ہو تو پھر خدا حافظ  
یاد رکھنا مگر دعاؤں میں  
ہاتھ اٹھانے سے فائدہ کیا ہوگا  
جب اثر نہیں دعاؤں میں  
صدقہ ہاشمی..... جھنگ صدر

اس مہربان کی نظر عنایت کا شکر یہ  
تحفہ دیا ہے عید پہ ہم کو فراق کا  
مریم چوہدری..... حافظ آباد

گئے برس کی عید کا دن کیا اچھا تھا  
چاند کو دیکھ کر اس کا چہرہ دیکھا تھا  
ناصر کبیرہ..... جتوئی

ہلال عید میرا بھی پیام لیتا جا  
کسی کے واسطے میرا سلام لیتا جا  
ساجد عباس اعوان..... حافظ آباد شی

خوشیوں کی شام اور یادوں کا یہ سماں  
اپنی پلکوں پہ ہرگز ستارے نہ لائیں گے  
رکھنا سنجبال کر چند خوشیاں میرے لیے



بندرگاہ کو اپنی ناگوں کے درمیان لیے کھڑا تھا۔  
 + مشہور گولڈن گیٹ برج اور بے برج امریکہ کے شہر سان فرانسسکو میں ہیں۔  
 + ٹھنڈے (سندھ) کی مسجد شاہجہانی سو گنبدوں پر مشتمل ہے۔  
 (سیراروشنی..... سیما ڈی، کراچی) اللہ

اقوال زریں  
 + خدا اور موت کو کبھی نہ بھولو۔  
 + اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالو۔  
 + لباس کی سادگی ایمان کی علامتوں میں سے ہے۔  
 + نیک کام کرنے کا موقع کبھی نکلنے نہ دے، کیا خیر موت کس وقت آ جائے۔  
 (عاصمہ انصاری..... جھمرہ ٹی)

بہر  
 سنو.....! جہر میں بکھری لکیروں کا رنگ بکھر نہیں کرتا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا چلا جاتا ہے لیکن تم اس شدت کرب سے نامانوس ہو کیوں کہ اپنی چاہت کو اپنے ہاتھوں کھونا پڑ جائے تو روح پر کیا گزرتی ہے تم اس ہولناکی سے واقف نہیں ہو!

(ساجد عباس اعوان حافظ آبادی)  
 گوہر نایاب  
 + ہر چیز کی زیادتی بے حد نقصان دہ ہے۔  
 + گھر رہنے کے لیے بنائے جاتے ہیں ناکہ نمائش کے لیے۔  
 + آپ کو اگر کسی دن دنیا اچھی نہ لگے تو کسی چھوٹے سے بچے کو آس کریم کھاتا دیکھ لیں، دنیا خود بخود خوب صورت لگنے لگے گی۔  
 + جس طرح زیادہ پانی پودوں کی جڑوں میں بیٹھ جاتا ہے اسی طرح زیادہ لاڈ پیار کر کے آپ

اپنے بچوں کی جڑوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔  
 + اللہ کے بارے میں ہمیشہ اچھا گمان رکھو وہ آپ کے بارے میں ہمیشہ اچھا گمان رکھے گا۔  
 + اللہ سے ہمیشہ عاجزی و انکساری سے مانگو وہ ضرور آپ کی مانگی ہوئی دعا قبول کرے گا۔ (انشاء)

(الی جب شانزے..... بارون آباد) یادگار لمبے  
 + بُری کتابیں ایسا زہر ہیں جو جسم کو نہیں روح کو مار ڈالتی ہیں۔  
 + مسلسل عبادت سے مقام کشف و مشاہدہ ملتا ہے۔  
 + اگر کسی کو تمہارے بارے میں اچھا گمان نہیں ہے تو اسے اچھا کر کے دکھاؤ۔  
 + خدا خوشحالی بخشے تو آرزوؤں کو وسیع نہ کرتے جاؤ۔  
 + سب سے اچھی مصروفیت کتابوں کا مطالعہ ہے یہ انسان کو بہت امیر اور با شعور کر دیتی ہے۔  
 + حسن بناؤ سنگھار سے نہیں کردار اخلاق اور اعمال سے ہوتا ہے جو دل موہ لیتا ہے۔  
 + چہرے پڑھا کر دیکھو یہ وہ کچھ بتاتے ہیں جو رویے اور عادات چھپاتے ہیں۔  
 (روبی مریم حمید..... اورنگی ٹاؤن، کراچی) یونین کے صدر

کلاس کے ایک اسٹوڈنٹ جو کہ یونین کے صدر تھے کے اعزاز میں الوداعی تقریب منعقد کی گئی۔  
 دوران تقریب ان میں سے ایک کلاس ٹیلو نے اُن کی شادی کے متعلق سوال کیا۔  
 ”شادی کا امکان کب تک ہے؟“  
 اس سوال پر تمام لڑکے اور لڑکیاں جواب سننے کے لیے خاموش ہو گئے۔  
 موصوف کافی شرمیلے تھے اسی لیے شرماتے

ہوئے جواب دیا۔  
 ”تین چار بہنوں کے رشتے آئے ہوئے ہیں اور ایک بہن سے تو بات بھی چل رہی ہے۔“  
 (لالہ رخ..... لاہور) باتیں بڑوں کی  
 + کتنے شرم کی بات ہے کہ صبح ہمارے جاگنے سے پہلے پرندے جاگ جائیں۔  
 (حضرت ابو بکر صدیقؓ)  
 + جو شخص دوسروں کی خوشحالی پر نظر رکھتا ہے وہ ہمیشہ نیک رہتا ہے۔  
 (حضرت علیؓ)  
 + زیادہ ہنسنے سے دل مر جاتا ہے۔  
 (حدیث نبویؐ)  
 + معافی بہت اچھا انتقام ہے۔  
 (حضرت علیؓ)  
 + امن چاہتے ہو تو کان اور آنکھ استعمال کرو اور زبان بند رکھو۔  
 (ہربرٹ اسپنر)  
 + جو اللہ کا وفادار نہیں وہ کسی کا وفادار نہیں۔  
 (امام غزالیؒ)  
 + سب سے بڑا چور وہ ہے جو آپ کا وقت چراتا ہے۔  
 (بالزاک)  
 + اپنی دشمنی میں احسان کا مطلب ایسے لیجئے کہ احسان کیجئے ضرور لیکن لیجئے مت۔  
 (بشری شیخ..... عارف والا) یادگار لمبے

میری گفتگوئے بے خودی  
 + جہاں قانون مجرم پر ہاتھ نہیں ڈالتا وہاں لوگ قانون کو ہاتھ میں لینے لگتے ہیں۔  
 + خیر سگالی..... خیر سے گالی بھی دے آئیں تو غیرت سے عاری قوم کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔  
 + جہاں ہر شخص صرف اپنی رائے اپنی بات اپنی سوچ اور خیال کو ہی درست سمجھتا ہو اور دوسروں کی رائے بات سوچ اور خیال کو غلط سمجھتا ہو وہاں اتفاق رائے اور مساوات نہیں ہو سکتی۔  
 + حسن اگر دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے تو بد صورتی بھی دیکھنے والے کی نگاہ میں ہی ہوتی ہے۔  
 + صبح کا بھولا شام کو گھر آ جاتا ہے مگر خدا کا بھولا کہیں جگہ نہیں پاتا۔  
 (سپاس گل..... رحیم یار خان) مہربان

آکر رقیبوں کے بہکاوے میں بدگماں ہونے سے پہلے میرے جذبے پر رکھ لینا! مجھ سے تصدیق کر لینا (طلعت رانا..... چیچہ وطنی) دنوں کی اہمیت

حضرت سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا پھر فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتہ کے دن پیدا کیا (یعنی زمین کو) اتوار کے دن اس میں پہاڑوں کو پیدا کیا۔ پیر کے دن درختوں کو پیدا کیا اور کام کاج کی چیزیں (جیسے لوہا وغیرہ) منگل کو پیدا کیا۔ اور بدھ کے دن نور کو پیدا کیا۔ اور جمعرات کے دن زمین میں جانور پھیل گئے۔ اور سیدنا آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر کے

دیکھ پگلی بڑا بنا چھوڑ دے  
 یعنی مجھے آلو بنا چھوڑ دے  
 روز ہو جاتی ہے بد قسمتی مجھے  
 روٹیاں پکی پکاتا چھوڑ دے  
 (ناراض چوہدری..... سوہا وہ)

اور سب سے بڑا چور وہ ہے جو آپ کا وقت چراتا ہے۔  
 (بالزاک)  
 + اپنی دشمنی میں احسان کا مطلب ایسے لیجئے کہ احسان کیجئے ضرور لیکن لیجئے مت۔  
 (بشری شیخ..... عارف والا) یادگار لمبے

دیکھ پگلی بڑا بنا چھوڑ دے  
 یعنی مجھے آلو بنا چھوڑ دے  
 روز ہو جاتی ہے بد قسمتی مجھے  
 روٹیاں پکی پکاتا چھوڑ دے  
 (ناراض چوہدری..... سوہا وہ)



بعد بنایا۔ سب سے آخر مخلوقات میں اور جمعہ کی سب سے آخری ساعات میں عصر سے لے کر رات تک آدم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ (مسلم)

(نویدہ قدیر ندا..... اسلام آباد)  
اقوال زریں

+ دیو کی طرح طاقت ور ہونا اچھی بات ہے مگر اس کی طرح طاقت استعمال کرنا بڑی بات بلکہ ظلم ہے۔

+ زبان کھولنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ دنیا میں تم سے زیادہ عقل مند لوگ بھی رہتے ہیں۔  
+ اصلی کامیڈین وہ ہے جس کے منہ کھولنے سے پہلے لوگ ہنس پڑیں۔  
(سمیرا روشنی..... سیما ڈی، کراچی)

اب جو آئے ہو تو کیا ہوگا

خود کھو گے مجھے دکھاؤ گے

یہی ہوگا کہ تم درجاں پر

دشمنیں دے کے لوٹ جاؤ گے

وہ اک شخص مجھ میں زندہ تھا

اس کو زندہ کہاں سے لاؤ گے

ایسے موسم گزر گئے ہیں کہ اب

مجھ کو بھی مجھ سا تم نہ پاؤ گے!

(خواجہ عرفانہ محبوب..... جتوئی)

عورت کے روپ

حسن..... عورت کا جادو ہے۔

سیرت..... عورت کی خوب صورتی ہے۔

حیا..... عورت کا زیور ہے۔

رحم..... عورت کی فطرت ہے۔

انکساری..... عورت کی شان ہے۔

اور قرض..... عورت کی منزل ہے۔

(سعدیہ عروج عباسی..... خانپور کٹورہ)

جبران نامہ

+ لوگ فطرنا اس شخص کے غلام ہیں جو کسی کے سامنے نہ جھکے۔

+ ٹوشنم کے قطرے پر غور کر، تجھے سمندر کا راز

معلوم ہو جائے گا۔

+ بعض لوگ کسی بات سے خوش ہو کر نہیں بنتے

بلکہ اس لیے بنتے ہیں کہ دوسرے لوگ انہیں بے

وقوف نہ سمجھیں۔

+ اقوال بے معنی ہیں جب تک یہ عادات پر اثر

انداز نہ ہوں۔

+ حقیقت سے روشناس ہونا لازمی ہے اور یہ

کوشش ہمیشہ جاری رہتی ہے اور یہ فاصلہ صرف

آرزوئی طے کر سکتی ہے۔

+ محبت اور شکر میں کبھی صلہ نہیں ہو سکتی۔

(ٹوبیہ جہانگیر..... آزاد کشمیر)

اقوال زریں

☆ برے دوستوں سے بچو کیونکہ وہ تمہارا تعارف بن

جاتے ہیں۔

☆ جب تک کسی سے بات چیت نہ کرو اسے حقیر نہ

جانو۔

☆ تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی زبان

ہے۔

☆ دولت کے بھوکے کو کبھی حقیقی سکون حاصل نہیں

ہو سکتا۔

☆ ہر ناکامی کے بعد کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ شرط

یہ ہے کہ ناکامی کے بعد مایوس نہ ہوا جائے۔

☆ دشمنوں کو نیک مشورے سے شکست دو اور

دوستوں کو اخلاق و انکسار سے اپنا گرویدہ بناؤ۔

☆ عورت مصیبت و غم کو کم کرنے کے لیے پیدا کی گئی

ہے۔

☆ امید کا دوسرا نام غریبوں کی قوت ہے۔

(ماہا جین۔ کراچی)

مطالعہ

۱۔ علم حاصل کرنے کے لیے مطالعہ اتنا ہی ضروری

ہے جتنا کنول کے لئے پانی۔ (تلسی داس)

۲۔ جو لوگ مطالعہ نہیں کرتے ان کے پاس سوچنے

کے لیے بہت کم باتیں ہوتی ہیں اور بولنے کے لیے

کچھ نہیں۔ (فرانسس بیکن)

۳۔ علم کے ساتھ صحیح ذوق ضروری ہے۔ علم کتنا ہی

وسیع ہو، ذوق صحیح نہ ہو تو علم بے نتیجہ اور بے اثر ہے۔

(بابائے اردو)

۴۔ دنیا کی کوئی تفریح اتنی سستی نہیں جتنی مطالعہ کی

عادت ہے۔ (والیٹی)

۵۔ کتابوں کے اوراق کی نسبت انسانوں کے

چہروں کا مطالعہ زیادہ دلچسپ ہے (بالمورتھا)

۶۔ اتنا کھاؤ جتنا ہضم کر سکو۔ اتنا پڑھو جتنا جذب

کر سکو۔

(سیدہ لیلیٰ شہزادی۔ لاہور)

فیض

ہم نے امید کے سہارے پر

ٹوٹ کر یوں ہی زندگی کی ہے

جس طرح تم سے عاشقی کی ہے

❖❖❖

اگر تم محبت کے ساتھ نہیں بلکہ ناپسندیدگی کے ساتھ

میں کام کر سکتے ہو تو اس سے بہتر یہ ہے کہ تم اپنا کام

چھوڑ دو اور مندر کے دروازے پر بیٹھ کر ان لوگوں

سے خیرات لو جو صبر کے ساتھ کام کرتے ہیں!

خلیل جبران

(المطرہ۔ نمائش کراچی)

احادیث مبارکہ

لڑکے لڑکی کا بھاگ جانا جسے آج کل مہذب

الفاظ میں کورٹ میرج کہتے ہیں یہ اسلامی روایات

اور امت کے عملی قواعد کے سراسر منافی ہے۔ ایسی



شاید میرا شمار ہو اہل کمال میں  
کیا کہیں کیسے گزرے ہیں لندن کے چار دن  
دو ٹیکسری میں کٹ گئے، دو اسپتال میں  
(ارم الیاس خان زادہ۔ ٹنڈوالہ یار)  
مسلمانوں کا المیہ

اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان  
آپس میں بھائی بھائی ہیں تو کشمیر، چیچنیا، بوسنیا اور  
دیگر مسلم ممالک میں اپنے بھائیوں کا خون دیکھ کر  
خاموش کیوں بیٹھے ہیں، ناصرف خاموش ہیں بلکہ  
پہلے سے زیادہ امریکہ کو اپنی وفاداریوں کا یقین  
دلانے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ افسوس صد افسوس!  
(شازیہ خان۔ نیو کراچی)

مدد و تعاون

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول  
اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”جو شخص کسی کی مدد کرتا ہے تو اللہ  
تعالیٰ اس کی کسی ضرورت کے وقت مدد کرتا ہے۔  
(صائمہ نذیر۔ کراچی)

یادگار لکے

❖ موت ایک بے خبر سا بھئی ہے۔  
❖ محبت کرو مگر مقدر سے شکوہ نہ کرو کیونکہ محبت میں  
کامیابی ہر ایک کو نہیں ملتی۔  
❖ جانور تو اپنے مالک کو پہچان لیتا ہے مگر افسوس کہ  
انسان اپنے حسن کو نہیں پہچانتا۔  
❖ خداوند تعالیٰ اس شخص پر رحمتیں نازل کرتا ہے جو  
کسی کے عیب ظاہر نہیں کرتا۔  
❖ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی  
ہیں۔

(ناصر کوہ عرف شاہ رخ۔ جتوئی)

قابل غور

خیل جبران کہتا ہے کہ ہم سفید سفید کونجوں کا  
ایک غول ہیں جو نیلے نیلے آسمان میں اٹھمنزل کی  
تلاش میں نکلتے ہیں، خوش خوش، لیکن کسی کو اپنی منزل

خوب صورت باغ میں ملے گی اور کوئی رات کی  
سیاہی میں سخت چٹانوں سے ٹکرا کر خارداروں میں  
گر جائے گا۔

(شازیہ ملک۔ بہاولپور)

ہجر

بعض لوگوں کے مقدر میں ہجر ہی لکھ دیا جاتا ہے  
وہ جس جانب پکیں، جس شخص کو چاہیں، اسے کبھی  
نہیں پاسکتے، کبھی رسمیں راستہ بدل دیتی ہیں اور کبھی  
چپکے سے وہ شخص ہاتھوں سے نکل جاتا ہے اور زندگی  
ہجر میں ہی تمام ہو جاتی ہے۔

(شازیہ ناز۔ ڈرگ روڈ)

قطعہ

اس کے نزدیک غم ترک وفا کچھ بھی نہیں  
مطمئن ایسا ہے وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں  
اب تو ہاتھوں سے لکیریں بھی مٹی جانی ہیں  
اس کو کھو کر تو مرے پاس رہا کچھ بھی نہیں  
(عابد محمود۔ ملکہ بانس)

موتی مالا

☆ لوگوں کو ہماری ضرورت نہیں بلکہ وہ صرف یہ  
دیکھتے ہیں کہ ہم ان کے لیے کتنے مفید ثابت ہوتے  
ہیں۔

☆ اللہ کا شکر گزار نہ ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی  
ناراضگی تجھے بڑی آفت میں مبتلا کر دے۔

☆ انسان اس سے زیادہ دھوکا کھاتا ہے جس سے وہ  
زیادہ پیار کرتا ہے۔

☆ ہر وقت یہ خیال رکھنا کہ کہیں تیری زبان کی تلوار  
سے کسی کا دل زخمی تو نہیں ہو رہا۔

☆ زندگی کے آدھے زخم انسان دوسروں سے  
امیدیں وابستہ کر کے خریدتا ہے۔

☆ جو چیز آسانی سے مل جاتی ہے وہ زیادہ دیر تک  
نہیں رہتی۔

(فریدہ جاوید فدی۔ لاہور)

تین چیزیں  
☆ تین چیزیں گفتگو کا حسن ہیں۔ خاموشی، عورت  
اور جذبہ۔

☆ تین چیزیں یاد رکھنے سے ثواب ملتا ہے۔ سچائی،  
فرض اور محنت۔

☆ تین چیزیں ہر ایک سے جدا ہوتی ہیں۔ صورت،  
سیرت اور قسمت۔

☆ تین چیزیں آپس میں لڑاتی ہیں۔ زن، زر اور  
زمین۔

☆ تین چیزیں دل سے کریں۔ رحم، کرم اور دعا۔

☆ تین چیزیں ہمیشہ یاد رکھیں۔ کم کھانا صحت، کم بولنا  
حکمت اور کم سونا عبادت میں داخل ہے۔

☆ تین چیزیں کسی کا انتظار نہیں کرتیں۔ موت، وقت  
اور عمر۔

(فرحین عمران۔ کراچی)

دل

کسی سے ناتا ہم کبھی جوڑا نہیں کرتے  
ملا میں ہاتھ تو عمر بھر چھوڑا نہیں کرتے  
ہمیں معلوم ہے بالآخر جیت ہماری ہے  
سو وقتی شکستوں پہ دل توڑا نہیں کرتے

شایدہ محرم سندس..... کمالیہ  
نظم

تم کیا جانو پاگل پریتم  
جب سے تم پر دلیں گئے ہو  
گھر خالی آنگن بناتے

ساوَن عیدیں بے رنگ گزریں  
کچھ تو سوچو ساجن تم بن  
کیسی عیدیں کیسی خوشیاں

چوڑی ہائی کاہل بندیا  
چند اعلیٰ پھول اور شمع  
سب کہتے ہیں

آ جاؤ ناں.....!  
تم کیا جانو ہر آہستہ پر

دل کی دھڑکن کہتی ہے  
تم آئے ہو  
پاگل پریتم.....!

تمہیں بتا رہے کتنے دن سے  
چوٹ پٹھن  
جتنی رستہ دیکھ رہی ہے

اُس کی سائلی سندر تائیں  
پیلا پن ہے  
جلدی لٹو عید آئی ہے

اب تو تم کو آنا ہوگا  
عید کو خاص بنانا ہوگا

(گنبد شاہ..... کراچی)

عید بند کمرے میں گزرجائے گی  
پھر عید آئے گی  
پھر سوچوں پہ پھرے ہوں گے

تیری ملاقات میں  
تیری بات میں  
اجاڑا آنکھوں کی پیاس کی تہوں میں

وصال و عددوں کی جنگاریوں کو  
اشکوں کی آنچ دے کر  
لفظوں کی آبتاریں

آہٹوں کا جال بنیں گی  
ہوا کی جھلکیوں میں تیری نرم باتیں  
مجھے پھر لائیں گی

سوچتا ہوں  
خیال آج بھی  
تمہاری انگلیوں سے

دل کے سرخ آنسو پوچھے گا  
اور ہر سال کی طرح  
یہ عید بھی بند کمرے میں گزرجائے گی

(ساجد عباس اعوان۔ حافظ آباد)



آئینہ

شہلا عامر

عباسی) ”بانہوں کے گھیرے میں“ (ہما جہانگیر) ان تمام رائٹر ز کو اور ڈمنا چاہیے۔ کیا شاندار ناؤ تحریر کیے ہیں۔ (واہ بھی واہ) غزلیں، نظمیں پڑھ کر تو یوں معلوم ہوا کہ جیسے سب ہی بازی لے جائیں گے اور واقعی سب کی تحریریں بہت اچھی لگیں۔ نازیہ کنول نازی اور تابندہ کوکب گیلانی ان دونوں نے کمال کر دیا نظم لکھنے میں۔ نازی کی شاعری بہت پسند ہے مجھے۔ ”دش مقابلہ“ میں ”سب سے دار تو رہے“ پسند آیا۔ بنانے میں اور کھانے میں۔ ”یادگار لکھے“ ہمیشہ کی طرح دل کو خوش کر گیا۔ ”دوست کا پیغام آئے“ میں سب کے پیغام لا جواب تھے۔ ”ہم سے پوچھیے“ میں چند راسوئی نمبر لے لیکن۔ ”آئینہ“ میں لکھا تھا کہ سب آج تبصرہ میں بازی لے جائیں گے۔ آپنی ویری گذ اس ماہ کے رسالے نے کمال کر دیا۔ خدا اس کو مزید ترقیاں عطا فرمائے۔ (آئین)

رونی مریم حمید۔ اور گی ناؤن کراچی۔ ڈیزر شہلا پیچھو! سب سے پہلے آپکل سے وابستہ ہر شخصیت کو السلام علیکم ڈیزر فرینڈ ز اینڈ آپکل ممبران امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے اور عید کی مناسبت سے مزے مزے کے پکوانوں سے لطف اندوز ہو چکے ہوں گے۔ شہلا پیچھو اس ماہ حیرت انگیز طور پر آپکل ۲۵ جنوری کو ہی مل گیا تھا۔ عید سے تقریباً ایک ہفتہ قبل اور یوں عید کی خوشی دوبالا ہوگی۔ بے زاری آنکھوں کا تاثر دیتی قاتل حسین کا ٹائٹل اور عید کی مناسبت سے اس کا سوٹ و جیولری زبردست لگا۔ اشتہارات کی دیوار چین پھلانگتے ہوئے پہلے آپ کی ”سرگوشیاں“ سینس اور پھر ”در جواب آں“ اپنے افسانے کے حوالے سے خالہ جانی کا جواب پڑھ کر دل میں تہیہ کیا کہ مزید محنت کریں گے۔ ”دانش کدہ“ میں حکیم صاحب کے مضمون ”تزکیہ نفس“ نے کافی معلومات فراہم کیں۔ اس کے بعد ہمارا آپکل کی سونیت کی عمرانیہ رمضان اور عظمیٰ صفر سے ملاقات کی۔ ”جیون ساسھی“ میں اپنی پیاری سی مصنفہ شمیم ناز صدیقی کی شادی کا احوال پڑھ کر اور تصویریں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ میری طرف سے انہیں شادی کی بے حد مبارک باد۔ ”محبت ابر کی صورت“ مکمل ناول میں کوئی بات خاص نہ تھی۔ عام سی اسٹوری کو خواجہ اتنا گھمایا پھر لایا۔ ”میری الفت میں صنم“ کی یہ قسط شاندار رہی۔ مشعل اپنے پیار سے ملنے کی شرط پر یہی آہی تبدیلی پر کچھ راضی تو ہوئی۔ ”کوئی ایسا شجر ہو“ اچھا لکھا گیا۔ ”تم میری خواہش ہو“ پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ کسی فلم کی اسٹوری کو بغیر گانوں کے کہانی کی شکل دی گئی ہو۔ اب میرا پسندیدہ ”افسون جاں“ کے لیے سوچ رہی ہوں کہ کیا لکھوں سوائے بیسٹ اور صرف بیسٹ کے تیسری قسط بھی زبردست رہی۔ عشنا جی ہر کردار کو بھر پور انداز میں لکھ رہی ہیں۔ ”چلے آؤ کر دل بہت اداس ہے“ میں کہانی نظر آتی اتنی غیر ذمے دارانہ غلطی یا غلطیاں تو اب ہمارا مزاج بنتی جا رہی ہیں۔ ”بانہوں کے گھیرے میں“ بے چاری عروہ شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ بہت زیادہ حسن بھی کبھی کبھی لڑکیوں کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ شاہ نے مجھداری کا مظاہرہ کیا۔ ”سبز رتوں کی جھیل میں“ تابندہ کے لیے آزمائشیں اور گھر کی سیاست کا آغاز ہو گیا ہے۔ تابندہ کا رد عمل تو آئندہ افسانہ پڑھ کر ہی پتا چلے گا مگر والدین کی نا فرمانی کی کچھ نہ کچھ سزا تو اسے ملنی چاہیے۔ مہندی کے ڈیزائن اس مرتبہ کچھ خاص نہیں تھے۔ ”غزل“ ”نظم“ میں نازیہ کنول فریدیہ خانم تابندہ کوکب کوٹھن اقبال کا کلام پسند آیا۔ ”بیاض دل“ اور ”یادگار لکھے“ کی ہر تحریر اچھی تھی۔ تبصرے بھی زبردست تھے جب کہ دوستوں کے پیغام میں سب سے اچھا پیغام شیر افضل اور اس کے بعد نوذیر کی حیرت انگیز کالگاہ۔ انفرادی حوالے سے تمام ہی اچھے تھے۔ ”ہم سے پوچھیے“ میں سوال ایتھے تھے مگر جوابات اس سے بڑھ کر اچھے اس شمارے پر تبصرہ کافی طویل ہو گیا ہے۔ اس لیے اب اجازت دیجئے اگلے تبصرے تک اللہ حافظ۔

نویدہ قدیر ناؤ اسلام آباد۔ پیاری آہی ڈھیر ساری دعائیں اور سلام۔ جونہی فردی کا آپکل ہاتھ میں آیا تو ہم نے اس کے خوب صورت ٹائٹل کی من ہی من میں تعریف کی۔ ٹائٹل گرل بہت اچھی نظر آ رہی تھی لیکن ”سرگوشیاں“ پڑھنے کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ کوئی ٹائٹل گرل نہیں بلکہ حضور اقریٰ بھائی ہیں۔ بہت پیاری بھالی ہیں حضور اتھاری۔ حمد و نعت سے فیض یاب ہونے کے بعد ہم نے اپنا فورٹ سلسلہ ”در جواب آں“ دیکھا۔ جہاں فرحت آہی اپنے مخصوص انداز میں جہنوں بھائیوں کے پوچھ گچھ کے سوالات کے خوب صورتی سے جوابات دے رہی تھیں۔ کئی پرانے اور کئی نئے چہروں کی جھپٹ میں ہم

سعد یہ ایل کاشف۔ آپکل کے ایڈا اس کے جانے والوں میں لکھنے والوں اس کو پڑھنے والا وہ سب مل گائیں۔ ”میں برتھ ڈے ٹو آپکل“ یہی برتھ ڈے ٹو آپکل کے لیے تبصرہ تحریر کرنا میرے لیے ہمیشہ باعث مسرت رہا ہے۔ ناول یا افسانہ بھی مجھے اتنا مزہ نہیں دیتا جتنا کہ تبصرہ۔ تو آپکل کے برتھ ڈے آپٹیل کے لیے تبصرہ تحریر کرنے جارہی ہوں۔ ماں تو فروری کا آپکل ہمیں جنوری میں ملا۔ یعنی ۲۹ تاریخ کو۔ ٹائٹل گرل یعنی عروہ سب کچھ غصے میں تھیں شاید بھی منہ پھلائے کھڑی تھیں۔ خیر میں آپکل کی واحد قاری ہوں گی جو کہ اشتہارات اور اسکچو کو بھی غور سے پڑھتی ہوں یا دھکتی ہوں۔ ”سرگوشیاں“ میں نئے ستاروں کے بارے میں پڑھا۔ حمد و نعت اور دانش کدہ سماعت فرمایا۔ عمرانہ رمضان سے مل کر بہت اچھا لگا۔ عظمیٰ صفر نے زیادہ انسا نہ کیا البتہ شمیم ناز صدیقی کے افسانوں ہی کی طرح ان کی شادی کا احوال بھی دل کو بھا گیا۔ شمیم کو ”یہ کیسا جیون“ کے بعد ”جیون ساسھی“ مل گیا۔ کالمز بھی اچھے تھے۔ ”آپ کی شخصیت“ بھی اچھا تھا۔ ”کام کی باتیں“ واقعی کام ہی کی تھیں۔ مشاعرہ بھی زبردست رہا۔ مجھے نازیہ کنول اور حکیم خان کی شاعری نے متاثر کیا۔ ”یادگار لکھے“ میں شاید بحر اور عائشہ صدیقی ایسا رنگ تھیں۔ ”آئینہ“ میں آزاد حسین بھائی کا تبصرہ اچھا تھا۔ ”دوست کا پیغام آئے“ میں شبیر انکھل کی دعائیں پڑھ کے آنکھ نم ہوگی۔ واقعی یہ ایک اچھے والد کے بلکہ باپ کے دل سے اٹھنے والی دعائیں تھیں۔ ”ہم سے پوچھیے“ میں اس بار ہمیں چاند صابہ یا صاحب کے سوال اچھے لگے۔ اب آتے ہیں ناول کی طرف۔ سلسلے اور ناول تینوں اپنی اپنی رفتار سے محسوس ہیں۔ عفت بہت اچھی جا رہی ہیں۔ بس ذرا الٹی کی شخصیت کو غیر واضح کہے ہوئے ہیں۔ مکمل ناول ”محبت ابر کی صورت“ نے متاثر کیا۔ چونکہ میرا پہلا افسانہ بھی اسی نظم پر مشتمل تھا۔ اسی لیے پہلے یہی پڑھا۔ ناول میں ”کوئی ایسا شجر ہو“ کہانی اتنی دلچسپ نہ تھی۔ اسلوب مختلف تھا۔ حنا ملک کا۔ اصل میں کہانیاں وہی ہوتی ہیں۔ اسلوب سے ہی پہچان ہوتی ہے۔ شبانہ کا ناول اچھی کہانی اور پلاٹ سے آراستہ ہے۔ امید ہے کہ اگلے سے اگلے ماہ تک ہم زندہ و سلامت رہیں گے اور اپنا سن پسند کام یعنی تبصرہ لکھیں گے۔

الی جب شانزے ہارون آباد۔ آہی السلام علیکم! خدا آپ کی عمر دراز کرے آئین۔ سب سے پہلے تو بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے ہمیں ”در جواب آں“ میں جگہ دی۔ اس کی ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ اس کے بعد اپنی تحریروں کی اشاعت نے بہت خوشی دی۔ گزشتہ دنوں میں بے حد بیمار رہی تھی۔ چکن پاکس نکلے ہوئے تھے۔ اب بھی طبیعت اتنی کچھ خاص بہتر نہیں ہوئی۔ اب ہم طبیعت نامہ بند کرتے ہیں اور آتے ہیں فردی کے آپکل کی طرف۔ کیا تعریف کریں آپکل کی؟ اس ماہ تو آپکل ٹائٹل سے لے کر آخری صفحے تک بے حد شاندار پایا۔ جیسے ہی آپکل ہاتھ میں آیا۔ ٹائٹل دیکھ کر دل بے حد خوش ہوا۔ (واہ کیا خوب صورت دلہن بھی) سب سے پہلے تو ذرا تبصرہ کرتے ہیں سلسلہ دار ناؤ پر۔ عشنا کو شرمسار کی کاوش ”افسون جاں“ بے حد اچھی لگی۔ یہ قسط شاندار تھی۔ ”میری الفت میں صنم“ پڑھ کر تو ایسا ہی لگا جیسے اس بار اقراء جی نے دل لگا کر نہیں لکھا۔ اس کے علاوہ ”سبز رتوں کی جھیل میں“ عفت جی نے بہت متاثر کیا۔ اس کے علاوہ ”محبت ابر کی صورت“ (سیدہ تہمنہ زہرہ) ”کوئی ایسا شجر ہو“ (حنا ملک) ”تم میری خواہش“ (سیدہ شبانہ مراد) ”چلے آؤ کر دل بہت اداس ہے“ (عذرا بتول



بھی موجود تھے۔ فوزیہ کپڑا بڑی خوشی سے اپنی فی شاعری کی کتابوں سمیت موجود تھیں۔ پھر ”ہمارا آچل“ تک پہنچے جہاں عمرانہ رمضان ہماری منتظر تھیں۔ پھر ”غزل اس نے چھٹی“ کے سلسلے تک پہنچے تو اپنی پرانی ساتھی عظمیٰ صفدر یا کو موجود پایا۔ بمع ان کی شاعری کے۔ خوشی ہوئی۔ شاہین ناز صدیقی اپنی بہن شیم ناز صدیقی کا خوشخوار ہی تعارف کروا رہی تھیں۔ جملایہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم آچل کی رات شیم ناز کو نہ جانتے ہوں۔ بہر حال ان کی شادی کا احوال کافی دلچسپ لگا ان کی تصاویر سمیت۔ اقراء صغیر احمد کی الفت میں ہم ”سبز رتوں کی جھیل میں“ عفت حشر پاشا سمیت غوطے لگا رہے تھے کہ ”محبت ابرکی صورت“ ہمارے چاروں طرف چھا گیا۔ تو ہمارا جھلیکے نے ہمیں اپنی ”بانہوں کے گھرے میں“ میں لے لیا۔ ابھی ہم کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک تیز دھوپ نکل آئی اور ہم کسی سایہ دار جگہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے جو کہ حنا ملک نے ہمیں ”کوئی ایسا خبر ہو“ کی صورت میں کرایا۔ عذرا بتول عباس پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ ”چلے آؤ کہ دل بہت اداس ہے“ سیدہ شبانہ سردار بھی اپنی خواہش کا اظہار کرنی نظر آ رہی تھیں ”تم میری خواہش ہو“ عید کی مناسبت سے عاتقہ شفا کے مہندی کے ڈیزائن سو سوئی تھے۔ جب کہ ”دُش مقابلہ“ میں کڑا ہی گوشت چائیز چلی کباب اور میوے دار ورق مرہائی ہی ہمارا دکھا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اوپر کوئے میں گلی گلیہ شاہ کی نظم شک کی دلہل نے بہت متاثر کیا۔ ”شعر و سخن“ میں فوزیہ حشر کائنات نازیہ کنول نازی گڑیا (کوئی) کے کلام نے دل پر اثر کیا جب کہ فریدہ خانم لاہوری محبت کو بدعا اچھی نہیں لگی۔ ”بیاض دل“ کے برعکس ”یادگار تھے“ کا سلسلہ جاندار تھا۔ ”ہم سے پوچھیے“ میں سوالات و جوابات دونوں ہی یوریت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ سوال اچھے ہوں تو جواب بھی لکھے گئے۔

لالہ رخ لاہور۔ سو سویت شہلا آئی، آچل اسٹاف اور پر بہار قارئین کو میرا محبتوں بھر اسلام۔ خدا کرے آپ سب جہاں بھی ہوں بننے سکراتے ہوں۔ آئین افروزی کا آچل حیرت انگیز طور پر ۳۱ جنوری کو ماٹول ایک دم سکر اور پھر ایک لمبی (آنکھوں کو چھوٹی ہوئی) مسکراہٹ نے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ ایک دفعہ پھر (چھپیل فروری کی طرح) دلہن سے بچے سرورق و تنقید نگاہوں سے دیکھنے ہی لگے کہ آواز آئی (ارے یہ تو بھائی جان ہیں) (صفورہ تم کی) ورق پلانا تو کمرشلز سے مذہم بیٹھ ہو گئی۔ غاف انہیں منشا کر ”سرگوشیاں“ میں اپنی پیاری خالہ جانی کی سرکوشی با آواز پڑھی۔ ”در جواب آئی“ میں پہلے میں پہلے کی نگرار کو چھوڑ کر حکیم سعید کی باتوں سے مستفید ہوئے۔ ”ہمارا آچل“ میں عمرانہ رمضان سے مل کر اچھا لگا اور ”غزل اس نے چھٹی“ میں عظمیٰ کی شاعری پڑھی۔ بس سو سوئی۔ ”جیون ساتھی“ میں شیم عثمان کی شادی کی روداد اچھی لگی۔ ”سبز رتوں کی جھیل میں“ (عفت حشر پاشا) مین کا کردار بالکل کثیر ہے۔ وہ کیا جانتی ہے اس کا انداز تو ہمیں دوسری قسط میں ہی ہو گیا تھا۔ (سمجھ داری کی بات ہے اور مایدولت.....) اب جب کہ صبرہ کو مین کے بارے میں علم ہوئی گیا ہے تو ایڈی سے چڑنا چھوڑ دے گی۔ ”تیری الفت میں صنم“ (اقراء صغیر احمد) ”آئینہ“ میں بہت سے قارئین نے اسے ”ہولا“ قرار دیا ہے۔ حالانکہ ایک کہانی لکھنا مشکل ترین کام ہے اور اقراء اس مشکل کو آسان کرنے میں کامیاب ہو رہی ہیں۔ ہاں اقراء جی پلیز جلدی سے شاہ اور مشعل کی طرح بے شک نہ کرنا کیونکہ کہانی کو توڑی کی تیزی دیں۔ (ایک دم ٹوک) ”افسون جاں“ (عشنا کوثر سردار) بظاہر سردار سلیمین حیدر لغاری نے اپنے چہرے پر بے نیازی اور گردن کو خول چڑھا رکھا ہے اس کے پیچھے بھی کوئی انہونی بات ہے۔ عفتان علی خان کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ محبت اتنا بھی لے بس نہیں کر دیتی کہ ہوش سے بیگانہ کر دے۔ بہر حال قصور انابہ کا بھی ہے اپنے تاثرات و راحت رکھے اور اذہان صاحب ابھی تک اپنے کھریلو مسائل میں الجھے ہوئے ہیں کہ دور دور تک ان کی ہیروئن نظر نہیں آ رہی۔ شاید انابہ..... ”محبت ابرکی صورت“ (سیدہ تہند زہرہ) اذکار اور وردہ کے درمیان کس انڈر اسٹینڈنگ کی جھج جھج آئی۔ جہاں دوق و محبت ہو وہاں بدگمانی بھی نہیں۔ ”کوئی ایسا شجر ہو“ (حنا ملک) حنا کی تحریر میں آہستہ آہستہ پچھلی آئی جا رہی ہے خوب صورت کہانی لیکن ایک بات تو بتائیں کہ کیا کسی ہیروئن کے رشتے دار نہیں ہوتے۔ ”تم میری خواہش ہو“ (سیدہ شبانہ سردار) ایک ملکی جھلکی کہانی پسند آئی۔ واقعی آج کل ڈگری ہولڈر دل رہے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہے۔ ”چلے آؤ کہ دل بہت اداس ہے“ (میں آگئی عذرا بتول عباس) بہت

خوب صورت افسانہ اچھے بھلے انسان کو روگ لگانے کی ناکام کوشش کی ان لب والوں نے میں تو روٹھتی تھی..... (خیال ہی خیال میں) ”بانہوں کے گھرے میں“ (ہما جگیا کیر) ڈری سبھی عروپہ برتر بھی آتا ہے۔ مستقل سلسلوں میں ”ہم سے پوچھیے“ میں سارہ بتول اور پر دین افضل کو اپنا نے اچھے جوابات دیے۔ ”دوست کا پیغام آئے“ میں اپنے نام پیغام اچھا لگا۔ ”یادگار تھے“ میں اوٹ سلاخ اور نفرت کی ڈیفنی نیشن اچھی لگی۔ ”بیاض دل“ میں فوزیہ حشر کائنات شازیر یا ش نازیہ را میں اور رشیدہ ناز کا انتخاب پسند آیا۔ ”شعر و سخن“ میں فوزیہ حشر کائنات فریدہ خانم (اے محبت) اور حکیم خان حکیم کی شاعری اچھی رہی۔ ”دُش مقابلہ“ میں ساری ڈشیں آزما میں آجیا۔ اب ذرا ”آئینہ“ کی بات ہو جائے۔ تانہہ کوکب گیلانی، سمیرہ اصغر علی اور آزاد حسین آزاد (بہت بہت شکر یہ تبصرہ پسند کرنے کا) نے زبردست تبصرہ کیا اور مس ملائکہ نے تو میری خوشی دیدنی کر دی (لیکن جب امی نے کہا کہ ”نمبروں ہوئی آچل میں چلو چکیں میں تو.....) میں سب کو ایک بات کہنا چاہوں گی کہ جب ہم کوئی کہانی پڑتے ہیں تو فٹ سے ہم اس پر تنقید کر دیتے ہیں کہ ہمیں نہیں پسند اگر ایسا ہوتا تو مزہ آتا تو یہ ہونا چاہیے تھا حالانکہ میرے خیال میں جس اور سپنس ہی کہانی کو آگے بڑھا تا ہے اگر کہانی کثیر ہوگی تو ہمیں مزہ نہیں آئے گا اور ہمیں پہلے سے علم ہوگا کہ آگے کیا ہونا ہے۔ اس لیے آپ لوگ تنقید ضرور کریں لیکن ایک دم سے کہہ دینا کہ کہانی اچھی نہیں واقعی میں اچھی بات نہیں (اف عقل! آئی مٹی) (اے کے ڈیز فرفرینڈ زاب اجازت چاہوں گی لیکن جانے سے پہلے ایک خوب صورت سی بات۔ ”خوب صورتی چہرے پر نہیں بلکہ دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتی ہے۔“ دوستو جب بھی دعائیں تو اپنے وطن عزیز کے لیے ضرور مانگیں۔ خدا ہمارے پاکستان کو شاد و پاد رکھے اور ترقی دے۔ آمین ثم آمین۔ خدا حافظ اللہ تمہارا۔ طلعت رانا پیچھے دھکی۔ کیونٹی شہلا آئی! السلام علیکم۔ سدا خوشیوں بھری برساتوں میں کھلتی رہیے (آمین) آپ! سب سے پہلے آپ لوگوں کی مشکور ہوں کہ اس نیاری بزم میں شامل کیا۔ میں تو بایوں ہو چکی تھی۔ آچل اپنے نہایت حسین ٹائٹل بلکہ انٹیکو ٹائٹل سمیت زبردست لگا۔ مستقل سلسلوں میں دوا لیے سلسلے ہیں جن کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہے۔ ایک ”آپ کی شخصیت“ اس کو پڑھ کر ذہن کو جلا پھیلتی ہے۔ دوسرا ”یادگار تھے“ اس میں ہر طرح کی وراثی ہوتی ہے۔ سوال کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ سے پوچھیے میں سوال مزاحیہ انداز کے ہوں تو اس کا مزہ مزید دو بالا ہو جائے۔ اس سلسلے میں اسٹارز کو توجہ دینی چاہیے کہ آچل کو خوب صورت رنگ دینے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ”آئینہ“ میں دوست بہت فیصلی اور معلوماتی تبصرے کرنے لگے ہیں۔ ہونے بھی چاہئیں۔ اس دفعہ ملائکہ خان اور آزاد حسین آزاد کا تبصرہ زبردست رہا۔ نازیہ کنول نازی بہت گہری شاعری کرتی ہیں۔ یہ ریڈیو میں بھی خاصی مقبول ہیں۔ عظمیٰ صفدر سے ملاقات بہت پسند آئی۔ خود بھی پیاری ہیں۔ شیم ناز صدیقی بہت سچ رہی تھیں۔ آپ کو زندگی کا نیا سفر بہت مبارک ہو۔ اقراء صغیر احمد حسب سابق اچھا لکھ رہی ہیں اور عشنا کوثر کی بات ہی کچھ اور ہے۔ عفت حشر پاشا چھاتی ہیں۔ امید ہے اتنی پیاری راتنر مزید ترقی کریں گی۔ خدا آچل کو یونہی چمکتا دیکھتا رکھے۔ آمین۔ اپنی دعاؤں میں مادر محبت کا آپ سب کے لیے ہمیشہ دعا گو۔

حنا ملک لمٹان۔ ڈیز آئی اور قارئین! السلام علیکم۔ آج کافی عرصے بعد ”آئینہ“ میں شرکت کر رہی ہوں۔ امید ہے سب خیریت سے ہوں گے۔ فروری کا آچل ۳۱ جنوری کو ہی مل گیا تھا جس پر میں ابھی تک حیران ہوں۔ (در اصل یہ انہونی پہلی بار ہوئی ہے ناں) سرورق اچھا تھا۔ اپنا ناول دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سب سے پہلے اپنے پسندیدہ ناول کی طرف دوڑ لگائی۔ جی ہاں میں بات کر رہی ہوں سبز رتوں کی جھیل کی۔ عفت جی! اول دن انڈیکپ اٹ اپ۔ ناول بہت اچھا اور دلچسپ ہے۔ پڑھتے ہوئے ایک لمحے کو بھی یوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ عفت جی پلیز یہ تو بتا دیں کہ ایڈی کا اصلی نام کیا ہے۔ ”افسون جاں“ بھی ایک اچھی تحریر ہے۔ البتہ نام خاصے مشکل مگر دلچسپ ہیں۔ ”تیری الفت میں صنم“ پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ ہم کوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔ بالکل فلمی سی کہانی لگتی ہے۔ مکمل ناول ”محبت ابرکی صورت“ بھی اچھا تھا مگر طویل بہت تھا۔ درمیان میں تو تھپو تا سٹو ہو گیا کہ یوریت ہونے لگی مگر ہونی طور پر پتھر پتھر اچھی تھی۔ سیدہ تہند زہرہ تعریف کی مستحق ہیں۔ ”تم میری خواہش ہو“ بھی بس ٹھیک ہی تھی۔ ہما جگیا کیر کا ناول بھی لائق تحسین تھا۔ ”ہمارا آچل“ میں عمرانہ رمضان



نہیں کیا جا سکا۔ کرداروں سے ملاقات کچھ اوصوری سی لگی۔ ”بانہوں کے گھیرے میں“ ہما جیہا گئیر کہانی میں جگہ جگہ ٹریجڈی دکھائی دی۔ آخر کار شاہ نے اپنی محبت سے عروہ کو خوف کے حصار سے نکال دیا۔ انڈ حسب توقع ہی رہا۔ ”سبز رتوں کی جھول میں“ عفت سحر پاشا کہانی دیر سے خوب صورت انداز میں بڑھا رہی ہیں۔ عین کی شخصیت بہت جلد سامنے آگئی۔ اچھا ہوا جو صبر و کج جلدی پتا چل گیا۔ دوست کے روپ میں دشمن دیکھ کر انسان بے اعتبار ہو جاتا ہے لیکن خلوص اور محبت اپنے لیے خود راستہ بنا لیتے ہیں۔ ضیاء صاحب کی موت تائبندہ کی طرح ہمیں بھی دکھی کر گئی۔ اس کے علاوہ آپ کی شخصیت ”آپ کی صحبت“ کام کی باتیں ٹیوی کی تائید مہندی کے رنگ دُش مقابلہ سے فیض یاب ہوتے ہوئے نظم غزل میں پناہ ملی۔ سب نے بہت اچھا لکھا۔ ”بیاض دل“ میں بھی سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ”ہم سے پوچھیے“ میں نازیہ صلاح الدین کے سوال اور ان کے جواب اچھے تھے۔ اس مرتبہ کہانیاں پڑھتے اس لیے بھی مزا آیا کہ سلسلے وار ناولوں کے ساتھ ہر کہانی کی ہیروئن بہت شرمیلی شرمیلی سی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہنرہ ختم کرتے ہوئے اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ کرے آئے والا وقت اپنے ساتھ بہت سی خوشیاں اور روشنیاں لائے۔

اسماء سامی لطیف آباد نمبر 10 ڈیز اینڈ سویت سی آئی السلام علیکم! خیریت موجود خیریت مطلوب۔ ناچ کا سلام تمام قارئین اور آپچل اسٹاف کو پہنچے۔ اب ذرا آپچل سے دو دو ہاتھ ہو جائیں (معانی کے ساتھ) اس مرتبہ تو آپچل کا ٹائٹل دیکھ کر ہم بس بے ہوش ہونے کے قریب تھے کافی عرصہ بعد اتنا اچھا ٹائٹل آیا۔ آگے بڑھے تو اشتہارات کی ایک لمبی فہرست تھی۔ خیر ذرا سستانے کے لیے ہم فرحت آنٹی کی محفل میں جا پہنچے جہاں نئے قارئین اور پرانے قارئین کو دیئے گئے جوابات سے مستفید ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے سوچا کہ اس مرتبہ پہلے ذرا مکمل ناول پڑھا جائے اور جب پڑھنے لگے تو کہانی میں کئی جگہ پرجھول نظر آیا یہیروئن کچھ زیادہ ہی بے وقف لگے جو کہ بلاوجہ ہی ایک دوسرے سے غلط بھی کی وجہ سے لڑتے رہے۔ جب کہ بات بھی کوئی خاص نہ تھی۔ خیر یہ تو ہمارا اپنا اندازہ تھا ورنہ لکھنے والا بے چارہ کتنی مشکلوں سے کہانی لکھتا ہے یہ صرف وہی جان سکتا ہے۔ خیر پھر ہم نے اپنی قسط وار کہانیاں پڑھیں۔ سب سے پہلے ”تیری الفت میں صدم“ اس بار پڑ کر خوشی ہوئی کہ چلو کہانی اب ذرا آگے بڑھی ورنہ کافی سلو چل رہی تھی۔ عفت سحر پاشا اپنے مخصوص انداز میں ناول آگے بڑھا رہی ہیں۔ افراتی کے بعد عفت سحر پاشا میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ بہت ہی اچھا لکھتی ہیں۔ عشتا بھی ”افسون جاں“ کے ساتھ اس ریس میں شامل ہیں۔ بھی تمھارا کریں اچھا لکھنے والوں کی ریس میں۔ حنا ملک کی ”کوئی ایسا سچر ہو“ بہت اچھی لگی اور ہما جیہا گئیر کی ”بانہوں کے گھیرے میں“ بہت ہی اچھی کہانی تھی آگے بڑھے تو نظموں اور غزلوں کی محفل میں جا پہنچے نازیہ کنول کی نظم بہت ہی اچھی لگی۔ فریدہ خانم کی نظم ”محبت“ ہمیں محبت سے زیادہ مدد لگی۔ تائبندہ کو کب ”نوشین اقبال اور حکیم خان حکیم کی بھی بہت بہتر لکھیں۔ ”بیاض دل“ میں تمام شعر دل کو بھائے۔ دُش مقابلہ میں مرد و کواریٹ پٹی چاہیں لذت لیے ہوئے تھیں۔ ”یادگار لمحے“ میں دیو یاسونی کی نظم بہت ہی اچھی تھی۔ مشعل راہ اور سنہری باتوں سے استفادہ کے ساتھ ہی کامیڈی کی ایک پروین افضل قطعہ رانا تیس مسز خالدہ شاہد کا غور و فکر خندہ اور عشتا نازیہ کی صلاح اور بھیا تک آواز کے ساتھ فوڈیہ سحر کائنات کی محبت بہت ہی زیادہ متاثر کن جملے تھے۔ آئندہ میں کافی جانے پہچانے چہرے تھے مگر ابھی پڑھا نہیں ہے۔ اس لیے باقی آئندہ پڑھوڑتے ہوئے اب اجازت چاہوں گی اگلے ماہ کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ اس دعا کے ساتھ اجازت کہ جہاں رہیں خوش رہیں اور ساتھ رہنے والوں کو بھی ہمیشہ خوش رہیں۔

میرن علی شاکت مسر پور آزاد کشمیر ٹوٹا میڈیٹ سونٹ اینڈ کیوٹ فرینڈز السلام علیکم! انڈ ہلو ہائے۔ کیسے ہیں آپ سب۔ امید ہے سب خیریت سے ہوں گے میں بھی بالکل ٹھیک ہوں اور سنایں بقر عید کی کڑی؟ امید ہے اچھی گزری ہوگی۔ آپچل کا ٹائٹل پسند آیا۔ صفورہ فہر کی بھائی پسند آئیں۔ سب کہانیاں ہی اس دفعہ ٹاپ کی رہیں۔ پچھلے ماہ ساری کہانیاں رکھی تھیں۔ اس دفعہ سب ہی موڈ کو خوشگوار کریں۔ محمد پروین مسر بارون الرشید نعت احباب ہاشمی نے لکھیں۔ بہت بہت اچھی تھیں۔ حکیم محمد سعید نے تزکیہ نفس کے بارے میں اچھا پچر دیا۔ علی صفورہ سے مل کر اچھا لگا اور عرمانہ رمضان

سے ملاقات اچھی لگی۔ تمام مستقل سلسلے بہترین تھے۔ سیدہ زنب زہرہ روئی مریم حکیم خان حکیم نوشین اقبال تائبندہ کو کب اور فوزیہ سحر کائنات کی شاعری پسند آئی۔ ”آئندہ“ میں ملائکہ خان، سمیرا اصغر علی آزاد حسین آزاد تائبندہ کو کب اور ہما کلثوم کے تبصرے پسند آئے۔ ”یادگار لمحے“ میں ہر کوئی ایک سے بڑھ کر ایک تھا۔ ”دُش مقابلہ“ مسز صفیہ آصف نے بہت اچھی ترکیب بتائی۔ اچھا جی اب اجازت چاہوں گی۔ آپچل کیلے کے لیے دعا گو ہوں۔ میں بہت کم شرکت کرتی ہوں مگر میرا بھی جی چاہتا ہے کہ آپچل کیلے کے لوگ مجھے بھی یاد رکھیں۔ میری تحریروں پر تبصرے کریں۔ تنقید برائے اصلاح کی مجھے اشد ضرورت ہے کہ شاید اسی طرح میری تحریروں میں چٹکتی آئے گی۔ اللہ آپچل کو مزید کامیابیاں عطا کرے آمین۔

پروین افضل شاہین بہاولنگر۔ پیاری باجی شہلا عامر صاحبہ السلام علیکم! خیریت موجود خیریت مطلوب اس بار آپچل خوب صورت سرورق سے سجا موصول ہوا۔ کہانیوں افسانوں میں محبت ابر کی صورت کوئی ایسا خیرناہوں کے گھیرے میں تمام میری خواہش ہوا پچھری رہیں۔ سلسلی کنول کو اللہ تعالیٰ تندرستی عطا فرمائے آمین۔

عظمیٰ عمر خان گڑھ۔ السلام علیکم! عید کی چٹھیوں کی وجہ سے ہم آج کل فارغ ہیں سوچا کیوں نہ آپچل سے فیض یاب ہوا جائے ہاں تو پچھری فروری کو آپچل ہمارے نرم و نازک ہاتھ میں آیا اور پھر ہماری چٹھیا لکھیں شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلی چٹھیا لگائی اور سلسلہ وار سلسلے یعنی فسون جاں سبز رتوں کی جھیل اور تیری الفت میں صدم پڑھ کر دل کو کچھ سکون ملا پھر دوسری چٹھیا لگائی اور محبت ابر کی صورت میں پہنچی جو بہت بہت پسند آیا۔ اس کے بعد جو چٹھا شروع کیا تو بانہوں کے گھیرے میں ہے۔ پرا کر اسٹاپ کیا۔ یہ کہانی بھی ہمارے اعلیٰ ذوق پر پوری اتاری اس کے بعد سفر دوبارہ شروع کیا اور پھر ”ہم سے پوچھیے“ پرا کر سانس لیا۔ پہلا سوال اور اس کا جواب ہمیں بہت پسند آیا۔ ”تم میری خواہش ہو“ اور ”کوئی ایسا سچر ہو“ نے ہمیں تھوڑا دکھی کر دیا۔ ”سبز رتوں کی جھیل میں“ تائبندہ کے والد کی وفات نے ہمیں بھی کر دیا۔ اچھا بھی ارے۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ ٹھہرے۔۔۔۔۔ ٹھہرے ہمیں ایک چیز تو بھول گئے یعنی کٹائیل۔ ٹائٹل پر ہم کوئی تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ ٹائٹل تھا ہی بہت پیارا۔

نادیہ گیلانی، مظفر آباد آزاد کشمیر۔ آپچل کا ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ بہت عرصے کے بعد بہت اچھا لگا تھا۔ محمد میں پروین مسر بارون الرشید نے ہمارے جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ نعت رسول مقبول ﷺ سے مستفید ہوتے ہوئے ”در جواب آن“ میں بے دھڑک حاضری دی کیونکہ اپنی شامت کا دور دور تک کوئی نشان نہیں۔ اس مرتبہ ہم نے سبھی نظر آئے اور ڈانٹ تو معمول کا حصہ ہے۔ سوچ چاہ دیکھتے رہے۔ ”واش کدہ“ اس بار بھی لا جواب رہا۔ ہمارے ہاں لوگوں کے ضمیر بہت گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ لیکن حکیم صاحب کی باتیں سمجھوڑنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اپنے اندر بہت وسعت رکھتی ہیں۔ بس دیکھنے والی آنکھ اور ایک عدد دل کا ہونا ضروری ہے۔ ابھی ہم ابھی باتوں کے حرم میں گرفتار تھے کہ عمر انہ رمضان سے ٹکراؤ ہو گیا اور یہ حادثہ بہت خوشگوار رہا کہ ہم نے پہلی ملاقات میں ہی تمام فاصلے سمیٹ لیے۔ ابھی اوداع کہنے ہی لگے تھے کہ عظمیٰ نظر آئیں۔ ارے جھلے جھلے مجھے میری محسوس جان نہیں سہہ سکتی۔ عظمیٰ کی اکثر باتوں سے میں متفق ہوں اور شاعری بھی زبردست ہے۔ شیم ناز صدیقی کی شادی خانہ آدی پران کو بہت بہت مبارک باد۔ سیدہ تائبندہ بہرہ ہمیں ”محبت ابر کی صورت“ کیسے ہے یہ تمھارے پر تھی ہوئی تھیں۔ انکار تو نہیں کئے تھے۔ اس لیے سننے بیٹھ گئے۔ آپ تو بہت اچھا لکھتی ہیں۔ بہت اچھی تحریر ہے۔ سب کردار ہی اپنی جگہ اچھے تھے کہ کوک سہنس بہت تھا لیکن کہانی بہت اچھی تھی۔ اس لیے تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ ”تیری الفت میں صدم“ افراسیور احمد نے ہمیں تو شاک لگایا ہی تھا شاہد ویز کو بھی ملا دیا کہانی آہستہ آہستہ واضح ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے جو سوچا تھا شاہد ویز وہی کر رہا ہے۔ امید ہے یہ نیا جلد پار ہو جائے گی۔ ”کوئی ایسا سچر ہو“ حنا ملک نے اچھا لکھا۔ ٹوکی شخصیت متاثر کن تھی۔ کہانی کا انجام بہت اچھا نکلا سا ہوا۔ ”تم میری خواہش“ سیدہ شبنم سردار کی کہانی پڑھ کر صبر کے پھل کی مٹھاس کا اندازہ ہو گیا۔ ”چلے آؤ کر دل بہت اداس ہے“ غلزار بتول عباس کا افسانہ بہت تیزی سے ہوئے تھا۔ ایک کے بعد دوسرا واقعہ اتنے تسلسل سے بیان کیا گیا ہے کہ ٹھیک سے کسی سے انصاف ہی



# سنت کی آواز

ہما احمد

سدا قائم رہے۔ (آمین پڑی برتھ ڈے ٹو آنچل۔)

(سعدیہ امل کاشف۔ ملتان)

نوشین امین کے نام

سلام خلوص جہاں رہو خوش رہو امید ہے خیریت سے ہوگی۔ حیرانی بھی ہو رہی ہوگی کہ یہ کون ہے جو مجھ سے اس طرح مخاطب ہے۔ نوشین نے شک ہماری دوستی بہت کم عرصے رہی مگر میں بھی اپنی کسی دوست کو بھولا نہیں کرتی اور نہ ہی میں مطلب کے لیے کسی سے دوستی کرتی ہوں۔ میں تو ہمیشہ دل سے دوستی کرتی ہوں مجھے بہت افسوس ہوا تھا جب تم نے بغیر کسی وجہ کے رابطہ ختم کر دیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ کچھ مجھ میں تو آگیا مگر کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہ تھا؟ اس کے ساتھ اجازت۔

(سمیرا روشنی۔ پانچری پاڑہ بھٹہ)

ونچ، سیمائی، گراچی)

رونی تبسم اور نازیہ کنول کے نام

(۱) رونی تبسم! مائی ڈیئر بیٹا جانی کیسی ہو تم؟ چاہے

چاہے میری طرح فرسٹ کلاس ہو اور مسکرا بھی رہی ہو خیر چھوڑو بھئی ۲۴ مارچ کو تمہاری ہے برتھ ڈے تو تم کو تمہاری چنگی تمہارے من پسند بینڈ باجوں کے ساتھ ڈھیر ساری مبارک باد دیتی ہے۔ کیسا.....؟ اور ان گنت دعائیں تمہاری خوب صورت سی زندگی کے لیے تمہاری جانو دوست۔ (۲) نازیہ کنول! پھول کلیوں سے پیاری نازی جان بہت سی محبتیں میری فاسٹ

آنچل کی پوری ٹیم کے نام

میں آنچل سے ملنے سے قبل کیا تھی؟ کچھ نہ تھی اور

پھر وہ انسان کہ جو اپنے اندر کے احساسات اور جذبات کو چھپائے بٹھا ہو وہ کیا ہوتا ہے سوائے ایک پوشیدہ شخصیت کے لیکن آنچل نے پوشیدہ شخصیت کے اندر کے تمام احساسات کو لوگوں سے ملوایا، آشنائی دی اور اس آشنائی نے ایک بچان دی۔ میں نے دیکھا ہے کہ آنچل ایسا رسالہ ہے جس کی پہنچ دور دور تک ہے۔ چاہے میں لاہور میں بیٹھی کسی اجنبی سے جو گفتگو ہوں، آنچل کا ذکر چھڑے ہی سعدیہ امل اس اجنبی کے لیے اجنبی نہیں رہتی۔ عشنا کوثر، آزاد بھائی، دلبر انکل اور عفت بابتاشا سے یہ قلمی رشتہ ایسے جڑا ہے جیسے سب اپنے گھر کے فرد ہوں۔ اب باتوں کے پیچھے صرف چند لوگوں کی دعائیں، محبتیں اور مہربانیاں ہیں۔ اپنے پن کا ایک مضبوط اور ٹوٹا رشتہ ہے۔ ان میں شامل ہیں مشتاق انکل، سلمیٰ کنول، باجی، فرحت آبی، شہلا آبی، ہما آبی، شانکہ اور فشین اور شاید ان سب کے علاوہ اور بھی بہت سے افراد۔ میں فرد افراد سب ہی کو آنچل کی سالگرہ کی مبارک باد پیش کرتی ہوں اور اتنی عزتیں اور محبتیں دینے کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ ہم سب اسی آنچل کی ڈور سے بندھے ہیں اور اس آنچل کو سجانے والے آپ سب ہی ہیں۔ آج کے اس نفرتوں کے دور میں اتنی محبتیں اور چائیں دینے کا شکریہ۔ دعا کریں کہ آپ کا اور ہمارا یہ ان دیکھا رشتہ

سے مل کر تو بہت ہی اچھا لگا۔ ویسے یہ سلسلہ اس لحاظ سے بھی میرا فیورٹ ہے کیونکہ اس میں ہمیں دوسروں کے بارے میں بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ بہنوں اور دوستوں سے مل کے ان کی عادتیں جان کے خوشی ہوتی ہے۔ ”ڈش مقابلہ“ میں سب ڈشیں کچھ خاص نہیں تھیں۔ البتہ کہانیوں اور شاعری نے خوب جی خوش کیا۔ نظموں میں فوزیہ سحر کائنات، نازیہ کنول، نازیہ حکیم خان حکیم کی اچھی تھیں۔ بیٹ آف دامہ نوشین اقبال اور شفاء خان کی رہی۔ شعروں میں نگینہ شاہ، سیدہ زہرہ آگینے، سارہ بٹول، شیا صابر، بٹ، نویدہ قدیر، ندا کے شعر اچھے تھے۔ ”ہم سے پوچھیے“ کے سوالات کچھ خاص نہ تھے۔ فرحین عمران کے ”نوٹکے“ پسند آئے۔ سلسلہ وار ناولوں میں عفت سحر، بابتاشا، اقرا، صغیر احمد اور عشنا جی نے زبردست لکھا۔ ”تیرے بنا“ کو، ہم نے بہت مس کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سلمیٰ کنول کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ آمین۔ ”محبت ابر کی صورت“ سیدہ تمیز زہرا کی بہت بہت زبردست اور اچھی کہانی رہی۔ اس میں اذکار کا کردار بہت اچھا لگا۔ کتنا کیرنگ تھا وہ وردہ کے لیے۔ حنا ملک ”کوئی ایسا شجر ہو“ بھی اچھی تھی۔ وہی طبقاتی فرق یہ غریب ہے یہ ہمارے سٹیشن کا نہیں ہے۔ وہ ٹیکل سوچ لیکن بالآخر دوستی کرنے والے مل ہی گئے۔ ”تم میری خواہش ہو“ سیدہ شبنم سردار کی یہ شاید سب سے دلکش ہے۔ لیکن زبردست کوشش کی ہے۔ ویل ڈن شبنم۔ عذرا بٹول عباسی کی وہی ٹیکل کہانی بیٹے نے خود پسندی والدین نے نہیں اور کروا دی۔ ”بانہوں کے گھیرے میں“ ہما جہانگیر واہ جی خوش کردیا زبردست تحریر تھی۔

فاکہہ فردوس، بہاولپور۔ سوئیٹ آبی السلام، سلیم! کیسی ہیں آپ دعا ہے خیریت سے اور ہنسی مسکراتی رہیں آمین۔ اب ذرا میں آنچل سے بھی مل لوں۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ یہ نئے نئے لکھنے والوں کی بہت محبت سے حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ دوسرا ”دوست کا پیغام آئے“ یہ سلسلہ بہت ہی زبردست ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میلی سے مخاطب ہوں۔ یقیناً آنچل بیٹلی فرینڈ ہے۔ فروری کا شمارہ دلکش سرورق کے ساتھ میرے ہاتھوں میں آیا۔ دھن کے چہرے پر مسکراہٹ کی بہت سی تھی۔ تھوڑی سی سائل ضرور ہونی چاہیے گی ایسا لگتا ہے جیسے زبردستی تصویر تپتی ہے خیر مجموعی طور پر سرورق بہت اچھا رہا ہے۔ ”دانش کدہ“ سے مستفید ہونے کے بعد عمران اور عفتی سے بھرپور ملاقات کی۔ ”جیون ساھی“ میں تبسم ناز کو دعائیں دینے آگے بڑھی تو اقرا، صغیر احمد ”تیری الفت میں غم“ کافی نظر آئیں۔ ویلڈن اقرا، جی اسی طرح جاری رکھیے ان سے بھلو بائے کرنے کے بعد آگے بڑھی تو اپنے آپ کو ”افسون جاں“ میں پایا جہاں سے میرے علاوہ اور بھی ساھی بہت انجوائے کرتے نظر آئے۔ عشنا کوثر بہت کامیاب جاری ہیں بس ذرا سکین کو لیاں مارنے کا ارادہ دل میں رکھتے ہوئے آگے آئی تو اپنے آپ کو ”سبز رتوں کی جھیل میں“ پایا۔ واہ کیا زبردستی چیز ہیں یہ عفت بھی ایک سحر ساطاری کر دیتی ہیں ہر ایک پر بہت ہی خوب صورت۔ پھر سیدہ تمیز زہرہ سے ملاقات کی جو ہمارے لیے ”محبت ابر کی صورت“ جیسا خوب صورت تحفہ لیے کھڑی تھیں۔ پیار سے ان کا تحفہ تمام کردار ان کو دوبارہ اسی طرح کے زبردست اور دلکش تحفے دینے کا وعدہ لے کر مڑی تو دیکھا کہ حنا ملک ”کوئی ایسا شجر ہو“ لیے کھڑی نظر آئیں۔ بہت شکر ہے حنا جی آپ کا گفٹ بھی پسند آیا امید کرتی ہوں کہ آئندہ بھی اسی طرح کے خوب صورت تحفے ہمیں دیتی رہیں گی۔ سیدہ شبنم سردار سے ملی تو وہ بھی یہ کہہ رہی تھیں۔ ”تم میری خواہش ہو“ ان سے ملنے کے بعد ہنسی مسکراتی ہوئی میں عذرا بٹول سے ملی جو میرے بغیر بہت اداس ہو کر یہ گارہی تھیں۔ ”چلے آؤ کہ دل بہت اداس ہے“ پھر آگے آئی تو ہما جہانگیر بھی ملیں جو ”بانہوں کے گھیرے میں“ لیے حاضر تھیں ان سے ملاقات تو بہت ہی دلچسپ اور خوب صورت رہی۔ اس دفعہ سب سے ملاقات کی بہت اچھا لگا اگر آپ لوگوں نے اجازت دی تو اس کے ساتھ ماہ انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔ آپ سب کے لیے بہت دعائیں اور ایک بات مستنصر حسین تارڑ کی کہ آپ کی زندگی کی تھویر آپ کو خوش بناتے آپ کا اخلاق آپ کی محبتیں بناتی ہیں۔





فرینڈ نازی کے لیے (ون سائل پلینز) Yes بالکل ایسے ہی ارے ۲۱ اپریل کو تمہارا جنم دن ہے آنا اور تم کو اسے خوش خوشی ہے منانا۔ یہ میرا حکم ہے اور کے اور تمہارے خوب صورت جنم دن پر بہت زیادہ سے بھی زیادہ مبارک باد۔ میری طرف سے اور دعا ہے کہ اللہ تمہارا جیون خوشیوں سے بھر دے۔ تمہارے خوشگوار مستقبل کی یقینی تمہاری نٹ کھٹ!

(ڈیفنڈ شاہینہ۔ جھنگ)

شیر احمد دلبر انکل اور دوسرے ساتھیوں کے نام ڈیزر انکل آداب! آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ کی باتیں، نہیں پھولوں کی طرح مہکی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ آپ جیسے تختیں بانٹنے والے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں مگر آپ جیسے لوگوں کی ہی ہمیں ضرورت ہے۔ اللہ نے آپ کو جس طرح ایک نیک اور دردمند انسان بنایا ہے اس لحاظ سے آپ میرے آئیڈیل ہیں۔ آپ کا انٹرویو اور تصویر دیکھ کر تو میں بہت مرعوب ہوا ہوں۔ میں آپ کے اور آپ کے گھرانے کی خوشیوں کے لیے ہمیشہ دعا کر رہا ہوں گا کہ آپ کے گھرانے کو کسی کی نظر نہ لگے۔ آمین! اس کے علاوہ عام نوید، مظہر قیوم، کاشف الطاف بھائی، حنا رانا، صائمہ الطاف آپ تمام لوگ آپچل کی رؤفیں ہیں۔ آپچل آپ کے بغیر سونا ہے، آپ جلد لوٹ آئیں اور آپچل کے دوسرے قارئین سے گزارش ہے کہ وقتاً فوقتاً شرکت کرتے رہا کریں کیونکہ آپچل آپ کے بغیر مکمل نہیں۔ ساجد عباس اعوان بھائی، نازیہ کنول آپچی کاشف رحمان (ڈی آئی خان) بھائی آپ کی شاعری لائق ستائش ہے۔ (مبارک باد) ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔

(قمر بخاری۔ علی پور)

قارئین کرام کے نام بہت پیارے دوستو! آپ سب کے پر خلوص خطوط کا شکریہ اور آپ سب کے شدید اصرار پر میں

ایک دفعہ پھر پھر پھر طریقے سے آپچل میں موجود ہوں اور ان لوگوں کا بھی شکریہ جنہوں نے میری کتاب ”میرے سب لفظ تیرے ہیں“ کو پسند کیا اور اپنی خوب صورت آراء سے نوازا۔ میں آپ کو بتاتا چلوں کہ اب کتاب اردو بازار کراچی صدر میں دستیاب ہے۔ یہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ بہت سارے لوگ ابھی تک اس کے مطالعہ سے محروم ہیں اور ایک اور خوش خبری کہ غفریہ اپنی شاعری کے حوالے سے ایک ذاتی ویب سائٹ لانچ کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ اس کو پسند بھی کریں گے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس کے وزٹ کے لیے کہیں گے اور یاد آ رہا ہے کہ اسماء سامی نے آپ کو اپنی کتاب ارسال کی تھی اگر مل گئی ہے تو ضرور بتائیں اگر نہیں ملی تو بھی بتائیں تاکہ نئی ارسال کر سکوں۔ اچھا ساتھیو دعا کریں کہ خدا مجھے مزید اچھی شاعری لکھنے کی صلاحیت ودیعت کرے۔ خدا حافظ۔

(آزاد حسین آزاد۔ پاک بحریہ، کراچی)

ڈیزر آپچل فرینڈز کے نام

ڈیزر نازیہ آرائیں! کیسی ہو جان؟ آپچل میں تمہارے معصوم سے الفاظ دل کو چھو گئے۔ تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں نے بھی تمہیں یاد نہیں کیا ہو گا۔ اوں ہوں محبت کرنے والوں کو تو ہم بھی بھولتے ہی نہیں نیا سال تمہیں بھی بہت مبارک ہو۔ اپنا خیال رکھنا اور خوش رہنا۔ اوکے۔ گڈ اور امی جیہ جانو تمہارا خلوص تو اس خاکسار پر قرض ہے۔ گزشتہ دنوں تمہارے گھر فون کیا تو معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو۔ خدا تمہیں جلد از جلد صحت کاملہ نصیب فرمائے آمین۔ آپچل میں انٹری پر دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید اور ڈیزر مونا طاہرہ۔ آپچل میں شائع میری مسلسل شاعری تمہارے اندر کیا تبدیلی لاتی ہے۔ تم نے اس سے باخبر نہیں کیا۔ پلیز اس بارے میں ضرور بتانا۔ شکریہ!

(نازیہ کنول نازی۔ ہارون آباد)

فرینڈ ز اور گزشتہ کے نام

پیاری اور انوینٹ سی چھوٹی باجی، مینا، نمرہ، سنیچہ اور ملائکہ خان آپ سب کو میری طرف سے جشن بہاراں بہت بہت مبارک ہو۔ چھوٹی باجی ابھی تک ناراض ہو۔ صرف اتنا بتا دو کہ تمہیں منانے کے لیے کیا کرنا پڑے گا۔ تاروں کی فرمائش بھی کر سکتی ہو۔ نمرہ یکم اپریل کو تمہاری سالگرہ ہے۔ اس لیے ایڈوانس میں پٹکی بھر دے تو یو۔ سنیچہ جی اب آپ کو پہلے سے زیادہ محنت کرنا ہوگی تاکہ اس دفعہ سینڈ ایئر میں اچھے نمبر آسکیں اور سوئیٹ سی ملائکہ خان میری دوستی کی محفل میں تمہیں مسکراہٹوں کے پھولوں سے خوش آمدید۔ امید ہے کہ میں تمہاری سابقہ دوست کی کمی کو پورا کر سکوں۔ یہ رہی میری آدھی ملاقات اب اسے پورا تم کر دو گی۔ آپ سب کے لیے دعا گو۔

(زرناشا۔ فیصل آباد)

ملائکہ خان اور مای صوفیہ کے نام بہت بہت پیار ڈیزر ملائکہ خان! کیسی ہو؟ یقیناً ہنسی مسکراتی ہوگی۔ ارے ملائکہ یہ تم نے کیا کیا۔ تمہیں قطعی ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بندی ناچیز اس قابل کہاں (حالانکہ دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں) تم نے مجھے ستاروں کھکشاؤں تک پہنچانے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بہر حال یہ تمہارا حسن نظر ہے کہ تم نے مجھے نمبر ون کہا جب کہ میں نمبر فور ہوں (بہن بھائیوں میں) میرا دل کر رہا ہے کہ میں میں..... جی جناب بالکل ٹھیک پہنچانا مبدولت وہی ہیں جو ایف ایم میں بھی لکھتی ہیں۔ دادو دینی پڑے گی تمہاری پیچان کی کہ لالہ رخ صرف میں ہی تو نہیں ہوں لاہور میں۔ بہر حال اب دونوں تمہاری ہوگئی چلو جلدی سے مٹھائی کھلاؤ۔ (خیال ہی خیال میں) اینڈ مائی ڈیزر سٹ کیوئیٹ سوئیٹ (اور ہر قسم کے میٹ) مای صوفیہ (مائی فرینڈ) کیسی ہیں آپ؟ آج آپ کے لیے ایک سرپرائزنگ پیغام ہے آپ کا گلہ مجھ تک پہنچ گیا تھا (منجھ دھمکی) تو جیسے آج آپ کی ہر طرح کی شکایت

دور کر رہی ہوں۔ جناب آپ کی ویڈنگ اینورسری آرہی ہے تو بہت بہت مبارک! ایک منٹ ٹھہریے آج کل تو آپ ہواؤں میں اڑ رہی ہوں گی ہمارے ماموں جو پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ گلے ہاتھوں ماموں کو بھی مبارک باد دے دیجیے گا۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا آپ کو ہنستا مسکراتا رکھے آمین۔ ارے ہاں یاد آیا کیا آپ بے مارچ کو لاہور آرہی ہیں؟ اور یہ بھی یاد آیا کہ ہم یعنی میں اور سنیچہ آپ سے ناراض ہیں اب جلدی سے ہمیں منائیں۔ نینب کو پیار۔ میرا حصہ نہیں کھانا! فقط آپ کی لاڈلی پیاری سوئیٹ اور جان (خبردار کچھ کہا تو)

(لالہ رخ۔ لاہور)

ڈیزر سٹ سہلی مای اور ماموں شتیق کے نام السلام علیکم! کیسے ہیں آپ لوگ؟ اس مرتبہ مای ہم نے سوچا کہ آپ دونوں کو آپچل کے ذریعے ایک بہت پیارا سا میٹھا سا سرپرائز دیں جو کہ نہ صرف آپ کو حیران کر دے بلکہ بہت زیادہ خوش بھی۔ بو جیسے تو جائیں؟ جی جناب آپ دونوں کو ہماری یعنی آل فیملی نمبرز کی جانب سے ۲۳ مارچ کو ویڈنگ اینورسری بہت بہت مبارک ہو۔ زندگی کے اس خوب صورت سفر میں ہم سب کی بے شمار پر خلوص دعائیں آپ دونوں کے لیے فقط آپ کی بھانجی۔

(رونی۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی)

پیارے بھایا احمد اینڈ ننھے ظہیر عباس کے نام کھلتے پھول، مہکتی کلیاں، غمٹاتے ستارے روشن قد بلیں اور ہمارے دعاؤں سے بھرے دل سب آپ کے نام۔ بھایا احمد حیران ہو رہے ہیں نا کہ ہم اور یہاں؟ دیکھ لیں ہم بھی یہاں پہنچ ہی گئے اور آتے ہی آپ کو یاد کیا۔ اب بتائیں کیسا لگا ہمارا سرپرائز؟ لگ گیا نا جھکا؟ اور سنائیں شادی وادی کب ہو رہی ہے۔ سرپرائزنگ کب سنا ہے (ویسے آپس کی بات ہے کہ اب سہرا نہیں بلکہ کلاہ پہنا جاتا ہے) اور اب تو آپ



ہماری خواہش پوری کر ہی دیں تاکہ ہم بھی ذرا اپنے بھائی کی شادی کو انجوائے کر سکیں اور ہاں اتنا زیادہ غصہ نہیں کرتے صحت کے لیے مضر ہوتا ہے اور ہماری دعا ہے کہ سدا اسی طرح بہتے مسکراتے اور خوش باش جیتے رہو۔ (آمین) اور ظہیر صاحب آپ سنائیں کبوتروں کا کیا حال ہے۔ مٹی نے کتنے کھالے اور کبوتروں نے کتنے انڈے دیئے اور پلیز پلیز ایک بات مان لو کہ بے شک کبوتروں کا شوق بالوکر ساتھ ساتھ بڑھائی بھی جاری رکھو۔ یہ تمہارے مستقبل کا سوال ہے۔ امید ہے کہ آچل کے ذریعے تم ہماری بات ضرور مانو گے ہے نا؟ اور ہمیشہ خوش رہو۔ خدا حافظ۔

(نادیہ جہانگیر اور ثوبیہ جہانگیر آزاد کشمیر) سالگرہ ہیں مبارک.....؟

۲۲ فروری ڈیفرنٹ شاہینہ جھنگ ۲۸ فروری شازیہ نذیر جھنگ ۱۳ فروری علی ناصر حافظ آباد ۲۰ فروری ریاست علی وٹو حافظ آباد ۲۲ فروری قمر سلطان حافظ آباد ۲۰ مارچ سارہ نواب خٹک جھنگ ۲۳ مارچ روبی تبسم لاہور ۱۸ مارچ امل بٹ تبسم حافظ آباد ۲۳ مارچ نوشینہ قدیر ہاشمی جھنگ ۱۹ مارچ اے نینا ہاشمی عیسیٰ خیل میانوالی آپ سب کو سالگرہ مبارک۔

(ساجد عباس اعوان۔ حافظ آبادی)

سوئیٹ رابی اسلم جی کے نام

کیسی ہو؟ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ ہم کو یاد کیا۔ ارے آپ نے کیسی بات کی کہ ”ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں“ آپ تو میری سر آنکھوں پر بیٹھیں اس لیے کہ آپ نے ہاتھ بڑھایا اور میں آپ کو تہ دل سے Wel come کرتی ہوں اور ہاں اب یہ دوستی بھی ٹوٹنے نہ پائے چاہے آندھی یا طوفان آئے۔ مگر ہم نے اس مضبوط بندھن کو کبھی بھی کمزور نہیں ہونے دینا میں نے تو عہد کر لیا ہے اب آپ بھی کر لیں عہد اور پھر کبھی بھی گلہ شکوہ نہ کرنا اس لیے کہ میں یہ نوبت انشاء اللہ کبھی بھی نہیں آنے دوں گی۔ آج عید کا دن ہے اور

گھر پر میں اکیلی ہوں۔ بھیا جی باہر دوستوں سے ملنے گئے ہیں سوچا چلو آج آپ کو پیغام لکھ دوں میری طرف سے بہت بہت عید مبارک ہو۔ تمام آچل ممبرز اور قارئین کو جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے سب کو عید کی خوشیاں مبارک۔

(مس زاہدہ رشید علوی۔ راولپنڈی)

اپنی پیاری سوئیٹ سوئیٹ سی

کزن شائلہ اینڈ صائمہ یاسمین

کزن شائلہ کیسی ہو۔ (۱) شائلہ ۱۸ فروری کو تمہاری سالگرہ تھی۔ تم نے کہا تھا کہ آنا لیکن میں آنہ سکی۔ اس لیے میں نے سوچا آچل کے ذریعے تمہیں سالگرہ کی مبارک باد دے دوں۔ تمہیں میری طرف سے بہت بہت سالگرہ مبارک ہو۔ امید ہے کہ اب ناراض نہیں ہو گی۔ صائمہ یاسمین تم آچل میں اپنی تحریریں بھیجتی رہتی ہو۔ میں پڑھتی ہوں۔ بہت اچھی ہوتی ہیں۔ تم نے میرے بھائی واحد کی وفات کے بعد آچل میں جو کچھ لکھا تھا۔ ہم نے پڑھا ہمیں بہت اچھا لگا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ میری امی کی طرف سے سلام اور دعائیں آپ کے لیے۔ باقی سب پڑھنے والوں کو سلام۔

(تسلیم کوثر۔ فیض پور)

محترمہ عشنا کو سردار کے نام السلام علیکم! سب سے پہلے تو میں آپ کو نئے ناول افنون جاں شروع کرنے پر مبارک باد دیتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ناول بھی اے شیخ کوئے جانناں کی طرح بے حد مقبول ہوگا کیونکہ آپ کے قلم میں ایسی تاثیر ہے کہ پڑھنے والوں کا دل موہ لیتی ہے۔ خاص کر کے آپ کے ہیر و اور ہیر وؤن کے نام بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ خط لکھ کر آپ کو زحمت دے رہی ہوں کہ افسون جان کی ہیر وؤن میرب سیال کا نام بہت خوب صورت ہے۔ میں آپ کے کرداروں کے خوب صورت ناموں کا مطلب ضرور دیکھتی ہوں لہذا اس

دفعہ بھی افسون جاں کے مرکزی رول کے نام کا مطلب ڈھونڈنے کی سعی تو باقی سب کا مطلب معلوم ہوا لیکن میرب کا مطلب نہیں معلوم ہو سکا۔ ساری ڈکشنری ڈھونڈنے پر بھی مطلب معلوم نہ ہوا تو پلیز آپ مجھے میرب کا مطلب رسالہ آچل کے توسط سے بتادیں اور یہ بھی بتائیں کہ میرب کس زبان کا لفظ ہے اگر مطلب معلوم نہ ہوا تو بے چینی رہے گی اور دوسری بات کہ اے شیخ کوئے جانناں کو کتابی شکل میں ضرور لائیں اس کو مکمل پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

(رملہ شہزاد)

آس اور آمنہ غزل

آس آمنہ غزل آج تمہاری سالگرہ ہے۔ مینی پی پی ریٹرن آف دی ڈے وش پو ویری ویری پی پی برتھ ڈے۔ نیلے آکاش تلے مسکرائی رہو تم جہاں جہاں رہو بہاریں تمہارا استقبال کریں۔ تمہارے دامن میں خوشبو بھری رہے۔ موسموں کے فرشتے تمہاری نگہبانی کریں۔ خوشیاں تمہارے قدم چومیں رنگوں پھولوں دھنک کا میا ہوں۔ محبتوں الفتوں اور چاہتوں کی برسات تم پر سایہ فیلن رہے۔ اللہ تم پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ غم کی پرچھائیاں بھی تم سے دور رہیں۔ تمہارے وجود نے ہماری زندگی میں جو جگہ گاہیں بکھیری ہیں وہ یونہی تابندہ و فروزاں رہیں۔ ہماری دعائیں ہمارا خلوص ہماری بے لوث محبت ہماری چاہتیں۔ ہماری زندگی کا ہر رنگ ہر موسم ہر پھول ہر خوشی اور ہر جذبہ تمہارے سنگ سنگ رہے۔ تمہاری اپنی مخلص خیر خواہ۔

(شبنا صاحبہ۔ اوکاڑہ سٹی)

نادی ڈیڑا مظہرہ کے نام

کیا ہو رہا ہے آج کل اور کیسی ہو؟ تم نے پوچھا تھا ”میں یاد آتی ہوں“ تو سنو نہیں بھول جانا میرے دل میں نہیں۔ اگر ہوتا بھی تو شاید نہ بھول سکتی اور یاد اسے کیا جاتا ہے جسے بھلایا جائے۔ میں نے کوئی ایسا دن

نہیں گزرا جس دن تمہیں یاد نہ کیا ہو۔ تمہارا سوال تھا کہ میں کیسی ہوں۔ تو سنو بس ٹھیک ہی ہوں اور تمہیں اس بات کا یقین دلادوں کہ میں تم کو کبھی نہیں بھول سکتی اور میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ میں تو بھی تھی کہ تم مجھے بھول گئی ہو لیکن یاد رکھنے کا شکریہ اور ملنے کا کب ارادہ ہے اور آخر میں آچل کا بہت شکریہ جس کی وجہ سے میں تم سے آج اتنی باتیں کر رہی ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔

(صباحہ۔ کراچی)

امبرین کے نام

ڈیڑا سٹ امبرین ہماری طرف سے تمہیں سالگرہ (۷ مارچ) بہت بہت مبارک ہو۔

(چندرا سونی اینڈ یو یاسونی۔ ٹنڈوالہ یار)

ڈیفرنٹ شاہینہ کے نام

آپ آچل شہری دفاع اور ریڈیو کے پروگرامز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ زیادہ سے زیادہ خواتین کے شماروں میں تحریریں لکھا کریں اور ریڈیو پروگرام فون ان میں زیادہ سے زیادہ فون کیا کریں۔ امید ہے میری ضرور خواہش پوری کریں گی۔

(پروین افضل شاہین۔ بہاولنگر)

پیاری بہن عفت اور بھائی جان ایاز کے نام السلام علیکم! بھینا میرا یہ خط آپ کے لیے سر پرانز ہوگا۔ ۲۳ جنوری کو آپ دونوں کی شادی کی پروقار تقریب میں شمولیت کی۔ بہت مزا آیا کہ اب تک شادی کی پروقار تقریب نظروں کے سامنے ہے۔ آپ دونوں بے حد جانتے لگے رہے تھے۔ میری طرف سے اور باقی سب گھر والوں کی طرف سے آپ دونوں کو شادی کی بے حد مبارک باد۔ ہم سب کی دعا ہے کہ یہ بندھن ہمیشہ قائم رہے اور آپ دونوں ہمیشہ خوش و خرم زندگی بسر کریں اور غم کا سایہ بھی آپ کی زندگی میں نہ آئے۔ (آمین) راشدہ کی طرف سے شادی



مبارک۔

(صدق مطلوب۔ چک چوبلہ فیصل آباد)

پیاری عاتشہ کے نام

کیسی ہو؟ امید ہے ٹھیک ہی ہوگی۔ اپنا اور اپنے سے وابستہ تمام لوگوں کا بہت خیال رکھو۔ خاص طور پر اپنے چھوٹو کا۔ بس اور کوئی خاص بات نہیں۔ ارے ہاں ہے ناں۔ تمہیں میری اور تانہہ کی طرف سے بہت بہت سالگرہ مبارک ہو۔ ایک تمہارے آنے پر کھا لیں گے (یاد سے لانا ضرور) تمہارے لیے دعا گو۔

(نادیہ تائبندہ کو کب گیلانی۔ مظفر آباد آزاد کشمیر)

مائی ڈیز عروج اینڈ جواہرہ کے نام

میں نے سوچا کہ اس دفعہ کی مبارک تم دونوں کو تمہارے فیورٹ رسالے آنچل کے ذریعے دوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں عید کی اصل خوشی آنچل میں میرا پیغام دیکھ کر ہوگی مجھے امید ہے کہ میری اس خوشی کو آنچل والے ضرور پوری کریں گے۔ آنچل میں میرا پیغام دے کر کیونکہ میں ان دونوں سے دور آئی ہوئی ہوں۔ عروج اینڈ جواہرہ میری طرف سے تم دونوں کو اور تمہاری پہلی کو میری طرف سے عید مبارک!

(شیخ گلزار۔ گوجرانوالہ)

انگلینڈ میں مقیم سسر عظمیٰ طاہر کزن ثناء طاہر اینڈ

فرینڈ مسرت شعیب کے نام

ہیلو سسر اینڈ فرینڈ زکیسی ہو؟ ارے ارے حیران

کیوں ہو رہی ہو، میں ہی ہوں آپ سب کی پیاری سی

صانگی۔ میری طرف سے تم سب کو عید کی خوشیاں

مبارک ہوں۔ ویسے آپس کی بات ہے میرے بغیر

۳/۳ کی عید کیسے گزرے گی کیونکہ ایک اہم ہستی تم

لوگوں میں نہیں ہوگی۔ تم لوگوں نے میرے ساتھ بہت

ظلم کیا ہے۔ تینوں مجھے بہت پیاری ہو اور تینوں نے

مل کر مجھے جدا دی ہے۔ میری بھی سی جان پر ظلم

ڈھایا ہے۔ ذرا سوچو تم لوگوں کے بغیر تمہاری صانگی کی

عید کیسی ہوگی۔ لوگ عید مناتے ہیں اور میں بیٹھ کر تم

لوگوں کے فون کا انتظار کرتی ہوں کیونکہ تم لوگوں کا

فون ہی میرے لیے عید کی خوشیاں لاتا ہے۔ شامل

تمہاری پہلی عید ہوگی۔ میں تمہیں بہت بہت مس

کروں گی اور مسرت تم پر مجھے خیر ہے کہ انگلینڈ جیسے

ملک جا کر بھی اپنی فرینڈ کو بھولی نہیں ہو۔ تم نے لکھا تھا

کہ میں بدل گئی ہوں۔ اگر بدلی تو میں نے تمہاری

بڑیاں توڑ دی ہیں۔ اگر میری روش بدلی تو اور باجو

تمہیں میں کیا لکھوں۔ بس اتنا کہوں گی۔ آسانی پر

جتنے ستارے ہیں ان سے ہزار گنا زیادہ میری دعا میں

تمہارے لیے۔ I miss you and please

come back بہت بہت سلام اور پیار دینا۔

تم سب کی اپنی۔

(صائمہ یاسمین۔ کوئٹہ)

ڈیز بھابی خالدہ کے نام

ڈیز بھابی السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟ میں نے

سوچا اس بار آنچل کے ذریعے آپ کو شادی کی سالگرہ

پر پیش کروں۔ پیاری بھابی اینڈ بھابی جان ۱۶ فروری

آپ دونوں کی زندگی کا خوب صورت اور یادگار دن

اس خاص دن کے موقع پر میری طرف سے اور تمام

فیمیلی کی طرف سے آپ کو شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔

ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا

رکھے۔ آپ زندگی کی خوشیوں کو جی بھر کے انجوائے

کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر اس چیز سے نوازے جس

کی آپ کو خواہش ہو اور وہ آپ کے حق میں بہتر ہو۔

آمین!

(عابدہ اینڈ فیمیلی۔ وکیل والا جھنگ)



# 

شائلہ کاشف

سعدیہ اہل کاشف..... ملتان

س: شائلہ ڈیز! تجھیں تحائف ہی میں کیوں پنہاں

ہوتی ہیں؟

ج: تحائف سے ہی محبت کا اظہار ہو سکتا ہے۔

س: آنچل کو مت بتائیے گا۔ میں آنچل کو کون سا

تحفہ دوں؟

ج: درازی عمر اور ترقی کا۔

س: آنچل کی سالگرہ میں سب مدعو ہیں۔ انشین

سہیل، شہلا، آپی، فرحت، آپی، مشتاق، انکل۔ ہمیں

کیوں نہیں بلایا؟

ج: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

س: آپ بھی تو شامل ہیں ہمارے ساتھ۔

ج: نہیں۔ محبت آسب نہیں، محبت سے تو آسب

بھاگتا ہے۔

س: محبت، عشق، وفا، یہ سب کتاب کی حد تک اچھی

لگتی ہیں، حقیقی زندگی میں ان کو شامل کرنا بڑی حماقت

ہے۔ کیا آپ اس سے اتفاق کریں گی؟

ج: حقیقی زندگی، محبت سے ہی عبارت ہے اگر

محبت ہو تو۔ ہمیں اس سے اتفاق ہے۔

س: انسانی زندگی میں صنف مخالف سے محبت کا

مقام کیا ہے اور کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے؟

ج: صنف مخالف تو ماں بھی ہے۔ اس کا مقام اور

اثر پذیر ی تو واضح ہے۔

س: سونو جی آنسو اور مسکراہٹ ایک ساتھ کب

آتے ہیں؟

ج: غیر متوقع خوشی پر۔

س: آپ کی نظر میں زلف کا پھندا اچھا ہے یا

پھانسی کا ایک شوہر کے لیے؟

ج: زلف کا..... اس میں مرتے ہیں۔

س: آپ کے خیال میں خوب صورتی کس میں

ہوتی ہے حسن میں یا نظر میں؟

ج: نظر میں۔ حسن تو خود ہی خوب صورتی ہے۔

س: تہائی اور قید تہائی میں کیا فرق ہے؟

ج: ذرا اس سوال کا مطلب سمجھا دو۔

س: بہاروں میں صرف پھول ہی کیوں کھلتے ہیں؟



دل کیوں نہیں کھلتے؟

ج: دل کھلنے کے لیے بہار شرط نہیں۔ ڈولی درکار ہوتی ہے۔

س: مرد عورت کو کھٹ پتلی کیوں سمجھتا ہے؟  
ج: والد محترم سے پوچھیے۔

سعدیہ عروج عباسی..... خانپور کٹورہ  
س: آپ سے پوچھیں، بھلا کیا؟

ج: خاموشی بھی سوال ہوتی ہے۔ ہم سمجھ گئے۔  
س: مرد اور عورت میں زیادہ کون ظلم کرتا ہے؟  
ج: کوئی بھی نہیں۔

س: اس عید پر بھی نہیں آئے آخر کیوں؟  
ج: وہ بیرینیا کے گھر گئے تھے۔

ثوبیہ نادیہ جہانگیر..... موصل آباد کشمیر  
س: ساس ساجن اور سانپ میں کیا فرق ہے؟  
ج: تینوں ”س“ سے شروع ہو کر کائے کو دوڑتے ہیں۔

س: آپ کو اتنی جلدی غصہ کیوں آ جاتا ہے؟  
ج: فضول اور بھل سوالات پر کیا پیارا گئے گا؟

لالہ رخ..... لاہور  
س: بجوا! دل میں داخل ہونے سے پہلے جوتے

کہاں اتارے جاتے ہیں؟  
ج: اُن کی اماں کے ”سر ہانے“۔

س: آپ بوجہ وہ نہیں، کب کیسے کیوں؟  
ج: آپ ان چکروں میں نہ پڑیے۔ صرف ”میں“

میں“ کرنی رہیے۔  
ج: آٹھل آپ کے لیے۔

س: بابا جیو وہ نہیں، کب کیسے کیوں؟  
ج: آپ ان چکروں میں نہ پڑیے۔ صرف ”میں“

میں“ کرنی رہیے۔  
ج: آٹھل آپ کے لیے۔

س: بابا جیو وہ نہیں، کب کیسے کیوں؟  
ج: آپ ان چکروں میں نہ پڑیے۔ صرف ”میں“

میں“ کرنی رہیے۔  
ج: آٹھل آپ کے لیے۔

س: اُن کی اماں بڑی ”وہ“ ہیں؟

ج: بڑوں کا ادب کرو۔  
س: بریت کی ریت انوکھی کیوں ہوتی ہے؟

ج: انوکھی نہ ہو تو کوئی بریت نہ کرے۔  
انصی صابر بٹ..... اوکاڑہ ٹٹی

س: بچپان پر ناز ہے تو بچا ہے؟  
ج: بچپان لیا۔ آگے بولیے۔

س: بچپن مرتبہ شرکت کر رہی ہوں بتائیے تشریف  
کا ٹوکرا کہاں رکھوں؟

ج: پگھلوں پر۔  
س: کوئی دعا دیجئے ہمیں اچھی سی؟

ج: اللہ زندگی اور ایمان میں اضافہ کرے آمین۔  
زرتاشا..... فیصل آباد

س: میری آنکھوں میں اُن کا عکس ہے تو پھر اُن کی  
آنکھوں میں؟

ج: اُن کی آنکھوں میں بھی آپ ہی کا عکس ہوگا۔  
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تجربہ کرو۔

س: آپ! محبت میں رسوائی کیوں ہوتی ہے؟  
ج: یہ کس نے کہہ دیا۔ محبت غلط ہوگی تو ردِ عمل بھی

غلط ہوگا۔  
س: ڈیر آپ! جب کوئی آپ کے تھے کوٹھکرائے

تو کیا کرنا چاہئے؟  
ج: خاموشی سے شکریہ ادا کر کے واپس رکھ لو۔

تخفے کی جان بچی۔  
طلعت رانا..... چیچہ وطنی

س: شہل آپ! میرے دل کی دھڑکنوں میں کوئی  
بس گیا ہے اب سانس نہیں آ رہی؟

ج: آئینہ لگوا لو۔  
س: کامیاب بیوی بننے کا کوئی طریقہ تو بتائیں؟

ج: کیا بیوی بن چکی ہو؟  
س: آپ سانس بہو کے جھگڑے میں پتا کون

ہے؟  
ج: قلم کے ذریعے۔

ج: ”بے چارہ“۔

پروین افضل شاہین..... بہاولنگر  
س: ہر سالگرہ پر مجھے گونجی کا پھول پارسل کرتے

ہیں۔ میں انہیں سالگرہ پر کیا پارسل کروں؟  
ج: گونجی کے پتے۔

س: سالگرہ میری ہوتی ہے مگر سارے تھے وہ  
وصول کر لیتے ہیں؟

ج: لاپچی لوگ یہی کرتے ہیں۔ کب تک بے  
وقوف بنی رہو گی؟

س: سالگرہ کے دن میک کاٹتے ہوئے اچانک  
بجلی چلی جائے تو؟

ج: میک اپ بھر چہرہ روشن کر لینا۔  
بشریٰ جج..... عارف والا

س: آپ جانی، کیا مسکراہٹوں سے کدورتیں دور  
ہو جاتی ہیں؟

ج: ہاں۔ دور ہو جاتی ہیں ایک مفکر کا قول ہے۔  
”ایک مسکراہٹ کدورتیں دور کر دیتی ہے میری بھی

آپ کی بھی۔“  
س: آپ! جدائی کا وقت زندگی میں کیوں آتا ہے؟

ج: کس دنیا میں رہتی ہو۔ زندگی تو دنیا سے جدا  
ہونے کا ہی نام ہے۔

س: آپ! یہ خوب صورت میاں بیوی کی جوڑی کو  
چاند سورج سے کیوں تشبیہ دی جاتی ہے؟

ج: سورج گرمی بخشتا ہے چاند ٹھنڈک۔ میاں  
بیوی گرم و سرد ہوتے ہیں ناس لیے یہ مثال بہت جج

ہے۔  
س: آپ! لوگ صرف خیالی پلاؤ ہی کیوں پکاتے

ہیں اور کچھ کیوں نہیں پکاتے؟  
ج: خیالی پلاؤ پکانا آسان ہے۔

س: آپ! زندگی کس چیز کے بغیر نامکمل ہے؟  
ج: ایمان کے بغیر۔

ج: آپ! وہ ذرا ذرا سی بات پر آپ سے باہر  
کیوں ہو جاتے ہیں؟

ج: اس لیے کہ آپ اُن کی جان چھوڑیں، وہ خود  
پہل کر نا نہیں چاہتے۔

س: ڈیر آپ! انہیں دوسروں کا مسکرانا زہر کیوں  
لگتا ہے؟ خاص طور پر میرا؟

ج: گلے پر گئی ہونا۔  
الی چہ شانزے..... ہارون آباد

س: بہت دل چاہتا ہے تم سے ملنے کو  
تم ہی بتاؤ کہ ہم کریں کیا؟

ج: صبر کریں، ہم کسی سے نہیں ملتے۔  
س: آپ! اگر کسی سے ملنے کو ہرگز نہ دل کرے تو

ہم کیا کریں؟  
ج: ہماری طرح کریں۔ نہ ملیں۔

س: آپ! جی! ”بھنچا کر اس حال تک ہمیں“ وہ  
کہتے ہیں بھلا کیا؟ جلدی بتائیے؟

ج: کس حالت تک پہنچی ہو؟ بتاؤ تو کچھ مشورہ  
دیں۔

س: میرے محبوب کے چہرے پہ دانے نکل آئے  
پہلے چاند تھا اب تارے نکل آئے ہیں

آپ! جی! ذرا بتائیں تو بھلا کیوں؟  
ج: آپ کے نوکیلے ناخنوں کا کمال ہے۔

س: آج کے دور میں پیسا آئینہ کی حیثیت  
اختیار کیوں کر گیا ہے؟

ج: یہ ہر دور کی آئینہ ہے۔  
ایمان مظفر..... چنڈی بھیلان

س: وہ کالے تو تھے ہی اب خیر سے چشمہ بھی  
لگانے لگے ہیں۔ سوچیں تو کیسے دیکھتے ہوں گے؟

ج: ایک لاکھ روپے والا قربانی کا بکرا۔  
س: ناک پر غصے اور عینک کا سنگم بھلا کیسا لگتا ہوگا؟

ج: ایمان مظفر لگتی ہوگی۔



س: میرے ہمسائے بڑا ستائیں۔ آخر میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے ایسا؟  
 ج: آپ خود بھی اچھی ہمسائی نہیں ہوں گی۔  
 س: ٹیپا صابرٹ..... اوکاڑہ ٹی  
 س: لوگ عشق کو دماغ کا خلل کہتے ہیں آپ کیا کہتی ہیں؟  
 ج: لوگ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ ہم بھی متفق ہوئے جاتے ہیں۔  
 س: ”نظر“ اور نذر“ میں فرق بتائیں؟  
 ج: غلط ذکا۔  
 س: میرا سوال پڑھ کر آپ کس سوچ میں گم ہیں؟  
 ج: کہ کاش آپ کو سوال کرنا آتا ہوتا۔  
 ناسیلہ سعید..... عارف والا  
 س: آپ اپنی ہم مسلمان تو عید پر جانوروں کی قربانی کرتے ہیں اور آپ.....؟  
 ج: ہم ”داد“ دیتے ہیں۔ (قربانی کرنے والوں کو)  
 س: جب دل کے آسکینے کو ٹھیس لگے تو کیا کرنا چاہئے؟  
 ج: دل بدل لینا چاہئے۔  
 س: آپ اپنی جان ریوٹ کنٹرول شوہر مارکیٹ میں کب تک دستیاب ہوں گے؟  
 ج: جب تک آپ بورسی نہ ہو جائیں۔  
 ساجد عباس اعوان..... حافظ آباد  
 جب کوئی اپنا دانستہ نظریں چراتا ہے تو کیسی قیامت ٹوٹتی ہے؟  
 ج: نظریں چرانے والا ”پتا“ کیسے ہوا؟  
 س: مینوں میں بھرے پانی کا مطلب کیا ہوتا ہے؟  
 ج: تیز اور گرد آلود ہواؤں سے آنکھوں میں پانی اتر آتا ہے۔  
 س: یادوں کے ناگ ڈننے سے پہلے اجازت کیوں نہیں لیتے؟

ج: کس قدر مہمل سوال ہے۔  
 نازیہ کنول نازی..... ہارون آباد  
 س: شی آپنی میرا دل اُن کی بے رخی سے بُری طرح اُچاٹ ہو چکا ہے۔ اب اگر وہ ”مُرخ“ ”آنجیل“ بھی لے آئیں تو.....؟  
 ج: دروازے سے لوٹا دینا۔  
 س: بس اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ.....؟  
 ج: اُن کو مارنے کا۔  
 س: شی آپنی فرس کیجئے اگر آپ کی جگہ میں نے یہ محفل سجائی ہوتی تو آپ مجھ سے کیا سوال کرتیں؟  
 ج: سوال ہی نہ کرتے۔  
 قراۃ العین بھٹی راجپور..... ساکھڑ سندھ  
 س: کیا آپ تنگ نہیں آتیں لالہ جی سوالوں کے جواب دیتے دیتے؟  
 ج: ہاں! آتا تو چاہئے مگر اب تو عادی ہو گئے ہیں۔  
 س: آپنی! فرحت خالہ کیسی ہیں؟  
 ج: آپ کی فرحت خالہ ٹھیک ہیں اور آپ کو دغا کہتی ہیں۔  
 س: آپنی میرا دل رکھنے کو دو لفظ کہیں؟  
 ج: اللہ آپ کو سلامت رکھے (آمین)۔  
 نوشین وفا..... کراچی  
 س: مائی ڈیئر شی آپنی میں پہلی بار آپ کی محفل میں شریک ہوں امید ہے کہ آپ مایوس نہ کریں گی کیونکہ آپ تو بہت.....؟  
 ج: ہم مایوس نہیں کریں گے آپ نے محفل میں شرکت کر لی۔  
 س: ”احساس اگر ہو تو محبت کرو“ محسوس“ اگر مصرع مکمل کر دیا تو مان جاؤں گی کہ آپ شائلہ کا شرف اور میری بہت اچھی آئی ہیں؟  
 ج: ہم دوسروں کے ”مصرع“ مکمل نہیں کرتے۔  
 ویسے مصرع کس طرح مکمل کیا جائے۔  
 س: سچی آپنی! جن سے ہمیں بے انتہا محبت ہو وہ ہم

سے دور کیوں ہو جاتے ہیں آخر کیوں؟  
 ج: خواہ مخواہ دور ہو جاتے ہیں۔ ہر وقت تو سر پر سوار رہتے ہیں۔  
 شازیہ سرفراز علی..... کراچی  
 س: ڈیئر شائل آپنی! السلام علیکم عید مبارک! نیا سال مبارک اور رمضان المبارک بھی مبارک۔ عید کی حنا کیا پیغام دیتی ہے؟  
 ج: یہی کہ ”رخصت“ کی گھڑی قریب ہے۔  
 س: عید کی صبح جب میں نے ان کے آگے ہاتھ پھیلا دیا تو وہ بولے.....؟  
 ج: اف! تو بے کتنے گندے ہاتھ ہیں۔  
 س: چوڑیوں کی کھنک لڑکیوں کی کلائیوں میں کہتی ہے کہ.....؟  
 ج: آ بھی جادل دارا۔  
 نگینہ شاہ..... صدر کراچی  
 س: آپنی! اگر تری صدی میں مسکرانے پر آٹھ آنے اور تھپتھپانے پر ایک روپیہ ٹیکس لگ جائے تو؟  
 ج: آپ کا تو بینک بینکس بڑھنے لگا! سو اس ٹیکس کی ابتدا آپ ہی کر ڈالئے۔  
 س: سنا ہے رومانس پر دفعہ لگنے والی ہے جلدی سے بتائیے کون سی؟  
 ج: رومانس خود دفعہ ہے۔  
 س: اگر انہوں نے اس بار بھی ہر مال دورو پے والی عیدی بھیجی تو میں اسے اٹھا کر.....؟  
 ج: رکھ لوں گی! اور وقت آنے پر اپنی نند کو دے دوں گی! یہی نا۔  
 آزاد حسین آزاد..... پاکستان نیوی کراچی  
 س: جب بھی عید آتی ہے وہ انگوٹھا چوستی ہوئی عیدی مانگنے آ جاتی ہے۔ بڑا تنگ ہوں آپنی؟  
 ج: جب عید نہیں ہوتی ہے تو کیا کرتی ہے؟  
 س: سنا ہے اس بار جنرل صاحب نے عید کینسل کر دی ہے۔ اب بقر عید اور عید الاضحیٰ منظم ہوں گی! کیا سچ

ہے؟

ج: آپ تو بحریہ کے آدمی ہیں۔ آپ کو زیادہ معلومات ہوں گی۔ یوں بھی بقر عید اور عید الاضحیٰ ہر سال ہی اُنکھی ہوتی ہیں۔

ظفر اقبال رحیمی..... سرانے عالمگیر  
 س: سچ بولنے والا اس دنیا میں خوار کیوں ہوتا ہے؟  
 ج: کس نے کہہ دیا؟

س: دو آنکھوں والے لڑکے اور دو آنکھوں والی لڑکی کے درمیان ہونے والی محبت اندھی کیسے ہو سکتی ہے؟  
 ج: محبت اندھی نہیں ہوتی! ہزار بار بتایا ہے۔

س: تھنڈے گھرے کا پانی پی کر کجرات کی سوتی کیوں یاد آ جاتی ہے؟  
 ج: فرصت ہونے کی وجہ سے۔

صائمہ نذر..... کراچی

س: ڈیئر آپنی! عید کے روز میں ان کی تواضع کس طرح کروں؟  
 ج: کہہ دیجئے ”اب تو آگئے! آئندہ قدم نہ رکھنا۔“

شہناز خان پٹھان..... کھیرو  
 س: ہر عید پر وہ سب کو عیدی دیتے ہیں مجھے نہیں دیتے! آخر کیوں؟  
 ج: اپنے آپ کو دینے کا ارادہ کر چکے ہیں۔

س: ہر عید پر وہ مجھے کہتے ہیں لالہ جوڑا سلواؤ! بھلا کیوں؟  
 ج: بے چارے لالہ جوڑے میں آپ کو دیکھنے کی حسرت لے کر کہیں گزرنے جائیں! ذرا جلدی کیجئے۔

س: چاند رات کو جب میں چھت پر چڑھتی ہوں تو محلے میں شور مچ جاتا ہے کہ عید کا چاند نظر آ گیا۔ کیا واقعی میں چاند ہوں؟  
 ج: کیوں نہیں ”کچھرو“ کا۔





زندہ دل بس لکھ جو ملے گردیدہ ہو جائے بڑی بڑی غلامی آنکھیں، گفتگو سچی ہوئی، کسی محفل میں ہوں، کسی شخص کو اجنبی ہونے کا احساس نہیں ہوتا لگتا ہی نہیں کہ ان کا تعلق شو بڑ سے ہوگا۔

س: آپ کا اصل نام؟

ج: عذر اصدیق۔

س: آپ کا اشار؟

ج: اشارز پر یقین نہیں رکھتی اس لیے کبھی غور نہیں کیا۔

س: کون سی عادت اپنی زیادہ پسند ہے؟

ج: میری نظر میں تو میری سچ بولنے کی عادت بہت پسند ہے وہ بھی منہ پر.....!

س: جب کوئی آپ کی تعریف کرتا ہے تو کیا لگتا ہے؟

ج: بہت اچھا لگتا ہے اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے اس قابل بنایا۔

س: پسندیدہ موسم؟

ج: سخت سردی۔

س: پسندیدہ رنگ؟

ج: وائٹ اور بلیو۔

س: ہمارے ملک میں شو بڑ کا کیا مستقبل ہے؟

ج: بہت تباہ کن ہے مگر تھوڑی سی ٹھیک ہونے کی گنجائش ہے اس فیلڈ میں اب زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت ہے جو کام میں مزید بہتری لاسکتے ہیں۔

س: ٹی وی ڈراموں کی ساکھ کرنے کی وجہ؟

ج: اس کی ایک وجہ تو مجھے یہ نظر آتی ہے کہ اس وقت ہر شخص پرائیوٹ پروڈکشن بنانے میں مصروف ہے چاہے اس کو الف بے کا علم ہو یا نہ ہو حکومت کو چاہئے کہ اس کے لیے بھی ایک ضابطہ اخلاق بنائے کسی معیار کا تعین کرے۔ صرف پیسے کے بل بوتے پر اچھی کا سٹ لے لینا کوئی کمال نہیں ہے۔ کہانی کا اسکرپٹ اس کی ہدایت کاری بھی اہمیت رکھتی ہے۔

س: کیا پی ٹی وی پرائیوٹ پروڈکشن بھٹان ہو گیا ہے؟

ج: جی ہاں یہ درست ہے آپ اگر ڈراموں پر نظر

ڈالیں تو 80 فیصد ڈرامے آپ کو پرائیوٹ پروڈکشن کے نظر آئیں گے جبکہ پی ٹی وی کے اپنے ڈراموں کی تعداد کم ہوگی۔

س: ملک میں پرائیوٹ ٹی وی چینلز ہونے چاہئیں؟

ج: جی ہاں بالکل ہونے چاہئیں کیوں کہ اس سے مقابلہ ہوگا اور ڈراموں کے علاوہ دیگر پروگراموں میں بھی بہتری پیدا ہوگی۔

س: لوگ انڈین فلموں اور ڈراموں کو کیوں پسند کرتے ہیں؟

ج: وہ لوگ اپنے آؤٹس کی پسند کا خیال رکھے ہیں وہ صرف وہی چیز بناتے ہیں جو آؤٹس پسند کر رہی ہوتی ہے۔ پھر ان کے پاس بے پناہ وسائل ہیں۔

س: فلم اور ٹی وی میں کیا فرق ہے؟

ج: بہت فرق ہے ٹی وی ۲۴ گھنٹے سنسکری زو میں ہے جبکہ فلم میں مکمل گلیمر ہوتا ہے۔ گلیمر کے بغیر کسی فلم کی کامیابی کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آپ خود بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بغیر گلیمر کے بغیر بننے والی فلم باکس آفس پر کیا بڑس کرتی ہے۔ میں تو اس چیز کی قائل ہوں کہ جب آپ فلم بنارہے ہیں تو اسے فلم ہی رہنے دیں محض تفریح کا ایک ذریعہ فلم کے ذریعے دیا ہوا پیغام کوئی قبول نہیں کرتا۔ لوگ فلم تفریح کے لیے دیکھتے ہیں اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں باقاعدہ ایک کہانی ہوتی ہے لیکن وہ بھی محض عوام کی دلچسپی کے لیے باقی جہاں تک ٹی وی کا تعلق ہے تو اگرچہ اس میں بھی تفریح کا عنصر کچھ زیادہ رکھا جاتا ہے لیکن یہ اس لحاظ سے ٹی وی سے منفرد ہے کہ اس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے آدمی کی دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔

س: پھر ان کے پاس بے پناہ وسائل ہیں۔

س: فلم اور ٹی وی میں کیا فرق ہے؟

ج: بہت فرق ہے ٹی وی ۲۴ گھنٹے سنسکری زو میں ہے جبکہ فلم میں مکمل گلیمر ہوتا ہے۔ گلیمر کے بغیر کسی فلم کی کامیابی کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آپ خود بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بغیر گلیمر کے بغیر بننے والی فلم باکس آفس پر کیا بڑس کرتی ہے۔ میں تو اس چیز کی قائل ہوں کہ جب آپ فلم بنارہے ہیں تو اسے فلم ہی رہنے دیں محض تفریح کا ایک ذریعہ فلم کے ذریعے دیا ہوا پیغام کوئی قبول نہیں کرتا۔ لوگ فلم تفریح کے لیے دیکھتے ہیں اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں باقاعدہ ایک کہانی ہوتی ہے لیکن وہ بھی محض عوام کی دلچسپی کے لیے باقی جہاں تک ٹی وی کا تعلق ہے تو اگرچہ اس میں بھی تفریح کا عنصر کچھ زیادہ رکھا جاتا ہے لیکن یہ اس لحاظ سے ٹی وی سے منفرد ہے کہ اس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے آدمی کی دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔

س: پھر ان کے پاس بے پناہ وسائل ہیں۔

س: فلم اور ٹی وی میں کیا فرق ہے؟

ج: بہت فرق ہے ٹی وی ۲۴ گھنٹے سنسکری زو میں ہے جبکہ فلم میں مکمل گلیمر ہوتا ہے۔ گلیمر کے بغیر کسی فلم کی کامیابی کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آپ خود بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بغیر گلیمر کے بغیر بننے والی فلم باکس آفس پر کیا بڑس کرتی ہے۔ میں تو اس چیز کی قائل ہوں کہ جب آپ فلم بنارہے ہیں تو اسے فلم ہی رہنے دیں محض تفریح کا ایک ذریعہ فلم کے ذریعے دیا ہوا پیغام کوئی قبول نہیں کرتا۔ لوگ فلم تفریح کے لیے دیکھتے ہیں اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں باقاعدہ ایک کہانی ہوتی ہے لیکن وہ بھی محض عوام کی دلچسپی کے لیے باقی جہاں تک ٹی وی کا تعلق ہے تو اگرچہ اس میں بھی تفریح کا عنصر کچھ زیادہ رکھا جاتا ہے لیکن یہ اس لحاظ سے ٹی وی سے منفرد ہے کہ اس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے آدمی کی دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔

س: پھر ان کے پاس بے پناہ وسائل ہیں۔

س: فلم اور ٹی وی میں کیا فرق ہے؟

ج: بہت فرق ہے ٹی وی ۲۴ گھنٹے سنسکری زو میں ہے جبکہ فلم میں مکمل گلیمر ہوتا ہے۔ گلیمر کے بغیر کسی فلم کی کامیابی کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آپ خود بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بغیر گلیمر کے بغیر بننے والی فلم باکس آفس پر کیا بڑس کرتی ہے۔ میں تو اس چیز کی قائل ہوں کہ جب آپ فلم بنارہے ہیں تو اسے فلم ہی رہنے دیں محض تفریح کا ایک ذریعہ فلم کے ذریعے دیا ہوا پیغام کوئی قبول نہیں کرتا۔ لوگ فلم تفریح کے لیے دیکھتے ہیں اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں باقاعدہ ایک کہانی ہوتی ہے لیکن وہ بھی محض عوام کی دلچسپی کے لیے باقی جہاں تک ٹی وی کا تعلق ہے تو اگرچہ اس میں بھی تفریح کا عنصر کچھ زیادہ رکھا جاتا ہے لیکن یہ اس لحاظ سے ٹی وی سے منفرد ہے کہ اس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے آدمی کی دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔

س: پھر ان کے پاس بے پناہ وسائل ہیں۔

س: فلم اور ٹی وی میں کیا فرق ہے؟

ج: بہت فرق ہے ٹی وی ۲۴ گھنٹے سنسکری زو میں ہے جبکہ فلم میں مکمل گلیمر ہوتا ہے۔ گلیمر کے بغیر کسی فلم کی کامیابی کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آپ خود بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بغیر گلیمر کے بغیر بننے والی فلم باکس آفس پر کیا بڑس کرتی ہے۔ میں تو اس چیز کی قائل ہوں کہ جب آپ فلم بنارہے ہیں تو اسے فلم ہی رہنے دیں محض تفریح کا ایک ذریعہ فلم کے ذریعے دیا ہوا پیغام کوئی قبول نہیں کرتا۔ لوگ فلم تفریح کے لیے دیکھتے ہیں اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں باقاعدہ ایک کہانی ہوتی ہے لیکن وہ بھی محض عوام کی دلچسپی کے لیے باقی جہاں تک ٹی وی کا تعلق ہے تو اگرچہ اس میں بھی تفریح کا عنصر کچھ زیادہ رکھا جاتا ہے لیکن یہ اس لحاظ سے ٹی وی سے منفرد ہے کہ اس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے آدمی کی دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔

س: پھر ان کے پاس بے پناہ وسائل ہیں۔

س: فلم اور ٹی وی میں کیا فرق ہے؟

ج: بہت فرق ہے ٹی وی ۲۴ گھنٹے سنسکری زو میں ہے جبکہ فلم میں مکمل گلیمر ہوتا ہے۔ گلیمر کے بغیر کسی فلم کی کامیابی کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آپ خود بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بغیر گلیمر کے بغیر بننے والی فلم باکس آفس پر کیا بڑس کرتی ہے۔ میں تو اس چیز کی قائل ہوں کہ جب آپ فلم بنارہے ہیں تو اسے فلم ہی رہنے دیں محض تفریح کا ایک ذریعہ فلم کے ذریعے دیا ہوا پیغام کوئی قبول نہیں کرتا۔ لوگ فلم تفریح کے لیے دیکھتے ہیں اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں باقاعدہ ایک کہانی ہوتی ہے لیکن وہ بھی محض عوام کی دلچسپی کے لیے باقی جہاں تک ٹی وی کا تعلق ہے تو اگرچہ اس میں بھی تفریح کا عنصر کچھ زیادہ رکھا جاتا ہے لیکن یہ اس لحاظ سے ٹی وی سے منفرد ہے کہ اس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے آدمی کی دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔

س: پھر ان کے پاس بے پناہ وسائل ہیں۔

س: فلم اور ٹی وی میں کیا فرق ہے؟

ج: بہت فرق ہے ٹی وی ۲۴ گھنٹے سنسکری زو میں ہے جبکہ فلم میں مکمل گلیمر ہوتا ہے۔ گلیمر کے بغیر کسی فلم کی کامیابی کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آپ خود بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بغیر گلیمر کے بغیر بننے والی فلم باکس آفس پر کیا بڑس کرتی ہے۔ میں تو اس چیز کی قائل ہوں کہ جب آپ فلم بنارہے ہیں تو اسے فلم ہی رہنے دیں محض تفریح کا ایک ذریعہ فلم کے ذریعے دیا ہوا پیغام کوئی قبول نہیں کرتا۔ لوگ فلم تفریح کے لیے دیکھتے ہیں اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں باقاعدہ ایک کہانی ہوتی ہے لیکن وہ بھی محض عوام کی دلچسپی کے لیے باقی جہاں تک ٹی وی کا تعلق ہے تو اگرچہ اس میں بھی تفریح کا عنصر کچھ زیادہ رکھا جاتا ہے لیکن یہ اس لحاظ سے ٹی وی سے منفرد ہے کہ اس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے آدمی کی دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔

س: پھر ان کے پاس بے پناہ وسائل ہیں۔

س: فلم اور ٹی وی میں کیا فرق ہے؟

ج: بہت فرق ہے ٹی وی ۲۴ گھنٹے سنسکری زو میں ہے جبکہ فلم میں مکمل گلیمر ہوتا ہے۔ گلیمر کے بغیر کسی فلم کی کامیابی کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آپ خود بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بغیر گلیمر کے بغیر بننے والی فلم باکس آفس پر کیا بڑس کرتی ہے۔ میں تو اس چیز کی قائل ہوں کہ جب آپ فلم بنارہے ہیں تو اسے فلم ہی رہنے دیں محض تفریح کا ایک ذریعہ فلم کے ذریعے دیا ہوا پیغام کوئی قبول نہیں کرتا۔ لوگ فلم تفریح کے لیے دیکھتے ہیں اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں باقاعدہ ایک کہانی ہوتی ہے لیکن وہ بھی محض عوام کی دلچسپی کے لیے باقی جہاں تک ٹی وی کا تعلق ہے تو اگرچہ اس میں بھی تفریح کا عنصر کچھ زیادہ رکھا جاتا ہے لیکن یہ اس لحاظ سے ٹی وی سے منفرد ہے کہ اس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے آدمی کی دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔

ماڈل:

عذر اصدیق

میک اپ:

روز بیوٹی پارلر 4977970

لباس:

ممتاز بوتیک 4552306

فونو:

موسیٰ رضا 03002140977